UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224493

UNIVERSAL
LIBRARY

رجسٹرڈ نمبر ۱۰۱ جولائی سنہ ۱۹۵۰ء

معارف

مجلس المصنفین کا ماہوار علمی رسالہ

مرتبہ

سید سلیمان ندوی
و
شاہ معین الدین احمد ندوی

قیمت :- چھ روپیے سالانہ

دفتر دارالمصنفین اعظم گڈھ

سلسلۂ تاریخ اسلام

دارالمصنفین کے سلسلۂ تاریخ اسلام کو بڑا حسن قبول حاصل ہوا، علمی و تعلیمی اداروں نے خصوصیت کیساتھ اس کی قدردانی کی، بعض یونیورسٹیوں نے اس کو اسلامی تاریخ کے نصاب میں داخل کرلیا، اس نے چند برسوں کے اندر تقریباً اس کے سب حصے ختم ہوگئے جن کے دوسرے اڈیشن مزید اصلاح و ترمیم، اور اضافوں کے ساتھ چھپ کر تیار ہوگئے ہیں، اور بعض زیر طباعت ہیں، اب یہ سلسلہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے،

تاریخ اسلام حصۂ اوّل

(عہد رسالت و خلافت راشدہ)

یعنی آغاز اسلام سے لے کر خلافت راشدہ کے اختتام تک اسلام کی مذہبی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ، ضخامت ۴۹۵ صفحے قیمت: ۔

تاریخ اسلام حصۂ دوم

(بنو امیہ)

یعنی اموی سلطنت کی صد سالہ سیاسی، تمدنی اور علمی تاریخ کی تفصیل،

ضخامت :- ۳۶۳ صفحے

قیمت :- ۔

"منیجر"

تاریخ اسلام حصۂ سوم

(بنی عباس اوّل)

یعنی ابوالعباس سفاح ۱۳۲ھ سے ابواسحاق متقی باللہ ۳۳۴ھ تک دو صدیوں کی سیاسی تاریخ، قیمت معہ

تاریخ اسلام جلد چہارم

(بنی عباس دوم)

یعنی مستکفی باللہ کے عہد سے آخری خلیفہ مستعصم باللہ تک خلافت عباسیہ کے زوال و خاتمہ کی سیاسی تاریخ

ضخامت :- ۴۲۲ صفحے

قیمت :- ۔

"منیجر"

جلد ۶۶ ماہ رمضان المبارک ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ جولائی ۱۹۵۰ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲ - ۴

مقالات

جن سے میں متاثر ہوا	سید سلیمان ندوی	۵ - ۱۲
البخریہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب	۱۳ - ۲۵
	سابق رفیق دار المصنفین	۲۶ - ۴۸
تاریخ بابل	مولانا ابو الجلال صاحب ندوی	
فتاوی بابری	جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری	۴۹ - ۵۷
کشمیر میں شاہان مغلیہ کے چند آثار	جناب ڈاکٹر سید بدر الدین صاحب استاذ عربی مسلم یونیورسٹی	۵۸ - ۶۱
ایک نادر کتاب کا تعارف	جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی	۶۲ - ۶۴

تلخیص وتبصرہ

ہندوستان میں مسلمانوں کے تمدنی اثرات	ص ع	۶۵ - ۷۶
مطبوعات جدیدہ ۵	"م"	۷۷ - ۸۰

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

حکومت کی زبان ہندی قرار پاجانے کے بعد اردو زبان کی خدمت کی نوعیت اور اُس کے طریقہ کار مین کچھ نہ کچھ تبدیلی ناگزیر ہے، اس لئے انجمن ترقی اردو ہند نے نئے حالات کے مطابق اپنے اغراض و مقاصد اور لائحہ عمل متعین کیا ہے، اس مین دوسری کامونکے ساتھ ہندوستانی زبان کی اشاعت اور دیوناگری اور رومن رسم الخط مین اردو کی معیاری کتابون کا منتقل کرنا بھی ہے، غالباً اس کی مصلحت یہ ہے کہ ہندوستانی زبان اور ہندی رسم الخط کے ذریعہ جو مخالفت اردو زبان اور اس کے رسم الخط کے مقابلہ مین ہندی سے زیادہ قریب ہے، اردو کے مخالفون کی شدت کم اور ان کو اس کی جانب مائل کیا جائے، اور جو نئی زبان بن رہی ہے، اس کو ہندوستانی سے متاثر کیا جائے، اس طرح کسی نہ کسی حد تک اردو کا وجود باقی رہ جائے گا، گو یہ مصلحت حقیقت سے یکسر خالی تو نہین ہے لیکن اس مین حسن ظن کو زیادہ دخل ہے جس ذہنیت کو آسان ہندی تک گوارا نہین وہ ہندوستانی کو کس طرح برداشت کرسکتی ہے!

درحقیقت موجودہ حالات مین جو کچھ خطرہ ہے وہ علمی و ادبی اردو کے لئے ہے، عام بول چال کی زبان کو جسے اردو کہا جائے یا ہندوستانی کوئی نقصان نہین پہنچ سکتا، اور اسے کوئی طاقت نہین مٹا سکتی، زبانین جبر اور قانون کے ذریعہ نہین بنائی جاتین، بلکہ وہ مختلف طبعی عوامل کے ماتحت صدیون مین خود بخود بنتی اور بگڑتی ہین اس لئے جو نئی مصنوعی زبان بنائی جارہی ہے، وہ کبھی عوام کی زبان نہین بن سکتی، اور اس کا دائرہ حکومت کے دفاتر اور علم و فن تک محدود رہے گا، روزمرہ کی زبان پر اس کا بہت کم اثر پڑیگا، زیادہ سے زیادہ اس مین ہندی کے کچھ الفاظ داخل ہوجائین گے، اور وہ تھوڑے تغیر کے ساتھ قائم رہے گی، اس کے مخالفین بھی بجز اس کے کہ نیل گھوڑے کی طرح اس کا نام بدل دین اسکو نہیں چھوڑ سکتے، اس لئے اس کو بچانے کے لئے ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہین اور علمی اور ادبی اردو کو جو خطرات ہین، انکے لئے یہ تدبیر کارآمد نہین ہے اور وہ اپنے حامیوں کی کوششون ہی سے قائم رہ سکتی ہے!

نئی زبان کو اردو سے متاثر کرنے کے لئے بھی ہندوستانی کو وسیلہ بنانے کی ضرورت نہیں، اس مقصد کے لئے اردو اور ہندوستانی دونوں برابر ہیں، اس لئے کہ جب ایک مقام پر ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوں گی تو وہ فطری طور سے ایک دوسرے سے متاثر ہوں گی، اس میں اردو اور ہندی کی تفریق نہیں، بلکہ اُن کے بجائے اگر ہندوستان میں عربی اور فارسی بھی بول چال کی زبان ہوتی، تو ہندی ان سے بھی متاثر ہوتی جس طرح ایک زمانہ میں ہو چکی ہے، اس لئے نئی زبان پر اثر ڈالنے کے لئے بھی ہندوستانی کی ضرورت نہیں ہے، وہ اردو دشمنی کے باوجود اس سے متاثر ہو کر رہے گی، اور ان دونوں کے میل جول سے جو زبان پیدا ہوگی، وہی اصلی ہندوستانی ہوگی،

اس تحریر کا مقصد ہندوستانی زبان کی مخالفت نہیں ہے اگر کوئی ادارہ اسکی تبلیغ و اشاعت کرتا ہے تو یہ بھی ایک مفید کام ہے لیکن انجمن ترقی اردو کا یہ کام نہیں ہے بس کو ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد اور اس کا رسالہ عرصہ سے انجام دے رہا ہے جس میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہیں، انجمن کا مقصد خالص اردو کی خدمت ہونا چاہئے اردو کی معیاری کتابوں کو ہندی رسم الخط میں منتقل کرنے کی تجویز البتہ معقول و مفید ہے اس سے ہندی زبان اور ہندی داں طبقہ دونوں متاثر ہوں گے لیکن رومن رسم الخط کی مصلحت سمجھ میں نہیں آتی، یہ محض اندھی تقلید ہے جس کا کوئی فائدہ نہیں،

انجمن نے دوسرا مفید کام اپنے ذمہ یہ لیا ہے کہ سرکاری اسکولوں میں اردو کے ساتھ جو بے اعتنائی بلکہ دشمنی برتی جا رہی ہے، اور اسکو ان حقوق سے بھی محروم کیا جا رہا ہے، جو دوسری مقامی زبانوں کے طفیل میں اس کو حاصل ہو گئے ہیں، اُن کی تحقیقات و تدارک کے لئے ایک کمیٹی بنا دی ہے جس نے اپنا کام شروع کر دیا ہے، اس کا مرکز لکھنؤ ہے اب یہ اردو کے بہی خواہوں کا فرض ہے کہ وہ شعبۂ تعلیم کے حکام کی اردو دشمنی اور اسکولوں میں اردو کی حق تلفی کے صحیح واقعات سے کمیٹی کو گنگا پرشاد میموریل ہال لکھنؤ کے پتہ پر مطلع کریں،

پاکستان کی قومی زبان اردو مان لی گئی ہے، لیکن اخبارات کی اطلاع سے معلوم ہوتا ہے، کہ سرکاری دفتروں اور تعلیم گاہوں میں ابھی بدستور انگریزی مسلط ہے گو اس بارہ میں اتنی عجلت اور سختی کی ضرورت نہیں کہ تمام دشواریوں اور مقامی زبانوں کے حقوق کو نظر انداز کر کے فوراً اردو کو جبری رائج کر دیا جائے لیکن یہ ضروری ہے کہ مقامی زبانوں کی اہمیت کو قائم رکھتے ہوئے وہ تمام ذرائع اختیار کئے جائیں جن سے جلد سے جلد

اردو دفتری اور تعلیمی زبان بن سکے، اور انگریزی کی احتیاج باقی نہ رہ جائے۔ اردو کبھی ضرورت کی تکمیل سے بھی قاصر نہیں ہے، حیدرآباد میں اس کا پورا تجربہ ہو چکا ہے، اور اردو برسوں سے حکومت کے تمام شعبوں اور یونیورسٹی کی تعلیم زبان رہ چکی ہے، اسی کے ذریعہ ہر فن کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم ہوتی رہی ہے جس کے نتائج سب کے سامنے ہیں، اور کسی شعبہ کو اس کی تنگ دامانی کی شکایت نہیں ہوئی، اب یہ بارِ امانت پاکستان کو اٹھانا ہے، اس کے لئے اردو کی اہمیت تنہا لسانی نہیں بلکہ مذہبی اور تمدنی بھی ہے، مذہب کے بعد وہی اہلِ پاکستان میں قومی اور تمدنی وحدت کا ذریعہ ہے، اس لئے اس کو جلد سے جلد عملاً قومی زبان بنانے کی ضرورت ہے،

ہم نے لاہور کے اس ناشر کے خلاف جس نے سیرۃ النبی جلد اول چھاپ لی تھی، پاکستان کی حکومت اور وہاں کے اخبارات کو توجہ دلائی تھی ہم کو مسرت ہے کہ ان دونوں بلکہ اہلِ پاکستان نے بھی اپنی اخلاقی وعلمی ہمدردی کا ثبوت دیا اور لاہور کے مشہور تاجر کتب شیخ مبارک علی صاحب کے ذریعہ یہ معاملہ بخیر وخوبی طے ہو گیا، دارالمصنفین اپنے ان تمام ہمدردوں کا شکر گذار ہے، اب اس کی قانونی بندش بھی کر دی گئی ہے اس لئے آئندہ کوئی صاحب دارالمصنفین کی کسی کتاب کے چھاپنے کا قصد نہ کریں،

سکہ کے اختلاف کی وجہ سے عرصہ سے پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وی پی آ جا نہیں سکتے، اب ایک نئی دشواری یہ پیدا ہو گئی ہے کہ پاکستان کے تاجر کتب حکومت سے لائسنس حاصل کئے بغیر ہندوستان سے کتابیں نہیں منگا سکتے، اس لئے فی الحال پاکستان سے تجارت بالکل بند ہے، لیکن یہ صورت عارضی ہے، اور یقین ہے کہ تاجر کتب جلد لائسنس حاصل کر لیں گے، لیکن سکہ کے تبادلہ کی دشواری پھر بھی باقی رہ جائیگی، اس لئے جب تک اس کا مسئلہ حل نہیں ہوتا، اس وقت تک شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور دارالمصنفین کے ایجنٹ ہیں، جن لوگوں کو یہاں کی کتابوں کی ضرورت ہو وہ شیخ صاحب سے طلب کریں، اور پاکستان کے معارف کے خریدار اپنا چندہ بھی انھیں کے پاس بھیجیں ان سب کا چندہ ختم ہو چکا ہے، لیکن ان کے اعتماد پر رسالہ بند نہیں کیا گیا، اس لئے ان کا بھی یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ فوراً اپنا چندہ ادا کر دیں،

مقالات

جن سے مین متاثر ہوا

از

سید سلیمان ندوی

"آل انڈیا ریڈیو دہلی نے کئی سال ہوئے مذکورۂ بالا عنوان سے ہندوستان کے ممتاز علماء و مشاہیر سے تقریرون کا ایک سلسلہ شروع کرایا تھا، اس سلسلہ مین حضرت الاستاذ مدظلہ نے بھی تقریر فرمائی تھی، یہ تقریر مختلف حیثیتون سے قابلِ اشاعت تھی لیکن اس کی نوبت نہ آسکی اور اب کئی سال کے بعد یہ تحفہ ناظرین معارف کی خدمت مین پیش کیا جاتا ہے" (بہ شکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

انیسوین صدی ختم ہو رہی تھی، تو میرے ہوش اور تمیز کی آنکھین کھل رہی تھین، پندرہ سولہ برس کا سن ہوگا، اس وقت قدیم و جدید کی کشمکش سے سارا ہندوستان خیالات کا دنگل بن رہا تھا، کانون مین دو قسم کی تحریکون کی آوازین وصدائین آرہی تھین، ایک سرسید کی تحریک یعنی انگریزی تعلیم کی اشاعت اور مذہب مین عقل اور فطرت کی مطابقت کی کوشش، اور دوسری علماء کو نئے زمانہ کے نئے خیالات اور فلسفہ سے آشنا کرکے پرانی عربی تعلیم کی از سرِ نو تنظیم کی تحریک، جس کو لے کر چند روشن خیال علماء اُٹھے تھے، اور یہ بھی عجیب بات تھی کہ اس تحریک کا مرکز بھی علی گڈھ کی ایک عربی درس گاہ تھی، جو مولانا لطف اللہ صاحب کی ذات سے عبارت تھی، اس تحریک کا دوسرا مرکز دہلی تھا، جہان مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی درس دیتے تھے،

کانون مین یہ دونون آوازین پڑین، مگر میرا خاندانی ماحول اسی دوسری تحریک سے متاثر تھا، اس لئے اسی دوسری تحریک سے دلچسپی ہوئی، اور وہ بڑھتی گئی، اور پھیلتی گئی، اور وہی میری زندگی کا جز بن گئی،

اس تحریک کا پہلا اثر یہ تھا کہ علمائے قدیم و جدید کی آمیزش سے نئی عربی درسگاہ کے قیام کی کوشش کی، اور سب سے پہلے مولوی سید نذیر حسین صاحب کے مشہور شاگرد مولانا ابراہیم صاحب آروی نے آرہ صوبۂ بہار مین مدرسۂ احمدیہ کی بنیاد ڈالی، اور اس کے بعد ندوۃ العلماء نے لکھنؤ مین اپنا مدرسہ دارالعلوم کھولا، میرے والد مرحوم نے مدرسۂ احمدیہ مین مجھے بھیجنے کا ارادہ کیا، مگر میرے خاندان کے چند عزیزون کا تعلق ندوۃ العلماء کی تحریک سے تھا، اس لئے دارالعلوم ندوہ لکھنؤ مین داخلہ کی تجویز میرے لئے مناسب بتائی گئی، مگر ابھی اسکے داخلہ مین کچھ تاخیر تھی، تو چند ماہ بہار کے مشہور علمی و مذہبی حلقہ خانقاہ پھلواری مین مجھے رکھا گیا، یہان خانقاہ مین ہر ہفتہ قوالی ہوتی تھی، اس کے اثر سے اس قصبہ مین شعر و سخن کا خاصہ چرچا تھا اور ہے، مین نے بھی اس فضا مین سانس لی، اور یہین سب سے پہلے مین نے مولوی عبدالحلیم شرر کا ناول "منصور موہنا" دیکھا، اس کا یہ اثر ہوا، کہ جس وقت کتاب ختم کی، خوب پھوٹ پھوٹ کر رویا،

ایک برس کے بعد مجھے دربھنگہ کے ایک اور نئے مدرسہ امدادیہ مین جو دارالعلوم ہی کے خاکہ پر بنا تھا، اب تک ہی چند ماہ رکھا گیا، یہان سب سے پہلے مین نے طلبہ کی انجمن دیکھی، اور لوگون کی تقریرین سنین، اور دوسرے ہی ہفتہ مین وقت کے عنوان پر ایسی تقریر کی کہ ہر طرف سے شاباش ملی،

مین نے جس ندوۃ العلماء کا اوپر ذکر کیا، وہ علما کی ایک مجلس کا نام ہے جس نے سب سے پہلے علماء کی منتشر جماعت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا، اور قوم و ملت اور علم و فن کی خدمت کے نئے راستون اور نئے طریقون سے ان کو مانوس کیا، اس کے جلسے سال بسال ہندوستان کے بڑے بڑے شہرون مین ہوتے تھے، ۱۹۱۰ء پورا ہو رہا تھا جب اس مجلس کا سالانہ جلسہ بڑے دھوم دھام سے پٹنہ مین ہوا، یہ جلسہ کیا تھا، جوش و خروش کا ایک سمندر تھا، یہ پہلا موقع تھا جب عمامے اور ہیٹ یکجا ہوئے، علما اور نئے تعلیم یافتہ اصحاب دونون نے ایک پلیٹ فارم پر بیٹھکر قوم و ملت

کی چارہ فوازی کی فکر مین کمین، مین بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ اس جلسہ مین شریک تھا، میری آنکھون نے قومی خدمت کا یہ پہلا تماشا دیکھا تھا، مین نے اسی جلسہ مین یہ پُر اثر منظر دیکھا کہ کوٹ پتلون مین ملبوس ایک بیرسٹر تقریر کر رہے تھے، اور خود رو رہے تھے، اور بڑے بڑے جبہ و دستار والے علماء اور مشائخ کو رُلا رہے تھے،

اسی جلسہ مین سب سے پہلے مین نے اس سلسلۂ تقریر کے اگلے مقرر یعنی شیخ (سر) عبدالقادر لاہور کو دیکھا، وہ اس وقت آبزرور کے اڈیٹر تھے، وہ اپنی اس تقریر کی تمہید مین ٹرانسوال مین بوئر دن کی لڑائی کی مختلف خبرین جو اس وقت آرہی تھین، دلچسپ انداز مین اُن کا حوالہ دیکر یہ کہہ رہے تھے کہ "اخبار نویسون کی بات پر اعتبار کیون کر کیا جائے"، اس تمہید کے بعد انھون نے کہا کہ "مین بھی اخبار نویس ہون، اور اگر تم سے یہ کہون کہ تمھارے بزرگون کی بہت بڑی دولت آج بھی الماریون اور صندوقون مین بند پڑی ہے مگر تم کو خبر نہین، تو تم کو بھی میری اس بات کا کیونکر یقین آئے گا" یہ کہکر انھون نے ندوۃ العلماء کی نگرانی مین اگلے بزرگون کی کتابون کو محفوظ کرنے کی تجویز پیش کی، ان کی تقریر ایسی دلچسپ تھی کہ جس نے پورے جلسہ کے ساتھ مجھے بھی محو حیرت بنا دیا، اور دل مین ایسی ہی تقریر کرنے کا جذبہ پیدا کر دیا جس کی مشق بعد کو ہوئی، جلسہ کے اختتام پر میرے شوق نے پر و بال پیدا کئے، اور مین اُڑ کر لکھنؤ پہنچا، اور ندوۃ العلماء کی درسگاہ مین داخل ہوگیا، اور یہ وہ مقام تھا جو اس وقت سارے ہندوستان کے علماء کا مرکز اور قوم کے بڑے بڑے لوگون کا مرجع بنا ہوا تھا، یہین آنکھون نے سب کچھ دیکھا، اور کانون نے سب کچھ سُنا،

یہان ہندوستان کی ایک مشہور ہستی صدر مدرس تھی، مولانا فاروق چڑیا کوٹی، یہ اپنے زمانہ مین ادب اور معقولات کے امام تھے، ان کی خاص چیز اُن کے پڑھانے کا طریقہ تھا، وہ جو کچھ پڑھاتے تھے عملی طور سے پڑھاتے تھے اور اسکی مشق کراتے تھے، صرف، نحو، ادب، عروض، منطق و فلسفہ ہر ایک فن مین ان کا یہی طرز تھا، دوسری خصوصیت ان کی یہ تھی کہ وہ کتاب کے لفظون کے پابند نہ تھے، یعنی وہ کتاب نہین پڑھاتے تھے، بلکہ اس فن کے مسائل پڑھاتے تھے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ طالب علم فن پر قابو پا لیتا تھا، ان کی طرز تعلیم کی

بہتری کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ مولانا شبلی جیسا کامل ان کی درسگاہ سے پیدا ہوا،

بہرحال موصوف کے طرز تعلیم نے چند ہی دنوں مین یہ کیفیت پیدا کردی کہ آنکھون سے پردے ہٹ گئے اور وہ مسئلے جو پہلے استادون کے سمجھانے سے سمجھ مین نہین آئے تھے، وہ روز روشن کی طرح نظر آنے لگے، یہ پہلی شخصیت تھی، جس نے میرے دل و دماغ پر اپنا پرتو ڈالا،

مین کہہ چکا ہون کہ اردو ادب کی پہلی کتاب مولانا شرر کی منصور موہنا میرے ہاتھ مین آئی، اس لئے میری تحریر پر سب سے پہلا اثر شرر کے طرز تحریر کا پڑا،

۱۹۰۱ء مین شیخ عبدالقادر نے لاہور سے مخزن نکالا، آج کل کے بہت سے بوڑھے اہل قلم اُس کے نوجوان مضمون نگار تھے مین نے بھی اپنی زندگی کا پہلا مضمون اسی مین لکھا، بلکہ اسی کو پڑھکر مضمون لکھنے کی تحریک دل مین پیدا ہوئی،

۱۹۰۲ء مین خود ندوہ کی طرف سے الندوہ نکلا، مولانا سید عبدالحی صاحب مددگار ناظم ندوہ نے مجھے اس مین مضمون لکھنے کی طرف متوجہ کیا، مین نے ایک مضمون علم حدیث اور دوسرا منطق پر لکھکر پیش کیا، دونون قبول ہوئے اور الندوہ مین لکھنے کو دیئے گئے، مگر عین وقت پر میری علمی زندگی کے اصلی رہنما مولینا شبلی ۱۹۰۵ء مین ندوہ آگئے، یہ دونون مضمون شرر مرحوم کے طرز مین تھے، مولانا نے پہلے مضمون کو تو کچھ اصلاح دیکر باقی رکھا، اور دوسرے کو جس مین شریت زیادہ تھی نکال ڈالا، اس وقت سے مولانا کے رنگ کی تقلید شروع کی، مگر اصل منزل تک پہنچنے مین کچھ دیر لگی کیونکہ ابھی یہ رنگ پوری طرح چڑھنے بھی نہ پایا تھا، کہ ۱۹۰۷ء مین شمس العلما آزاد دہلی کی سخندان پارس کے مطالعہ کا اتفاق ہوا، اس کی دلکشی نے اپنی طرف کھینچا، ایک دو مضمون اُس رنگ مین لکھے، مگر یہ طرز تحریر ایسا تھا کہ جو آمد ہو تو کیا کہنا، اور بدقسمتی سے اگر وہ آمد ہو تو اُس سے بُرا کوئی اور نہین، ناچار اُدھر سے ہٹ کر پھر استاد کی بنائی ہوئی شاہ راہ پر آجانا پڑا، کیونکہ علمی مضامین کے لئے اُن کے طرز تحریر سے بڑھکر کوئی دوسرا طرز کارآمد نہین، اس لئے بار بار

اُن سے اصلاحیں لیں، اُن کی ایک ایک تصنیف کئی کئی دفعہ پڑھی، اور سالہا سال اُن کی صحبت اٹھائی، تو علمی زندگی کا ایک نیا تقریر کا ایک طرز اور تحریر کا ایک رنگ نکل آیا،

میرا سیاسی ذوق بھی مولانا شبلی مرحوم کا فیض ہے، وہ اٹھارہ برس سرسید کے ساتھ رہنے کے باوجود اُن کے سیاسی خیالات کے سخت مخالف تھے، پھر طرابلس کی لڑائی، مسجد کانپور کا ہنگامہ اور بلقان کی جنگ نے اس نشہ کو اور تیز کیا، اسی کا نتیجہ تھا کہ مولانا ابوالکلام نے جو خود بھی مولانا شبلی کی صحبتوں سے متاثر تھے، جب ۱۹۱۲ء میں اپنا اخبار الہلال نکالا، تو میں اس کے اسٹاف میں شامل ہو گیا، اخبار کے لٹریچر اور ادبی سطح کو یکساں رکھنے کے لئے میں نے اسی کے طرز میں لکھنا شروع کیا، چنانچہ الہلال میں اس زمانہ میں میں جو تحریریں میرے قلم سے نکلیں، ان میں ابوالکلام کا طرز اتنا نمایاں ہے کہ لوگ غلط فہمی سے اس کو مولانا ابوالکلام کے نام سے بے تکلف چھاپ رہے ہیں، اور پڑھ رہے ہیں، اور میری پہلی کتاب ابن الوقت میں بہت کچھ مٹانے پر بھی اس کی جھلک موجود ہے،

معارف میں جو شذرات لکھے جاتے ہیں، اس کا آغاز میں نے الہلال ہی میں کیا تھا لیکن معارف میں آکر ہلالیت کم ہو کر ایک اور خاص رنگ ابھر آیا،

لیکن بہر حال چند روز ادھر ادھر بہک کر پھر اسی راستہ پر آگیا، جس پر استاد مرحوم نے لاکر مجھے کھڑا کر دیا تھا، خصوصیت کے ساتھ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے جانتے اُن کے طرز ادا کے نباہنے کی پوری کوشش کی ہے،

میں نے شروع ہی میں اپنے ایک جرم کا جس کو میں چھپاتا رہا۔ ہلکا سا اقبال کر لیا ہے یعنی شعر و سخن کا ذوق میں نے جب آنکھ کھولی، تو ملک میں امیر اور داغ کے معرکے تھے، میرے ایک استاد شمس العلماء مولانا حفیظ اللہ صاحب مدرس دار العلوم جو جنرل عظیم الدین خان کے زمانہ میں رامپور میں رہے تھے، اور وہاں منشی امیر احمد صاحب مینائی کی صحبت برسوں اٹھائی تھی، وہ اکثر امیر مرحوم کے تذکرے کیا

کرتے تھے، اور اُن کے شعر سُناتے تھے، ایک اور اتفاق یہ ہے کہ حضرت امیر مینائی کے جلیل القدر شاگرد جلیل مانک پوری جواب نواب فصاحت جنگ سے مخاطب ہیں، اُن کے بڑے صاحبزادہ مولوی صدیق صاحب (متوسل صدر کار نظام) میرے ساتھ دارالعلوم ندوہ میں پڑھتے تھے، ان کے ذریعہ سے حضرت امیر کی بہت سی غزلیں میری نظر سے گذریں اور دل میں امیر مرحوم کی قدر و منزلت نے گھر کیا، کلیات امیر اکثر مطالعہ میں رہتا، دارالعلوم میں لڑکوں کے مشاعرے ہوتے تھے غزلیں پڑھی جاتی تھیں، ایک صاحب داغ کا روپ بھرتے تھے، اور مجھے امیر مرحوم کی پیروی کا دعویٰ تھا، لیکن ۱۹۱۲ء میں جب مولانا شبلی نے نئی اردو شاعری کی طرح ڈالی، تو دل نے اس میں بھی استاد کی پیروی کا حق ادا کرنا چاہا، متعدد نظمیں اس رنگ میں لکھیں، جن کا خاتمہ استاد کے ماتم پر ہوا، جو نوحۂ استاد کے نام سے ۱۹۱۵ء میں پونہ میں چھپا، جہاں ان دنوں دکن کالج میں فارسی کا لکچرر تھا، میں نے جب یہ نوحہ لکھا تو اکبرالہ آبادی، ڈاکٹر اقبال، عزیز لکھنوی، مولانا شروانی وغیرہ اور استاد مرحوم کے اکثر دوستوں اور قدر دانوں کے پاس اس کو تحفہ بھیجا، سب نے تعریفیں کیں، اور دل بڑھایا، مگر ایک آزمودہ کار صاحب کمال ایسا تھا جس نے شفقت کی راہ سے مجھے لکھا کہ معاف کیجئے آپ شاعر نہیں، اور اس کے بعد ایک ایسا نکتہ مجھے بتایا جو میرے دل میں پیوست ہو گیا، انھوں نے فرمایا کہ جب تک انسان کسی فن میں کامل نہ ہو جائے، اس کو دوسروں کے سامنے عرض ہنر نہیں کرنا چاہیئے، میں نے اسی دن بساط سخن لپیٹ دی اور شاعری سے توبہ کر لی، اس کے بعد اگر کبھی دل کے تقاضے سے مجبور ہو کر کچھ کہا تو اس کو عیب کی طرح چھپایا، اور اگر چھپ نہ سکا، اور چھپ گیا، تو نام کو رمز و اشارہ بنا دیا، یہ آزمودہ کار صاحب کمال جنھوں نے مجھے یہ قیمتی نصیحت کی، جس نے میرے رُخ کو نظم سے تمامتر نثر کی طرف پھیر دیا، نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے،

اسی طرح طالب علمی کے زمانہ میں ایک اور بزرگ نے عین وقت پر میری ایسی رہبری کی جس نے میرے خیالات کی دنیا پلٹ دی، یہ بزرگ ندوۃ العلماء کے پہلے ناظم مولانا سید محمد علی صاحب ہیں، مجھے

اُس زمانہ مین عربی ادب اور منطق کا شوق تھا، ایک دن اونھون نے مجھے بلوا کر پوچھا کہ تم کو کس کس فن سے ذوق ہے، مین نے عربی ادب اور منطق کا نام لیا، فرمایا کیون، مین نے کہا اس لئے کہ یہ دونون دوسرے اصل مقصود علوم کے خادم اور ذریعہ ہین، ارشاد ہوا کہ آخر ان اصل علوم کی طرف توجہ کب ہوگی، عرض کی جب اُن مین کمال پیدا ہو جائے گا، فرمایا تو اسی خادم اور ذریعۂ علوم مین تو ہمارے علما کی پوری عمرین بسر ہو جاتی ہین، اور اصل مقصود کی نوبت نہین آتی، اس پر انھون نے یہ حکایت بیان کی، کہ ایک صاحب کو تصنیف کا شوق پیدا ہوا، تو وہ قلم بنا بنا کر رکھنے لگے، یہان تک کہ تمام کمرہ قلمون سے بھر گیا، کسی نے اُن سے پوچھا کہ حضرت یہ آپ اتنے قلم بنا بنا کر کیون رکھ رہے ہین؟ تو متانت سے ارشاد ہوا کہ "میرا ارادہ تصنیف کا ہے"، پوچھنے والون نے کہا کہ "پھر وہ کب ہوگی"؟ فرمایا جب ان قلمون سے فرصت ملے گی"،

تمثیل اس بات کی تھی کہ عربی نصاب تعلیم کا بڑا حصہ دینی علوم کی تمہید اور ذریعہ کے طور پر پڑھا جاتا ہے، مگر ہوتا یہ ہے کہ یہ ذریعہ تعلیم اصل تعلیم کی جگہ لے لیتا ہے، مولانا کی یہ حکایت میرے لئے اس درجہ موثر ہوئی کہ مین نے پھر تمام عمر ذریعۂ علوم اور مقصد علوم کے درمیان کبھی مغالطہ نہین کھایا،

دار العلوم ہی مین تھا کہ ایک اور بزرگ سے نیاز حاصل ہوا، یہ مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین صاحب بی اے تھے، یہ عربی کے عالم اور انگریزی کے گریجوایٹ تھے، فلسفہ مین وہ ڈاکٹر آرنلڈ کے اور ادب مین مولانا فیض الحسن سہارنپوری کے شاگرد تھے، یہ ان لوگون مین تھے، جو دینی علوم کی تکمیل کی بھول بھلیون سے نکل کر اصل مقصد کی منزل تک پہنچ گئے تھے، سالہا سال سے وہ قرآن پاک کی حقائق و معانی پر غور کر رہے تھے، اُن سے قرآن پاک اور فلسفۂ جدید کے سبق تو کم ہی پڑھے، مگر صحبت بار بار اُٹھائی، اور مشکلات مین مشورے بار بار کئے، سیرت کی تیسری جلد مین جو معجزات پر ہے، انہی کے فلسفہ کی تقلید کی ہے،

سب جانتے ہین کہ میرا تصنیفی ذوق مولانا شبلی مرحوم کی تربیت کے دامن مین پرورش پایا ہے، استاذ مرحوم کا طریقہ یہ تھا کہ وہ نوآموزون کو پہلے مضمون لکھنے کی ہدایت کرتے تھے، کبھی وہ عنوان خود تجاتے تھے، اور کبھی طالب علم خود ہی مقرر کر لیتے تھے، پھر وہ اس مضمون کے متعلق معلومات کا سراغ کتابون مین بتاتے تھے، طالب علم اپنی محنت سے ان کا کھوج لگاتے تھے، اور جب کافی معلومات جمع ہو جاتے تو اُن کو لکھ کر اُن کے سامنے پیش کرتے، وہ اس مین کاٹ چھانٹ کرتے، مضمون کے بعد پھر رسالون کی، اور اس کے بعد کتابون کی تصنیف کی باری آتی، تاکید ہوتی کہ معلومات اور مواد کو کہنہ اور گوشے اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ رہ جائے، اس عنوان پر اگر پہلے کسی نے لکھا ہو تو اُس سے تمہارا مضمون بالکل الگ رہے، یا اس سے بڑھ جائے، مستند حوالہ کے بغیر کوئی واقعہ نقل نہ کیا جائے، حوالہ مین سب سے قدیم اور سب سے مستند ماخذ کا خیال رکھا جائے، انشا کے ساتھ عبارت کی چستی، طرز ادا کی شگفتگی، اور تشبیہ و استعارہ کی ندرت ہاتھ سے نہ جائے، پامال معلومات، مبتذل محاورات اور عامیانہ الفاظ سے پوری طرح پرہیز کیا جائے، یہ ان کا طریقہ تھا، اور اسی طریقہ کی پابندی ہمارے دارالمصنفین مین جس مین علما اور گریجویٹ اصحاب کو تصنیف و تالیف کی تعلیم دیجاتی ہے، اب تک کیجاتی ہے،

خطباتِ مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے ان کو بیحد پسند کیا،

ضخامت ۱۹۴ صفحے،

قیمت عہ (چوتھا اڈیشن)

"منیجر"

الجزیہ

از

جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دارالمصنفین

"جزیہ کے متعلق غیر مسلمون مین مدتون سے جو غلط فہمی چلی آرہی تھی، اس کو سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے الجزیہ لکھ کر دور کیا لیکن اسکے بعض پہلو پھر بھی تشنۂ تحقیق تھے، اس مضمون مین تمام فروعی پہلوؤن پر مفصل بحث کرکے جزیہ کی حقیقت واضح کی گئی ہے"۔

جزیہ کا لفظ جزیہ کس زبان کا لفظ ہے؟ اس کے متعلق دو خیال ہین،

(۱) پہلا خیال یہ ہے کہ وہ عربی ہے، اس کا مادہ ج ز ی ہے، یہی خیال زیادہ عام ہے، طبری (۳۱۰ھ) جصاص (۳۷۰ھ) ابو بکر سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) جوہری (۳۹۳ھ) راغب اصفہانی (اوائل ۵۰۰ھ) محی السنہ بغوی (۵۱۶ھ) زمخشری (۵۳۸ھ) معافری (۵۴۳ھ) رعینانی (۵۹۳ھ) امام رازی (۶۰۶ھ) جمال قرشی (۶۶۱ھ) بیضاوی (۶۸۵ھ) نسفی (۷۰۱ھ) ابن مکرم (۷۱۱ھ) ابو حیان غرناطی (۷۴۵ھ) فیروزآبادی (۸۲۰ھ) مہائمی (۸۳۵ھ) بدرالدین عینی (۸۵۵ھ) جلال الدین محلی (۸۶۴ھ) جلال الدین سیوطی (۹۱۱ھ) ابو سعود (۹۵۱ھ) شہر بینی (۹۶۰ھ) محمد طاہر (۹۶۶ھ) زبیدی (۱۲۰۵ھ) محمد اشرف (۱۲۴۴ھ) آلوسی (۱۲۷۰ھ) سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) جو مشہور کتب تفسیر، فقہ اور لغت کے مصنف ہین، یہی لکھتے ہین،

(۲) دوسرا خیال یہ ہے کہ وہ فارسی ہے، اصل مین گزیت تھا جس کے معنی خراج کے ہین، یہ خیال

ابو عبداللہ محمد بن احمد بن یوسف خوارزمی (۳۸۷ھ) نے مفاتیح العلوم (ص ۵۰) مین ظاہر کیا ہی، اس کی کتاب ۱۸۹۵ء مین G. Van Vloten نے شائع کی ہے، اور ایک کتاب منتخب اللغات کے قلمی نسخہ مین بھی جو ناقص الاطراف ہے، یہی لکھا ہے، اس کتاب سے مراد اگر منتخب اللغات شاہجہانی ہی تو اس کا مصنف عبدالرشید حسینی مدنی ٹھٹہ (سندھ) کا رہنے والا تھا جس نے اس کتاب کو حسب روایت ریو، سنخاو، اور ایتھے ۱۰۴۶ھ مین تمام کیا،

گزیت کے دو تلفظ ہین، فردوسی کے ان اشعار

گزیتے نہادند بر یک درم — گرایدون کہ دہقان بود سی درم

گزیتے زیادہ درشش درم — بکر ماستان برنہین زد رقم

اور نظامی کے اس شعر

گشش خاقان خراج چین فرستد — گشش قیصر گزیت دین فرستد

مین گزیت امیر کے وزن پر ہے، لیکن مفاتیح العلوم کے ناشر نے اس کو رہبر کے وزن پر پڑھا ہے،

جزیہ کا تلفظ | جزیہ کو جو لوگ معرب نہین مانتے، بلکہ عربی سمجھتے ہین، وہ اس کا تلفظ دو طرح پر کرتے ہین،

الف:- جزیہ، جیم کے نیچے زیر، یہ عام تلفظ ہے، جیسے شکوہ بمعنی شکایت،

ب:- جزیہ، جیم کے اوپر زبر جیسے قعدہ اور جلسہ، یہ امام ابن جریر طبری (۳۱۰ھ) نے اپنی مشہور تفسیر جامع البیان (ص ۹۰ ج ۱۰) مین، اور امام ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) نے بحر المحیط (ص ۳۰ ج ۵) مین لکھا ہے، دوسری کتاب مین قعدہ کی جگہ پر عقدہ چھپ گیا جو غلط ہے،

تنقید | میرے نزدیک عربی جزیہ، معرب جزیہ سے زیادہ قدیم ہے، اور اس کے حسب ذیل دلائل ہین،

(۱) یہ لفظ قرآن مجید مین موجود ہے، اور چونکہ آیت جزیہ ۹ھ مین نازل ہوئی ہے[۱] اس لئے عربی ادبیات مین اس کو رواج پائے ہوئے تیرہ سو ساٹھ برس کا زمانہ گذرا ہے،

(۲) عرب کے ایک جاہلی شاعر ابو کبیر ہذلی (عامر بن حلیس[۲]) جنھون نے اسلام کا زمانہ بھی پایا ہے، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت سے مشرف ہوئے ہین[۳]، لسان العرب ابن مکرم (۷۱۱ھ) مین جو عربی زبان مین لغت کی سب سے بڑی کتاب ہے ان کا ایک شعر نقل کیا ہے (ص ۵۹ جلد ۱)

واذا الکماۃ تعاورو اطعن الکلی
تذر البکارۃ فی الجزاء المضعف

اس مین جزار کا لفظ جزی اور جزر کی جمع ہے، اور یہ دونون لفظ جزیہ کی جمع ہین،

(۳) حدیث کی کتابون مین یہ لفظ عام طور پر ملتا ہے،

(۴) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے کتاب الخراج، خاص خراج اور جزیہ پر لکھی ہے لیکن جزیہ کو معرب نہین کہا ہے،

(۵) امام یحیی بن آدم (۲۰۳ھ) نے بھی کتاب الخراج تصنیف کی ہے، اور اس مین بعض ایسے الفاظ بھی آئے ہین، جو معرب ہو کر مستعمل ہو چکے ہین، مثلاً زمین کے خراج کے لئے قسط (ص ۵۷) بیعانہ کے لئے وضر (ص ۵۹) یا دستجہ جو غالباً دستہ کا معرب ہے، (ص ۱۴۴) لیکن جزیہ کو معرب نہین لکھا ہے،

(۶) ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری (۲۸۱ھ) نے الاخبار الطوال مین بعض معرب الفاظ لکھے ہین جیسے شمشیر جو سمرہ کا معرب ہے لیکن جزیہ کے متعلق وہ بھی خاموش ہین،

---

[۱] تفسیر ابن جریر ص ۶۵، ۶۸، ج ۱۰: [۲] کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ (۲۹۶) مطبوعہ لیڈن ۱۹۰۲ء
[۳] اصابہ وغیرہ،

(۷) تمام مفسرین اور فقہا نے جزیہ کو عربی الاصل سمجھا ہے،

(۸) کوئی اہل لغت اس کو معرب نہیں کہتا،

(۹) گزیت کا سب سے قدیم عربی ماخذ خوارزمی ہے جس نے ۳۸۷ھ میں وفات پائی،

(۱۰) فارسی ماخذ میں گزیت کا لفظ سب سے پہلے فردوسی کے ہاں ملتا ہے جس نے ۴۱۱ھ میں انتقال کیا تھا، اس لحاظ سے اس لفظ کو فارسی اسلامی ادبیات میں آئے ہوئے نو سو اٹھاون برس ہوئے اور یہ مدت عربی جزیہ سے بقدر ۱۵۴ برس کم ہے،

(۱۱) فارسی میں علم لغت کی پہلی کتاب ابوالحسن علی بن احمد اسدی طوسی نے لکھی جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ چھٹی صدی ہجری سے قبل فرض کیا جا سکتا ہے، اس کتاب کا نام لغت فرس ہے، اور بقول مصنف بلخ ماوراء النہر اور خراسان (گویا ایران و ترکستان) کی فارسی کے الفاظ جمع کئے ہیں، جو عربی کی آمیزش سے بالکل پاک ہیں، اور ان کی سند میں اشعار بھی پیش کئے ہیں، لیکن باایں ہمہ اس کتاب میں گزیت کا لفظ نہیں ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ گزیت فارسی نہیں بلکہ جزیہ کا مفرس ہے،

(۱۲) گزیت کے جو معنی خوارزمی (۳۸۷ھ) نے لکھے ہیں، بالکل وہی معنی جزیہ کے اس عربی مصنفین نے لکھے ہیں، جو اُن سے مقدم تھے، مثلاً طبری (۳۱۰ھ) اور سجستانی (قبل ۳۸۶ھ) اور ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ معرب نہیں، بلکہ گزیت مفرس ہے

(۱۳) چونکہ صحیح لفظ گزیت بروزن امیر ہے، جیسا کہ فردوسی اور نظامی کے اشعار سے ثابت ہے اس لئے جزیہ اُس سے معرب نہیں ہو سکتا،

(۱۴) ان تمام باتوں کے باوجود یہ امکان ضرور ہے کہ اسلام سے پیشتر یہ لفظ ایران سے یمن آیا ہو اور معرب ہو کر عرب میں رائج ہو گیا ہو، لیکن یہ امکان ہی امکان ہے، شواہد سے اس کی تائید مشکل ہے،

(۱۵) یہ بھی پیش نظر رہنا چاہئے کہ اسلام سے پیشتر نہ صرف ایران، بلکہ چین اور ہندوستان مین بھی جزیہ کا رواج تھا، اور اہل عرب تجارتی سلسلہ سے ان مقامات مین آتے جاتے تھے، اس لئے جس طرح یہ ممکن ہے کہ جزیہ کا لفظ ایران سے لیا گیا ہے، یہ بھی ممکن ہے کہ چین یا ہندوستان مین جزیہ کا طریقہ دیکھ کر اہل عرب نے اس کا عربی نام جزیہ رکھ لیا ہو،

جزیہ کے معنی مفسرین فقہاء اور ائمہ لغت نے جزیہ کے معنی خراج کے لکھے ہین،

(ا) امام ابوجعفر محمد بن جریر طبری (سنہ ۳۱۰ھ جامع البیان (۸ ج، مصر) مین لکھتے ہین،

حتّٰی یعطوا الخراج عن رقابھم — یہان تک کہ وہ اپنی گردنون کی طرف سے خراج دین،

(ب) امام ابوبکر محمد بن عزیز سجستانی جنھون نے سنہ ۳۳۰ھ سے قبل وفات پائی، اپنی تصنیف غریب القرآن (عرف نزہتہ القلوب) ص ۸۳ (مصر سنہ ۱۳۲۵ھ) مین فرماتے ہین،

الجزیۃ، الخراج المجعول علی راس الذمّی، — جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کی ذات پر لگایا جاتا ہے،

(ج) شمس الائمہ ابوبکر محمد بن ابوسہل سرخسی (سنہ ۴۸۳ھ) مبسوط (ص ۱۰، ج ۱۰ مصر) مین لکھتے ہین :-

وضع خراج علی رؤوس الرجال — آدمیون پر فی راس خراج لگانا (جزیہ) ہے،

(د) محی السنۃ ابو محمد حسین بن مسعود بغوی (سنہ ۵۱۶ھ) کی معالم التنزیل (ص ۲۷ جلد ۲ بمبئی سنہ ۱۲۷۶ھ) مین ہے :-

وھی الخراج المضروبۃ علیٰ — اور وہ جزیہ ان (ذمیون) کی گردنون پر

مقررہ خراج ہے،

۷ - علامہ ابوالقاسم جاراللہ محمود زمخشری (۵۳۸ھ) کی اساس البلاغۃ (ص ۶۵ جلد ۱ مصر) مین مرقوم ہے،

واشتری من دھقان ارضًا	اور اس نے کسی زمیندار سے زمین
علی ان یکفیہ جزیتھا ای	اس شرط پر خریدی کہ اس کا جزیہ
خراجھا،	یعنی خراج ادا کرے گا،

۸ - علامہ جمال الدین محمد بن مکرم (۷۱۲ھ) نے لسان العرب (ص ۱۵۹ ج ۱۸ مصر) مین لکھا ہے،

والجزیۃ خراج الارض والجمع جِزًی	جزیہ زمین کے خراج کو کہتے ہین،
وجِزًی،	جِزًی اور جِزًی اسکی جمع ہے،

۹ - علامہ اثیرالدین ابوحیان محمد بن یوسف غرناطی اندلسی (۷۴۵ھ) اپنی تالیف تحفۃ الاریب بما فی القرآن من الغریب (ص ۲۰، حماۃ ۱۳۴۵ھ) مین جس کا نام سیوطی نے نحاۃ (ص ۲۲) مین اتحاف الاریب لکھا ہے فرماتے ہین،

الجزیۃ خراج المجعول علی راس	جزیہ وہ خراج ہے جو ذمی کے سر
الذمی،	پر لگایا گیا ہو،

۱۰ - علامہ مجدالدین ابوطاہر محمد بن یعقوب فیروزآبادی (۸۱۷ھ) نے القاموس المحیط (ص ۷۱۳) مین تحریر فرماتے ہین،

والجزیۃ بالکسر خراج الارض	جزیہ (بکسر جیم) زمین کا خراج ہے اور
وما یوخذ من الذمی	جو ذمی سے لیا جائے (وہ بھی جزیہ) ہے،

ط - علامہ ابن احمد مہائمی (۸۳۵ھ) کی تفسیر تبصیر الرحمٰن و تیسیر المنان (ص ۲۹۸ ج ۱) مین ہے،

وھی الخراج المضروب علی	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنون
الرقاب،	پر لگایا جاتا ہے،

ی - علامہ جلال الدین محمد بن احمد محلی (۸۶۴ھ) اور علامہ جلال الدین عبد الرحمٰن بن ابی بکر سیوطی (۹۱۱ھ) کی تفسیر جلالین (ص ۱۷۷) مین ہے،

الخراج المضروب علیھم کل	(جزیہ) ان (ذمیون) پر مقرر کیا ہوا
عام	سالانہ خراج ہے،

ک - علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب، جنھون نے سراج المنیر کے نام سے ایک تفسیر ۹۶۷ھ مین تالیف کی، اس کے ص ۴۰۳ ج ۱ مین لکھتے ہین،

وھی الخراج المضروب علی	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو ان
رقابھم،	(ذمیون) کی گردنون پر مقرر کیا جائے

ل - مولینا محمد طاہر جنھون ۹۸۶ھ مین مجمع البحار الانوار کے نام سے ایک لغت تصنیف کیا، اس کی جلد ۱ ص ۵۴ مین لکھتے ہین

من اخذ ارضا بجزیتھا	جو شخص کوئی زمین جزیہ (یعنی خراج ادا کرنے
لارض ای بخراجھا،	کی شرط) پر لے،

ھ - علامہ سید محمد مرتضیٰ زبیدی حنفی واسطی (۱۲۰۵ھ) نے تاج العروس (ص ۳، ج ۱۰ مصر) مین قاموس کی مندرجۂ بالا عبارت نقل کرکے اس کے ایک لفظ (ومایوخذ) کی یون تشریح کی ہے،

(و) منہ (مایوخذ)	اور جزیہ ہی ہے جو ذمی سے قرض لیا جاتا ہے

ن - مولانا محمد اشرف لکھنوی نے ایک جماعت کے ساتھ مل کر، ضخیم جلدون مین تاج اللغات تصنیف کی تھی، اس کتاب کے مصنفین اور سنہ تصنیف کا کچھ پتہ نہین ہے، مولانا محمد اشرف کا نام مولانا سید سلیمان صاحب ندوی نے کتاب کی پہلی جلد کے سرورق پر تحریر فرمایا ہے، الدرۃ یہ عبارت لکھی ہے،

"یکے از مولفینش مولانا محمد اشرف لکھنوی است در ۱۲۴۴ھ وفات یافت"

بہرحال اس کتاب کے (ص ۲۹۵) مین ہے:-

"جزیہ بالکسر حاصل زمین وچیزیکہ گرفتہ شود از کفار اہل ذمہ"

س - امیر الملک والاجاہ نواب سید صدیق حسن خان (۱۳۰۷ھ) نے تفسیر فتح البیان (ض جلد ۴، مصر ۱۳۰۱ھ) مین لکھا ہے،

وھو الخراج المضروب علیٰ	اور وہ (جزیہ) خراج ہے جو گردنون
رقابھم کل عامٍ	پر سالانہ مقرر کیا جاتا ہے،

غرض ۳۱۰ھ سے ۱۳۰۷ھ تک جتنے مشہور عالم گذرے ہین، بالاتفاق سب نے جزیہ کے معنی خراج کے لئے ہین،

جزیہ کی اصطلاح | جزیہ کے لغوی معنی جو اوپر بیان کئے گئے، انہی سے اس کے اصطلاحی معنی متفرع ہوتے ہین، لغت مین جزیہ کے معنی خراج کے ہین، اب اگر وہ خراج رعایا کے ہر فرد سے بحساب فی کس سالانہ وصول کیا جائے، تو اس کو جزیہ کہا جائے گا، اور یہ عام معنی ہونگے لیکن اگر وہ خراج سلطنت اسلام مین صرف غیر مسلم رعایا سے وصول کیا جائے، تو یہ شرعی اور اصطلاحی جزیہ ہوگا، اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

۱- لغت مین جزیہ اور خراج محصول کو کہتے ہین، خواہ وہ کسی چیز کا ہو، اور کوئی شخص اگر

۲۔ مسلم اور غیر مسلم رعایا پر انفرادی حیثیت سے جو محصول عائد ہو، لغت کے لحاظ سے اس کا نام جزیہ ہے، اور اس مین کوئی تفریق نہین ہے،

۳۔ صرف غیر مسلم رعایا جو فرداً فرداً محصول ادا کرے، اوس کو شرع کی اصطلاح مین جزیہ کہتے ہین، اور مسلم رعایا جو محصول ادا کرتی ہے، اس کو زکوٰۃ، صدقہ، اور دوسرے نامون سے تعبیر کیا جاتا ہے،

جزیہ اقوام غیر مین | جزیہ کے لغوی معنی سمجھنے کے بعد یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس کا رواج دوسری قومون اور ملکون مین بھی تھا؟ ہندوستان، ایران، اور چین، اس کا جواب اثبات مین دیتے ہین،

ہندوستان مین جزیہ | منوشاستر سے جو ہندوستان کا مدنی اور سیاسی قانون ہے، اور جدید تحقیقات کے مطابق حضرت مسیح کے دو تین سو سال پیشتر تالیف ہوا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ جزیۂ رقاب (Poll Tax) کا رواج ہندوستان مین کم از کم بائیس سو برس سے ہے، منوجی نے کتاب مذکور کے باب ۷ مین جزیہ کے متعلق حسب ذیل دفعات درج کئے ہین:-

دفعہ ۱۲۸۔ جس طریق سے کام کرنے والے کو اور راجہ کو فائدہ ہو، اس طریق کو دیکھ کر راجہ اپنے محصولات کو تجویز کرے، جو کہ ہر شخص پر برابر ہو،

دفعہ ۱۳۳۔ ..... وید پڑھنے والے برہمن سے محصول نہ لیوے،

دفعہ ۱۳۶۔ راج مین چھوٹے آدمیون سے بھی تھوڑا ساگ، پتا، وغیرہ سال تمام مین بطور محصول کے لیوے،

دفعہ ۱۳۷۔ رسوئین بنانے والے وہر قسم کے کاریگر و شودر جسم کی تکلیف سے اوقات بسر کرنے والے

لہ تمدن ہند موسیو گستاولی بان مترجمۂ مولانا سید علی بلگرامی ص ۲۱۰۔

(پتہ دار وغیرہ) ان سبھون سے ہر مہینہ مین ایک دن کام کرائے، ان کا یہی محصول ہے،

دفعہ ۱۳۹ - اگر بہ تقاضائے محبت، محصول رعیت سے نہ لیوے تو راجہ اپنی جڑاد کھاڑتا ہے،

دفعہ ۱۵۴ - آٹھ کامون کو..... بچاوے، آٹھ کام یہ ہین، رعیت سے محصول لینا،..... (باب ۸)

دفعہ ۳۹ - چیز مدفونہ یا فتہ کے نصف حصہ کو لینے والا راجہ ہے، کیونکہ حفاظت کرتا ہے اور سب کا مالک ہے،

دفعہ ۳۹۴ - اندھا، بہرا، لنگڑا، ستر برس کی عمر والا، دھن دہانیہ سے ویدیا پاٹھون کا اُپکار کرنے والا، ان سبھون سے راجہ باوجود خالی ہونے خزانہ کے اپنے لینے کے لائق محصول کو نہ لیوے،

دفعہ ۴۰۵ - گاڑی وغیرہ محمولہ اشیاء وغیرہ سے بلحاظ چیزہاے محمولہ کے سارا سار بچار کر کے محصول مقرر کرنا چاہئے، اور جس گاڑی وغیرہ مین اشیا وغیرہ نہین ہے اور جو آدمی کچھ سامان وغیرہ نہین رکھتا اُنھون سے تھوڑا محصول لینا چاہئے،

ان دفعات سے اصولی طور پر پتہ چلتا ہے، کہ

(۱) پیشہ ور اور غیر پیشہ ور سب پر جزیہ تھا (۲) عورتین مستثنیٰ نہ تھین اور نہ بچے مستثنیٰ تھے (۳) غیر مستطیع لوگون کو بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑتا تھا (۴) معذور، زیادہ معمر اور برہمن مستثنیٰ تھے (۵) مزدور، چمار، نوکر، جو محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، اُن سے محصول کے عوض ہر مہینہ مین ایک دن بیگار لی جاتی تھی (۶) خراج نہ لینا، سلطنت کی بیخ کنی کے مرادف تھا (۷) محصول ہر شخص پر برابر تھا،

ایران مین جزیہ | ایران مین جزیۂ رقاب کب سے رائج تھا؟ اس کا صحیح جواب ہم نہین

دیکھتے، البتہ اتنا معلوم ہے کہ نوشیروان سے پہلے بھی اُس کے وصول کرنے کا دستور تھا، طبری (ص ۹۷۰ ج ۲) مین ہے،

وکان ملوک فارس یاخذون	اور ایران کے بادشاہ نوشیروان سے پہلے
من کور من کور هو قبل ملوک	خراج مین بعض صوبون سے تہائی بعض
کسریٰ انوشروان فی خراجها	سے چوتھائی بعض سے پانچوان بعض سے
الثلث ومن کور الربع، ومن کور	چھٹا حصہ شادابی، اور پیداوار کے مطابق
الخمس ومن کور السدس علی	لیا کرتے تھے، اور کھوپڑیون کے جزیہ
قدر شربها وعمارتها، ومن جزیة الجاجم	مین بھی کچھ مقرر رقم وصول کیجاتی تھی

قباد بن فیروز نے اخیر زمانہ سلطنت مین خراج کی صحیح تشخیص کرانی چاہی، لیکن اس کا انتقال ہوگیا، اور اس کام کو اس کے بیٹے نوشیروان نے انجام دیا، طبری (حوالۂ سابق) مین ہے،

حتی اذا ملك ابنه کسریٰ امر باستتمامها	جب اس کا بیٹا کسریٰ بادشاہ ہوا تو
واحصاء النخل والزیتون والجماجم	اُس نے اس کام کو مکمل کرایا، کھجور،
..... وامر کاتب خراجه ان یقرء	زیتون اور کھوپڑیان شمار کی گئین،
علیهم الجل التی استخرجت من	..... اور محکمۂ خراج کے سکریٹری کو حکم
اصناف غلات الارض، و	ہوا کہ لوگون کو وہ الفاظ پڑھ کر سنائے
عدد النخل والزیتون والجماجم	جو زمین کے متعدد اقسام کے غلون اور
	کھجور، زیتون، اور کھوپڑیون کی تعداد کے
	متعلق درج تھے،

کسریٰ نوشیروان نے اس تشخیص کی وجہ یہ بتلائی ہے،

انا قد رأينا ان نضع على ما احصى من جريان هذه المساحة من النخل والزيتون والجماجم وضائع، وتأمر بانجامها في السنة في ثلثة انجم، وتجمع في بيوت اموالنا من الاموال مالو اتانا من ثغر من ثغورنا او طرف من اطرافنا فتق او شئ نكره واحتجنا الى تدارکه او حسمه ببذل لنا فيه مالا كانت الاموال عندنا معدة موجودة، و لم نرد استئناف اجتبائها على تلك الحال (طبری ۹۷۰-۹۷۱ جلد ۲)

مابدولت کی راے ہے کہ مابدولت کھجور اور زیتون کی پیمایش شدہ جریبون اور کھوپڑیون پر ٹکس لگائین، اور سال مین اُن کو تین قسطون مین ادا کرنے کا حکم دین، تاکہ مابدولت کے خزانون مین اس قدر دولت جمع رہے، کہ اگر کبھی کسی سرحد یا کسی سمت سے کوئی بغاوت یا بدامنی رونما ہو، اور مابدولت کو اس کے تدارک یا قلع قمع کرنے مین روپیہ خرچ کرنے کی ضرورت پڑے تو وقت پر ہمارے پاس روپیہ موجود رہے اور نئے سرے سے اس وقت مابدولت کو روپیہ جمع کرنے کی ضرورت نہ پیش آئے

اور اس جزیہ کی شرح یہ تھی،

والزموا الناس الجزية ما خلا اهل البيوتات والعظماء و المقاتلة والصرابذة والكتاب ومن كان في خدمة الملك، وصيروها على طبقات اثنى

اور لوگون پر انھون نے جزیہ لگایا سوائے اونچے گھرانون معززین، فوج پیشوایان مذہبی، محرر اور ملازمین شاہی کے، اور اور اس (جزیہ) کی چند شرحین رکھین، یعنی بارہ درہم اور آٹھ اور چھ اور چار،

عشر دراهم او ثمانية وستة و
اربعة كقدر اكثار الرجل و
اقلاله ، ولم يلزموا الجزية
من كان اتى له من السنين
دون العشرين او فوق الخمسين

(طبری ص ۲۶۰۹ ج ۲)

آدمی کی ثروت اور فقر کے لحاظ سے، اور
جس شخص کا سن بیس سے کم یا پچاس سے
اوپر تھا، اوس پر جزیہ نہیں لگایا،

ان بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ

۱- ایران مین انسانون پر محصول عائد تھا،

۲- ان محاصل کا مقصد بغاوتون کے رفع کرنے اور دشمنون کا مقابلہ کرنے کے لئے تیاری تھی،

۳- بیس برس سے کم اور پچاس سال سے زیادہ کے آدمی محصول سے مستثنیٰ تھے،

۴- عورتین مستثنیٰ نہ تھین،

۵- جزیہ حسب حیثیت تھا،

۶- اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم جزیہ ادا نہین کرتے تھے

چین مین جزیہ چین مین جزیۂ رقاب عرصہ سے تھا، مسلمانون مین پہلا مصنف جس نے اس کا تذکرہ کیا، سلیمان تاجر ہے، جس نے اپنا سفرنامہ ۲۳۷ھ کے حدود مین لکھا ہے، وہ لکھتا ہے،

ولكن عليهم جزية على الجماجم
الذكور حيثما يرون من الاحوال
وان كان بها احد من العرب
او غيرهم اخذ منه جزية ماله

اور لیکن ان پر حالات کے مطابق جزیہ ہے
جو سر (مردون) سے لیا جاتا ہے
اور اگر وہان عرب یا دوسرے ملک کا
کوئی شخص ہوتا ہے، تو اس سے اس کے

لیحرز مالہ، مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال کی حفاظت کیجائے۔

(سفرنامہ ص ۴۰)

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم — اوران پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ

وانما یوخذ من الرؤوس علی — سروں (مردون) سے مال اور جائداد کا

قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۰) — تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہے

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرۃ سنۃ اخذت — جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہے

منہ الجزیۃ فاذا بلغ ثمانین سنۃ — تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اور جب اسی

لم توخذ منہ جزیۃ (ص ۴۰) — برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقاب نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلا تامل جزیۂ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین چین کی طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونون کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علیحدہ علیحدہ نام رکھدیا جائے، تاکہ سننے والون کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانون کے محصول کا نام زکوٰۃ اور غیر مسلمون کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکوٰۃ اور جزیہ کا فرق | چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولون (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانون کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکوٰۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکوٰۃ (ب) کھجور پر زکوٰۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوٰۃ (د) معادن پر زکوٰۃ، (ھ) دفینہ پر زکوٰۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور غبر پر زکوٰۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکوٰۃ (ح) میراث پر زکوٰۃ (ط) قرض کی پر زکوٰۃ (ی) مال تجارت پر زکوٰۃ، (ک) بکریون پر زکوٰۃ (ل) گائے پر زکوٰۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکوٰۃ، (ن) پھلون پر زکوٰۃ، (س) عید الفطر کی زکوٰۃ،

ان انواع مین سے اگر چند کا بھی کوئی مسلمان محصول (زکوٰۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے، بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہاتھ مین جانے سے اس کے امن و امان اور نظم و نسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compalsory dues) کا ایثار

لیجوز مالہ، مال کا جزیہ لیا جاتا ہے تاکہ اوس کے مال کی حفاظت کیجائے۔

(سفرنامہ ص ۴۰)

دوسری جگہ لکھتا ہے،

ولیس علیھم خراج فی ضیاعھم وانما یوخذ من الرؤوس علی قدر اموالھم وضیاعھم (ص ۴۰) اوران پر جائداد کا خراج نہین ہے، بلکہ سروں (مردون) سے مال اور جائداد کا تخمینہ کرنے کے بعد (جزیہ) لے لیا جاتا ہے،

آگے چل کر کہتا ہے،

فاذا بلغ ثمانی عشرۃ سنۃ اخذت منہ الجزیۃ فاذا بلغ ثمانین سنۃ لم توخذ منہ جزیۃ (ص ۴۲) جب وہ (مرد) اٹھارہ برس کا ہوتا ہے تو اس سے جزیہ لیا جاتا ہے، اور جب اسی برس کو پہونچتا ہے، تو جزیہ نہین لیا جاتا،

اس سے چند باتین معلوم ہوتی ہین،

(۱) چین مین دو قومین آباد تھین چینی اور مسلمان (۲) چینیون سے حسب حیثیت جزیہ لیا جاتا تھا (۳) جزیہ مین مردون کی تخصیص تھی (۴) عورتین مستثنیٰ تھین (۵) اٹھارہ اور اسی سال کے درمیان عمر والون سے جزیہ لیتے تھے، اٹھارہ سے کم اور اسی سے زیادہ عمر کے لوگ مستثنیٰ تھے (۶) عرب اور دوسری قومین جو تجارت کے سلسلہ سے وہان قیام پذیر تھین، ان سے جزیہ رقاب نہین لیا جاتا تھا، یہ لوگ صرف مال کا محصول ادا کرتے تھے (۷) غیر قومون سے جزیہ کی وصولی حفاظت مال کی غرض سے تھی،

اسلام مین جزیہ ہندوستان ایران اور چین کی طرح سلطنت اسلامیہ مین بھی رعایا پر جزیہ تشخیص کیا گیا، جس کو لین پول اور سرکار کی طرح ہم بلا تامل جزیۂ رقاب نہین کہہ سکتے، اسلامی سلطنت مین بھی تین طرح دو قسم کی رعایا تھی، مسلم اور غیر مسلم، اور چونکہ دونون مین سلطنت کی امداد اور ملک کی حفاظت

کے متعلق قدرتی طور پر نقطۂ نظر کا اختلاف پایا جاتا تھا، اس لئے ضرور تھا کہ دونون کے لئے جزیہ کی شرح مختلف ہو اور اس کا علیحدہ علیحدہ نام رکھدیا جائے، تاکہ سننے والون کو سمجھنے مین آسانی ہو، اسی بنا پر مسلمانون کے محصول کا نام زکوٰۃ اور غیر مسلمون کے خراج کا نام جزیہ رکھا گیا، معنی کے لحاظ سے زکوٰۃ یا جزیہ مین شرف یا ذلت کا کوئی پہلو نہین ہے،

زکوٰۃ اور جزیہ کا فرق | چونکہ مسلم اور غیر مسلم رعایا کی ذمہ داریان کسی حد تک مختلف تھین، اس لئے ان کے محصولون (زکوٰۃ اور جزیہ) کے تشخیص مین بھی اس کا لحاظ رکھا گیا،

مسلمانون کی سلطنت قومی تھی اور ضرورت کے وقت ان کو مال تو مال خود جان سے بھی دست بردار ہونا پڑتا تھا، اس لئے ان کے محصول مین "ایثار" کے جذبہ کو بہت زیادہ سامنے رکھا گیا، چنانچہ ان پر (۱) زکوٰۃ مقرر کی گئی، جو مختلف انواع کی جامع تھی، مثلاً

(ا) اونٹون پر زکوٰۃ (ب) کھجور پر زکوٰۃ (ج) مسکوک سونے چاندی پر زکوٰۃ (د) معادن پر زکوٰۃ، (ہ) دفینہ پر زکوٰۃ (و) زیور، بے سکہ سونا اور غیر پر زکوٰۃ (ز) یتیمون کے مال پر زکوٰۃ (ح) میراث پر زکوٰۃ (ط) قرض کی پر زکوٰۃ (ی) مال تجارت پر زکوٰۃ، (ک) بکریون پر زکوٰۃ (ل) گائے پر زکوٰۃ (م) تجارتی گھوڑون پر زکوٰۃ، (ن) پھلون پر زکوٰۃ، (س) عید الفطر کی زکوٰۃ،

ان انواع مین سے اگر چند کا بھی کوئی مسلمان محصول (زکوٰۃ) ادا کرے تو اچھی خاصی رقم ہو جاتی ہے، بخلاف اس کے غیر مسلم رعایا کی ہمدردی زیادہ سے زیادہ "عزت وطن" کے نام سے حاصل کیجا سکتی تھی، جو اگرچہ اس وقت بھی اجنبیون (عرب) کے قبضہ مین تھا، تاہم دوسرے اجنبیون (مخالفین عرب) کے ہاتھ مین جانے سے اس کے امن و امان اور نظم و نسق مین خلل پڑنے کا اندیشہ ہو سکتا تھا، اس بنا پر غیر مسلم رعایا سے واجبی محصول یا جبری مواجب (Compulsory dues) کا ایثار

چاہا گیا، جو زکوٰۃ سے مقدار مین کم اور اس کی طرح گوناگون نہ تھا، اور یہ ایک مرجح رعایت تھی،

(۲) مسلمانون کا محصول (زکوٰۃ) ایک مذہبی فرض تھا جن کو وہ کار خیر سمجھ کر ثواب کے لئے ادا کرتے تھے، اس لئے اس کی مقدار زیادہ ہونے مین کچھ ہرج نہ تھا، بخلاف اس کے غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) محض سیاسی تھا جس پر ان کے عقیدہ کے مطابق کوئی اُخروی ثواب مرتب نہین ہوتا تھا، اس لئے اس کی شرح زیادہ نہین رکھی گئی،

۳ - مسلمانون کا محصول معاف نہین ہوسکتا تھا، کیونکہ وہ مذہبی فرض تھا، لیکن غیر مسلمون کا محصول (جزیہ) نقدی شکل مین معاف ہوسکتا تھا، مواعید کا مسئلہ جزیہ کے باب کا ضروری مسئلہ ہے، مبسوط (ص ۸۲ ج ۱۰) مین اس کے متعلق جو کچھ ہے وہ تفصیل کے ساتھ ہے، اور امام اعظمؒ اور صاحبینؒ کے اختلافات دکھائے ہین لیکن فتاوائے سراجیہ مین جو ۵۶۵ھ کی تصنیف[1] ہے یعنی مبسوط کے بعد کی ہے، اس مسئلہ کو بلا اختلاف ذکر کیا ہے اور مواعید کے معنی بھی بتلائے ہین، یعنی فی الفارسیۃ ماندہا[2]، اس مسئلہ کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی ذمی (غیر مسلم) پر برسون سے جزیہ باقی چلا آتا ہو، تو اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا، بلکہ جس سال حاکم مطالبہ کرے گا، اسی سال کا جزیہ ادا کرنا ہوگا، اور اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فقہا، جزیہ کو قرض نہین سمجھتے، بلکہ عطیہ اور صلہ سمجھتے ہین، مبسوط مین ہے،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ ولیست بدین واجب (ص ۸۰ ج ۱۰)	اس لئے کہ جزیہ ایک مالی صلہ ہے واجب قرض نہین،

(۴) مسلمانون کی زکوٰۃ مین تخفیف نہین ہوسکتی لیکن جزیہ مین کمی کی جاسکتی ہے، چنانچہ نجران کے وہ عیسائی جو عراق چلے گئے تھے، انھون نے حضرت عثمانؓ کے زمانہ خلافت مین تخفیف جزیہ کی درخواست کی تو امیر المومنین نے ولید بن عقبہ حاکم عراق کے نام ایک فرمان بھیجا، جس مین یہ فقرے

---

[1] کشف الظنون ج ۲ ص ۱۰۷۶، [2] فتاوی سراجیہ قلمی باب الجزیہ،

بھی تھے[1]

وانی قد خففت عنهم ثلاثین — مین نے اُن کے جزیہ سے تیس حلّے

حلة من جزیتهم، — کم کر دیئے،

یحییٰ بن آدم (۲۰۳ھ) نے اپنی تصنیف کتاب الخراج مین جو ابھی حال مین چھپی ہے، لکھا ہے کہ حسن (شاید حسن بن صالح) کا قول تھا کہ جن لوگون پر حضرت عمرؓ نے ۴۸، ۲۴، ۱۲ کے شرح سے جزیہ مقرر کیا تھا، اُن پر اُس سے زیادہ نہ مقرر ہونا چاہئے، اور ان مین سے جو ادا نہ کر سکتا ہو اُس کے جزیہ مین تخفیف کر دی جائے، کیونکہ حضرت عمرؓ یہ بھی فرماتے تھے کہ اُن کو طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے[2]،

۵- مسلمانون مین جو صاحب نصاب ہو وہ زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہو سکتا لیکن غیر مسلم خدمات کے صلہ مین نقد رقم جزیہ سے مستثنیٰ ہو سکتے ہین، چنانچہ عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، جرجان کے فتوحات کے سلسلہ مین طبری نے حضرت عمرؓ کے فرامین اس مضمون کے متعلق نقل کئے ہین (واقعات ۱۷ھ و ۲۲ھ ہجری)

۶- اگر کوئی اسلامی ملک دشمن کے نرغہ مین ہو تو مسلم رعایا کا محصول (زکوٰۃ) واپس نہین کیا جاتا، لیکن غیر مسلم رعایا کا جزیہ واپس کر دیا جاتا ہے، چنانچہ حضرت ابو عبیدہؓ نے شام کے تمام عمال سے نہ صرف جزیہ بلکہ خراج تک واپس کرا دیا تھا[3]،

۷- زکوٰۃ مسلمان عورتون اور بوڑھون بلکہ یتیم بچون سے بھی وصول کیجاتی تھی، لیکن جزیہ غیر مسلم بچون، عورتون اور بوڑھون سے نہین لیا جاتا تھا،

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۴۲ [2] کتاب الخراج یحییٰ بن آدم قرشی ص ۲۳،

[3] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۱،

۸- زکوٰۃ مسلمانوں کے مختلف ذرائع آمدنی سے وصول کی جاتی تھی، لیکن جزیہ کی یہ حالت نہ تھی،

۹- روپیہ کی تعداد زیادہ ہونے سے زکوٰۃ کی رقم بڑھتی جاتی ہے، لیکن جزیہ بڑے سے بڑے مالدار شخص کو بھی ۴۸ درہم سالانہ سے زیادہ نہیں ادا کرنا پڑتا، رقم جزیہ کی زیادتی کے شاکی، اور غیر مسلم رعایا کی اقتصادی حالت کے مرثیہ خوان سرحد دنیا تھ سرکار کو حساب لگا کر دیکھنا چاہئے تھا کہ ایک مسلمان اور ایک غیر مسلم پر محصول کا بار کس تناسب سے پڑتا تھا ؟

۱۰- زکوٰۃ کا نصاب متعین ہے، لیکن جزیہ کی کوئی شرح متعین نہیں، اسی لئے اس میں فقہاء مختلف الرائے ہیں، جزیہ کا تقرر دو طرح پر ہوتا ہے، صلح سے کوئی رقم طے ہو جائے، جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے اور نجران کے عیسائیوں سے جزیہ طے فرمایا تھا، ایسے جزیہ کی رقم پر اضافہ نہیں ہو سکتا،

غلبہ کے بعد بادشاہ جزیہ مقرر کرے، اس میں بادشاہ کو کمی بیشی کا اختیار ہوتا ہے، احکام القرآن مصنفہ امام ابو بکر احمد بن علی رازی، الجصاص (سنہ ۳۷۰ھ)، اور رمز الحقائق شرح کنز مصنفہ قاضی بدر الدین ابو محمد محمود بن احمد عینی (سنہ ۸۵۵ھ) وغیرہ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے جزیہ کی رقم متعین کرنے میں فقہاء نے اختلاف کیا ہے، حنیفہ اور حسن بن صالح ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ایک دو اور چار دینار مقرر کرتے ہیں، جو حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے ثابت ہے، امام مالکؒ کے نزدیک ہر بالغ پر چار دینار یا ۴۰ درہم ہیں، امام شافعیؒ ایک دینار فی کس تجویز فرماتے ہیں، اور امام احمدؒ تشخیص کا کام بادشاہ پر چھوڑتے ہیں[1]،

ان روایتوں اور خصوصیتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کوئی ذی عقل جزیہ کو غیر ضروری تمیز خیال نہیں کر سکتا،

جزیہ کی حیثیت | جیسا کہ اوپر کے عنوان سے معلوم ہوا ہوگا، جزیہ کی حیثیت محض سیاسی تھی، یعنی اس کو

---

[1] احکام القرآن ج ۲ ص ۹۲ و رمز الحقائق ج ۱ ص ۳۲۰،

مذہب سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہ تھا، اب یہ دیکھنا ہو کہ اس کے تعین کا باعث کیا تھا؟ کس مقصد کو سامنے رکھکر اس کی تشخیص ہوئی؟ اور اس کو کس چیز کا معاوضہ یا بدل قرار دیا گیا؟ اس مین علماء کے متعدد اقوال ہین،

جزیہ جان کا محصول ہو | مبسوط وغیرہ مین بعض علماء کے جو اقوال نقل کئے گئے ہین، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ جان کا معاوضہ ہو، کیونکہ غیر مسلم جزیہ قبول کرکے قتل سے محفوظ رہتے ہین، یہ وہی خیال ہو، جس کی بنیاد پر لین پول نے ڈیول انڈیا مین اور جدوناتھ سرکار نے تاریخ عالمگیر مین جزیہ کو (Poll Tax) کہا ہو، لیکن درحقیقت اس خیال کی کوئی اصل نہین، شمس الائمہ سرخسی نے اس کو نقل کرکے خود تردید فرمائی ہے، وہ لکھتے ہین،

ثبوت الحقن لیس بالمال، بل بانعدام علة الاباحة وهو القتال،	قتل سے محفوظ رہنا مال کی وجہ سے ثابت نہین ہوا، بلکہ (خون) مباح ہونے کی علت یعنی لڑائی کے نہ ہونے کی وجہ سے (ثابت) ہوا ہے،
(مبسوط ص ج ۱۰)	

دوسری جگہ فرماتے ہین،

وَلَا هُوَ بدل عن حقن الدم، لان الآدمی فی الاصل محقون الدم، و الاباحة بعارض القتال فاذا زال ذالك بعقد الذمة عاد الحقن	اور نہ وہ (محصول) حفاظتِ خون کا بدلہ ہے، کیونکہ آدمی درحقیقت خون (جان) کے لحاظ سے محفوظ پیدا کیا گیا ہے یعنی اوس کو مارنے کا کسی کو حق نہین، اور (خون کا) مباح ہونا لڑائی پیش آنے کے سبب سے ہوتا ہے پس

الاصلی جب یہ عارض (لڑائی) ذمہ کے معاہدہ
کے سبب سے دور ہو جائے، تو حق اصلی (جان
(صفحہ ۸۱ ج ۱۰) کے محفوظ رہنے کا اصلی حق) واپس آجائیگا

جزیہ جان و مال کا محصول ہے؟ یہ خیال بہت قدیم ہے کہ جزیہ جان و مال کا محصول ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ جان اور مال سے سلطنت کی امداد کرنے کے بجائے اس کو ایک خاص محصول رعایا ادا کرتی ہے، اور حفاظت کا کام فوج کے متعلق ہو جاتا ہے منوشاستر (باب ۸ دفعہ ۳۳) سے ہندوستانیوں کا اور نوشیروان کے فرمان (مندرجہ طبری ص ۹۶۰ - ۹۶۱ ج ۲) سے ایرانیوں کا جزیہ کے متعلق یہی خیال معلوم ہوتا ہے مسلمانوں میں قرن اول کے بعض حضرات مثلاً حضرت ابو عبیدہؓ وغیرہ نے اور فقہاء میں مرغینانی (۵۹۳ھ) نے ہدایہ میں اور ابن نجیم (۹۷۰ھ) نے البحر الرائق میں اس کو ظاہر کیا ہے کہ غیر مسلموں کا جزیہ فوجی خدمت سے مستثنیٰ ہونے کا محصول ہے،

تعجب ہے کہ سر جدوناتھ سرکار اس کو جدید خیال کہتے ہیں[1] اور انسائیکلوپیڈیا آف اسلام سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) تک جزیہ خود ٹرکی میں مذہبی آزادی کا محصول سمجھا جاتا تھا، اس کے بعد فوجی خدمت سے آزادی کا معاوضہ قرار پایا، لیکن ان کو معلوم نہیں کہ جس جدید مصنف (غالباً علامہ شبلی مرحوم) کی طرف وہ اس نظریہ کو منسوب کر رہے ہیں، اس سے بہت پیشتر پہلی صدی ہجری میں خود صحابہ کرام اور چھٹی صدی ہجری کے بعض مشہور فقہاء کا یہی نظریہ معلوم ہوتا ہے، یا مذہبی آزادی کا معاوضہ ہونا تو یہ اکثر فقہاء کا جزیہ کے متعلق خیال نہیں ہے، اور نہ اس کو کوئی خاص وقعت علمی طور دی گئی ہے،

جزیہ کفر کا محصول ہے امام ابوبکر جصاص (۳۷۰ھ) نے احکام القرآن میں قاضی ابوبکر محمد بن عبداللہ

---

[1] تاریخ عالمگیر حاشیہ ص ۲۷۴ ج ۳،

معافری اندلسی (م ۵۴۳ھ) نے جو "ابن العربی" کے نام سے مشہور ہین، احکام القرآن مین، مرغینانی (م ۵۹۳ھ) نے ہدایہ مین، حافظ الدین ابو البرکات عبد اللہ بن احمد نسفی (م ۷۰۱ھ) نے مدارک التنزیل مین یہ بھی نقل کیا ہے کہ جزیہ کفر کا محصول تھا، یا الفاظ دیگر مذہبی آزادی کا معاوضہ تھا لیکن اس کا ثبوت قرآن مجید یا حدیث سے نہین مل سکتا،

جزیہ مکان کا محصول ہے | شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) نے مبسوط مین، اور محمد بن احمد شربینی خطیب (موجود ۹۶۷ھ) نے تفسیر سراج المنیر مین یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ جزیہ سکونت کا معاوضہ ہے، اس طرح اس کی حیثیت کرایۂ مکان یا محصول مکان (House-Tax) کی ہے، مبسوط مین اس کو بعض کا قول کہکر اس طرح تشریح کی گئی ہے،

قد قیل انه بدل من السکنی	بعض نے کہا ہے کہ وہ (جزیہ) سکونت
لانه مع الاصرار علی الکفر	کا بدل ہے، کیونکہ وہ (ذمی) کفر پر قائم رہ
لا یکون من اهل دار الاسلام	کر دار الاسلام کے (اصلی) باشندون مین
اصلا ولا یمکن من السکنی	کبھی شامل نہین ہو سکتا، اور دوسرے
فی دار الغیر الا بکراء،	کے گھر مین سکونت کرایہ کے بغیر ممکن
(صفحہ ۱۰، ج ۱۰)	نہین،

پھر آگے چل کر اس خیال کی تردید کرتے ہین،

لانه بعقد الذمة صار من اهل	کیونکہ وہ ذمہ کا معاہدہ کرکے ہمارے گھر
دارنا، فانما لیسکن دار نفسه	والون مین سے ہو گیا، تو وہ اپنے گھر مین
ولا لیسکن ملک نفسه حقیقة	رہتا ہے، البتہ اپنی ملکیت مین دراصل
وقولنا دار الاسلام نسبة	نہین رہتا، (کیونکہ اب اصلی ملکیت اسلام

للولایۃ، کی ہوگئی ہے) اور ہمارا قول دار الاسلام
(صفحہ ۱۰ ج ۱۰) ولایت (تولیت) کی نسبت کے سبب سے ہے،

اس تردید کے الفاظ پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ امام سرخسی غیر مسلم آبادی کو اس سے بلند سمجھتے ہیں کہ اس کو سلطنت اسلام کا کرایہ دار فرض کریں،

جزیہ امن کا محصول ہے | امام ابوحیان غرناطی اثیر الدین ابوعبداللہ محمد بن یوسف جیانی (م ۷۴۵ھ) نے تفسیر البحر المحیط میں لکھا ہے کہ جزیہ امن کا معاوضہ ہے،

جزیہ کسی چیز کا محصول نہیں بلکہ مالی امداد ہے | ان نظریات کے نقل کرنے کے بعد اب ہم اس مقام پر پہنچے ہیں، جہاں دراصل غیر مسلم رعایا کی صحیح منزلت اور جزیہ کی اصل حقیقت نظر آتی ہے شمس الائمہ سرخسی (م ۴۸۳ھ) جنھوں نے ۳۰ جلدوں میں المبسوط لکھی ہے، جو فقہ حنفی کی مستند کتابوں میں سب سے بڑی کتاب ہے، جزیہ کے متعلق یہ خیال ظاہر فرماتے ہیں کہ وہ کسی چیز کا معاوضہ یا محصول نہیں ہے، بلکہ مالی امداد ہے، ان کے الفاظ یہ ہیں،

لان الجزیۃ صلۃ مالیۃ (ص ۲، ج ۱۰) کیونکہ جزیہ مالی امداد ہے،

دوسری جگہ لکھتے ہیں،

فاذا ثبت انہ لیس بعوض عن شیئ عرفنا انہ صلۃ، جب یہ ثابت ہوگیا کہ وہ (جزیہ کا مال) کسی چیز کا عوض نہیں، تو ہم نے سمجھا کہ وہ (مال) صلہ ہے،
(ص ۸۲)

ان الفاظ کو پڑھو اور بار بار پڑھو کیا یہ وہی جزیہ ہے جس کو یورپ اور ہندوستان کے غیر مسلم حد درجہ ذلت آمیز اور نفرت انگیز خیال کرتے ہیں، اور جس کی باعث ان کے دلوں میں اسلامی سلطنتوں کی طرف سے بغض و عناد بھرا ہوا ہے، محکوم قوموں کے محصول کا مالی امداد نام رکھنا فاتح و مفتوح کی

اس مساویانہ حیثیت کو نمایاں کرتا ہو جس کی نظیر خود اعتراض کرنے والوں کی قومی تاریخوں مین بھی نہین مل سکتی،

جزیہ ایک خاص عطیہ ہو | شمس الائمہ سرخسی کا نظریہ بیان کرنے کے سلسلہ مین اب یہ دکھانا ضروری ہوگیا ہو کہ مشرق کی طرح مغرب بھی غیر مسلمون کا اسی فراخ دلی سے خیر مقدم کرتا تھا، اور سلطنتِ اسلامیہ کے پورے طول وعرض سے جزیہ کے متعلق ایک ہی آواز آتی تھی، ابن العربی اندلسی قاضی ابو بکر معافری (۵۴۳ھ) نے جزیہ کو ایک مخصوص عطیہ لکھا ہے، جس سے ان شریفانہ جذبات کا پتہ چلتا ہے، جو غیر مسلم رعایا کے احترام کے متعلق اسلامی قانون سازون اور قانون دانون کے دلون مین موجود تھے، اور جنھون نے فقہ (قانون) کی کتابون مین جگہ پاکر عملی حیثیت اختیار کرلی تھی، کیا وہ محصول جو "مالی امداد" ہو "عطیۂ خاص" ہو کسی شخص کی دل آزاری یا ذلت کا باعث ہوسکتا ہو؟ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ

ہنر بچشم عداوت بزرگ تر عیبے است
گل است سعدی و در چشم دشمنان خارات

جزیہ نشان فرمانبرداری ہو | اس حد تک لکھنے کے بعد اب یہ بات بالکل واضح ہوجاتی ہے، کہ جزیہ فرمان بردار رعایا ہونے کی ایک علامت ہے، آج بھی جو رعایا محصول ادا نہین کرتی، باغی سمجھی جاتی ہے، اسی طرح اسلامی حکومت کے زمانہ مین جو لوگ جزیہ نہین دیتے تھے، حربی (جنگجو) سمجھے جاتے تھے، اور جزیہ ادا کرنے والے سلطنت کے مطیع اور فرمانبردار متصور ہوتے تھے شمس الائمہ سرخسی لکھتے ہین،

لان الذمی ملتزم احکامنا والاسلام فیما یرجع الی المعاملات، — کیونکہ ذمی اسلام کے ان احکام کا پابند ہوتا ہے، جو معاملات سے متعلق ہین،

(مبسوط ص ۲۰۴ ج ۱۰)

(باقی)

تاریخ بابل

سلسلۂ اعلام القرآن

از

مولانا ابوالجلال صاحب ندوی

"مولانا ابوالجلال صاحب ندوی اعلام القرآن کے نام سے جو کتاب لکھ رہے تھے، افسوس ہے کہ وہ اس کی تکمیل نہ کرسکے لیکن اس کے متفرق اجزا، لکھ گئے ہیں، ان میں سے بعض معارف میں شائع بھی ہوچکے ہیں جن کو اہل علم نے بہت پسند کیا، اور ان کو جاری رکھنے کی فرمایش کی اس لئے وقتاً فوقتاً اس کے مختلف ٹکڑے ہم شائع کرتے رہیں گے، "م"

حضرت سلیمان علیہ السلام کے مخالفوں میں سے ایک کا نام احیاہ تھا، سفر ملوک میں اسی کو نبی بتایا گیا ہے، حضرت سلیمانؑ کی زندگی ہی میں اُس نے اُن کے ایک نوکر کو حضرت سلیمانؑ سے ان پر کفر و شرک کا الزام لگاکر بہکایا کہ ان کے خلاف بغاوت کردو، یربعام نے بغاوت کی، ناکام رہا اور مصر بھاگ گیا، ان کی وفات کے بعد وہ مصر سے واپس آیا اور بنی اسرائیل کے دس قبیلوں کو یربعام نے خاندان سلیمان سے توڑ لیا، ۵ برس بعد فرعون مصر شیشق نے یروشلم پر چڑھائی کی، اور اس کو لوٹ مار کر چلا گیا، اس سے یربعام کی حکومت مستحکم ہوگئی، کچھ عرصہ بعد یربعام نے اپنے زیر اثر بنو اسرائیل کو بہکا کر پھر سے دین سامری کو رواج دیا اور بنو اسرائیل کا یہ طبقہ بچھڑا پوجنے لگا،

یہ واقعہ سفر ملوک ۱ (۱۲: ۲۹، ۳۰، و ۱۲: ۱-۲۰، و ۱۴، و ۱۵) اور سفر ایام میں بہ تشریح مذکور ہے

عرب کے اندر آغاز اسلام میں ایسے بنی اسرائیل بھی تھے، جو حضرت سلیمانؑ کی بابت اخبار کے فتوی پر ایمان رکھتے تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر اعتراض کرتے ہوئے اخبار کو نبی ماننے والے چند اہل کتاب نے کوئی ایسی بات کہی جس کے جواب میں خدا نے فرمایا،

ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون واتبعوا ما تتلوا الشیاطین علی ملک سلیمان وما کفر سلیمان ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر وما انزل علی الملکین ببابل ھاروت وماروت،

(بقرہ ۱۲: ۵ و ۶)

اور جب ان کے پاس ایک پیغمبر آئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تصدیق بھی کر رہے ہیں اس کتاب کی جو اُن کے پاس ہے، ان اہل کتاب میں سے ایک فریق نے خود اس کتاب اللہ ہی کو پس پشت ڈال دیا، جیسے گویا اصلا علم ہی نہیں اور انھوں نے ایسی چیز کا اتباع کیا جس کا چرچا کیا کرتے تھے شیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے کفر نہیں کیا، مگر شیاطین کفر کیا کرتے تھے، اور حالت یہ تھی کہ آدمیوں کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے، اور اس کا بھی جو ان دونوں فرشتوں پر نازل کیا گیا تھا بابل میں جن کا نام ہاروت و ماروت تھا،

حضرت سلیمان کے حالات سفر ملوک اور سفر ایام کے مؤلفوں نے ناتن نبی (؟) کی کتاب اور سیلانی

اخیاہ کی پیشین گوئیون اور عبدیدنی کی روایتون کی کتاب سے نقل کئے ہین' (سفر ایام ۹ - ۲۹) یہ کتابین اب ناپید ہین، حضرت سلیمانؑ پر اہل کتاب کے کفر کا فتوی دراصل سیلانی اخیاہ کی کتاب کا اعادہ تھا یہ کتاب نزول قرآن کے زمانہ تک موجود تھی، اور کلام اللہ سمجھ کر اس کی تلاوت کی جاتی تھی، اسی کتاب کا ذکر قرآن کی اس آیت مین ماتتلوا الشیاطین کے لقب سے آیا ہے، اس آیت مین خدا نے بتایا ہے کہ سلیمان علیہ السلام نہین بلکہ اُن پر کفر کا فتوی لگانے والے شیاطین خود کافر تھے، اُن کے کافر ہونے کی دلیل یہ ہے کہ یہ لوگ ایک دوسرے کو سحر کی اور ہاروت اور ماروت کے ذریعہ سے سحر کی تعلیم دیتے تھے،

ہاروت اور ماروت کی ہستیون کا ان کے ذریعہ سے سحر کا یہ محل نہین ہے یہ فرشتے کہلانے والے اشخاص بابل کے باشندے تھے،

وجہ تسمیہ | بابل کو یہ نام کیون دیا گیا؟ اس سوال کے جواب مختلف دیئے گئے ہین، یاقوت نے معجم البلدان مین لکھا ہے،

قال ابو المنذر ہشام بن محمد	ابو المنذر ہشام بن محمد نے کہا کہ.....
..... ومدینۃ بابل بناھا بیوراسب	بابل کا بانی بیوراسب جبار تھا، بابل کی
الجبار واشتق اسمھا من اسم المشتری	پرانی زبان مین مشتری کو بابل کہتے تھے
لان بابل باللسان البابلی الاول اسم	اسی کے نام سے یہ شہر موسوم ہوا،

بانی بابل کا نام بیوراسب غالباً ایران کی کہانیون سے ماخوذ ہے، پرانی کلدانی مین بابل مشتری کو کہتے تھے یا نہین اس کا ہم کوئی فیصلہ نہین کر سکتے، یہ بات یاقوت نے تذکرہ بابل مین کہی ہے، فسطاط مصر کا ایک زمانہ مین کسی وجہ سے بابلیون نام تھا، بابلیون کے ذکر مین یاقوت نے لکھا ہے،

ذکر اھل التوراۃ ان مقام آدم	اہل توراۃ کا بیان ہے کہ آدم علیہ السلام
علیہ السلام کان ببابل فلما قتل	بابل مین رہتے تھے جب قابیل نے ہابیل

قابیل هابیل مقت آدم قابیل — کو قتل کیا تو آدم علیہ السلام قابیل سے

فهرب قابیل باهله الی الجبال — نفرت کرنے لگے، اور قابیل پہاڑون کی

عن ارض بابل فسمیت بابل یعنی — طرف بھاگ گیا، اس لئے اس کا نام بابل

الفرقه — یعنی جدائی رکھا گیا،

معلوم نہین اہل تورات کا یہ قول یا قوت نے کہان سے نقل کیا، سفر تکوین مین یہ ذکر ہے کہ حضرت ابراہیم کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے، اُن کے یہان آنے سے پہلے

وهی کل ارض شفتیما احد یعر — ساری زمین ایک ہونٹھ اور ایک

دوبریوا حد یهو، — بولی تھی،

یہان پہنچنے کے بعد ان لوگون نے ایک برج بنانا چاہا، خدا کو یہ ارادہ ناگوار گذرا اس لئے خداوند نے ان کی بولی بات مین اختلاف ڈال کر ان کو تمام روے زمین مین پراگندہ کیا، سو وے اس شہر کے بنانے سے باز رہے" یہ واقعہ نقل کرکے سفر تکوین کے جامع نے لکھا ہے، کہ

"اس لئے اس کا نام بابل (اختلاف) پڑا کیونکہ خداوند نے وہان ساری زمین مین کی زبانون مین اختلاف (ببل) ڈالا، اور وہان سے اُن کو تمام روے زمین پر پراگندہ کیا، (تکوین ۱۱: ۱ تا ۹)

یاقوت نے ابوبکر احمد بن مروان المالکی الدینوری کی کتاب المجالس کے حوالہ سے تقریباً یہی قصہ حضرت انس بن مالک کی طرف منسوب کیا ہے، جس مین انھون نے اخیر مین فرمایا ہے کہ پھر لوگ بہتر زبانین بولنے لگے،

وتبلبلت الالسن، فسمیت — اور زبانین گڈ مڈ ہوگئین، اس لئے اس

بابل، — کا بابل نام پڑا،

کسی عمارت کی تعمیر اختلاف السنہ کا سبب نہیں ہوسکتی، جس عمارت کی تعمیر کے عزم کا توراۃ میں ذکر ہے، اور بتایا گیا ہے کہ بولی بات میں اختلاف کی بدولت وہ اس عمارت اور شہر کی تعمیر سے باز رہے، بعد میں ان لوگوں میں جو یہیں رہ گئے، اسے بنایا، اس عمارت کا نام سمیری زبان میں تنزر کی کا دنجر (دیوتا کا آستانہ) تھا، اسی کا ترجمہ یہاں کے سامی باشندوں نے باب ایل (خدا کا پھاٹک) اور باب ایلون (خداؤں کا پھاٹک) کیا، جو مختصر ہوکر بابل ہوگیا، یہ پہلے اسی برج کا نام تھا، جسے توراتی بیان کے مطابق تعمیر کرنے کے عزم کی بنا پر خدا نے وہاں والوں کی بولی بات میں اختلاف ڈالا، پھر بتدریج یہ نام اس شہر کا جس میں یہ عمارت تھی، اور اس کے بعد اس پورے علاقہ کا نام ہوگیا، جس پر شاہانِ شہر بابل حکومت کرتے تھے، توراۃ میں جس قسم کی بولی بات کے اتحاد اور اختلاف کا ذکر ہے، وہ مذہبی کلمہ کا اتحاد اور مذہبی کلمہ کا اختلاف ہے، اس بولی بات کے اختلاف کی نظیر بابل کے دو بادشاہوں کے ناموں میں ملتی ہے،

ایک شاہ بابل کا نام تھا ساموابی یعنی میرا باپ سام ہے، اس نام میں کوئی بات ایسی ہے جس سے اپنے نام خدا کو ناپسند تھے، چنانچہ توراۃ کے بیان کے بموجب حضرت ابراہیمؑ کا نام جو اُن کے باپ نے رکھا تھا، وہ ابی رام تھا، (میرا باپ رام ہے) خدا نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ یہ نام بدل دو اور آج سے تمہارا نام ابی رام نہیں، بلکہ اب راہام ہوگا، حضرت ابراہیمؑ کا نام جس سبب سے خدا نے بدلوایا، اس کو سمجھنے کے لئے حضرت یرمیاہ کے صحیفہ میں خدا کا ارشاد پڑھو،

"جس طرح چور جب پکڑ لیا جاتا ہے رسوا ہوتا ہے، اسی طرح اسرائیل کا گھرانا اور ان کے بادشاہ اور امیر اور کاہن اور جھوٹ موٹ کے نبی رسوا ہونگے، جو کاٹھ سے کہتے ہیں کہ تو میرا باپ ہے، اور پتھر سے کہ تو نے مجھے جنا ہے، انھوں نے میری طرف رُخ نہیں بلکہ پشت پھیر رکھی ہے مگر مصیبت کے وقت کہیں گے اُٹھ اور ہمیں بچا (یرمیاہ ۲: ۲۶، ۲۷)

اس سے معلوم ہوا کہ ابی رام اور سماوابی جیسے نام رکھنے کا مطلب اس عقیدہ کا اعلان تھا کہ رام ایلو (رام ایک خدا ہے) اور سماوایلو (سام ایک خدا ہے) اب سماوابی کے نام کا مطلب سمجھنے کے بعد اس کے ایک جانشین کا نام سنو، سامولوایلو (سام خدا نہین ہے) اس قسم کے بہت سے نام باشندگان بابل کے پیش کئے جاسکتے ہین مثلاً بل بالی (بعل خالق ہے) اور یابنی ایا خالق ہے) ان نامون سے ظاہر ہے کہ بابل مین جا کر بسنے کے بعد وہان والون مین جس قسم کا اختلاف اُن کی بولی بات مین پڑا تھا، وہ مذہبی اختلاف تھا، اور اسی مذہبی اختلاف کی وجہ سے بابل کو باب ایل نہ ماننے والون نے اسے بدل کر بیل بنا دیا، اور اب اس نام کے معنی طرح طرح کی بولی بولنا ہوگئے، بابل کی توراتی وجہ تسمیہ کو جدید تحقیقات کی روشنی مین غلط نہین کہنا چاہئے، بلکہ اسے ترمیم اسم کی وجہ قرار دینا چاہئے، بابل کے مندر کو باب ایل تسلیم کرنا سفر تکوین کے جامع کے لئے ناممکن تھا اسلئے اختلاف کلمات کے مطلب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس شہر کے نام مین ترمیم کردی گئی،

محل وقوع | بابل عراق کے ایک شہر کا نام ہے، عراق دریاے دجلہ وفرات کی درمیانی وادی کا نام ہے، عرب کے نقشہ پر غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ طول بلد ۴۸، و ۵۰ اور عرض بلد ۳۰ تک خلیج فارس ایران وعرب کے درمیان گھسی ہوئی ہے جس مین دریاے دجلہ وفرات گرتے ہین، جو واسط کے پاس پہنچکر ایک ہو جاتے ہین، واسط سے شمال کی جانب طول بلد ۴۵ اور عرض بلد ۳۲ کے پاس فرات کے مغربی کنارہ پر ایل مقام واقع ہے، جو تل نمرود کہلاتا ہے، اسی مقام کا نام بابل تھا، جسے عرصہ دراز کی بول چال نے دوآبہ دجلہ وفرات کے مثلث زیرین کا نام بنا دیا تھا،

باشندگان بابل | بابل کی وجہ تسمیہ مین ایک قول یہ نقل کیا گیا ہے کہ یہی مقام آدم کا ابتدائی مسکن تھا جہان سے قابیل جبال نوح کو بھاگا تھا، یہ قول قابل اعتنا نہین ہے، یاقوت نے لکھا ہے،

ویقال ان اول من سکنھا نوح اور کہا جاتا ہے کہ بابل مین سب سے پہلے

علیہ السّلام وھو اوّل من عمرھا وکان نزلھا بعقب الطوفان — حضرت نوح آباد ہوئے، اور یہاں وہ طوفان کے بعد آئے،

قرآن مجید کے بیان کے مطابق جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا نام جودی ہے اور تورانی نام اس پہاڑ کا ارارات ہے، آشوری روایات کے مطابق اس پہاڑ کا نام نسر تھا، (دیکھو بحث جودی) حضرت نوحؑ اور اُن کے اصحاب کشتی اسی پہاڑ کے آس پاس بسے ہونگے، یہ آرمینیہ مین واقع ہے، حضرت نوحؑ کا بابل مین آباد ہونا مشکل سے یقین کیا جاتا ہے، مگر آشوری افسانہ ازدوبار مین جس کا تذکرہ قصہ نوح مین کیا گیا ہے، طوفان سے پیشتر حضرت نوحؑ کا آشوری نام تامیت ناپشتم (شیث کامل) تھا، شہر شوپاک کے باشندہ سی دراُبارا توتو (قوم اُبار) کے فرزند تھے، یہ شہر خود اس افسانہ کے مطابق "ساحل فرات" پر واقع تھا، غالباً اسی روایت نے بعد مین یہ صورت اختیار کر لی کہ حضرت نوح کا مسکن بعد طوفان بابل مین تھا، توراۃ کے بیان کے مطابق بنی نوح جو اس دیار مین بسے یہاں کے قدیم باشندے نہین تھے، بلکہ وہ اس دیار مین قدم سے آئے،

"اور جب وے قدم سے روانہ ہوئے، تو ایسا ہوا کہ انھون نے شنعار کے ملک مین ایک میدان پایا، اور وہین رہ پڑے، (تکوین ۱۱: ۲)

اسی ملک شنعار کے اس حصہ کا جس مین بنی نوح یا بالفاظ دیگر اسلاف ابراہیم علیہ السلام آباد ہوئے، دوسرا نام بابل ہے، (تکوین ۱۱: ۹)

توراۃ کی اس آیت مین میدان کی بجائے اصل عبرانی لفظ "قاعہ" ہے، قاعہ چٹیل میدان کو کہتے ہین، جہان نہ آدم ہو نہ آدم زاد، اور وہان نہ درخت ہو اور نہ کوئی اور سایہ دار چیز، بنی نوح یا اسلاف ابراہیم علیہ السلام یہان ایسے زمانہ مین آئے جب یہ علاقہ غیر آباد تھا،

حضرت ابراہیم کے اسلاف مین ایسے افراد بہت گذرے ہین، جو اپنے نام "ساموائی" جیسے رکھتے

تھے، اس لئے وہ بنوسام کہلائے، ان لوگون کے یہان آنے کے بعد لیکن اُن کے برسرعروج آنے سے پہلے ایک اور قوم اس دیار مین آبسی جس کی زبان اور طرز زندگی کے علاوہ صورت شکل بھی مختلف تھی، آثار باقیہ کے علمار نے اس قوم کو سمیریون کا نام دیا ہے، سفر تکوین کا جامع اور اس کے اتباع مین بعد کے عرب مورخین تمام اقوام عالم کو حضرت نوحؑ کے تین بیٹون کی اولاد بتاتے ہین جن مین سے ایک تو بنوسام کا مورث تھا سام، ایک بیٹے کا نام حام تھا، دراصل یہ نام مصری لفظ خم کی عبرانی صورت ہے خم سرزمین مصر کا نام تھا، کیونکہ وہان کی زمین سیاہ ہے، اور خم کے معنی ہین کالی مٹی، رفتہ رفتہ یہ اہل مصر اور ان کے ہم نسلون کے مورث اعلیٰ کا نام ہوگیا، تورات کے بیان کے مطابق بنوحام بھی ابتدا مین سرزمین بابل مین رہتے تھے، پھر مصر وغیرہ مین جا بسے، تیسری قوم کا قدرانی نام بنویافث ہے، یہ بھی ابتدا مین بابل مین رہتے تھے، ان بابلی بنویافث کو ہم آثار قدیمہ کی سمیری قوم سے تطبیق دیتے ہین، حاصل اس تفصیل کا یہ ہے کہ شنعار مین جو کہ بعد مین ارض بابل یا کلدانیون کی سرزمین کہلایا ابتدا مین تین قومین آباد تھین (۱) بنویافث (۲) بنوحام (۳) بنوسام

لیکن بابلی آثار قدیمہ کے علمار اس علاقہ کی دو ہی قومون کو جانتے ہین جن مین سے ایک سومیری قوم تھی اور ایک سامی، لیکن توراۃ کے بیان کو بالکل بے اصل نہین کہا جاسکتا، اور کی حکومت کے قیام سے پہلے کش نام ایک شہر مین مسیلم نام ایک فرمانروا تھا جس کے جانشینون کا راج عروج وزوال کے ساتھ ۴۲۰۰ سے ۳۱۰۰ ق م تک قائم رہا، یہ خاندان سامی النسل تھا، ۳۱۰۰ ق م تک شہر سرپلا، نام ایک شہر مین جس کو جرسو، تن جرسو اور سنجر بھی کہا جاتا تھا، ایک بادشاہ اور کا جنا اور اس کے جانشین راج کرتے رہے، ان بادشاہون کو سمیرین قوم سے بتایا گیا ہے، مسیلم کے برسرعروج آنے سے پہلے ۵۰۰۰ ق م مین ایک شاہ کنجی گذرا ہے، جس نے مسیلم کے پیش رو حکام کش کو شکست دیکر یہان کا مال غنیمت آثار قدیمہ کی شہادت کے مطابق "زمینون کے خداوند انلیل" کی

خدمت مین نذر پیش کیا تھا، اس بادشاہ کی بابت ہسٹورینس ہسٹری آف دی ورلڈ کی پہلی جلد کے مولف نے لکھا ہے کہ ہمارے پاس یہ بتانے کے لئے مواد موجود نہین ہے کہ وہ کس قوم سے تھا سامی تھا یا سمیری تھا،

لیکن اس کا نام تھا، ان شنگ کوشن انا، = جو چار لفظون کا مجموعہ ہے،

(۱) شنگ یا سنگ = سردار (۲) انا = آسمان رتبہ (۳) ان = آقا، (۴) کوش = یہ نام توراتی کوش بن حام کے نام سے ملتا جلتا ہے جس کے فرزند نمرود کی بابت توراۃ مین ہے، کہ

"اس کی حکومت کی ابتدا شنعار کی سرزمین مین بابل ارک اکاد اور کلنہ مین ہوئی مگر پھر وہ اشور کو نکل گیا اور نینوی اجاب عبر اور کلح کو بنایا اور نینوی اور کلح کے درمیان اس کی تعمیر کی، جو بڑا شہر ہے، (تکوین ۱۰: ۱۰ تا ۱۲)"

چونکہ بنو حام بالکل ابتدائی زمانہ مین اس دیار سے نکل گئے تھے اسلئے اُن کے نشانات یہان نہین ملتے، مگر واقعہ یہ ہے کہ اس دیار مین پہلے تین قومین آباد تھین، ان تینون کو سفر تکوین کے جامع نے حضرت نوحؑ کی اولاد بتایا ہے، خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ یہ قصہ کہان تک درست ہے کہ تمام زبانین بولنے والی دنیا بھر کی تمام قومین حضرت نوحؑ کی اولاد ہین،

بنو سام یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسلاف اس دیار مین قدم سے آئے تھے، قدم کے لغوی معنی سامنے کے ہین، مصر والے مشرق کو قدم کہتے تھے، توراۃ پر مصری محاورہ کا کافی اثر ہے، قدم توراۃ مین خصوصیت کے ساتھ عرب کا نام ہے دوآبہ فرات و خابور کے علاوہ پورے عرب کو بشمول آرمینیہ جہان دجلہ و فرات کے سرچشمے واقع ہین، توراۃ مین قدم کہا گیا ہے جس قوم کو سمیری کہا جاتا ہے ہمارے خیال مین اسی کا قرآنی نام یاجوج اور ماجوج ہے،

افسانوی تاریخ قرآن مجید کی جس آیت مین بابل کا ذکر ہے نہ صرف اُس کے بلکہ قرآن مجید کے

اکثر قصوں کے فہم کے لئے ابتدا سے بنی اسرائیل کی اسیری بابل کے عہد تک دوآبہ دجلہ و فرات کی اجمال کے ساتھ پوری تاریخ دینا زیادہ مفید ہوگا، ہر قوم خصوصًا ایسی قوم کی تاریخ جس کا زمانہ عروج فن تحریر کی ایجاد سے پہلے گذرا ہو خلاف عقل کتھاؤں سے شروع ہوتی ہے، ان کتھاؤں میں زمانہ دراز کی بھول بھلیوں اور شاعروں کی بلند پروازیوں نے بہت مشکلات پیدا کر دی ہیں لیکن ہر پرانی کتھا اپنے اندر قدیم تاریخ کو چھپائے ہوئے ہے،

اہل بابل کی ایک کتھا کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں دو ہستیاں تھیں جن کے نام ہیں ابسو اور تیامت، یہ دونوں میاں بی بی تھے۔ ان سے نخمد اور نخا موپیدا ہوئے، جو انشار اور کیشر کے والدین تھے، ان دونوں نے انو، بل اور یا وغیرہ دیبی دیوتاؤں کو جنم دیا، ان دیبی دیوتاؤں سے ناراض ہو کر تیامت نے چند شریر ہستیوں کو چن کر اُن کا امیر کنجو کو مقرر کیا، اور کنجو کی فوج دیوتاؤں سے ان کی خدائی چھیننے کو چلی، اس کی خبر انشر کو ہو گئی، اس نے اپنے اپچی جاجا کو بھیج کر دیوتاؤں کو متنبہ کیا، چنانچہ مردوک اُن سے لڑنے کو اترا اور اس نے تیامت کو چیر کر دو حصے بنا دیئے جن سے آسمان اور زمین، پھر سیارے اور انسان وجود پذیر ہوئے، (ہسٹوریس ہسٹری آف دی ورلڈ ج ۱ ص ۵۲۰)

اس افسانہ کے اندر قدیم تاریخ موجود ہے۔ قدیم زمانہ میں عرب کو خالدیہ والے ماتی تیامت، (ارض البحر) کہتے تھے۔ نخم عرب میں ایک خاص قسم کی مچھلی کو کہتے ہیں، اس لئے ماتی تیامت یعنی ارض البحر کے قدیم باشندے نخم کہلائے۔ یہ نبو نخم جب اس سرزمین میں پہنچے جس کا قرآنی نام بابل ہے، تو وہ انشر اور کیشر بن گئے، یہاں انھوں نے انو، بل اور یا وغیرہ بہت سے دیوتاؤں کو جنم دیا، اور وہ مشترک اور متعدد دیوتاؤں کے قائل ہو گئے، اس وقت کنجو نام ایک رئیس کے ماتحت تیامت یعنی ارض البحر کے رہنے والے ایک دوسرے گروہ نے دیوتاؤں کی خدائی سے محروم کرنے کی جد و جہد شروع کی، ان دونوں گروہوں میں جنگ ہوئی، ایک گروہ کا رئیس کنجو تھا، دوسرے کا مردوک، مردوک

کے گروہ مین ایک تیسرا گروہ بھی شامل تھا جس کا نام (Gaga) ہے یہ نام توراتی جوج کے نام سے ملتا جلتا ہی، جوج کا نام قرآن مین یاجوج اور آشوری کتبون مین اجی جی ملتا ہے، اس جنگ مین غلبہ اس گروہ کو ہوا، جس کو جوج کی تائید حاصل تھی، اور مردوک نے پھاڑ کر تیامت کے دو حصے کر دیئے، ان مین ایک حصہ آسمان (سام) اور دوسرا حصہ زمین (حام) کے نام سے موسوم ہوا،

اثری تاریخ | یہ تاریخ اس زمانہ کی ہے، جب فن تحریر ایجاد نہین ہوا تھا، اس کی ایجاد کے بعد ہم کو اس دیار مین دو قومین ملتی ہین جن مین سے ایک کو آثار قدیمہ کے علماء نے سمیری قوم کا نام دیا ہے کیونکہ قدیم شاہان عراق جو شمالی اور جنوبی دونون حصون پر حکومت کرتے تھے، اپنے آپ کو اکاد اور سومیر کا بادشاہ کہتے تھے، اور دوسرے گروہ کو بنو سام نام دیا گیا ہے جن کی بولی عربی اور عبرانی وغیرہ بانون کے مطابق تھی،

افسانوی تاریخ مین سمیری قوم کا ذکر جا جا کے نام سے آیا ہے، جو توراۃ کا جوج اور قرآن کا یاجوج ہے اس زمانہ مین یہ قوم نخم اور کنجو کے مقابل غیر اہم تھی لیکن اثری زمانہ مین جو فن تحریر کی ایجاد کے بعد گذرا ہے ابتدا مین یہی قوم سب سے اہم تھی، اور سب سے پہلے اسی قوم نے اس دیار کے متعدد شہرون مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم کین، پھر کچھ عرصہ بعد سامی زبانین بولنے والون نے بھی حکومت اور اقتدار مین حصہ بٹانا شروع کیا، اسی زمانہ کی بابت توراۃ مین ہے کہ

"عابر سے دو فرزند پیدا ہوئے ان دو مین سے ایک کا نام فلج رکھا، کیونکہ اس کے زمانہ مین زمین بانٹی گئی، اور دوسرے کا نام یقطن رکھا گیا،

سب سے قدیم سامی بادشاہ جس نے ارض عراق مین اپنی حکومت قائم کی تھی، حال کی تحقیقات کے مطابق کش کا شہر یار مسیلم تھا، اس کا زمانہ اندازاً ۳۴۰۰ ق م قرار دیا جاتا ہے، اس کے جانشینون کی حکومت عروج و زوال کے ساتھ ۳۰۰۰ ق م تک قائم رہی، پھر پورے علاقہ مابین دجلہ و فرات

پر ایک دوسرے سامی خانوادہ نے قبضہ کرلیا جس کا مرکز حکومت اکاد تھا، اور اس خانوادہ کے بانی کا نام تھا،

شارجنی سار علی بن اتی بل

اس کو آشوری روایتون کے مطابق سرجون اکبر بھی کہا جاتا ہے، یہ نام تورات کی عابر کے پوتے سروج بن رعو کے نام سے ملتا جلتا ہے،

سرجون اکبر کے برسر عروج آنے سے پہلے ایک شہر سربرلامن پر جس کو جرسو، بن جرسو، اور سنجر بھی کہتے تھے، ایک سمیری خانوادہ حکومت کرتا تھا، جس کے قدیم ترین فرمانروا کا نام اور کا جناہے اس کی حکومت مسیلم سے تقریباً سو برس پہلے قائم ہوئی، اور سرجون اکبر کے زمانہ تک عروج وزوال کے ساتھ قائم تھی، سرجون اکبر کے پہلے اُدر اور گونی نام دو شہرون مین دو اور حکومتین سومیریون کی تھین، خاندانِ سرجون کی حکومت ضعیف ہو جانے اور ابرخ، ای اس، اور لارسا مین چھوٹی چھوٹی حکومتین قائم ہوئین، سنہ ۲۴۰۰ ق م کے قریب ان تمام حکومتون کو ایک نئے خاندان نے جس کے بانی کا نام سامواِبی تھا، اور جس کا پایۂ تخت شہر بابل تھا ختم کر دیا، سمو ابی کے خانوادہ کو عربی خاندان بتایا جاتا ہے،

اس طرح بابل مین یکے بعد دیگرے سات خانوادون نے سنہ ۱۷۲۰ ق م تک حکومت کی جن مین سے دوسرے خانوادہ کے گیارہ بادشاہون کے نام سومیریون کے سے ہین، اس خانوادہ کے خاتمہ (سنہ ۲۰۰۰ ق م) کے بعد سے سمیری قوم بتدریج اس طرح نابود ہو جاتی ہے کہ پھر اس کا سُراغ نہین ملتا،

سنہ ۱۸۳۰ ق م کے قریب ملک آشور مین ایک اور سامی قوم نے اپنی عظمت ووقار کی بنیاد رکھی قرآن کریم مین قوم یونس کے نام سے اسی قوم کا ذکر آیا ہے، جس کے ایک بادشاہ تغلات پلاسر

(فولکلتی اپلا اشور) نے ۷۲۰ء مین بابل کی حکومت کا خاتمہ کرکے اس علاقہ پر خود اپنا راج قائم کرلیا، لیکن ۶۰۶ء ق م کے بابل کے ایک اشوری گورنر نبوپال اشور نے بابل مین ایک نئے خانوادہ کی بنیاد ڈالی جس کو ۵۳۸ء ق م مین ایرانیون نے شکست دیکر اپنے ماتحت کرلیا،

یہ ہے بابل کے اس عہد تک کی مختصر تاریخ جس عہد کے بابل کا قرآن کریم مین ذکر آیا ہے،

نبوپال اشور (نبوپلاسر) کے فرزند نبوکدراوسر کا بائبل مین بنوکدنضر کے نام سے ذکر آیا ہے، یہ نام نبوخذ نضر پھر نبوخت نضر، پھر بخت نصر ہوکر عربی تاریخون مین بخت نصر بن گیا ہے، اسی بخت نصر کے زمانہ کی تاریخ بنی اسرائیل کی طرف خدا نے سورۂ بنی اسرائیل کی پانچوین آیت مین اشارہ فرمایا ہے، بنو اسرائیل پر بخت نصر نے چڑھائی کی، اور بہتون کو گرفتار کرلیا اور لیجاکر بابل کی سرزمین مین انکو بسایا، ایرانیون کے زمانہ مین اُن کو وطن واپس آنے کی اجازت ملی، اسی اسیری بابل کے زمانہ مین بنو اسرائیل نے وہ چیز سیکھی جس کی بابت قرآن مجید مین ارشاد ہوا ہے کہ

یُعلمون الناس السحر و ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت،

اہل بابل کے دین و مذہب اور اُن کے طور طریقہ پر یاجوج و ماجوج، قوم ابراہیم، قوم یونس اور لفظاً بنی اسرائیل کے ماتحت مشرح بحث کیجائے گی،

ارض القرآن حصہ اول

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے،

قیمت :- ۴ ؎ "مینیجر"

فتاویٰ بابری

از

جناب شیخ فرید صاحب برہان پوری

دودمانِ گورگانیہ کے آخری جلیل القدر شہنشاہ حضرت محی الدین اورنگ زیب عالمگیرؒ کے عہد کی بیشتر علمی و مذہبی یادگار فتاویٰ عالمگیری محتاجِ تعارف نہیں، مقامِ حیرت ہے کہ اسی خاندان کے عظیم المرتبت فاتح، عدیم المثال سپاہی اور اولوالعزم بادشاہ ظہیر الدین بابر کے عہد کی فقہ حنفی کی ایک تصنیف "فتاویٰ بابری" کے ذکر سے تاریخ ادبیات فارسی کی معروف و معتبر کتب خالی ہیں[1]، اتفاق سے اس کا قلمی نسخہ مولینا سید احکام اللہ صاحب بخاری امام جامع مسجد، برہان پور کے ذخیرۂ مخطوطات میں راقم السطور کی نظر سے گذرا، اس مضمون میں اسی تاریخی تبرک کا تعارف مقصود ہے،

مصنف کتاب شیخ نور الدین خوافی کے حالات کتب متداولہ میں نہیں ملتے، نفائس المآثر میں مختصر حالات درج ہیں، مولانا امتیاز علی صاحب عرشی ناظم کتب خانہ رام پور نے میری درخواست پر متعلقہ حصہ نقل کر کے ارسال فرمایا ہے، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بزرگ شیخ زین الدین خوافی کی اولاد میں سے ہیں، سلطان حسین مرزا کے عہد میں انھوں نے ہرات میں نشو و نما پائی، شیخ الاسلام سیف الدین احمد

---

[1] معارف فتاویٰ بابری، اگرچہ کمیاب ہے لیکن نایاب نہیں ہے، اور اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں، پٹنہ لائبریری میں بھی اس کا نسخہ موجود ہے اور اس کی فارسی مخطوطات کی فہرست میں مصنف کے ساتھ تصنیف کے بھی مختصر حالات ہیں، مذکر کیٹلاگ مخطوطاتِ فارسی پٹنہ لائبریری، ج ۴ ص ۸۶)

کے شاگرد تھے، جو ملا سعد الدین تفتازانی کی اولاد مین سے تھے،

"از بنابر حضرت شیخ زین خافی است، بہ غایت خوش طبع و فہم عالی داشتہ، شیخ نور الدین و شیخ زین[1] بہ دو نور کمالات متاز اند، ایشان در زمان سلطان حسین مرزا بہ ہرات نشو و نما یافتہ، بہ تحصیل فنون و فضائل کمال شتافتہ اند، شیخ نور الدین شاگرد شیخ الاسلام[2] است کہ از بنابر مولانا سعد الدین تفتازانی است"

مرزا علاؤ الدین قزوینی نفائس المآثر مین رقمطراز ہین کہ چودہ سال کی عمر مین سلطان حسین مرزا کے مدرسۂ ہرات مین صغر سنی، جمال اور سادہ روئی کے باوجود مسند درس پر فائز ہوے، دانش مندی اور مولویت مین وہ رتبہ اور استعداد بہم پہنچائی تھی کہ بڑے بڑے فاضل اُن کی مجالسِ افادات سے مستفید و بہرہ مند ہوتے تھے،

"در صغر سن و عنفوان شباب رتبۂ مولویت و دانش مندی بجائے رسانیدہ کہ دانشمندانِ آن زمان از مجالس افادات مستفید و بہرہ وری بودند"

"در زمان شاہی بیگ خان اورا در چہاردہ سالگی با وجود سادہ روئی و جمال مدرس مدرسۂ سلطان حسین مرزا ساختہ بودند"

شیخ مذکور کے کمال علم و فضل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہین :-

"از غایت جدتِ طبع و دقت ذہن در اقرانِ شباب از تحصیل علوم عقلی و نقلی فراغت یافتہ گوش ہوش تلاندہ از نتائج بحر خاطر فیض مآثر بہ لآلی نکاتِ دقیقہ گران بار گشت، و پایۂ قدر و منزلش در سلک زہد و تقوی و تجرد و فنون و علم فتوی از اماثل و اقران در گذشتہ"

یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بحث و مناظرہ مین شیخ موصوف کا پلہ اکثر بھاری رہتا تھا،

---

[1] بابر کی تزوکی مبین کے شارح شیخ زین کے حالات بزم تیموریہ ص ۱۳۱ پر ملاحظہ کیجئے [2] بزم تیموریہ ص ۱۳۱

"مثل ملایان عصر و ملا نورالدین مثل کشتی گیرے است کہ ہر یکے را بہ طریق خاص مغلوب می می سازد کہ ہرگز تصور آن نہ کردہ اند"

نفائس المآثر مین ہے کہ شیخ نورالدین اور شیخ زین الدین ۹۲۲ھ مین قندھار آئے، اور حضرت فردوس مکانی بابر کی ملازمت اختیار کی،

"در ۹۲۲ھ (اثنی وعشرین وتسعمایۃ) مجموع برادران بہ قندھار آمدہ بہ ملازمت حضرت فردوس مکانی رسیدہ"

فتاوی بابری کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۹۲۵ھ کے آخر مین شیخ صاحب اپنے وطن سے روانہ ہوئے،

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا بابر کی خدمت مین اُن کو باریابی کا شرف ۹۲۵ھ مین حاصل ہوا؟

دیباچہ کی سفر کی تاریخ آخر خمس وعشرین وتسعمایۃ[1] سے اگر آخری دو مہینہ مراد لئے جائین تو اس زمانہ کی طوائف الملوکی، خوانین وہرات سے قندھار کے بعد سفر کی مشکلات راستہ کی دشواریون اور ان موانع اور قوانین کے پیش نظر جن سے استخلاص شیخ کو دشوار اور مہلک نظر آرہا تھا بابر کے دربار سے شیخ کے توسل کا زمانہ ذی الحجہ ۹۲۵ھ یا محرم ۹۲۶ھ ہوگا،

شیخ بذلہ سنج اور خوش طبع بھی تھے، صاحب نفائس المآثر نے ان کی خوش طبعی کا یہ واقعہ نقل کیا ہے

"مولانا نزلالی شاعر کہ یکے از خوش طبعان است ومعمائی بود وبہ بجہت آن کہ سبز چہرہ بود اورا سبزہ نزلالی نسبت می کردہ اند، در سر جادہ ہری (مقام) بر شیخ نورالدین رسید واحوال پرسیدہ از پریشانی حال خود شکایت کردہ گفتہ اند کہ بخانہ ابناے روزگاری رویم وحکایات بلافائدہ

---

[1] دیباچہ ملاحظہ کیجئے،

می گوئیم و می شنویم، ملا زلالی این بیت خواندہ

تا کے بگرد درہا چون شیخ و شیخ زادہ

گوئیم ہرزہ ہرزہ کردیم لا وہ لا وہ

و بنیاد خندہ کردہ است، شیخ نورالدین در بدیہہ فرمودہ کہ این بیت گویا معمہ است با اسم شما کہ ہر ہر لا از ان حاصل می گردد، شما را خندہ کردن عجب است ملا درہم شدہ و ازین مطائبہ و خوش طبعی نادم گشتہ"

بدیہہ گوئی مین شیخ کو ید طولی حاصل تھا، وہ شعر و ادب کی محفلون مین جب دوسرے شعراء کے اشعار سُناتے تو اسی ردیف و قافیہ مین خود فی البدیہہ بیس بیس شعر کہہ کر شامل کر دیتے، اور سامعین مشکل سے یہ تمیز کر سکتے، کہ شیخ موصوف اپنے اشعار سنا رہے ہین،

شیخ نورالدین نے کابل مین وفات پائی،

کیفیت مخطوطہ | فتاوی بابری کے زیر نظر قلمی مخطوطہ کی تقطیع "۱۰×۱۰½" اور ۲۹ صفحات مین ہر صفحہ مین پندرہ سطرین ہین، خط نستعلیق، روشنائی سیاہ اور عنوانات شنگرفی ہین، لوح کتاب مطلا و مینا کاری کی جدولین سُرخ اور سُنہری ہین، ناقص الآخر ہین،

سبب تصنیف | کتاب کے دیباچہ مین مولانا خوافی نے لکھا ہے، کہ وہ اپنے جوہر علم و فضل کو تصنیف کی شکل مین بادشاہ کی خدمت مین پیش کر کے اس کے وسیلہ سے دربار شاہی سے منسلک ہونے کی دیرینہ تمنا کو پورا کرنے کے لئے اپنے وطن سے ۹۲۵ھ کے آخر مین روانہ ہوئے، اور "مراحل و منازل" طے کرتے ہوئے، "ممالک محروسہ" (؟) سے قریب ایک مقام پر پہنچے تھے، اور اس کشمکش مین تھے، کہ کس فن مین اپنی تصنیف پیش کرین، کہ بادشاہ کا حکم پہنچا کہ مسائل شرعیہ مین ایک کتاب فارسی مین تصنیف کیجائے، اس حکم پر مصنف نے مستند روایتون اور کتابون سے مسائل شرعیہ کو ضبط تحریر مین لانا شروع

کیا، اور ہدایہ (ہ)، کافی (ک) شرح وقایہ (شو) شرحِ مختصر وقایہ (ش)، خزانہ (خ) فتاوی قاضی خان (ق) اور خلاصہ (ص) سے اس کی تالیف میں مدد لی ہے، تو سین کی علامتیں مصنف نے حوالہ کے لئے مقرر کی ہیں، جہاں مختلف فیہ مسائل میں اپنی رائے ظاہر کی ہے، وہاں علامت ن سے کام لیا ہے،

دیباچہ کتاب | کتاب کا دیباچہ گو کسی قدر طویل ہے لیکن اس سے مصنف اور تصنیف کے بعض پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے، اس لئے اس کو نقل کیا جاتا ہے،

"بازمی نماید بندۂ درماندۂ عاصی جانی نورالدین بن قطب الدین بن احمد بن زین الدین الکوانی اصلح اللہ شانہ، وصانہ عماشانہ، کہ مدۃ مدید این حقیر قلیل البضاعت را داعیہ آن بود کہ خود را بہ سایۂ دولت پادشہِ فضیلت پروری رساند کہ باوجود کمال فطنت، بلند شرائف اوقات ارجمند را بہ ملاحظہ نکاتِ علوم نقلی و عقلی صرف نمودہ نحوے کامل وحظے وافر از ہر علم حاصل کردہ باشند، تا بمقتضائے انما یعرف ذو الفضل من الناس ذو دہ" درجہ از درجات فضائل ومرتبہ از مراتب ارباب آن بر ضمیر منیرش مخفی نماند و فرصت بعید این کسیر عدیم الاستطاعت غنیمت آن می نمود کہ مخزوناتِ خزانہ سینہ را کہ حاصلِ حیوات ومحصول اوقاتِ دیرینہ است مطرح محلس نامی ومحفل گرامی دین پناہے معدلت گستر ے گرداند کہ بمقتضائے عدالتِ ذاتی وموروثی رعایت ہر امرے بہ قدر مرتبہ آن فرمودہ، اجتناب از ترجیح مرجوح واحتراز از تفضیل مفضول بر ذمت ہمت واجب داند والحق احضار این مفہومات ور ذاتِ ملک صفات حضرت بادشہ اسلام پناہ مصداق مقولہ السلطان ظل اللہ، سلیمان دیوان تاج بخشے وصاحب قرانے، شہسوارِ میدانِ عالمگیری وکشور ستانی مطیع فرمانِ شریعت متین، متابع اعیان سلاطین، صاحبِ تمکین، تابع احکام ان اللہ یامر بالعدل والاحسان، قامع آثار اتمام ارباب ظلمت وطغیان،

مشید ارکان دین و ملت، مخرب بنیان کفر و اباحت، حامی ارباب سنت و جماعت، ماحی اصحاب بدعت و ضلالت و افروزندهٔ چراغ علم و تقوی، بعد از انطماس و انطفا، افرازندهٔ لوای درس و فتوی، بعد از اندراس و اشفا، و والی ممالک جهانداری و رعیت پروری، بانی مبانی شهریاری و معدلت گستری، مهر سپهر جلالت و کامرانی، شاه بارگاه ایالت و جهانبانی، دُرّ درجِ حشمت و جلال، ری بُرج سلطنت و اقبال

آنکه چون در مدحش اندیشم مقال
ناطقه حیران بماند عقل لال

الممدوح بلسان ارباب الحرفت و اصحاب الانتباه، ظهیر السلطنت و الدنیا و الدین محمد بابر بادشاه، شید الله ارکان الدین المتین بدوام وجوده و بقایه، و تبع العالمین بتوالی جوده و تعاقب عطایه، چون انحصار مفهوم نیر اعظم در جرم آفتاب ظاهر و روشن، بلکه اظهر من الشمس و ابین من الامس است،

لِکُلِّ زمان واحدٌ یلتجی به
وهذا زمان انت لاشک واحد

و علاوه این امور آنکه همواره آبا و اجداد این بیچاره به وظائف که دعوات درویشان است بخاندان عالی الشان آن حضرت اشتغال نموده، در ظل عواطف پادشاهان این دودمان متوالی الاحسان مرفه و خوش الحال می بوده اند، بنابرین مقدمات اکثر اوقات در تمهید اسباب آن می بود که سعی و کوشش نماید، تا به هر حیله که از دست برآید، در سلک دعاگویان این دولت قاهره درآید، به واسطهٔ کثرت وقایع که به سبب به دمدوی طامع واقع بود، شاهد این مقصود از نقاب خفا چهره نمی کشاد، و دخول برین مطلوب در حجاب توقف می افتاد تا آنکه در

اواخر خمس وعشرین وتسع مایه (۹۲۵ھ) به عزیمت آنکه اوّلا طواف آن آستانه که قبلهٔ آمال وکعبهٔ اهل سعادت واقبال است، نموده، بعد از رخصت بجانب حرمین شریفین توجه نماید، از وطن مالوف هاجرت اختیار نمود، و بقدم سعی واجتهاد بسیارے از مراحل ومنازل پیموده تا به موضع که قریب به ممالک محروسه است، رسید، و در آن موضع آن مقدار موانع وقوائم ظاهر گردید، که استخلاص ازان متعسر وملک متعذر می دید، ناگاه نسیم اقبال از هبت عنایات وزید ودر الحال قبول از نواب بارگه فلک اشتباه به مشام جان رسانید، بموجب جذبات من جذبات الحق یوازی عمل الثقلین کمند شوق در گردن این مستحق انداخته موانع متنوع را مرتفع ساخته در بسیاری از بوادی بیم ناک که مظنهٔ تلف وهلاک بود، دوانید تا آخر الامر رخت اقامت را به بر خے از بلاد که در ظل نواب کامیاب از سائر مخافات مصئون ومحزون ست کشید، الحمد لله الذی به انا لهذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله، وقبل از استسعاد وشرف بساط بوسی پر توالطاف وعنایات آن آفتاب فلک جاه وجلال برین ذرهٔ شکسته حال تافت وبانواع پرسش ونوازش نواب گردون جناب شرف اختصاص یافت، شکر این مواهب را واجب بود که تحفهٔ دعا وصحیفهٔ ثنائے معروض یافت مجلس عالی گرداند، بخاطر خطیر افتاد که ادائے آن ادعائے والتقائے آن ثنائے بر وجے مناسبت باشد که بعد الایام بر صحیفهٔ روزگار باقی ماند بنا بر آن عزیمت جزم نموده که در فنے از فنون رساله تالیف نموده، موسوم باسم شریف سازد، فاما در تردد آن بود که کدام یک از علوم در نظر اشرف مقبول تر است تا بنظم ترتیب آن پردازد، همانا که بموجب کلمهٔ مشهورهٔ "ارباب الدول لهمون" پر تو تردد این حقیر بر ضمیر منیر افتاده وکمال مرحمت وشفقت پادشاهانه، بقدر آن تردد را در خاطر این کمینه رخصت نداده که درین اثنا حکم جهان مطاع رسید که بجمیع تالیف قسم مبادات از مسائل شرعیه فرعیه اشتغال نموده، آن چه

رائج و معتبر عند الاکثر است بزبان پارسی در قید کتابت آورده، وسط خلافیات در روایاتِ ضعیف نموده خاطر بند کرآنها مشغول ندارد، ایجاباً بالحکم المطاع واطاعة لامر الواجب الاتباع با وجود قلت بضاعت و عدم استطاعت درین امر خطیر شروع نموده که بعد از اتمام به مقتضای حدیث "رب حامل فقه الی فقیه اوالی من هو افقه منه" در آن محفل عالی که ملجاء و ملاذ افاضل و اعالیست معروض دارد، از کتب معتبر پنج هفت کتاب بدست نیامد که اسامی آن کتب را عنقریب بتفصیل رقمی آرد، لاجرم چنان که گذارنده بواسطهٔ عدم اطلاع بر حرکاتِ ثوابت مدار علوم نجوم را بر سبعهٔ سیاره نهاده اند به جهت طلب اختصار بر ستاره را بر قمی امتیاز داده، این فقیر ضعیف نیز چون کتاب دیگر ندارد، بنا این رساله برین هفت کتب می گذارد، و هر روایتی را با نکه متفق باشد با یکی ازین کتب مستمد ساخته مرقوم برقمی می گرداند و هر رقم را علامت کتابی می دارد، چنان چه

از ۸ ایه به هم

و از کافی به ک

" شرح وقایه به ش

" شرح مختصر وقایه به ش

" خزانه به خ

" خلاصه به ص

" فتاوی قاضی خان به ق

تعبیری نماید چندان که می تواند سخنان اکمل را به حکایاتِ ناقص خود مقرون نمی گرداند، چرا که ناقص مصاحبتِ کامل را نشاید و اگر احیاناً کلمهٔ چند ضرورت باشد مصدر بر قسمی کند که حرف اول و آخر نقصان و نام این ناتوان است می سازد تا من اخول را به علامت نقصان سخن و قائل آن

از سخنان اہل کمال متاز گردیدہ کسے را در وغلط نیندازد و از ہر رقم تا رقم دیگر منسوب بدان رقم اول می دارد و اصلاح سخن غیرے در ان میان نمی آرد، مامول از مطالعہ کنندگان مصنف آن کہ چون این ضعیف بکمال عجز و نقصان معترف است اگر بر خطاے خللے اطلاع یابند بذیل عفو و اصلاح بپوشند و بسیار در خصلت عیب جوئی و بدگوئی نکوشند فانما جزاء واثق وامید صادق است کہ چون از پرتو توجہ خاطر کیمیا اثر کہ آئینہ جمال نمائی مخدرات عالم غیب است جلوہ ظہور یافتہ از شوائب عیب و خلل و مواقع ریب و زلل مصون و محفوظ ماند، الکون العصمۃ والعون بیدہ و ہو الموفق والمعین و ہو حسبنا و نعم الوکیل بپوشیدہ نماند کہ اول چیزے کہ بر مکلف یعنی عاقل و بالغ فرض شود بعد از ایمان نماز است.....

نسخۂ مذکور ناقص الآخر ہے، کتاب الصلوٰۃ سے شروع ہو کر کتاب الحج کی عبارت ذیل پر ختم ہو جاتا ہے:

"حج در لغت قصد کردن است بچیزے از روے تعظیم و در شریعت عبارت است از ارکان مخصوصہ بشرائط مخصوص کہ تفصیل آن معلوم خواہد شد، و این ارکان را حج باسطہ آن می گویند کہ مشتمل است بر قصد کعبہ معظمہ و این حج فریضہ است محکم و یکے از ارکان اسلام است و اگر کسے از فریضہ آن منکر شود کافر گردد و در ہمہ عمر یک بار فرض است و مراد و شرائط است کہ چون وجود گیرد فرض شود بعد از استجماع ....."

نغماے حیات

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں دوبارہ چھپ گیا ہے اس ایڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہے اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے ضخامت :- ۱۴۴ صفحے، قیمت :- مجلد للعصر، غیر مجلد ۲ے

"منیجر"

کشمیر مین شاہانِ مغلیہ کے چند آثار

از

جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاد عربی مسلم یونیورسٹی

مندرجۂ بالا عنوان سے میرا ایک بسیط مقالہ معارف اعظم گڈھ بابت ماہ مارچ ۱۹۴۰ء مین شائع ہوا تھا، اس مین ملاحظہ ہو ص ۲۰۰ چشمۂ شاہی کے متعلق لکھا تھا کہ اس کا ذکر جب مجھ کو قدیم شاہی زمانے کی کتابون مین نہ مل سکا، تو دوسرے وسائل سے کوشش کی لیکن اس مین بھی ناکامی رہی، البتہ مندرجۂ ذیل قطعۂ تاریخ غیر معلوم شاعر کا مل گیا،

دوشم دیدم نشستہ بر کوثر — شاہ مردان علی جہاہی
گفتمش السلام گفت علیک — گفت، بر گود گر چہ می خواہی
گفتمش بہر چشمہ تاریخے — گفت بر گوئے، کوثر شاہی

۱۰۴۲ھ

اگست ۱۹۲۸ء مین میرا لکھنؤ جانا ہوا، اتفاقاً عزیزم مولوی نثار احمد صاحب ایڈووکیٹ چیرمین میونسپل بورڈ سیتاپور سے ملاقات ہوئی، انھون نے میرے پاس بیٹھتے ہی کچھ فارسی اشعار گنگنانے شروع کئے جن مین چشمۂ شاہی کا نام سُن کر میرے کان کھڑے ہوئے، اور مین نے وہ اشعار اُن سے بآواز بلند پڑھوائے، یہ ایک قطعہ کے اشعار تھے، جو اُن کے پردادا مولوی مظہر علی صاحب نے بزمانۂ قیام کشمیر چشمۂ شاہی کی مرمت کے موقع پر کہا تھا، یہ قطعہ سنانے کے بعد انھون نے وہ قطعہ بھی پڑھا، جو اوپر درج ہے، مولوی مظہر علی صاحب کے قطعہ سے میرے علم مین یہ اضافہ ہوا کہ سابق کا دستیاب شدہ قطعہ ابو طالب

کلیم کا ہے، مین نے اس وقت غزیز موصوف کو مختصراً اپنی دلچسپی کی وجہ بتادی اور یہ بھی کہدیا کہ اس وقت کا واقعہ معارف مین بطور ضمیمہ مضمون سابق شائع ہوگا،

لکھنؤ سے واپس آتے ہی ابو طالب کلیم کے کلیات اور اُس کے حالات کی تلاش کی کہ اس کی جانب قطعہ کی نسبت جو معلوم ہوئی ہے، وہ پختہ طور پر ثابت ہو جائے، تذکرون مین حالات ملے، اور کشمیر سے اس کا شغف بھی معلوم ہوا لیکن افسوس ہے کہ کلیات کا نسخہ نہ ملا، حیرت اور تعجب افسوس اس بات پر ہے کہ مطبوعہ ہوتے ہوئے بھی وہ نایاب ہے، جہان جہان سے مستعار مانگا وہان بھی نہ تھا، پرانی کتابون کے فروخت کرنے والون سے علی گڈھ اور لکھنؤ مین رجوع کیا، مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی، پھر قلمی نسخون کا خیال کیا، ایک ناقص نسخہ ہماری لٹن لائبریری مین ہے، اس کی بنیاد پر فیصلہ غیر مناسب تھا، بعض احباب کے ذریعہ سے کچھ اور قلمی نسخے ملے جن مین سے بعض ناقص اور بعض مکمل تھے لیکن اس قطعہ سے خالی، بالآخر مصداق

تجری الریاح بما لا تشتهی السفن

اس لئے مجبور ہونا پڑ رہا ہے، کہ جیسا کچھ بھی ہے، اس انکشاف کو ناظرین معارف کے سامنے پیش کر دیا جائے،

مولوی منظر علی صاحب کا قطعہ تاریخ مرمت چشمہ شاہی درج ذیل ہے،

چشم بد دور چشمۂ ایست کہ ہست — آب و نایش زماہ تا ماہی
بر رہ او نہادہ سر تسنیم — سلسبیلش نمودہ ہمراہی
بود خاکش بسر ز حسرت شاہ — آبش افزود و شیخ جم جاہی
پیش ازین کلک تر زبان کلیم — در فشان شد کہ چشمہ شاہی
سال تاریخ حال چشمۂ شیخ — گفت منظر زدے آگاہی

۱۲۵۸ ۱۲۵۹

چونکہ شعر بتلا رہا ہے کہ پہلا قطعہ کلیم کا ہے، اور یہ کہ مادہ تاریخ چشمہ شاہی ہے لیکن اس کے

اعداد ۶۶۶ ہین، اس وجہ سے یہ مادہ نہین ہوسکتا، بلکہ جیسا اصل قطعہ کے اندر ہے، مادہ کوثر شاہی ہے جس سے ۱۳۴۲ھ برآمد ہوتے ہین، الدّاع

درفشان شد کہ چشمۂ شاہی

سے مولوی صاحب کا مقصد اس نام کی طرف اشارہ کرنا ہے جس سے وہ مشہور ہے،

اس انکشاف کے بعد اپنے محولۂ بالا مضمون کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ خود اس کے اندر شاعر کا نام موجود تھا، جو ماخذ مین کتابت کی غلطی سے مخفی رہ گیا، کیونکہ وہان تحریر ہے کہ "حکم بدیہہ تاریخ گفت" اسکو "کلیم بدیہہ تاریخ گفت" ہونا چاہئے تھا،

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ مولوی منظر علی صاحب کا مختصر حال لکھدیا جائے، جو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم برادر کلان مولوی نثار احمد صاحب موصوف کی عبارت مین بعینہ ملاحظہ ہو،

مولوی منظر علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکابر علماے عصر مین سے تھے، اور صاحب تصانیف بھی تھے، قبل تعین بصفت صدر امین و قاضی القضاۃ بریاست کشمیر مولوی صاحب مرحوم مدرسہ عالیہ کلکتہ مین پرنسپل تھے، اپنے ایک انگریز دوست کی فرمایش پر قلم برداشتہ ۲۹ روز مین ایک کتاب موسوم بہ اصول العلوم عربی زبان مین لکھی، جس مین دس علوم متداولہ پر ایسی اجمالی روشنی ڈالی کہ باریک سے باریک نکات بھی روشن ہوگئے ہین، اس کی نقل میرے پاس بھی موجود ہے، یہ کتاب خود اپنی نظیر ہے،

۱۲۷۲ھ مین جب کہ مولوی صاحب لاہور ہوتے ہوے وطن آرہے تھے، تو بغرض قدمبوسی خلاصہ دودمان مصطفوی نقاوہ خاندان مرتضوی سید السادات جناب مولانا سید رجب علی خان بہادر مقام لدھیانہ قیام کیا، اور جناب مولانا کی فرمایش پر ایک کتاب بزبان فارسی الموسوم بالرحمۃ النازلہ فی شرح التحفۃ المرسلۃ لکھی جو کہ مطبع نیز اعظم بٹالہ مین چھپی ہوئی کتاب ہم کو بہت تلاش کے بعد کتب خانہ انوری تکیہ شریفہ کاکوری مین ملی جس کی نقل ہمارے پاس موجود ہے، علاوہ اس کے مولوی صاحب نے ایک تفسیر

کلام مجید بزبان عربی لکھی، جس کا نام مجھکو یاد نہین، یہ تفسیر میرے یہان موجود نہین، اس کا مسودہ بھی مولوی صاحب نے اپنے ایک دوست کو دیا، اور ہنوز انہی کے پاس ہے، واللہ اعلم بالصواب۔

مولوی صاحب کا کشمیر مین بزمانہ مہاراجہ گلاب سنگھ قاضی القضاۃ ہونا اُن کی مہر سے ثابت ہے جس کی نقل ذیل مین درج ہے، یہ نقل مجھ کو مولوی نیاز احمد صاحب مرحوم نے دی تھی،

بہادر مولوی مظہر علے
صاحب گلاب سنگھ ۱۲۶۳ھ
متعینہ سرکار سرمہاراجہ صنے
مہر صدر امین و قاضی القضاۃ

اس مہر کی عبارت کو اس طرح پڑھنا چاہئے: "مہر صدر امین و قاضی القضاۃ مولوی مظہر علی متعینہ سرکار سر مہاراجہ گلاب سنگھ صاحب بہادر ۱۲۶۳ھ"

مین نے چاہا تھا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ سے مولوی صاحب کے حالات بحیثیت صدر مدرس معلوم کرون، مگر اس مین بھی کامیابی نہ ہوئی، معلوم ہوا کہ ملک کی تقسیم کے وقت جو سامان کلکتہ سے ڈھاکہ کو گیا اس مین مدرسہ کی تاریخ بھی چلی گئی، اس لئے یہ پہلو بھی تشنہ رہ گیا،

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب بنو اسمٰعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار، اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیل مباحث،

(زیر طبع)

ایک نادر کتاب کا تعارف

از

جناب سید نجم الحسن صاحب رضوی خیرآبادی

مولانا فضل امام خیرآبادی (علامہ فضل حق رحمہما اللہ کے والد ماجد) دنیائے علم مین ایک نامور معقولی اور یگانہ روزگار فلسفی کی حیثیت سے متعارف ہین منطق مین آپ کی مشہور تصنیف مرقات ہندوستان کے تمام چھوٹے بڑے مدارس عربیہ کے نصاب مین داخل ہے لیکن بہت سے اہل علم بھی اس سے واقف نہین ہین، کہ مولانا کی جولانگاہ محض معقولات تک محدود نہ تھی، بلکہ دوسرے علوم وفنون پر بھی آپنے طبع آزمائی کی ہے، آمد نامہ[1] جو فارسی قواعد کے تمام شعبون پر حاوی ہے، اور جس کی ایک فصل مین مشاہیر اہل علم کا بھی ذکر ہے، خاص خاص حلقہ مین روشناس ہو چکا ہے، حال مین موصوف کی ایک تاریخی تصنیف حکیم سید مشرف حسین مرحوم خیرآباد کے کتب خانہ مین نظر سے گذری جس سے لوگ واقف نہین ہین، اس لئے اس کا تعارف کرا دینا مناسب معلوم ہوا،

یہ کتاب فن تاریخ وسیر مین ہے اور فارسی زبان مین ہے، اور اتنی خستہ اور بوسیدہ ہو چکی ہے، کہ جابجا اوراق کے ٹکڑے اڑ گئے ہین، کتاب مین کاتی غلطیان موجود ہین بعض مقامات پر کاتب نے پورا صفحہ سادہ چھوڑ دیا ہے جس کی وجہ سے اگلی اور پچھلی عبارت مین ربط باقی نہین رہ گیا ہے پوری کتاب چھ سو سات صفحات مین تمام ہوئی ہے، ہر صفحہ مین سترہ سطرین ہین، قلم متوسط ہے، مصنف نے اس

[1] اس کا قلمی نسخہ بخط مصنف کتبخانہ مرتوفہ لاہر پور ضلع سیتاپور مین محفوظ ہے، ۱۲

تصنیف کا سبب دیباچہ میں یہ بیان کیا ہے،

"پس می گوید اضعف عباد اللہ المتوکل علی المتفضل المنعام الہادی محمد فضل امام بن محمد ارشد ایخرآبادی غفرلہ ولوالدیہ واحسن الیہما والیہ کہ روزے بخاطر فاتر این بندۂ ضعیف گزشت کہ چون انسان را احوال گزشتگان موجب عبرت وخبرت می باشد، وبسا امور دینی ودنیوی ازان انتظام می یابد لہذا اساتذہ در ہر زمان بتالیف کتب سیر وتواریخ پرداختہ اند ودفاترہا ازان پرساختہ درین زمان بسبب قصور فہم اکثر ابناے روزگار ازین علم شریف عاری وعاطل اند، وبمثابت مہمالات ازین فن شریف بسیارے ارباب زمانہ بے بہرہ وغافل اند، مناسب است کہ مختصرے ازکتب متعارفہ التقاط کردہ آید کہ گزشتگان را تذکارے وبراے آئندگان یادگارے باشد، بنا بران این چند اجزا، ازکتب معتبرہ مانند تاریخ فرشتہ وشمشیر خانی ومنتخب التواریخ ودیگر کتب بعبارت سلیس ووضع انتخاب کردہ درسلک تحریر کشیدہ شد، وبناے این کتاب برچند گفتار نہادہ اند"

پوری کتاب سات گفتاروں اور ایک خاتمہ پر مشتمل ہے،

"گفتار اول در ذکر احوال خلقت آدم علی نبینا علیہ السلام وذکر انبیاے دیگر وغیر مرسل گفتار دوم، در ذکر صوفیاے کرام واولیاے عظام گفتار سوم در ذکر ملوک ایران، گفتار چہارم در ذکر راجگان کہ حکومت بہ دہلی ودیگر بلاد داشتند، گفتار پنجم در ذکر حکام غزنویہ ولاہور، گفتار ششم اسلاطین سلاطین سلجوقیہ گفتار ہفتم در ذکر مشاہیر حکما واطبا ومشاہیر خوشنویسان، خاتمہ در بیان بلاد ہفت اقلیم وعجائب وغرائب بلدان"

کتاب کی تصنیف کا زمانہ وہ ہے جب مولانا دہلی میں افتا کے منصب پر فائز ہوئے تھے، اس لئے مشاغل کی کثرت، دربار کی حاضری اور درس وتدریس کی مشغولیت نے کتاب پر نظر ثانی کا موقع بھی نہیں دیا،

اور دوستون کے پیہم اصرار سے مجبور ہوکر مسودہ اسی طرح انکے حوالہ کردیا اگر مصنف کو اس کتاب کی تکمیل و تصحیح کا پورا موقع ملا ہوتا، تو اس کتاب کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا، اس کا مصنف کو افسوس تھا، وہ لکھتے ہین -

تالیف این کتاب وقتے اتفاق افتاد کہ قاعدہ قضا و قدر این کمترین خلائق را در دہلی انداختہ بفتوی نویسی عدالت آنجا مبتلا ساختہ بود، و ذلک فی سنہ ۱۲۴۳[1] ہجری قدسی و چون انحال این احوال بر سبیل ادبجال اتفاق افتادہ و فرصت آن نشد کہ نظر ثانی کردہ آید، چہ اکثر در دربار می گزشت و بوقت از اوقات در تدریس صرف می شد و آن قدر مہلت کہ برائے سیر کتب سیر و تواریخ وغیرہ گنجایش تواند داشت دست بہم نمی دارد و بعضے دوستان در نقل گرفتن و استنساخ این سخت عجلت و جلدی فرمودند لاجرم ہمان نسخہ مسودہ حوالۂ اوشان نمودہ شد، بنابران ناظرین توقع آن دارد کہ اگر بر سہوے و خطائے وقوف یابند آزا بے مائگی راقم و بے سوادی مولف حمل کردہ بہ ذیل عفو پیوشند، و العفو عند کرام الناس مقبول،

راقم ڈاکٹر سید انظار حسین نبیرۂ حکیم سید مشرف حسین مرحوم کا ممنون ہے جنھون نے اس نایاب گران بہا گنجینہ کے جس کا غالباً اور کہین وجود نہین ہے، مطالعہ کا موقع دیا، یہ کتاب اس لائق ہے کہ اسکی نقل حاصل کی جائے تاکہ یہ تاریخی یادگار ضائع ہونے سے محفوظ ہو جائے،

---

[1] غالباً کاتب نے ۱۲۴۳ھ کو غلطی سے ۱۲۴۴ھ لکھدیا ہے، اس لئے کہ مرزا غالب نے مولانا کا سنہ وفات اپنے قطعہ تاریخ مین ۱۲۴۳ھ لکھا ہے، یعنی اس سے چار سال قبل آپ وفات پا چکے تھے، مرزا کے قطعہ کا شعر یہ ہے،

گفتم اندر سایۂ لطف نبی
باد آرامشگہ فضل امام
۱۲۴۳ھ

(باغی ہندوستان بحوالہ سبد چین غالب)

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان مین مسلمانون کے تمدنی اثرات

"موجودہ عہد مین "ہسٹری آف اورنگ زیب" کے مصنف جدوناتھ سرکار مغلیہ دور کے بڑے مستند اور بلند پایہ مؤرخ سمجھے جاتے ہین، انھون نے اورنگ زیب کی ضخیم تاریخ جس نقطۂ نظر سے لکھی ہے اس کو مسلمانون نے پسندیدہ نگاہون سے نہین دیکھا ہے، اس لئے وہ مسلمانون کی تاریخ اور تمدن کے دوست اور ان کے حامی نہین سمجھے جاتے لیکن انھون نے اپنے ایک مضمون مین غالباً باول ناخواستہ کچھ ایسے حقایق لکھے ہین، جن کا مطالعہ آج کل بعض حیثیتون سے بہت مفید اور دلچسپ ہوگا، ان کا ایک انگریزی مقالہ اپریل ۱۹۲۹ء کے ہندوستان ریویو مین "اسلام ان انڈیا" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، گو یہ مضمون بھی بہت سے غلط واقعات و مفروضات پر مشتمل ہے تاہم اس مین بہت سی حقیقتون کا بھی اعتراف کیا گیا ہے، اس لئے اس کے خاص خاص حصے ناظرین کی خدمت مین پیش کئے جاتے ہین، اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ ہندوستان کے سنوارنے مین مسلمانون کا کیا حصہ رہا ہے، اس مضمون مین بہت سے ایسے خیالات بھی ہین جو صحیح نہین، اس لئے مضمون نگار کی ہر رائے سے اتفاق عروری نہین ہے"

مسلمانوں نے جب ہندوستان کو فتح کیا، تو ان کی فتح گذشتہ تمام فتوحات سے مختلف تھی، وہ ہندوستان آئے، تو اُن کو یہاں کے پرانے باشندے اپنے میں ضم نہ کرسکے، ورنہ اُن سے پہلے یونانی تورانی، تاتاری اور پارتھین حملہ آور جب یہاں آباد ہوئے، تو چند نسلوں کے بعد ہی وہ اپنے نام، لباس، رسم ورواج اور مذہب میں بالکل ہندو بن گئے، دوسری صدی قبل مسیح میں ایک یونانی ہیلیوڈورس نامی نے سفیر کی حیثیت سے ہندوستان کی سیاحت کی تھی، تو اُس نے وشنو کی پوجا کی، اور اس دیوتا کی یاد میں ایک ستون بھی بنوایا.....

لیکن اسلام میں توحید کا تخیل اس قدر خالص اور شدید ہے کہ اس میں اور شرک اور تعدد الٰہ کی کوئی گنجایش ہی نہیں ہے، اسلام کا خدا ہمیشہ زندہ اور غیور رہتا ہے، وہ کسی کو اپنا شریک نہیں بنا سکتا، اور نہ اپنے اوپر ایمان لانے والوں کے دلوں میں کسی اور خدا کے وجود کو گوارا کرسکتا ہے، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانوں کا ہندومت کے ساتھ ضم ہونا ناممکن ہوگیا، وہ اپنے اللہ کو نہ وشنو کے کثیر التعداد اوتاروں میں سے ایک اوتار مان سکتے تھے، اور نہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو ایک صاحب الہام سادھو تسلیم کرنے کیلئے تیار ہوسکتے تھے، اسی لئے ہندو اور مسلمانوں کے ایک ہی سرزمین میں رہتے ہوئے بھی دونوں میں آمیزش نہ ہوسکی، اور ان میں جو خلیج پیدا ہوگئی، اس کو کوئی چیز پاٹ نہ سکی، ہندوستان کے مسلمانوں کا رجحان ہندوستان کے بجائے باہر کی سمت رہا۔ آج بھی جب وہ نمازوں میں کھڑے ہوتے ہیں، تو اُن کا منھ مکہ کی طرف ہوتا ہے، وہ ہر زمانہ میں جب بھی اپنے ذہنی نشو ونما، قوانین کی تدوین، ملک کے انتظامی معاملات اور نوشت وخواند کے معیار کے سلسلہ میں کوئی نمونہ تلاش کرتے تو وہ ہندوستان سے باہر، عرب، شام، ایران اور مصر کا ہوتا، مسلمانوں کی بہت سی چیزیں مثلاً ان کی مقدس زبان، اُن کا لٹریچر، ان کے اساتذہ، اُن کے اولیاء اللہ اور اُن

کی درگا' ہین مشترکہ ہین جو تمام دنیا مین پھیلی ہوئی ہین، اور ہندوؤن کی طرح صرف ہندوستان ہی مین محدود نہین ہین،

ہندوؤن نے مسلمانون کو اپنے مین ضم کرنے کی کوشش کی، اسی لئے اونھون نے (Allo-panic had) لکھی، اور شہنشاہ اکبر کو اوتار تسلیم کر لینے کا خطرہ بھی مول لیا، لیکن مسلمان اپنے مذہب کی بنیادی باتون کو ترک کرنے، اور ان نئی رسمون کو اختیار کرنے کے لئے بھی آمادہ نہین ہوئے، جو ہندو سوسائٹی مین داخل ہونے کے لیے ضروری تھین' انھون نے قرآن کے اس حکم کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ مشرک نجس ہین، اور کوئی نجس چیز کعبہ مین داخل نہین ہوسکتی،

ہندوستان آنے والے مسلمانون اور اُن سے پہلے کے حملہ آورون مین یہی بنیادی فرق رہا، اس کے علاوہ ایک اور خاص فرق یہ تھا کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۶۰۰ء تک مسلمانون کی ریاست اور سوسائٹی سپاہیانہ اور خانہ بدوشانہ طرز کی تھی، حکمران طبقہ اس ملک مین اس طرح رہا، جس طرح کوئی فوجی کیمپ مین رہتا ہو، سولہوین صدی کے اخیر مین اکبر نے اس ملک کے لوگون مین یہان کی حکومت سے دلچسپی پیدا کرانے کی کوشش کی، اور خود حکومت بھی حاکمانہ فرایض کے علاوہ کچھ معاشرتی اور عمرانی فرایض انجام دینے کی طرف مائل ہوئی لیکن مسلمان باشندے اس ملک مین رہنے کے باوجود اکبر کے عہد تک اس کا جز بن کر نہین رہے،

اب سوال یہ ہے کہ مسلمانون نے اپنے عہد مین ہندوستان کو کیا کیا چیزین دین؟ ہمارے نزدیک یہ دس چیزین ہین،

(۱) مسلمانون نے ہندوستان کے تعلقات بیرونی دنیا سے قائم کرائے، جس کی وجہ سے بحری جہازرانی اور بحری تجارت کو از سر نو فروغ ہوا، ہندوستان مین چولا کی حکومت کے خاتمہ

کے بعد یہ دونون چیزین بالکل ختم ہوگئی تھین،

۲۔ ہندوستان کے بیشتر علاقون خصوصًا ونڈھیا کے شمال مین اندرونی طور پر امن وسکون قائم ہوا،

۳۔ ایک ہی قسم کے نظام حکومت سے تمام ملک مین یکسانیت پیدا ہوئی،

۴۔ مذہبی عقائد کے اختلاف کے باوجود اونچے طبقہ کے لوگون کے عادات واطوار اور لباس وغیرہ معاشرتی امور مین یکرنگی پیدا ہوئی،

۵۔ ہندی اور اسلامی طرز کا ایک آرٹ پیدا ہوا، جس مین ہندوؤن اور چینیون کے آرٹ کی بھی آمیزش تھی، اس لئے تعمیرات مین ایک نیا اسٹائل پیدا ہوا، اور عمدہ قسم کی صنعتون کو فروغ ہوا، شال، کمخواب، قالین، اور مرصع کاری اسی زمانہ کی یادگارین ہین،

۶۔ ایک مشترکہ زبان پیدا ہوئی جو ہندوستانی یا ریختہ کے نام سے مشہور ہوئی، نثر نویسی مین ایک سرکاری اسٹائل کا رواج ہوا، جس کی بنا ان ہندو منشیون نے ڈالی جو فارسی لکھا کرتے تھے، اور اس اسٹائل کو مرہٹون نے بھی اپنی زبان مین رائج کیا،

۷۔ دہلی کی حکومت کی وجہ سے جب امن اور اقتصادی خوشحالی بڑھی تو ملکی لٹریچر کو بھی ترقی ہوئی،

۸۔ مذہب مین توحید کے تصور کی تجدید ہوئی، اور تصوف پھیلا،

۹۔ تاریخی لٹریچر پیدا ہوا،

۱۰۔ فنون جنگ اور تمدن کے عام شعبون کو فروغ ہوا،

بیرونی تعلقات | بودھون کے زمانہ مین تو ہندوستان کے تعلقات ایشیا کے اور ملکون سے پیدا ہوئے لیکن جب آٹھوین صدی عیسوی مین از سر نو ہندو سوسائٹی کی تشکیل ہوئی، تو ہندوستان دنیا سے بے تعلق ہوکر خود اپنی سرحد کے اندر محدود ہوگیا، لیکن بارھوین صدی عیسوی مین جب مسلمانون

نے ہندوستان کو فتح کیا، تو ایشیا اور افریقہ کے بعض علاقون سے ہندوستان کے تعلقات پھر سے قائم ہوئے، لیکن اس کے بعد بھی ہندو خود باہر نہین نکلے، بلکہ باہر سے ہزارون غیر ملکی ہندوستان آتے رہتے، اور کچھ مسلمان بھی ہر سال باہر جاتے رہتے، افغانی سرحد کے درّون کی راہ سے بخارا، سمرقند، بلخ، خراسان، خوارزم اور ایران سے عام لوگون کے علاوہ تاجرون کی آمد و رفت برابر جاری رہی اور یہ سلسلہ مغلون کی حکومت کے خاتمہ یعنی ۱۷۳۹ء تک قائم رہا، بولن کے درہ سے قندھار اور ایران تک راستہ جاتا تھا، اس راستہ سے جہانگیر کے زمانہ یعنی سترہوین صدی کے آغاز مین ہر سال چودہ ہزار بار شتر تجارتی سامان باہر سے آتا تھا، مغربی ساحل پر بہت سی بندرگاہین ایسی تھین، جن کے ذریعہ بیرونی دنیا مین رسائی ہوتی رہتی تھی، مشرق مین مسولی پٹیم کی بندرگاہ پر گولکنڈہ کے سلاطین کا قبضہ ۱۶۸۶ء تک رہا، جس کے بعد مغلون کا قبضہ ہوا، یہان سے لنکا، سماترا، جاوا، سیام اور چین تک جہاز جاتے رہتے تھے،

یکسانیت | مغلون کے دوسو سالہ عہدِ حکومت مین پورے شمالی ہند اور دکن کے بیشتر حصہ مین سرکاری زبان، نظامِ حکومت اور سکون مین یکسانیت پیدا ہوئی، ایک مشترکہ زبان بھی پیدا ہوئی، جس کو برہمنون اور دیہاتیون کے علاوہ ہر طبقہ کے لوگ بولتے، مغلون کے ملکی نظام، سرکاری خطابات، درباری آداب اور سکون کے ضوابط کو ان ہندو راجاؤن نے بھی اختیار کیا جو مغلون کے زیر اثر تھے،

مغلون کے زمانہ مین بیس صوبے تھے، ہر صوبہ مین ایک ہی قسم کا نظم و نسق تھا، ایک ہی قسم کے خطابات بھی تھے، سرکاری کاغذات مین ایک ہی زبان فارسی استعمال کی جاتی تھی، سرکاری عہدہ دارون اور فوجیون کا تبادلہ ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین برابر ہوتا رہتا تھا، اس لئے ایک صوبہ کا آدمی دوسرے صوبہ مین اپنے کو اجنبی محسوس نہین کرتا تھا، تاجر اور مسافر آسانی سے

ایک شہر سے دوسرے شہر اور ایک صوبہ سے دوسرے صوبہ مین آیا جایا کرتے تھے، اور اس آمد و رفت سے اُن کو اس وسیع ملک کی مسیاسی وحدت کا احساس ہوتا تھا،

فنون لطیفہ فنون لطیفہ مین مسلمانون کے بڑے احسانات حسب ذیل ہین،

۱۔ انھون نے تعمیرات مین ایک نیا طرز ایجاد کیا، محلون اور مقبرون کی تعمیر اُن کی خاص چیز ہے،

۲۔ ان کی وجہ سے مصوری مین ایک خاص اسکول قائم ہوا،

۳۔ ہندوستان مین فن باغبانی کا ذوق پیدا ہوا،

شروع مین مسلمانون کی مصوری کے جو نمونے خراسان اور بخارا سے ہندوستان پہنچے، ان مین خصوصًا چرون چٹانون، اژدہون، آگ اور پانی کی چادر کی مصوری مین چینی اثرات کا غلبہ نظر آتا تھا، لیکن ہندوستان کے اصلی قومی بادشاہ اکبر کے دربار مین مسلم آرٹ مین چینی اور غیر ہندوستانی اثرات کے ساتھ ہندو آرٹ کی بھی آمیزش ہونے لگی، جس کی روایات مین اجنٹا، بجارموت اور ایورا کی مصوری کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی،

اکبر کے زمانہ مین مسلم آرٹ مین پہلی دفعہ تغیر پیدا ہوا، اور چینی آرٹ مین جو سختی پائی جاتی تھی اس مین نرمی پیدا کی گئی، اور اس آرٹ کی رسمی باتون سے پرہیز کیا جانے لگا، چٹان، پانی، اور آگ کی مصوری مین ایک نیا طرز اختیار کیا گیا جس مین چینی اسکول کے اثرات تو باقی تھے، لیکن وہ فطرت سے قریب تر ہوتے تھے، پھر رفتہ رفتہ چینی اثرات زائل ہونے لگے، اور مصوری کی خصوصیات اور مناظر مین طور پر ہندوستانی ہوگئے، اور یہ ترقی اکبر کے بعد بھی جاری رہی، یہان تک کہ شاہجہان کے عہد مین چینی اثرات پر ہندوستانی اثرات غالب آگئے، پھر اس آرٹ نے نزاکت، رنگ آمیزی، باریکی، مرصع کاری، اور فطرت نگاری مین بڑا کمال پیدا کیا، اس طرح مسلم آرٹ کو فروغ مغلون کے دربار ہی مین ہوا، اور اس زمانہ مین ہندوستان کے مصورون نے اپنے کمالات کے جوہر دکھائے یہ اثرات

ہندوستانی آرٹ یا مغل مصوری کے نام سے اب تک باقی ہے،

زبانوں کی ترقی ۱۲۰۰ء کے بعد سے سنسکرت ایک زندہ زبان کی حیثیت سے باقی نہیں رہ گئی تھی، اور گو اس زبان میں کتابیں لکھی جاتی رہیں، اور اب بھی لکھی جاتی ہیں، لیکن یہ تمام کتابیں بناوٹی ہیں یعنی یا تو وہ شرحیں ہیں، یا شرحوں کی شرحیں ہیں، یا رسمی باتوں پر کچھ رسالے ہیں، ان میں کوئی ایسی اوریجنل تصنیف نہیں ہے جس کو واقعی لٹریچر کہا جا سکتا ہے، اس کی کوئی کتاب نہ دل کو متاثر کرتی ہے، نہ معلومات میں اضافہ کرتی ہے، اس لئے یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ ۱۲۰۰ء سے ۱۵۵۰ء تک کا زمانہ جس کو عام طور سے پٹھانوں کا عہد کہا جاتا ہے، شمالی ہندوستان کا ایک تاریک دور تھا، اس ساڑھے تین سو برس کی مدت میں ہندوؤں کا دماغ بالکل کورا اور بنجر رہا۔ لیکن جب اکبر نے اپنے دشمنوں پر غلبہ پاکر شمالی ہند میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تو امن و امان اور اچھے نظام سلطنت کے خوشگوار نتائج پیدا ہونے لگے، امن کی وجہ سے دولت بڑھی، اور دولت کے ساتھ ذہنی تعیشات کی جلوہ آرائی شروع ہوئی، تمام صوبوں کی زبانوں میں یکایک ترقی ہونے لگی، بنگال میں چیتنیا کے مقلدوں نے بنگالی زبان میں ایک نئی روح پھونک دی، اس زبان میں گیتوں کے علاوہ بعض اہم کتابیں خصوصاً سوانحعمریاں لکھی گئیں،

ہندی زبان میں تلسی داس نے اپنی غیر فانی کتاب رام چرت مناس ۱۵۷۴ء عیسوی میں لکھنی شروع کی، اس سے پہلے محمد جائسی نے پدماوت ۱۵۴۰ء میں ختم کی تھی، اس نے ۱۵۱۲ء میں مری گاوت بھی لکھی، اس زمانہ میں ہندی نظمیں بکثرت لکھی گئیں، انہی میں سے اکھراوت، ہنماوت کندراوت، مادھو ملاتی، عثمان چترآوتی ہیں، کبیر داس، اور نانک نے بہت سی مذہبی نظمیں لکھیں، لیکن ان کی حیثیت

لہ معارف :- فاضل مقالہ نگار مغلیہ عہد کے مورخ ہیں، اس سے پہلے کے عہد پر ان کا تاریخی مطالعہ وسیع نہیں، اس لئے اُن کی یہ رائے قابلِ قبول نہیں،

مستقل لٹریچر کی نہیں، وہ محض پند و نصائح ہیں، جو زبانی یاد کرائے جاتے تھے،

اردو سولھویں صدی میں پیدا ہوئی، شروع میں یہ بازاری زبان تھی، اور مصنفوں اور اعلیٰ سوسائٹی کی نظروں میں حقیر سمجھی جاتی تھی، لیکن شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ زبان علمی بن گئی، دکن میں ایک صدی پہلے ہی اردو جس کو ریختہ بھی کہتے تھے، شاعری کے اچھے اچھے نمونے پیش کئے گئے۔ تہمتی اور نگ آبادی اردو کے سب سے پہلے ممتاز شاعر سمجھے جاتے ہیں،

اکبر اور اس کے باجگذار حکمرانوں نے علوم و فنون کی بڑی سرپرستی کی، جس کی وجہ سے سولھویں صدی کے آخر اور سترہویں صدی کے نصف تک ہندوستان کے ذہن و دماغ کا حیرت انگیز نشو و نما ہوا، اسی زمانہ میں بنگال کی تاریخ سنسکرت میں "فیخ سبھودیا" لکھی گئی، جس میں ایک عجیب و غریب مخلوط زبان استعمال کی گئی ہے، اسی عہد میں شاہجہان کے درباری چندر بھان برہمن کی فارسی تحریروں کی شہرت ہوئی، اسی دور میں ہندی کی تصنیف مشرا بندھو و نود مشہور ہوئی،

مذہب کے اثرات | مشہور مورخ کنگھم رقمطراز ہے کہ

"مسلمان ہندوستان میں ایک نئی قوم کی حیثیت سے آئے، وہ اپنی شجاعت میں چھتریوں کے برابر یا اُن سے بڑھکر تھے، وہ برہمنوں کے تقدس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، انھوں نے توحید کو بیانگ دہل پیش کیا، اور یہ بتایا کہ خدا بتوں سے نفرت کرتا ہے ان تمام باتوں نے ہندوستان کے لوگوں کے ذہن کو متاثر کیا،..... "ہندو مذہب اور اسلام کے اختلاط کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ چودھویں صدی کے آخر میں بنارس کے رامانند نے ایک مذہبی فرقہ کی بنیاد ڈالی، جس کا ہر فرد خدا کی نظروں میں یکساں سمجھا جاتا تھا، اور اس میں کسی امتیاز کے بغیر ہر قوم کے لوگ رامانند کے چیلے بن کر شریک ہو سکتے تھے"

نظر دوسرے یورپین مصنفوں کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ازمنۂ وسطیٰ کے ہندوؤں

مین توحید کا تخیل اور ذات پات کے خلاف جذبات اسلام کے اثر سے پیدا ہوئے، ہندوؤن مین شروع سے جتنے بڑے بڑے مفکر اور مذہبی مصلح پیدا ہوئے، انھون نے یہی تعلیم دی کہ بے شمار دیوتاؤن کے پیچھے ایک ہی خدا ہے، اور ہر پجاری خدا کے نزدیک برابر ہے، ان مصلحین نے یہ بھی تعلیم دی کہ مذہبی رسم ورواج تو بہت ہین لیکن ان تمام چیزون سے بالاتر صرف ایک سیدھا سادہ عقیدہ ہے، انھون نے مذہب کی باتون کو آسان بنا کر ادنی طبقہ تک پہونچانے کی بھی کوشش کی، لیکن اس مین شک نہین کہ ان تمام اصلاحی تحریکون مین مسلمانون کے آنے کی وجہ سے بڑی ترقی ہونے لگی، ہندوؤن کے دماغ پر جو تعصب چھایا ہوا تھا، وہ مسلمانون کی سوسائٹی کے اثر سے دور ہونے لگا،

مسلمان صوفیون نے ہندوؤن اور مسلمانون کے اعلی دماغون کے لئے ایک مشترکہ پلیٹ فارم تیار کیا، اور صوفیون کے فلسفہ کے اثرات سے حکمران طبقہ محکومون سے قریب تر ہوا،

تاریخی لٹریچر | تاریخ نویسی مین ہندوؤن کا دماغ بالکل محدود تھا، مسلمانون کی فتح سے پہلے ہندوؤن نے کوئی ایسی کتاب نہین لکھی تھی، جو صحیح معنون مین تاریخ کہی جاسکتی ہے، اس کے برخلاف عربون کا دماغ خشک، مرتب اور حقیقت پسند ہوتا ہے، وہ تمام واقعات کو تاریخ وار لکھنے کے عادی ہین، مسلمانون کا تاریخی لٹریچر بہت ہی وسیع اور متنوع ہے، اور اس مین سنہ وسال کی باضابطہ ترتیب رہتی ہے، ہندوستان کے ہر مسلمان خاندان کے زمانہ مین تاریخین لکھی گئین، مغلون کے ہر بادشاہ نے اپنے عہد کی تاریخ لکھوائی، ان تاریخون کا نہ صرف مطالعہ کیا گیا، بلکہ ہندو مصنفون اور راجاؤن نے ان کے طرز کو نقل کرنے مین تساہل سے کام نہین لیا، اس طرح ہندوستانی لٹریچر مین ایک نئے اور بہت ہی مفید فن کا اضافہ ہوگیا، چنانچہ سترہوین اور اٹھارہوین صدی مین تاریخون، سوانحعمریون اور خطون کا ایک عظیم الشان ذخیرہ فراہم ہوگیا،

کلچرل اثرات | مسلمانون نے ہندوستان مین صدیون حکومت کی، اس لئے یہان اُن کے تمدنی

اثرات گوناگون ہین،

شکار خصوصاً باز اور شکرے سے شکار کھیلنے کے طریقون مین مسلمانون کا اثر غالب ہوا، اس کے لئے ان ہی کی اصطلاحات استعمال ہوئین، تمدن کے دوسرے شعبون مین بھی فارسی عربی اور ترکی الفاظ ہندی بنگالی بلکہ مرہٹی زبان تک مین استعمال کئے جانے لگے،

مسلمانون نے فنونِ جنگ مین بڑی ترقی کی تھی، انھون نے یہ فن ٹرکی سے سیکھا تھا، جو یورپ کے فنون جنگ سے متاثر تھا، اور کچھ ایرانیون سے بھی سیکھا تھا، مغلون کی فوج کے نظم ونسق کو ہندو راجاؤن نے بڑی رغبت سے اختیار کیا، تمدن جیسے جیسے بڑھتا گیا، اور جنگ مین توپون کے استعمال کی کثرت ہوئی، تو مسلمانون نے حصار بندی کو بڑی ترقی دی، مسلمانون ہی نے یہان بارود رائج کی، ہندوؤن کو جنگ مین ہاتھیون پر بڑا بھروسہ رہا کرتا تھا، لیکن مسلمانون نے سوارون کے دستے کے طریقۂ جنگ کو اتنی ترقی دی کہ ہاتھی جنگی مصرف کے لئے بیکار ہو گئے اور وہ لڑائی مین صرف باربرداری کے کام مین آنے لگے،

ملکی نظام، دربار کے آداب، لباس پوشاک، اعلیٰ طبقہ کے طرز زندگی، سامان تعیشات، فنونِ لطیفہ، تعمیرات اور فن باغبانی مین مسلمانون کے اثرات بہت نمایان طور پر ظاہر ہوئے، مغلون نے دربار کے مراسم، خطابات اور سرکاری عہدیدارون کے آداب مین جن جن باتون کو رائج کیا، ان کو اکثر ہندوؤن نے فخریہ نقل کیا، راجپوت اور مالوہ کی بعض ریاستون مین سرکاری زبان اب تک اردو ہے، اور اس کا رسم الخط دیوناگری کے بجائے فارسی ہے،

محکمۂ مالیات کا نظام تو وہی رہا جو بہت ہی قدیم زمانہ سے ہندوستان مین رائج تھا، لیکن اس نظام کی سرکاری ترتیب اور اس کے حساب کتاب کے طریقون اور اس محکمہ کے القاب کو مسلمانون نے رائج کیا اور اُن سے ہندو ریاستون نے لیا،

مسلمانوں کی روزانہ کی زندگی میں ہندوؤں کے مقابلہ میں تعیش زیادہ تھا، وہ زیادہ تر شہروں میں رہتے تھے، اس لئے اُن کی وجہ سے صنعتوں اور فنون لطیفہ کو زیادہ فروغ ہوا، اُن کا ذوق ہندوؤں سے زیادہ بلند اور پاکیزہ تھا، متمول ہند وخصوصًا سرکاری طبقہ ان ہی کے ذوق کو اپنی زندگی کا معیار بناتا تھا حتی کہ معصیتوں میں بھی ان ہی کی ریس کرتا تھا،

مسلمانوں نے کھانے پینے کی بہت سی نئی چیزیں رائج کیں، جمالیات، عطریات اور رقص وسرود میں مسلمان شاہی خاندان کا ذوق پوری سوسائٹی کی رہبری کرتا تھا، گو رقص وسرود میں اُن کا ذوق کچھ بہت ترقی یافتہ نہ تھا،

کاغذ مسلمانوں ہی نے یہاں رائج کیا، جیسا کہ اس کے عربی نام سے ظاہر ہے، کاغذ کے رائج ہونے کے بعد پتیوں پر کتابوں کے لکھنے کا رواج بند ہو گیا اور کتابیں ظاہری حسن کے ساتھ زیادہ تعداد میں ہاتھوں میں آنے لگیں، مخطوطات کی طلاکاری ایک خاص آرٹ ہے، جو مغلوں کے زمانہ میں شروع ہوا، اکبر اور اس کے بعد کے عہد میں ہندو راجاؤں کے لئے ہندی اور سنسکرت کتابیں نقل کی جانے لگیں، اور اُن کو مصوّر بھی کیا گیا، یہاں کی فارسی کتابوں کی طلاکاری اور خطاطی کی شہرت یورپ تک پھیلی، جس کی وہ مستحق تھی، مسلمانوں ہی کے اثر سے کتابیں عام طور سے نقل کی جاتیں، اور علوم وفنون کو پھیلایا جاتا، ورنہ اس سے پہلے ہندو اپنی کتابوں اور علوم وفنون کو راز ہی میں رکھنا پسند کرتے تھے،

یونانی اطبا اپنے زمانہ کے بہترین طبی مشیر سمجھے جاتے تھے، اس کی وجہ کچھ تو یہ ضرور تھی کہ سلاطین اور امرا اُن کی سرپرستی کرتے تھے، لیکن ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوؤں کے فن طب کی ترقی بالکل مسدود ہو گئی تھی، اور مسلمانوں کا یہ فن روز افزوں ترقی کر رہا

تھا، کیونکہ وہ مغربی ممالک کی ترقیون سے باخبر رہتے تھے،

مسلمان بیرونی ملکون کا سفر کرکے تجارت کیا کرتے تھے، اس سے اُن کے ذہن و دماغ مین وسعت پیدا ہوتی رہتی تھی، ان کے مقابلہ مین ہندو گھر ہی مین بند رہنا پسند کرتے تھے، فارسی زبان مین "مرد جاندیدہ" ایک اصطلاح ہے، جو ایسے شخص کے لئے استعمال کی جاتی تھی، جس نے بہت زیادہ سیر و سیاحت کی ہو، ایسا شخص عقل و دانش اور کلچر کا نمونہ سمجھا جاتا تھا، جو بالکل صحیح ہے،

"ص ع"

خطبات مدراس

مولانا سید سلیمان ندوی نے ۱۹۲۶ء مین مدراس مین سیرت نبوی کے مختلف پہلوؤن پر آٹھ خطبے دیے تھے، جو نہایت مقبول ہوئے، اور مسلمانون نے اُن کو بیحد پسند کیا،

ضخامت :- ۱۹۲ صفحے، چوتھا اڈیشن، قیمت :- عہ

دروس الادب

عربی کی پہلی اور دوسری ریڈرین جن کو مصنف نے عربی کے ابتدائی طالب علمون کے لئے اس طرح لکھا ہے کہ طالب علم کو ادب اور نحو کے ساتھ ساتھ تعلیم اور مشق ہو سکے، اکثر مدارس مین یہ داخل نصاب ہے،

قیمت :- جلد اول ۳ر، جلد دوم ۶ر

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

تاریخ اسلام کامل (حصہ اول) | از جناب مولوی عبدالقیوم صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۴ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت معمولی قیمت للعہ ر، پتہ ۱-
محمد زبیر کتب خانہ امجدیہ ستر کھ ضلع بارہ بنکی،

مصنف روشناس صاحب قلم اور متعدد کتابوں کے مصنف ہیں، انھوں نے اسلام کی ایک کامل تاریخ لکھی ہے جس میں اُن کے بیان کے مطابق ابتداے آفرینش سے قیامت تک کے حالات ہونگے" چنانچہ اس حصہ میں تخلیق عالم سے لیکر بنی امیہ کے خاتمہ تک کی تاریخ ہے، اس کی تالیف میں عربی ماخذوں کے علاوہ اردو میں بھی مصنف کو تاریخ اسلام پر جو مستند مواد مل سکا ہے، اس سے فائدہ اٹھایا ہے، خصوصاً دار المصنفین کی کتب سیرت اور تاریخ اسلام سے بکثرت استفادہ کیا ہے لیکن حوالے اُن کے بجاے بیشتر اصل ماخذوں کے دیئے ہیں تاہم اس حیثیت سے یہ کتاب قابل قدر ہے کہ اس میں اسلام کی ابتدائی سو اصدی کے متعلق سیاسی مذہبی اخلاقی تمدنی اور علمی وغیرہ ہر قسم کے ضروری اور مفید معلومات سلیقہ سے جمع کر دیئے ہیں، جس سے پڑھنے والوں کے سامنے اسلام کی ہمہ گیر برکتوں کا اجمالی نقشہ آجاتا ہے، اگر مصنف اس کتاب کا دامن ازل سے لیکر ابد تک وسیع نہ کر دیتے تو بھی اس کی حیثیت میں کوئی فرق نہ آتا اتنی جامعیت اسلامی تاریخ کے لئے ضروری بھی نہیں تھی، دوسرے اس کا نباہنا بھی آسان نہیں تھا چنانچہ اس کتاب میں تخلیق عالم سے لیکر ظہور نبوی تک کی تاریخ کا کل سرمایہ حضرت آدمؑ حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیمؑ کے چند ناتمام واقعات ہیں اور وہ بھی دو چار صفحات سے زیادہ نہیں جن کو اس دور کی تاریخ سے کوئی

نسبت نہیں قیامت تک کے حالات کے علم کا ذریعہ تو غیب کے سوا دوسرا نہیں ہوسکتا، اور اگر اس سے مراد قیامت کی پیشینگوئیاں ہیں، تو ان کی حیثیت تاریخ کی نہیں ہے، ایک علمی وادبی کتاب کی توثیق کے لئے وزرائے حکومت کی تحریریں بھی بالکل غیر ضروری ہیں، اُن کے شکرانے کے دوسرے طریقے بھی ہوسکتے تھے تاہم ان پہلوؤں سے قطع نظر یہ کتاب تاریخ اسلام سے متعلق متفرق معلومات کے لئے مفید اور عام لوگوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

رہنمائے انسانیت یعنی دینِ فطرت از جناب مولوی صفوۃ الرحمٰن صاحب تقطیع بڑی ضخامت ۲۲۹ صفحات کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت :- عاریۃ :- ڈیڑھی

شہریار جنگ محلہ سلطان شاہی ڈاکخانہ شاہ علی بنڈہ حیدرآباد دکن،

آج کل مسلمانوں میں عقیدہ اور عمل دونوں قسم کی گمراہیاں پھیلی ہوئی ہیں، ایک طبقہ جو نئے اثرات سے متاثر ہے، اسلام سے بالکل بے گانہ اور بے عمل ہے، اس کی نگاہ میں اسلامی تعلیمات کی کوئی قدر و قیمت نہیں، ایک دوسرا طبقہ جو اس کا منکر نہیں، بلکہ اس پر عامل بھی ہے لیکن بیشتر مروجہ عقائد و اعمال کو خود اسلام سے بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان پر اوہام اور بدعات کے اتنے حجابات پڑ گئے ہیں کہ ان میں اصلی اسلامی تعلیمات بالکل گم ہوگئی ہیں، اور ان پر عمل کرنے والے بہت کم ہیں، اس لئے مسلمانوں کی اصلاح کے ساتھ خود بگڑی ہوئی اسلامی تعلیمات میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے، یہ کتاب اسی مقصد سے لکھی گئی ہے اس میں رائج الوقت غیر اسلامی عقائد و تصورات کی پوری تردید کی گئی ہے، اور قرآن مجید و احادیث نبوی کی روشنی میں صحیح اسلامی عقائد و اعمال پیش کئے گئے ہیں کتاب اپنے مقصد پر حاوی ہے، مصنف نے ان تمام غیر اسلامی عقائد و اعمال کی تصحیح کی ہے جن میں نہ صرف عوام بلکہ بہتیرے تعلیم یافتہ تک مبتلا ہیں، اس لئے مصنف کی یہ دینی خدمت لائق تحسین ہے، لیکن جا بجا ان کا طرز اصلاحی کے بجائے مناظرانہ اور مجادلانہ ہوگیا ہے اور طریقۂ تعبیر میں شدت پیدا ہوگئی ہے جو اصلاح و تبلیغ کے لئے مفید نہیں ہے، خصوصاً ان مختلف فیہ

مسائل مین جن مین تاویل کی گنجایش نکل سکتی ہے، تشدد مناسب نہین ہے، اور مصنف کے حسن نیت اور ان کے خیالات کی صحت کے باوجود اس سے بعض طبقون کو شکایت پیدا ہو سکتی ہے، تبلیغ و اصلاح مین شدت کے بجائے نرمی کے ساتھ افہام و تفہیم زیادہ مفید اور کارگر ہوتی ہے، خصوصاً جن مسائل کی مختلف تعبیرین ہو سکتی ہین ان مین زیادہ سختی مناسب نہین ہوتی، اس پہلو سے قطع نظر یہ کتاب اپنے مقصد اور خیالات کے اعتبار سے قابلِ قدر اور تعلیم یافتہ مسلمانون کے مطالعہ کے لائق ہے،

۵۷ء کے ہیرو، از سیدہ انیس فاطمہ صاحبہ بریلوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۱۲ صفحے قیمت مجلد عہ، پتہ مسلم یونیورسٹی پریس علی گڈھ

۵۷ء کے انقلاب مین جن بلند ہمت اور حوصلہ مند شخصیتون نے ہندوستان کو انگریزون کی غلامی سے چھوڑانے کی کوشش کی تھی، اس کتاب مین ان مین سے تین واجد علی شاہ کی بیگم حضرت محل، جنرل بخت خان اور ضیاء الملک محمود خان روہیلہ کے مختصر حالات اور کارنامے لکھے گئے ہین، واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی کے بعد اُن کی بیگم حضرت محل نے اپنے کمسن لڑکے برجیس قدر کو تخت نشین کرکے بڑی بہادری سے انگریزون کا مقابلہ کیا تھا، جنرل بخت خان بریلی مین حافظ الملک رحمت خان کے پوتے محمود خان کو گدی پر بٹھا کر مقابلہ میں آئے، اور ضیاء الملک محمود خان نے بجنور مین بہادر شاہ کی حمایت اور سرپرستی مین مخالفت کا علم بلند کیا تھا لیکن انگریزون کے تدبر اور ہندوستانیون کی نااتفاقی سے تینون کا خاتمہ ناکامی پر ہوا، اس کتاب مین ان تینون حوصلہ مندون کی جنگ آزادی اور اس کی ناکامی کی مختصر سرگذشت بیان کی گئی ہے، اس سلسلہ مین حکومت اودھ کی مختصر تاریخ اور اس زمانہ کے متعدد مجاہدین کے حالات بھی آگئے ہین، مصنفہ کا انداز تحریر ادیبانہ اور موثر ہے، ایک خاتون کے قلم سے ایسی مفید اور سنجیدہ کتاب تحسین و آفرین کی مستحق ہے، کتاب کے شروع مین پروفیسر رشید احمد صاحب صدیقی کے قلم سے ایک مفید اصلاحی مقدمہ ہے،

مرزا شوق لکھنوی از جناب خواجہ احمد صاحب فاروقی تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عہ، پتہ محمد اسلم نمبر ۵، عماد الملک روڈ، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ وارد دیک ڈپو پچھراون ضلع مراد آباد،

اردو کی مثنویوں میں نواب مرزا شوق کی مثنویوں بہارِ عشق و زہرِ عشق خصوصاً زہرِ عشق کو جو حسن قبول حاصل ہوا، وہ کسی دوسری مثنوی کے حصہ میں نہیں آیا، اس کی وجہ یہ ہے کہ حسن بیان و لطف زبان، محاورون اور روزمرہ کے استعمال، فصاحت و سلاست، سادگی و بے ساختگی، جذبات و کیفیات کی مصوری اور جذب و کشش میں کوئی مثنوی زہرِ عشق اور بہارِ عشق کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور ان کے جیسے بہتر نمونے ان دونوں میں ملتے ہیں، ان سے اردو کی دوسری مثنویاں خالی ہیں، اور اس وصف میں گلزارِ نسیم اور سحر البیان بھی اپنی تمام خصوصیات کے باوجود ان کا مقابلہ نہیں کرسکتیں، زہرِ عشق پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن بہارِ عشق کا پورا حق ادا نہیں کیا گیا تھا، مصنف نے اس کتاب میں اس کو ادا کیا ہے، وہ صاحبِ ذوق ادیب و نقاد ہیں، اس لئے بڑی خوبی سے زہرِ عشق اور بہارِ عشق کا تجزیہ کرکے ان کی خصوصیات اور ان کے محاسن و معائب دکھائے ہیں، انداز بیان دلکش اور ادیبانہ ہے،

ہماری کتاب قاعدہ پہلا دوسرا اور تیسرا حصہ | مرتبہ جناب افضل حسین صاحب ایم اے بی ٹی ناظم درسگاہ جماعت اسلامی، تقطیع بڑی کاغذ کتابت بہتر قیمت فی حصہ ۲ مجموعی عہ پتہ مکتبہ جماعت اسلامی اہور

مسلمان بچوں کی ابتدائی تعلیم کی کتابوں کی کمی نہیں ہے لیکن ایسی کتابیں بہت کم ہیں جن میں ان کی تمام تعلیمی ضرورتوں کا لحاظ رکھا گیا ہو، یہ نصاب اسی ضرورت کے پیش نظر مرتب کیا گیا ہے، اس میں اصول تعلیم کے مطابق اردو کی تعلیم کے ساتھ مذہبی و اخلاقی تعلیم و تربیت، مفید مذہبی معلومات، تاریخ اسلام کے متفرق مؤثر واقعات، بچوں کے ذوق کی رعایت حکایات و منظومات وغیرہ وہ تمام باتیں موجود ہیں جو ایک مسلمان بچے کے لئے ضروری ہیں، اسلئے یہ نصاب تعلیمی اور مذہبی دونوں حیثیتوں سے ان کے پڑھانے کے لائق ہے،

"م"

جلد ۶۶ ماہ شوال المکرم ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اگست ۱۹۵۰ء عدد ۲

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۸۲-۸۴

مقالات

الجزیہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین،	۸۵-۱۱۰
ہاروت وماروت	مولانا ابو الکلام ندوی	۱۱۱-
الدرایہ فی تخریج احادیث الہدایہ	مولینا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو،	۱۳۲
شہاب الدین محمود آلوسی	جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی	۱۳۳-۱۴۴

تلخیص وتبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک	آنریبل سر تیج بہادر سپرو، ڈاکٹر پروفیسر رام پرشاد گھوسلا بی اے آکسن،	۱۴۵، ۱۵۱
کثیر التصانیف مصنفین	"ص ع"	۱۵۱-۱۵۳

ادبیات

رنگ تغزل	جناب عارف عباسی بلیاوی	۱۵۴-۱۵۵
حشر جذبات	جناب ثاقب کانپوری	۱۵۵-
مطبوعات جدیدہ	"م"	۱۵۶-۱۶۰

شذرات

اس صوبہ مین اردو زبان کی تعلیم کے مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہین نکلا، تاہم اس سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ کسی حد تک اردو کا بھی حق مان لیا گیا، اور اسکو بھی تعلیم گاہون مین بار مل گیا لیکن اسکی جو شکل اختیار کی گئی ہے وہ عملاً بے نتیجہ ہے، اور شعبۂ تعلیم کے حکام اور عہدہ دارون کی اردو دشمنی کی بنا پر اس اجازت سے بھی پورا فائدہ نہین اٹھایا جا سکتا،

اس کی تفصیل یہ ہے کہ نئے نظام تعلیم مین بنیادی طور پر یہ مان لیا گیا ہے کہ ابتدائی تعلیم مادری زبان مین دیجائے گی، اور مادری زبان وہ مانی جائے گی جو بچون کے والدین بتائین گے، اس اصول کے مطابق پرائمری تعلیم مین اردو کو بھی ذریعۂ تعلیم بنایا گیا ہے، اور اس کی کتابین بھی ملتی ہین لیکن اس کے متعلق احکام اتنے مجمل ہین کہ ان سے فائدہ اٹھا کر پرائمری اسکولون سے عملاً اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے، اور صاف جواب ملتا ہے کہ اردو کی تعلیم کا انتظام نہین ہو سکتا، اگر کسی اسکول مین کسی مجبوری کی بنا پر اس کا انتظام ہو بھی تو اردو کے ساتھ ہندی کی تعلیم بھی ضروری ہے حتی کہ اسلامی مکاتب بھی اس پر مجبور ہین، اس سے بچون پر دوہرا بار پڑتا ہے، اور جب اعتراض یا گرفت کا خطرہ ہوتا ہے تو یہ جواب دیا جاتا ہے کہ اردو مین پڑھنے والے لڑکے ہی نہین ملتے، یہ جواب ان مقامون کے لئے جہان مسلمانون کی آبادی بہت کم اور محض ادنی طبقون پر مشتمل ہو کسی حد تک قابل قبول ہو سکتا ہے لیکن ان بڑی آبادیون کے لئے جہان ہر طبقہ کے مسلمان ہون، یہ عذر لنگ کسی حیثیت سے بھی قابل سماعت نہین، ضلع اعظم گڈھ مین مسلمانون کی بڑی بڑی بستیان ہین لیکن کسی پرائمری اسکول مین اردو مین تعلیم کا انتظام نہین، یہی حال دوسرے اضلاع کا بھی ہوگا،

جونیر ہائی اسکول یعنی چھٹے ساتوین آٹھوین مین ہندی لازمی ہو اور اردو کی حیثیت جنرل سائنس اور انگریزی کے ساتھ اختیاری مضمون کی ہو، چنانچہ جن اسکولون مین جنرل سائنس کی تعلیم کا انتظام ہو وہان اُس کے ساتھ صرف ایک اختیاری مضمون لیا جا سکتا ہے، جو ظاہر ہے کہ اپنی اہمیت کی بنا پر انگریزی زبان ہوگی، اس طرح ان اسکولون مین اردو کی تعلیم کا کوئی موقع ہی نہین رہ جاتا، لیکن اس کے باوجود اگر کوئی طالب علم اردو لینا چاہے تو بھی اس کو مختلف قسم کی دشواریون کا سامنا کرنا پڑتا ہے مثلاً ہندو اسکولون مین جن کی بڑی تعداد ہے، اردو بالکل ختم کر دی گئی ہے گورنمنٹ اسکولون مین ممکن ہو، یہ صورت نہ ہو لیکن موجودہ ذہنیت مین وہان بھی اردو کی تعلیم دشواریون سے خالی نہ ہوگی، اس لئے دیگر مسلمانون کے اسکولون مین جن کی تعداد بہت کم بلکہ برائے نام ہو، اردو باقی رہ گئی ہے، اُن کے لئے یہ مشکل ہے کہ اردو کی کتابین نہین ملین، اردو سے بے اعتنائی کا یہ حال ہو کہ اس سال کے نصاب مین دوسری تمام اختیاری باتون حتی کہ بنگالی تک کی کتابین مقرر کر دی گئی ہین لیکن اردو کتابون کا کہین نام نہین ایسی حالت مین جن اسکولون مین اردو ہے بھی وہ کونسی کتابین پڑھائین، سکنڈری ہائر اسکولون مین بھی کم و بیش اسی قسم کی مشکلات ہین، اس پر مستزاد یہ ہو کہ ان مین ذریعۂ تعلیم ہندی کر دی گئی ہو اور ۱۹۳۲ء سے امتحانات کے جوابات بھی ہندی مین دینا ہونگے ایسی حالت مین اردو کی حیثیت اور اہمیت کیا رہ جاتی ہے، اس سلسلہ مین اردو کی جانب سے یہ بنیادی غفلت بھی قابلِ ذکر ہے، کہ اس سال سے ٹرمننگ اسکولون سے اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چند دنون مین اردو پڑھانے والے اساتذہ نہ ملین گے،

(۰)

اگر اردو کے بارہ مین گورنمنٹ کی پالیسی اعتراض سے بچنے کے لئے اس کی تعلیم کی محض قانونی اجازت نہیں بلکہ وہ درحقیقت اسکی تعلیم بھی چاہتی ہو تو ان ساری مشکلات کا حل یہ ہو کہ ابتدائی تعلیم کے بارہ مین اسکی پوری خصوصیت ہونی چاہئے کہ جن طالب علمون کی مادری زبان اردو ہوگی، ان کو صرف اردو مین تعلیم دیجائیگی، اسکے ساتھ ہندی پڑھائی جائیگی اور اردو کی تعلیم کے انتظام کے لئے طلبہ کی تعداد بھی معین کر دینی چاہئے تاکہ اجمال کی وجہ سے

اردو کو ختم کر دینے کی گنجایش باقی نہ رہے، جونیر ہائی اسکول مین ایک کے بجائے دو اختیاری مضمون کر دیئے جائین تاکہ دوسرا اہم مضامین کے ساتھ اردو لینے کی گنجایش بھی باقی رہے، کم از کم گورنمنٹ اسکولون مین جو اس کے اختیار مین ہین اردو کی تعلیم کے احکام پر سختی کیساتھ عمل کرایا جائے، سکنڈری ہائر اسکولون مین جو اردو مین تعلیم دینا چاہین انکو اس کی اجازت دیجائے اور اُس کے نصاب کی کتابین مہیا کیجائین، امتحان کے سوالات کے جوابات اردو مین بھی دینے کا اختیار دیا جائے، ٹریننگ اسکولون مین اردو کی تعلیم کا انتظام کیا جائے جن مقامون پر مسلمانون کی کافی آبادی ہو وہان اُردو کے مستقل پرائمری اور جونیر ہائی اسکول قائم کئے جائین جن مین صرف اردو ذریعہ تعلیم ہو، یہین کوئی دشواری نہین ہے کیا صوبہ متحدہ مین اردو کی وہ حیثیت بھی نہین ہے جو بمبئی مین ہے، وہان گجراتی اور مرہٹی کے ساتھ اردو کے بھی مستقل اسکول قائم کئے گئے ہین، اردو سے اس بے اعتنائی کے باوجود اس صوبہ سے اس کا اتنا تعلق تو ماننا ہی پڑے گا کہ

گو یہان نہین پہ یان سے نکالی ہوئی تو ہے　　اس کو بھی اس دیار سے نسبت ہے دور کی

ورنہ موجودہ صورت مین تو اردو کی تعلیم اور اس کا باقی رہنا ممکن نہین ہے،

انجمن ترقی اردو نے اردو کے متعلق شعبۂ تعلیم کی جملہ شکایتون اور بے عنوانیون کی تحقیقات اور اس کے تدارک کے لئے لکھنؤ مین جو کمیٹی مقرر کی ہو ضرورت ہے کہ تمام اضلاع بلکہ ضلع کی بڑی بڑی آبادیون مین اسکی سب کمیٹیان قائم کیجائین جو اپنے یہان کی تعلیمی شکایات کو لکھنؤ کی مرکزی کمیٹی تک پہنچائین، اب اردو کا تحفظ اور اس کی بقا صرف اس کے حامیون کی کوشش پر منحصر ہے، اس لئے گورنمنٹ نے جس حد تک بھی اسکی تعلیم کی اجازت دی ہو اس سے فائدہ اٹھانے کی تمام شکلین اختیار کرنی چاہئین، اور باقی حقوق کو حاصل کرنے کے لئے جد وجہد جاری رکھنی چاہئے، اس کے لئے عمل اور ایثار و قربانی کی ضرورت ہے، اگر اردو کے حامی ہمت، جرأت اور استقلال سے کام لین تو گورنمنٹ اردو کے واجبی حقوق ماننے پر مجبور ہوگی،

مقالات

الجزیہ

از

مولانا سعید انصاری سابق رفیق دارالمصنفین

(۲)

جزیہ اور قرآن | جزیہ کے متعلق یہ غلط فہمی رفع کرنے کے بعد کہ وہ ذلت کا نام اور وضع تھا، آیت جزیہ پر بحث اور مفسرین کے اقوال سے صغار کی تشریح کی جاتی ہے، سرجدوناتھ سرکار کی طرح بہت سے معترضین اس آیت کا حوالہ دیتے ہیں، اور اس سے جزیہ کی ذلت کا مفہوم نکالتے ہیں، بلاشبہ بعض مفسرین اور فقہا نے جزیہ کو ایسا ہی سمجھا ہے لیکن اسلامی حکومتوں کے عمل سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے اس کی حیثیت ان فقہا اور مفسرین کے ذاتی اقوال سے زیادہ نہیں ہے،

قرآنی تعلیمات پر عمل کا سب سے کامل نمونہ عہد رسالت اور عصر خلفائے راشدین ہے، اور ان مبارک زمانوں میں صغار (ذلت) کا مطلق پتہ نہیں چلتا، چنانچہ مفسرین کی جماعت میں سے ایک بڑے عالم علامہ محمد بن احمد شربینی خطیب جنہوں نے تفسیر سراج المنیر ۹۶۷ھ میں تالیف کی تھی، اپنی اسی کتاب (ص ۶۰۲ جلد ۱) میں لکھتے ہیں،

تفسیر کا ان یجلس الآخذ ..... اوس کی یہ تفسیر کہ بوں خیر مسلم کو ذلیل

مردود، بان ھذہ الھیئۃ باطلۃ ودعوی سنیتھا او وجوبھا اشد بطلانا، ولم ینقل ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم او احدا من الخلفاء الراشدین فعل شیئا من ذالک وعلی تفسیرھا بما ذکر یمتنع التوکیل اذا قیل بوجوبہ

کیا جائے) مردود ہے کیونکہ یہ (ذلیل کرنے کی) شکل غلط ہے اور اس کے سنت یا واجب ہونے کا دعوی کرنا اور بھی غلط ہے اور یہ منقول نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا خلفاء راشدین میں سے کسی نے اس میں سے کچھ بھی کیا ہو (یعنی ذلت کا کوئی طریقہ بھی اختیار کیا ہو) اور اس تفسیر کے موجب جب یہ ہیئت تذلیل بھی ضروری ہو تو

(ابو حیان غرناطی اور ابن قیم وغیرہ کی تشریحات آگے آتی ہیں)

قرآن کے ایک شارح اور عالم اسلامی کے ایک مشہور مفسر کے اس دعوی کے بعد ہم کو حق پہنچتا ہے کہ پروفیسر جدید تاریخ سرکار کی تاریخ دانی سے ان واقعات کا استفادہ کریں جو غیر مسلموں سے وصول جزیہ کے وقت اسلامی دفاتر میں بطور ہدایت و تذلیل پیش آئے ہوں۔ سرکار نے جو کچھ لکھا ہے وہ بے شبہہ بعض کتابوں میں موجود ہے لیکن اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ کم از کم ہندوستان میں اس پر عمل بھی ہوتا تھا۔

صغار کی بحث | بہرحال قرآن مجید میں جزیہ کے متعلق جو آیت ہے یہ ہے۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَدٍ وَهُمْ

تم لڑو ان لوگوں سے جو نہ خدا پر ایمان لاتے ہیں، نہ آخرت پر، اور نہ حرام سمجھتے ہیں ان چیزوں کو جو خدا اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچا مذہب اختیار کرتے ہیں ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی یہاں تک

صَاغِرُوْنَ، (توبہ) کہ وہ چیزیں دین، ہاتھ سے اور وہ پست ہون

اس آیت مین چند امور غور طلب ہین،

۱۔ یہ تمام غیر مسلمون کے متعلق نہین ہے، بلکہ اس کا تعلق خاص اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے ہے،

۲۔ تمام اہل کتاب کے متعلق بھی نہین ہے، بلکہ ایک خاص گروہ کے متعلق ہے، جو اسلام کا دشمن تھا،

۳۔ سیاق و سباق سے معلوم ہوتا ہے کہ سورۂ برأت مین جن مشرکون یا یہود و نصاریٰ سے لڑنے کا حکم دیا گیا ہے، اُن مین یہ معائب موجود تھے، معاہدہ پورا نہ کرنا، مسلمانون کے خلاف دشمن کو مدد دینا، مسلمانون کے عہد اور قرابت کا لحاظ نہ کرنا، زبان سے محبت ظاہر کرنا، اور دل مین عداوت رکھنا، بدعہدی، لالچ، اسلام سے نومسلمون کو برگشتہ کرنا، مظلم اسلام پر حملہ کرنا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے جلا وطن کرنا، زیادتی مین پہل کرنا، معمولی مذہبی خدمتون پر فخر کرنا، خاص یہود و نصاریٰ مین یہ عیوب تھے، کفر، یہود حضرت عزیرؑ کو اور عیسائی حضرت مسیحؑ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے، شرک حضرت مسیحؑ احبار اور رہبان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے، اسلام کو فنا کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس سے لوگون کو برگشتہ کرتے تھے، غلط طریقون سے مال کھاجاتے تھے، کار خیر مین سونا چاندی خرچ نہین کرتے تھے،

۴۔ ظاہر ہے کہ جو فرقہ مذہبی اور اقتصادی خرابیون کے ساتھ ساتھ سیاسی حیثیت سے مسلمانون کا مقابل ہو، جو اسلام کو فنا کرنے پر تیار رہو، جو نومسلمون کو ورغلاتا ہو، اس کی سزا اس سے زیادہ نرم اور مناسب کیا ہوسکتی ہے کہ اوس کو لڑکر زیر کیا جائے، اور اپنا ماتحت بنایا جائے،

۵۔ ایسے لوگون کا ماتحت ہونا اور محصول (جزیہ) ادا کرنا، نہ صرف ان کے نقطۂ نظر بلکہ تمام دنیا کے نقطۂ خیال سے ذلت اور پستی کا مرادف ہے، خواہ حاکم ان کو ذلیل سمجھے یا نہ سمجھے،

۶۔ چونکہ یہ لوگ علانیہ اسلام کے دشمن تھے، اس لئے تہدیداً خدا نے فرمایا کہ مسلمانون کو ان سے برابر لڑتے رہنا چاہیے تا وقتیکہ یہ پست ہوکر محصول نہ ادا کرین،

۷۔ آیت مین دو لفظ ہین جن سے صغار کا مفہوم پیدا کیا جاتا ہے، عن ید اور صاغرون

۸۔ عن ید کا مطلب بعض لوگون نے یہ لیا ہے کہ اصالۃً جزیہ کی رقم ادا کرنی چاہئے، وکالۃً داخل نہین ہوسکتی لیکن یہ خود مختلف فیہ مسئلہ ہے، فقہ کی متعدد کتابون مین اس کی تصریح آئی ہے کہ اصالۃً حاضر ہونا ضروری نہین، گو بہتر ہے[1] اور آج بھی عدالتون، بنکون، اور ڈاکخانون مین روپیے کے کمار وبار کے وقت اصالۃً موجود رہنا بہتر سمجھا جاتا ہے، خود اورنگ زیب کے زمانہ مین بھی اصالۃً حاضری ضروری نہ تھی، چنانچہ ۱۰۹۰ھ مطابق ۱۶۷۹ء جب سیسودیہ چتوڑ کے رانا نے جب اس شرط پر صلح کی کہ

"قبول جزیہ بجہار دون دو سہ پرگنہ عوض زر جزیہ از ملک خود"[2]

تو اس شرط کو قبول کیا گیا، حالانکہ اگر اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہوتا، تو نہ پرگنے اس کا عوض ہوسکتے تھے، اور نہ اپنی ریاست کے پایہ تخت مین موجود رہنا کافی ہوسکتا تھا،

۹۔ عن ید کے اور بھی معنی ہین، امام ابن العربی (۵۴۳ھ) نے احکام القرآن مین پندرہ قول نقل کئے ہین جن کا ماحصل یہ ہے کہ ید کے حقیقی معنی مراد لئے جائین یا مجازی، اگر حقیقی معنی مراد ہون تو اصالۃً زر جزیہ لے کر حاضر ہونا ضروری ہے، اور اگر مجازی معنی لئے جائین، تو بہت سی صورتین ہوسکتی ہین چنانچہ اس دوسری صورت مین ید کے حسب ذیل معنی بھی ہوسکتے ہین، ہاتھون[3] ہاتھ (یعنی دینے والا اپنے ہاتھ سے حاکم جزیہ کے ہاتھ مین دے، خواہ اصالۃً خواہ وکالۃً) نقد ادا کرے[4] زر جزیہ کو باقی نہین رکھنا چاہئے، ہاتھ[5] پیشی وطلب (ادا کرے) وغیرہ (ص ۳۰۷ ج ۱۱ مصر) غرض ان مین سے جو صورت بھی ہو (یا کسی صغار و ذلت) کا کوئی پہلو پیدا نہین ہوتا،

۱۰۔ صاغرون کا لفظ البتہ صغار کو صاف ثابت کرتا ہے لیکن صغار کیا صورت ہے؟ اس مین فقہاء مختلف الرائے ہین، بعض نے اس کی یہ شکل تجویز کی ہے کہ غیر مسلم جزیہ کی رقم لے کر جب جائے، اور

---

[1] ہدایہ ج ۲ ص ۱۳۸ جلد ۲ ص ۵۲ منتخب اللباب ج ۲ صفحہ ۲۶۲ [illegible]

کھڑے ہوکر اپنی رقم داخل کرے لیکن کھڑا رہنا ذلت کی بات نہیں، آج عدالتوں، بنکوں اور ڈاکخانوں میں عموماً کاروباری آدمی کھڑے ہی رہتے ہیں، کیونکہ بیٹھنے کا انتظام نہ ہوتا ہے اور نہ ہوسکتا ہے، مسلمانوں کی سلطنت میں اگر دفاتر جزیہ میں کھڑے ہوکر رقم داخل کرنا غیر مسلموں کے لئے ضروری تھا، تو معترضین کو اس کے بالمقابل یہ بھی دکھانا چاہئے کہ مسلمانوں کی نشست کا انتظام زکوٰۃ کے دفاتر میں ہوتا تھا، بعض کا قول ہے کہ حاکم جزیہ، ذمی سے کہے "اذدمی" (جزیہ دے) اس قول کو سر جد ونا تھ نے اپنی تاریخ (ص ۲۶۹ ج ۴) میں بڑے آب وتاب سے نقل کیا ہے، اور دکھایا ہے کہ اسلامی فقہ کے رو سے وصول جزیہ کا بھی ذلیل طریقہ تھا، لیکن یہ نہیں دکھایا ہے کہ اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی طرح جزیہ وصول بھی کیا جاتا تھا، فقہ کی کتابوں میں لکھا ہوا اور بات ہے، اور اس پر عمل ہونا اور بات، اس موقع پر علامہ ابوحیان غرناطی (۷۴۵ھ) کی عبارت غور سے پڑھنے کے قابل ہے وہ البحر المحیط (۲۹ جلد ۵) میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے ذلت کی جو صورتیں لکھی ہیں، ان میں سے آیۃ قرآنی میں ایک کا بھی تذکرہ نہیں اسی طرح امام ابن قیم (۷۵۱ھ) کی یہ رائے قابل توجہ ہے،

وھذہ کلھا متاولا دلیل علیہ — یہ تمام باتیں بے دلیل ہیں، اور

ولا ھو مقتضی الآیۃ ولا النقل — نہ ان کو یہ چاہتی، اور نہ رسول اللہ

عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولا — صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ سے یہ باتیں

(اصحاب فتح البیان ص ۹۲ جلد) منقول ہیں،

علامہ سرہندی کا وہ قول بھی دکھنا چاہئے جس میں انھوں نے تصریح کی ہے کہ ہانت کی یہ صورت غلط ہے اور اس کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں کوئی ثبوت نہیں ملتا، نواب صدیق حسن خاں بھی لکھتے ہیں کہ ان چیزوں کی کوئی دلیل نہیں ہے (فتح البیان ص ۹۲ ج ۴)

بعض نے صغار کے زیادہ مناسب معنی بیان کئے ہیں، یعنی جزیہ دینا خود ذلت ہے، اس بنا پر

غیر مسلمون کے لئے ذلت کی شکلین پیدا کرنے کی ضرورت نہین ہے) یہ امر کہ محکومی اور غیر قوم کی اطا
ذلت ہے، ریاستہائے متحدہ امریکہ آسٹریلیا، آئرلینڈ اور اُن کے سیاسی رہنماؤن سے دریافت کرنا چاہیئے،
بہرحال طبری (۳۱۰ھ) محی السنۃ بغوی (۵۱۶ھ) اور امام فخر الدین رازی (۶۰۶ھ) نے اپنی تفسیرون
مین یہ خیال بھی نقل کیا ہے،

امام شافعیؒ کا قول ہے کہ صغار یہ ہے کہ اسلامی قانون (معاملات کے متعلق) اُن پر عائد ہوتا رہے
یعنی وہ مذہبی مسائل کے علاوہ دنیاوی باتون مین قانون اسلامی کی پابندی کرتے ہین، یہ خیال جو دنیائے
اسلام کے ایک بڑے امام کا ہے، تمام خیالون سے زیادہ صحیح ہے، اور محی السنۃ بغوی نے معالم التنزیل
(ص ۶۷ ج ۲) مین امام ابن مکرم (۷۱۱ھ) نے لسان العرب (ص ۲۹ ج ۲) مین اور ترمذی نے (۲۷۹ھ)
نے سراج المنیر مین (اس کو نقل کیا ہے، تیسرے اور چوتھے نظریون کے مطابق صغار کا مفہوم
محض ذہنی اور خیالی رہ جاتا ہے) اور اس کا تعلق مسلمان حکام سے باقی نہین رہتا، اب ان تمام
مباحث کا حاصل یہ ہوا کہ

(۱) قرآن مجید کے رو سے صغار کے مستحق تمام غیر مسلم نہین ہین، بلکہ وہ مخصوص اہل کتاب ہین جو
اسلام اور مسلمانون کے دشمن تھے، اور جن سے لڑائی کا حکم دیا گیا تھا،

(۲) اور غیر مسلم اس لئے جزیہ دیتے تھے کہ ان کے محصول کا یہی نام تھا، اور کوئی نیا نام رکھا نہین
گیا تھا،

(۳) صغار کا لفظ قرآن مجید مین دشمنان اسلام کے لئے تہدیداً استعمال کیا گیا ہے اور اس پر خود عہد
رسالت مین بھی عمل نہین ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زجر و توبیخ ویسی ہی تھی جیسی کہ ماں باپ
اپنی اولاد کو کرتے ہین، اس کا مقصد مسلمانون کے دلون مین غیر مسلمون کی طرف سے منتقمانہ جذبات کی
پرورش نہ تھی،

(۴) جو غیر مسلم دشمنِ اسلام نہیں ہیں، اُن کے لئے صغار بھی نہیں ہے،

(۵) صغار کا مطلب ذلیل برتاؤ نہیں، بلکہ ماتحتی اور سیاسی معاملات میں اسلامی قانون کی پابندی ہے، معزز ماتحت بھی بہرحال ماتحت ہے، یعقوب بن لیث الصفار کا قول ہے کہ کہتر چون تو باید نشست[1]

اب ضرورت ہے کہ سر جدوناتھ سرکار اور ہمارے معترض ارسطو[2] اس پر غور کریں کہ اسلامی عہدِ حکومت میں غیر مسلموں کے ساتھ کیا ذلیل برتاؤ کیا جاتا تھا؛

جزیہ کی شرح | ہندوستان کے جزیہ کی (جس کا تذکرہ منوسمرتی میں ہے) کوئی شرح منوجی نے مقرر نہیں کی، بلکہ ہر شخص پر برابر محصول لگایا (باب ۷، دفعہ ۱۲۸) جو ظاہر ہے کہ بالکل خلاف انصاف تھا، نوشیروان کے فرمان میں رعایا کی مالی حالت کے اختلاف سے جزیہ بھی مختلف مقرر کیا گیا، یعنی ۱۲، ۸، ۴، ۶، درہم (طبری ص ۹۰۲ جلد ۲) لیکن اس میں سلطنت کے مختلف صوبہ جات کی اقتصادی حالت کو سامنے نہیں رکھا گیا تھا، بلکہ امراء متوسطین اور غرباء کی یکساں حالت تمام صوبوں میں فرض کرلی گئی تھی اور یکساں جزیہ لگا دیا گیا تھا، اُس کے ساتھ ہی خواص و عوام کی نہایت ناگوار تفریق پیدا کی گئی تھی لیکن اسلام میں معاشیات کا سوال ابتدا سے سامنے تھا، اس لئے مختلف ممالک کی اقتصادی حالت کے مطابق دہقان کی رعایا پر جزیہ مقرر ہوا، اور اس کی مختلف شرحیں قرار دی گئیں، اہلِ یمن سے بحساب ایک دینار سالانہ، اہلِ شام سے ۴ دینار، مکہ کے ایک نصرانی سے ایک دینار[3]، عراق کی رعایا

---

[1] زین الاخبار ص ۱۳ تالیف ابوسعید عبدالحی گردیزی در حدود ۴۴۰ھ [2] اس مضمون میں ان تمام اعتراضات کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جو جزیہ پر کئے جاتے ہیں، عرصہ ہوا آریہ گزٹ لاہور میں آرسطو کے فرضی نام سے جزیہ کے خلاف ایک مضمون نکلا تھا، اس مضمون میں ارسطو کے اعتراضات کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے [3] احکام القرآن ابن عربی ص ۷۷، ۳، جلد ۱،

[4] کتاب الخراج یحییٰ بن آدم ص ۷۳،

سے (بعض روایات کے مطابق) ۴۸ درہم سالانہ[۵۱] اور عام ممالک و صوبہ جات سے ۱۲، ۲۴، ۴۸، درہم سالانہ فی کس جزیہ وصول کیا جاتا تھا، یہ آخری شرح جیسا کہ بالتصریح معلوم ہے حضرت عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے زمانہ مین برابر قائم رہی[۵۲] اور امام ابوحنیفہؒ، امام محمد بن حسنؒ اور (بروایت مصنف فتح البیان) امام احمد بن حنبلؒ نے اسی کو اختیار کیا[۵۳] جزیہ کا عالمگیری قربان اگرچہ مرآت احمدی (ص ۳۱۳ ج ۱) مین بلفظہ منقول نہین ہے لیکن سرجادوناتھ سرکار نے اس کا خلاصۃً نقل کیا ہے، اس کی دفعہ ۲ مین یہی شرح موجود ہے، جو ان کے نزدیک ایک ناقابل برداشت بوجھ ہے، جو غریبون کے کاندھون پر ڈالا گیا (اس کا جواب آگے آتا ہے)

معاشی حیثیت سے ایک اور اصول زر جزیہ کے متعلق اختیار کیا گیا ہے، قدیم ہندوستان مین محصول نقد کی شکل مین لیتے تھے، مثلاً روپیہ، دہرن، ستمان، نشک، اشرفی وغیرہ (منوسمرتی باب ۸ دفعات ۱۳۵ تا ۱۳۸) ایران مین بنفول طبری درہم تھے، چین کا کچھ پتہ نہین لیکن اسلام مین ہر پیشہ والے کو یہ آزادی دی گئی ہے کہ وہ جزیہ کی رقم کے بجائے اپنے اپنے پیشہ کی چیز کو دیسکتا ہے، البتہ مردار سور اور شراب جزیہ کی رقم مین قبول نہین کئے جائین گے[۵۴] اس طرح جو سہولت غیر مسلم رعایا کو اسلامی سلطنت کے اندر میسر تھی، وہ دوسرے ممالک مین نہ تھی، اور نہ آج تک کسی ملک مین میسر ہے،

جزیہ کون لوگ دیتے تھے | قدیم ہندوستان مین ہر شخص سے جزیہ لیا جاتا تھا، (منوسمرتی دفعہ ۱۳۰ باب ۸) جن مین عورتین اور بچے بھی شامل تھے، ان کو مستثنیٰ نہین کیا گیا ہے، غیر مستطیع بھی کچھ نہ کچھ دیتے تھے (دفعہ ۴۰۵ باب ۸) جو لوگ محصول ادا کرنے کے قابل نہ تھے، وہ ہر مہینہ مین ایک دن بیگار مین پکڑے جاتے تھے (دفعہ ۱۳۸ باب ۷) ایران مین اس سے کم سختی تھی، وہان ۱۲ اور پچاس سال کے درمیان عمر والے مرد جزیہ دیتے تھے، اور عورتین مستثنیٰ نہ تھین، چین مین اس سے بھی زیادہ سہولت تھی، وہان صرف مردون

---

[۵۱] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۲۲ [۵۲] عینی شرح کنز ص ۳۲۰ ج ۵ [۵۳] فتح البیان ص ۸۹ جلد ۴ [۵۴] کتاب الخراج (امام ابو یوسف ص ۶۹)

سے جزیہ لیا جاتا تھا جن کے لئے ۱۸ سے ۸۰ سال تک عمر کی شرط تھی،

اسلام مین ان تمام ممالک سے زیادہ جزیہ مین رعایت کی گئی، صرف عاقل بالغ اور کام کرنے کے قابل مردون پر محصول لگایا گیا، اور کام کی حیثیت سے اُن کے ۳ طبقے قرار دیئے گئے،

۱۔ غنی جو دس ہزار درہم یا اس سے زیادہ کا مالک ہو،

۲۔ متوسط جو ۲۰۰ درہم سے دس ہزار تک کا مالک ہو،

۳۔ فقیر جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا اس کی آمدنی ضروریات زندگی سے زائد نہ ہو،

امام ابو یوسف نے کتاب الخراج (ص ۷۰) مین اس کی پوری تفصیل بیان کی ہے کہ صراف، بزاز، مالک جائداد، تاجر، مطب کرنے والے طبیب مین جو غنی اور متوسط ہون، وہ اپنی آمدنی کے مطابق جزیہ ادا کرین، ہاتھ سے کام کرنے والے کاریگر، مثلاً خیاط، رنگریز، موچی وغیرہ تیسرے درجہ مین ہین، وہ اس کی شرح کے مطابق محصول دین، اس موقع پر سرجدونا تھ نے بعض فقہاء کی رائے کے مطابق صرافون وغیرہ کو پہلے درجہ مین اور خیاطون وغیرہ کو تیسرے درجہ مین رکھکر درمیانی طبقہ کو غائب کر دیا ہے، (تاریخ عالمگیر ص ۲۶۹ ج ۳) حالانکہ امام ابو یوسف کی طرح اور فقہاء نے بھی صرافون وغیرہ کے دو درجے قرار دیئے ہین، غنی اور متوسط،

ایسے اپاہج، اندھے اور لنگڑے لولے جو متمول ہون اور جن کا کاروبار اچھا چلتا ہو، اُن پر جزیہ ہے، اسی طرح دولت مند مقدس راہب اور پجاری بھی اس سے مستثنیٰ نہین ہین، (اورنگزیب کے عہد کے مالدار برہمن بھی اسی حکم مین آتے ہین،)

کون لوگ جزیہ نہین دیتے تھے | قدیم ہندوستان مین صرف تین قسم کے لوگ جزیہ سے مستثنیٰ تھے، مندور، ستر برس کے بوڑھے اور برہمن، (منوسمرتی دفعہ ۳۹۲ باب ۸) ایران مین ۲۰ سال سے کم اور پچاس سال سے زیادہ عمر کے لوگ محصول ادا نہین کرتے تھے، اُن کے علاوہ خاندان شاہی معززین

فوج، مذہبی پیشوا دفاتر کے منشی، اور ملازمین سلطنت جزیہ کے مطالبہ سے آزاد تھے، چین میں عورتیں جزیہ نہیں دیتی تھیں، اور ۱۲ سال سے کم اور ۶۰ سال سے اوپر عمر والے مرد بھی مستثنیٰ قرار دئے گئے تھے،

اسلام نے عورتوں، بچوں، پاگلوں، غلاموں، محتاج اور از کار رفتہ بوڑھوں، ناداروں، راہبوں، اور بجاریوں (ناداربرہمن اورنگ زیب کے زمانہ میں اسی حکم میں شامل تھے)، مفلس، اندھوں، اپاہجوں، اور لنگڑے لولوں کو محصول سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اورنگ زیب نے عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ایک حکم بھیج کر غیر مسلم ملازمین سلطنت کو بھی جزیہ سے بری کیا تھا، مرآت احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) میں یہ الفاظ ہیں،

"بندگان حضرت قدر قدرت عنایت اللہ خان را تبشیت این کار تفویض فرمودند حکم اشرف اعلیٰ شرف صدور یافت کہ از ملازمان سرکار بدولت مدار مواخذہ نکنند، وسوائے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

تعجب ہے کہ ہمارے آرسٹو صاحب کی نظر اس نکتہ اور اس عبارت پر نہیں پڑی، ورنہ وہ یہ تکلیف نہ فرماتے، کہ ۱۶۷۹ء میں اورنگ زیب نے حکم دیا کہ جزیہ سب سے وصول کیا جائے خواہ اسلامی ہندوستان ہو یا راجپوتانہ کوئی سرکاری ملازم ہو یا نہ" (آریہ گزٹ)

جزیہ کے مصارف | مصارف عامہ کا بنیادی اصول بہبود عامہ ہے، اور اسلام میں جزیہ کے مصارف کو مختلف مدوں میں اس طرح تقسیم کیا گیا ہے، کہ عوام کو ہر مد کے مصارف سے بشیر میں فائدہ حاصل ہوتا تھا،

۱۔ مصارف عامہ کی سب سے پہلی اور ضروری مد فوجی انتظام ہے، اور یہ اسی جزیہ کی رقم سے ہوتا تھا امام ابو یوسفؒ نے حضرت عمرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے[1]،

---

[1] کتاب الخراج ص ۱۴،

واضع علیھم فیھا الخراج و فی	اور مین ان (ذمیون) پر زمین مین خراج
رقابھم الجزیۃ یؤدونھا	اور اُن کی گردنون مین جزیہ مقرر کرتا ہون
فتکون فیئًا للمسلمین المقاتلۃ	جس کو وہ ادا کرین گے اور جو مسلمان فوج
والذریۃ ولمن یاتی من	اور اس کی اولاد اور آئندہ آنے والون
بعدھم،	کے لئے (غنیمت) ہوگا،

یہ فوج سرحدون کے علاوہ بڑی بڑی چھاؤنیون (مثلاً شام، جزیرہ، کوفہ، بصرہ، مصر) مین بھی رہتی تھی جس کا اسی تقریر مین ذکر ہے، اور یہ سب فوجی وظیفہ دار تھے، خلیفہ کا فقرہ ہے وادر العطاء علیھم، اور مبسوط ص ۸، ج ۱۰) مین بھی ہے،

فیوخذ منھم العمال لیصرف	یعنی ذمیون سے جو وصول ہوگا، وہ اُن
الی الخزانۃ الذین یقومون	غازیون کو ملے گا، جو دارالاسلام کی حفاظت
بنصرۃ الدار	کرتے ہین،

(۲) ایک مد تحصیل کے اخراجات کی تھی، اس سے عمال کو تنخواہ ملتی تھی، مصنف کنز الدقائق (ص ۱۷۱) اور صاحب درمختار نے اس کی تصریح کی ہے،

(۳) سول یا دیوانی محکمون کی تنخواہون اور اخراجات کی مدمین بہت سی مدین شامل تھین، مثلاً

امور نافعہ (پبلک ورکس) مین پتھر کے پلون (قناطر) اور لکڑی اور مٹی کے پلون (جسور) کی کی تعمیر کا کام اسی مد سے ہوتا تھا، (کنز و درمختار)

محکمۂ عدالت مین قاضیون اور مفتیون کی تنخواہین، (کنز و درمختار) دفاتر قضا کے محررون اور تقسیم کے گواہون کے معاوضہ (کنز و درمختار) اسی سے ادا کئے جاتے تھے،

نباور کی نگرانی کرنے والے اسی رقم سے تنخواہ پاتے تھے، (کنز و درمختار)

تعلیمات مین علماء اور طلبہ کے وظائف اسی سے نکالے جاتے تھے، (در مختار در ردّ مختار ص ۳۰۳ جلد ۳)

۴۔ مسلمانون کے علاوہ خود ذمیون کے ایسے افراد کو جو قابل امداد ہو جاتے تھے، اسی سے مدد دیجاتی تھی، حضرت خالد بن الولید رضؓ نے حیرہ والون کو جو فرمان عطا کیا، اس مین یہ الفاظ درج تھے[1]

ایما شیخ ضعف عن العمل او	اور جو بوڑھا کام کرنے مین کمزور ہو یا اُس پر
اصابته آفة من الآفات او	کوئی آفت آگئی ہو، یا مالدار ہونے کے بعد
کان غنیًا فافتقر وصار اهل	محتاج ہو گیا ہو، اور اُس کے مذہب والے
دینه یتصدقون علیه طرحت	اُس کو خیرات دینے لگے ہون، تو اس کا
جزیته وعیل من بیت المال	جزیہ معاف کیا جائے، اور مسلمانون کے
المسلمین وعیاله ما اقام	بیت المال سے اس کو اور اس کے بچون
بدار الهجرة ودار الاسلام	کو اس وقت تک دیا جائے جب تک وہ دار الہجرۃ اور دار الاسلام

حضرت عمرؓ کے زمانۂ خلافت مین اور مقامات کے معذور بوڑھون کے لئے بھی یہ عام قاعدہ بنا دیا گیا تھا، انھون نے ایک دفعہ ایک بوڑھے نابینا یہودی کو ایک دروازہ پر بھیک مانگتے دیکھا، دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ جزیہ کی رقم اور دوسری ضروریات کے لئے بھیک مانگ رہا ہے، حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اُس کا اور اُس کے جیسے تمام بوڑھون کا جزیہ معاف کر دیا جائے[2]

اسلامی اور غیر اسلامی جزیون کا فرق | (۱) اسلامی اور غیر اسلامی محصولون مین نمایان فرق یہ ہے کہ اسلام نے ربانی ذمہ داری کی بنا پر دنیا کا نظم و نسق اپنے ہاتھ مین لیا تھا، اس لئے وہان محصول کا اصل مقصد روپیہ نہ تھا، شمس الائمہ سرخسی (۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۲، ج ۱۰) مین جابجا اس کا تذکرہ کیا ہے اور ذمیون کی بقایا رقم (موانید) کے معاف کر دینے کی وجہ بھی یہ بتلائی ہے کہ جزیہ کے ذریعہ مال جمع کرنا

[1] کتاب الخراج ص ۷۵، ۷۲ ایضاً ص ۷۲

مقصود نہیں ہی، بخلاف اس کے دوسرے ممالک اور اقوام مین محصول کے متعلق ہر زمانہ مین فقہا کی ذہنیت یہ کی گرج سنائی دی ہی، جس نے غربا کی جبین خالی کر امرا کے عیش و عشرت کا سامان مہیا کیا ہے، اور اس طرح اس بے زبان طبقہ کی سادہ مزاجی اور بھولے پن سے فائدہ اٹھاتی رہی ہے، منوسمرتی باب ۷ دفعہ ۱۳۹ و ۱۴۰ اور باب ۸ دفعہ ۳۰۵ خاص طور سے اس سلسلہ مین قابل ملاحظہ ہین،

(۲) دوسرا عظیم الشان فرق اس سیاسی تخیل کی وجہ سے پیدا ہوا ہے، جو مسلمان اور غیر مسلمون کے "سلطنت" کے متعلق تھا، مسلمانون نے نظریۂ "تولیت" (Trustee Ship) کا صحیح مفہوم سمجھ کر اپنے کو اس کا پورا اہل بنایا تھا، وہ اپنے کو ملک کا مالک نہین، بلکہ متولی سمجھتے تھے[۱] اس لئے انھون نے محصول رعایا کی مالی حالت کے مطابق لگایا جس سے اس کی خوشحالی مین فرق نہ آئے، اور ملک کی سرسبزی قائم رہے، بخلاف اس کے دوسری قومون نے اپنے کو ملک کا متولی نہین بلکہ مالک سمجھا تھا، اس لئے انھون نے رعایا کی مالی حالت کے بجائے دوسرے اصول پر محصول متعین کئے، چنانچہ قدیم ہندوستان کے قانون منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۳۹) مین راجہ کو بالتصریح مالک کہا گیا ہے، اور اسی بنا پر یہان محصول بمعاوضہ خدمات کی ایک شق "مساوات" کا اصول پیش نظر رکھا گیا تھا، جس کا مطلب یہ ہے کہ محصول سرکاری خدمات کا معاوضہ ہے، لیکن چونکہ سرکاری خدمات کا تخمینہ انفرادی طور پر ناممکن ہے، اور ان خدمات سے تمام ملک مستفید ہوتا ہے، اس لئے محصول بلا امتیاز بمقدار مساوی قائم ہونا چاہئے، منوسمرتی (باب ۸ دفعہ ۱۲۸) کا حکم اس بارہ مین نہایت صریح اور صاف ہے لیکن اس اصول مین معاشی حیثیت سے چند نقائص ہین، یہ مانا کہ خدمات منفردہ کا تخمینہ ممکن نہ سہی، تاہم اس سے بھی انکار نہین ہوسکتا، کہ سب

---

[۱] صحیح بخاری (کتاب الاعتصام باب یکرہ من التعمق) مین حضرت ابوبکرؓ کا یہ قول نقل کیا ہے انا ولی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسلو بہ حضرت عمرؓ کا یہ قول لکھا ہے، انا ولی رسول اللہ صلعم وابی بکر اور مبسوط (ص ۱۰، ج ۱۰) مین ہے وقولنا دار الاسلام منسبۃ للولایۃ،

لوگ سرکاری خدمات سے یکساں مستفید نہیں ہو سکتے، اور بالعموم دولتمندوں کو غربا کے مقابلہ میں بہت زیادہ فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ پھر جب غربا کو اپنا اور اپنی اولاد کا پیٹ پالنا بھی دشوار ہو رہا ہو، اور بسر اوقات کے لئے دوسروں کی فیاضی کے دست نگر ہوں تو اُن سے ٹیکس طلب کرنا کہاں تک قرین انصاف اور وصول کرنا کہاں تک ممکن ہے؟ اس لئے مساوی ٹیکس کا یقینی نتیجہ خود ملک کی تباہی و بربادی ہے[1]

ایران میں مساوات کے بجائے سرکاری خدمات کی انفرادی حیثیت پر نظر رکھی گئی جس طرح مزدور کو محنت کی اُجرت دیجاتی ہے ٹیکس بھی سرکار کی خدمت کا معاوضہ ہے، اس لئے جو سرکار سے جتنی خدمت لے اسی کے مطابق معاوضہ بشکل ٹیکس ادا کرے، اسی بنا پر ایران میں ۱۲-۸-۶-۴ درہم کی شرح سے مختلف حیثیتوں کے لوگوں پر جزیہ مقرر ہوا، اور وہ لوگ جو سرکار کے مفہوم کی "وسعت" میں آتے تھے مثلاً اونچے گھرانے، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، منشی، اور سلطنت کے ملازم جزیہ سے مستثنیٰ کر دیے گئے، لیکن عورتیں جو سرکار کے مفہوم میں شامل نہ تھیں، قدیم ہندوستان کی طرح ایران میں بھی جزیہ ادا کرتی تھیں، معاشی حیثیت سے اس اصول میں بھی متعدد خامیاں ہیں، سب سے ناگوار چیز تو وہ تفریق ہے، جو اونچے گھرانوں اور عوام میں رکھی گئی ہے، حالانکہ محصول کو "فرقہ داری" سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہئے (اسلام میں زکوٰۃ خود خلیفہ کو بھی ادا کرنی پڑتی ہے) دوسرے سرکاری خدمات اس قدر بے شمار اور اُن کے نتائج اس قدر گوناگوں ہیں، کہ ان میں کسی شخص کے حصہ کا تخمینہ کرنا بالکل محال ہے، پیڑ، دن، فوجی حکام کی تنخواہوں، شہر کی صفائی، سڑکوں کی درستی، واٹر ورکس، غرض لوکل یا امپیریل محصولوں سے ہر شخص کو جو فائدہ پہونچتا ہے، اس کا جداگانہ تخمینہ کیونکر ممکن ہے؟ اور پھر جو ٹیکس ان مصارف کے طلب کیا جائے وہ سرکاری خدمات منفردہ کے مساوی کیونکر مقرر ہو سکتا ہے؟

---

[1] اصول معاشیات برنی ص ۲۹۸، ۲۹۹،

کیا شرح جزیہ میں ایران کی تقلید کی گئی ہے

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۱۶۷ ج ۲) نیز اپنے مضامین الجزیہ اور غیر قوموں کی مشابہت (مقالات شبلی ج ۱ ص ۲۳۰، ۱۶۷) میں صاف صاف لکھا ہے، کہ حضرت عمرؓ نے نوشیروانی قواعد جاری کئے تھے، اس سلسلہ میں انھوں نے ابوحنیفہ دینوری اور شاہ ولی اللہ صاحب کا نام بھی لیا ہے، اور اصلی ماخذ طبری کو قرار دیا ہے، جس نے یہ الفاظ لکھے ہیں،

وھی الوضائع التی اقتدی بھا	اور یہ وہی شرحیں ہیں، جن کی عمرؓ بن
عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد	الخطاب نے پیروی کی، جب انھوں نے
الفرس وامر باجتباء اھل الذمۃ	فارس کے شہر فتح کئے، اور انھوں نے اہل
علیھا	ذمہ سے انہی (شرحوں) کے مطابق وصول
(طبری ص ۹۹۲ ج ۲)	کرنے کا حکم دیا،

شاہ ولی اللہ صاحب طبری سے متاخر ہیں، اس لئے اُن کی رائے عین طبری کی رائے ہو سکتی ہے تاہم وہ بھی حضرت عمرؓ کا نام لینے میں تامل کرتے ہیں، ابوحنیفہ دینوری (۲۸۱ھ) البتہ طبری سے مقدم ہیں لیکن انھوں نے اس کا ذکر ہی نہیں کیا ہے، اب رہے، امام طبری (۳۱۰ھ) تو ان کے متعلق حسب ذیل امور قابل لحاظ ہیں،

(۱) امام ابو یوسف (۱۸۲ھ) نے جہاں جزیہ کی شرح بیان کی ہے، حضرت عمرؓ کی تقلید کا ذکر نہیں کیا ہے،

(۲) امام موصوف نے کتاب الخراج (ص ۴۹) میں یہ بھی لکھا ہے کہ عراق فتح ہونے کے بعد حضرت عمرؓ نے وہاں کے بعض زمینداروں کو بلایا، اور پوچھا کہ زمین کا محصول تم عجمیوں کو کیا ادا کرتے تھے، ؟ انھوں نے کہا، ۲، فرمایا میں اس پر راضی نہ ہوں گا،

۳- امام یحییٰ بن آدم (سنہ ۲۰۳ھ) بھی تقلید کے ذکر سے ساکت ہیں،

۴- امام طبری (سنہ ۳۱۰ھ) نے آگے چل کر جو عبارت لکھی ہے وہ تمام کتب فقہ اور تاریخ کے خلاف ہی وہ لکھتے ہیں:

ولم یخالف عمرؓ بالعراق خاصۃ	اور عمرؓ نے خاص کر عراق میں کسریٰ کی اُن
وضائع کسریٰ علی جریان الارض	شرحوں کی مخالفت نہیں کی جو اُس نے زمین
وعلی النخل والزیتون والجماجم	کی جریبوں اور کھجور، اور زیتون اور سروں
(ص ۹۶۳)	پر مقرر کی تھیں،

(الف) اس عبارت کی رو سے میزان کے طبقات چار ہونے چاہئیں کیونکہ چار شرحیں طبری نے مقرر کی تھیں (طبری جلد ۲ ص ۹۶۳)

(ب) شرح ۱۲، ۸، ۶، ۴، درہم ہونی چاہیے،

حالانکہ اسلام نے ۳ طبقے قرار دیئے ہیں، اسی طرح ۴۸، ۲۴، ۱۲ درہم شرح رکھی ہے، اور اس کے حوالے اوپر آچکے ہیں،

(ج) طبری نے اقساط کا جو طریقہ لکھا ہے مسلمانوں کا طرزِ عمل اُس کے خلاف شہادت دیتا ہے کیونکہ وہ عموماً سالانہ جزیہ وصول کرتے تھے،

(د) طبری کی روایت کے مطابق کسریٰ نے خاندانِ شاہی، معززین، فوج، مذہبی پیشوا، اور ملازمینِ سلطنت کو جزیہ سے مستثنیٰ کیا تھا، حالانکہ حضرت عمرؓ نے ایسا نہیں کیا،

(ہ) شمس الائمہ سرخسی (سنہ ۴۸۳ھ) نے مبسوط (ص ۱۰، ج ۱۰) میں لکھا ہے کہ جزیہ کی مقدار کا علم حضرت عمرؓ کی روایت سے ہوا ہے، اور وہی اصل ہے، انھوں نے مزدوں پر ٹیکس ۱۲ درہم اور ۲۴ درہم اور ۴۸ درہم مقرر کئے، اور مقدار ماسے مقرر نہیں ہوتی، اس سے ہم نے سمجھا کہ انھوں (حضرت عمرؓ) نے رسول اللہ صلعم سے سماعت پر اعتبار کیا ہوگا، (یعنی انھوں نے خود یا کسی اور صحابی نے رسول اللہ صلعم سے

سُنا ہوگا،) تو ہم نے اُس کو لے لیا،

(۸) عموماً مفسرین اور فقہا تقلید کے ذکر سے خاموش ہیں،

اب ایک طرف یہ تمام قدماء اسلام ہیں جن کی کتابوں میں نوشیروان کی پیروی کا ذکر تک نہیں ہے اور دوسری طرف مولانا شبلی ہیں جن کو طبری کی روایت پر اس قدر اصرار ہے کہ وہ جزیہ کے اختلافِ شرح کو بھی نوشیروانی پیروی کی طرف منسوب کر دینا چاہتے ہیں، حالانکہ محصول اور اس کی مختلف شرحیں مقرر کرنا نوشیروان کا کوئی تمغائے امتیاز نہ تھا، یہ تو معمولی سی بات ہے، اور ہر مدبر اس کو سوچ سکتا ہے،

جزیہ اور سیاسیات اب تک جزیہ کے متعلق جو گفتگو کی گئی، وہ قانونی (فقہی) اور کسی حد تک تاریخی پہلو لئے ہوئی تھی، لیکن اب یہ دکھایا جائے گا، کہ پالیٹکس میں اس کی کیا حیثیت ہے ؟

(۱) اوپر جزیہ کے متعلق فقہاء کے جو سات نظریات بیان کئے گئے ہیں، اُن سب کا قدرِ مشترک نکلتا ہے کہ وہ ایک محصول ہے اور محصول کی تعریف بسٹیبل (Bastable) نے اپنی کتاب "سرکاری مالیات" (Public Finance) میں اس طرح کی ہے[1]،

"محصول (Tax) کسی شخص یا جماعت کی دولت کا وہ حصہ ہے جو بلا لحاظ اس کی رضامندی یا ناراضگی کے سرکاری اغراض کے لئے حاصل کیا جاتا ہے"

پروفیسر محمد الیاس برنی ایم اے، ال ال بی نے اصولِ معاشیات (ص ۲۹۶) میں اس تعریف کو یوں واضح کیا ہے،

"ٹکس سے مراد دولت کا وہ حصہ ہے جو لوگ غیر اختیاری طور پر سرکار کو مصارفِ حکومت کے واسطے ادا کریں"

پھر اسی کتاب اور اپنی دوسری تصنیف علم المعیشت میں اس تعریف کے بعض الفاظ کو غور طلب قرار

---

[1] معاشیات ص ۳۵۲ مصنفہ مولوی حبیب الرحمٰن ایم اے ایل ایل بی جامعہ عثمانیہ،

دیا ہے، جن مین ایک لفظ دولت بھی ہے وہ اس لفظ کے متعلق لکھتے ہین،

اصطلاح "دولت" اپنے وسیع معنون مین استعمال کی گئی ہے، گویا مال وجائداد کے علاوہ "خدمات" بھی اس مین شامل ہین، چنانچہ بیگار بھی ایک ناپسندیدہ قسم کا ٹکس ہے،

لفظ "دولت" کی اس وسعت کو سمجھنے کے بعد جزیہ کے متعلق ایک بڑا مغالطہ دور ہو جاتا ہے، علامہ شبلی نعمانی مرحوم نے الفاروق (ص ۶۱ جلد ۲) مین جہان جزیہ کی بحث لکھی ہے، اس کو حفاظت کا معاوضہ قرار دے کر تاریخ سے چند تائیدی دلائل بھی تحریر فرمائے ہین، اسی سلسلہ مین لکھتے ہین:-

"اس سے بھی زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ جن لوگون سے کبھی کسی قسم کی فوجی خدمت لی گئی، اُن کو باوجود اُن کے مذہب پر قائم رہنے کے جزیہ معاف کر دیا"

پھر شواہد مین ۱۷ھ اور ۲۲ھ مین عراق، آذربائیجان، آرمینیہ، اور جرجان کے غیر مسلمون سے جو معاہدے ہوئے تھے، اُن کو نقل کیا ہے،

لیکن "معاشیات" مین دولت کا لفظ جن عام معنی مین استعمال ہوتا ہے، اگر ان کو سامنے رکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے، کہ ذمیون کی جنگی خدمت بھی "دولت" کے وسیع مفہوم کے اندر داخل تھی، اس لئے اپنی جان کو لڑائی کے لئے پیش کرنا، گویا زر جزیہ کو نقدی صورت مین ادا کرنا تھا، اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ جزیہ معاف نہین کیا گیا، بلکہ دوسری شکل مین وصول یا قبول کیا گیا،

حقیقت یہ ہے کہ جو سلطنت کسی ملک پر سیاسی حیثیت سے تسلط حاصل کرتی ہے وہ قانوناً اس کی مجاز ہے کہ بروقت ضرورت رعایا سے جانی اور مالی خدمات کا مطالبہ کرے، مسلمانون کی ابتدائی سلطنت (خلافت راشدہ) جو آج کل کے اعلیٰ ترین جمہوری طرز حکومت "منتقیہ" سے بدرجہا بہتر تھی، اس نے بھی اپنی رعایا سے دونون قسم کی خدمتین لین،

۱- ابتداءً جیسا کہ ہر قوم مین ہوتا ہے، صرف مسلمان فوج مین شامل تھے، ۱۷ھ مین جب غیر مسلمون

کا اس کو اعتماد حاصل ہو گیا، تو اُن کو بھی فوج مین شرکت کی اجازت مل گئی، جو حفاظت سلطنت کے لئے جانی امداد تھی ؟

۲ - مالی امداد مصارفِ حکومت کے لئے تھی جس کو مسلمان بشکل زکوٰۃ اور غیر مسلم بصورتِ جزیہ دیتے تھے، اس کو فوجی خدمت سے کچھ واسطہ نہ تھا جس طرح صاحبِ نصاب مسلمان فوجی خدمت کی وجہ سے زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہین ہوتے تھے، مستطیع غیر مسلمون کا جزیہ بھی معاف نہین کیا جاتا تھا؟ خلافتِ راشدہ کے بعد شخصی سلطنتون مین بھی یہ نکتہ ہمیشہ ملحوظ خاطر رہا ہے، چنانچہ سلطنتِ مغلیہ مین برابر راجپوتون کی فوج رہتی تھی، اور خود شہنشاہ (اورنگ زیب) جس پر ارسطو نے اعتراضات کئے ہین، راجپوتون کو فوج مین بھرتی کرتا تھا، اُن سے فوجی خدمت لینے کے باوجود جزیہ بھی لیتا تھا، چنانچہ ہمارا معترض حیرت سے لکھتا ہے،

"مگر چلو ہم ایک لمحہ کے لئے یہ فرض کر لیتے ہین کہ یہ فوجی خدمت کا معاوضہ تھا، جو غیر مسلمون سے لیا جاتا تھا، تو اُن ہندوؤن سے جزیہ کا وصول کرنا کس طرح بھی جائز نہ تھا، جو فوج مین ملازم تھے، پھر اورنگ زیب کا وسط ہند اور راجپوتانہ کے راجپوت راجاؤن سے جزیہ وصول کر لینا کیسے درست ہو سکتا ہے"..... پھر فوج کے ساتھ میر جزیہ مقرر کئے گئے تھے، جو جزیہ وصول کرتے تھے، ۱۲ جولائی ۱۷۰۳ء (۱۱۱۴ھ) کا اعلان اُن فوجی امیرون کا ذکر کرتا ہے، اس کا صاف مطلب ہو کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ فوج مین اُن کی موجودگی کی اور کیا تاویل ہو سکتی ہے، پھر دوسری طرف کوئی ایسا حکم نہین جس مین فوجی ملازم ہندوؤن کو جزیہ کی ادائگی سے مستثنیٰ کیا گیا ہو، یہ صرف معمولی فوجی ملازمون سے ہی وصول نہین ہوتا تھا، بلکہ ہندو افسر تک اس حکم سے باہر نہ تھے" (آویہ گزٹ)

لیکن معترض کی حیرت کا اصلی سبب علامہ شبلی مرحوم کا یہ خیال ہے کہ جزیہ صرف جنگی خدمت کا معاوضہ تھا، اور گو تاریخی واقعات سے انھون نے اس کی تائید بھی کر دی ہے لیکن جزیہ کی سیاسی

حیثیت پر اس کی نظر نہیں گئی تھی، اسی لئے جزیہ کو فوجی خدمت کا معاوضہ قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں،

"اس کا فائدہ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہیں جس طرح نوشیروان عادل نے عموماً اہل فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے، اور جن کی حفاظت مسلمانوں کو کرنی پڑتی تھی، ان کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمت کے لئے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کیلئے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا" (ص ۲۳۱، ۲۳۲)

لیکن اوپر سیاسی حیثیت سے مسلمانوں کے جس اصول اور عمل پر روشنی ڈالی گئی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فوجی خدمت اور مالی امداد بالکل دو جداگانہ چیزیں تھیں، مولانا نے یہ تو لکھا ہے کہ مسلمانوں کو جزیہ سے مستثنیٰ ہونا چاہئے تھا، لیکن یہ نہیں بتلایا ہے کہ اُن سے زکوٰۃ کا مطالبہ ہوتا تھا، مسلمانوں کا محصول جزیہ نہ تھا، بلکہ زکوٰۃ تھی، اور جب وہ فوجی خدمت کے صلہ میں زکوٰۃ سے مستثنیٰ نہیں کئے گئے، تو غیر مسلم فوج میں رہ کر جزیہ سے کیونکر مستثنیٰ ہو سکتے تھے؟ پھر یہ بھی صحیح نہیں ہے کہ غیر مسلموں سے فوجی خدمت لینے کا اسلام کو کوئی حق نہ تھا، ہر سلطنت کو اپنی رعایا سے فوجی خدمت لینے کا حق حاصل ہے، اور اسلامی سلطنت کو تو بدرجۂ اولیٰ یہ حق حاصل تھا، کیونکہ اولاً تو وہ مسلم اور غیر مسلم کی نادرست تفریق پسند نہیں کرتی تھی، دوسرے زمین کا مالک اُس نے عام طور پر غیر مسلموں ہی کو بنا رکھا تھا،

رہا یہ امر کہ ابتدا میں غیر مسلم فوج میں کیوں شریک نہیں کئے گئے؟ اس کا سبب یہ تھا کہ غیر مسلم مفتوح تھے، جو مسلمانوں کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور اپنی قومی سلطنت کو دوبارہ واپس لانے کا خیال ان کے دماغوں میں موجزن رہتا تھا، اس بنا پر آغازِ فتح میں سیاسی حیثیت سے ان کو فوج میں بھرتی کرنا قرینِ مصلحت نہ تھا، البتہ جب عہدِ نبوت سے لے کر خلافتِ فاروقی تک اُن کو مسلمانوں سے

سابقہ پڑا، جس مین اسلام کی عادلانہ حکومت کا سکہ اُن کے دلون پر بیٹھ گیا، اور انھون نے خود دشمنانِ اسلام سے نبرد آزما ہونے کی خواہش ظاہر کی، تو اُنھین اُن کو اجازت دے دی گئی، اور معاشی نقطۂ نظر سے اُن کی اس فوجی خدمت کو جزیہ کا قائم مقام سمجھ لیا گیا، جو اُن کے ساتھ فرید رعایت تھی،

۲- تعین محصول کے سلسلہ مین "مساواتِ محصول" (Parity of Tax) کا اصول اختیار نہین کیا گیا، جس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ چونکہ سب کو سرکار سے یکسان آرام اور فائدہ پہنچتا ہے اس لئے سب لوگ برابر محصول دین، بلکہ جزیہ اشخاص کی مختلف قابلیتون اور حیثیتون کے مطابق مختلف نرخ سے مقرر ہوا، کیونکہ اصولِ "مساوات" سے غربا پر جس قدر ظلم ہو سکتا ہے، محتاج بیان نہین، فرید برآن سیاسی لحاظ سے بھی یہ اصول ناقابلِ عمل ہے[1]"

۳- ورودِ محصول (Incidence of Taxation) کی بنا پر محصول کی دو قسمین قرار دی گئی ہین (۱) یہ کہ ٹیکس کا ادا کنندہ (Payer of Tax) اور مورد (Subject of Tax) ایک ہی شخص ہو، یعنی جو دوسرون پر منتقل نہ ہو سکے، (۲) یہ کہ جس کے ادا کنندے اور مورد مختلف اور متعدد لوگ ہون یعنی جو ادا کنندہ سے گذر کر بہت سے لوگون پر منقسم ہو جائے، اصطلاحاً اول کو ٹیکس بلا واسطہ (Direct Tax) اور دوم کو ٹیکس بالواسطہ (Indirect Tax) کہتے ہین[2]،

جزیہ بلا واسطہ ٹیکس (Direct Tax) ہے جس سے عام "سیاسی بیداری" پیدا ہوتی ہے، کیونکہ ٹیکس بلا واسطہ، لگان، سودِ اجرت، یا ملک و جائداد مین سے براہِ راست و صریحاً اپنا حصہ نکالتا ہے، یہ ٹیکس "سیاسی تربیت" کا نہایت کارگر آلہ ہے، انسانی خاصہ ہے کہ جس کام مین کسی کا روپیہ لگتا ہے، اُس سے

---

[1] معاشیاتِ ہند ص ۲۶۲، مصنفہ پرمتھ ناتھ بنرجی، مترجمہ مولوی الیاس برنی [2] اصولِ معاشیات ص ۳۰۸ مصنفہ مولوی الیاس برنی،

خواہ مخواہ تعلق اور دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ بعض انجمنوں میں تو علاوہ مالی امداد کے دلچسپی بڑھانے کی غرض سے بھی ممبروں سے چندہ طلب کیا جاتا ہے، جب لوگ جان بوجھ کر مصارفِ حکومت ادا کرتے ہیں، تو ان کو سیاسی معاملات سے خود بخود تعلق زیادہ محسوس ہونے لگتا ہے، اور اس کا نتیجہ عام سیاسی بیداری ہوتا ہے

(اصولِ معاشیات ص ۳۰۹)

اور واقعات شاہد ہیں کہ جزیہ کے سبب سے ہمیشہ غیر مسلموں میں سیاسی بیداری قائم رہی ہے، گو کبھی کبھی اس کا اظہار مظاہرہ کی نامناسب شکل میں بھی ہوا ہے، جیسا کہ سرکار نے "تاریخ اورنگ زیب" (ص ۱، ۲ ج ۳) میں اور علامہ شبلی مرحوم نے (مقالات شبلی، الجزیہ ص ۴۰) میں دکھایا ہے،

جزیہ اور معاشیات | جزیہ کو معاشیات (Economics) سے بڑا گہرا تعلق ہے، انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ص ۲۶۴ ج ۲۲ طبع ۱۱) میں آدم اسمتھ (Adam Smith) کی کتاب "دولتِ اقوام" کے حوالہ سے ٹیکس کے حسب ذیل قوانین بیان کئے گئے ہیں،

(۱) قانونِ عدالت: ہر مملکت کی رعایا کو چاہئے کہ جہانتک ممکن ہو سکے اپنی اپنی قابلیت کے تناسب سے یعنی اس آمدنی کے تناسب سے جو انھیں مملکت کے زیرِ حفاظت اپنے اپنے طور پر حاصل ہوتی ہے، حکومت کے مصارف میں شریک ہوں،

(۲) قانونِ تیقن: جس ٹیکس کا ادا کرنا ہر فرد پر لازمی ہو وہ بالکل باقاعدہ اور یقینی ہونا چاہئے، وقتِ ادائگی، طریقۂ ادائگی، مقدارِ ٹیکس، یہ تمام امور نہ صرف ادا کرنے والے پر بلکہ دوسرے تمام اشخاص پر بھی واضح ہونے چاہئیں،

(۳) قانونِ سہولت: ٹیکس ایسے وقت پر اور اس طریقہ سے عائد کیا جائے جو ادا کرنے والے کے حق میں زیادہ سے زیادہ سہولت کا باعث ہو،

(۴) قانونِ کفایت: ہر ٹیکس اس طور پر تجویز کیا جائے کہ اس کی بدولت جس قدر رقم سرکاری

خزانہ مین داخل ہوتی ہے اس کے علاوہ حتی الوسع کم سے کم مزید رقم رعایا کی جیبون سے خارج ہو.....

ان چار کے علاوہ بعض مصنفین نے دو قانون اور بھی لکھے ہین،

(۵) قانون پیداآوری: ٹکس بدرجۂ اولی پیداآور (Productive) ہونا چاہئے یعنی حاصل ٹکس کی مقدار بہت معقول ہونی چاہئے، کیونکہ ٹکس قائم کرنے کا منشا، مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنا ہے. اور جب ایسی آمدنی کی مقدار قلیل ہو، تو ظاہر ہے کہ ٹکس ناقص ہوگا، اور اس سے حصول آمدنی کی غرض بدرجۂ ادنی پوری ہوگی،

(۶) قانون تغیر پذیری: ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار حاصل مین اضافہ وتخفیف ہوسکے،

یہ چھ قانون ہوے جن کا ٹکس قائم کرنے مین لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ ان کی خلاف ورزی سے عام مرفہ الحالی اور معاشی ترقیون کو ضرر پہنچنے کا اندیشہ رہتا ہے،

جزیہ قائم کرتے وقت ان قوانین کو پیش نظر رکھا گیا تھا، یا نہین؟ اس کا جواب ذیل مین دیا جاتا ہے،

پہلا قانون معدلت یا عدل ہے اس کی تعریف مین یہ الفاظ "اپنی اپنی قابلیت کے تناسب" ہمیشہ سے معاشی علماء کے اختلاف کا آماجگاہ رہے ہین، یہ امر کہ محصول انصاف سے قائم کرنا چاہئے بالکل مسلم ہے لیکن یہ مکمل کیونکر ہوسکتا ہے؟ اور محصول کے تقرر مین کیا تدابیر اختیار کرنی چاہئین؟ اس کے متعلق علما نے چند راستے اختیار کئے ہین، جو محصول بمعیار خدمات، محصول مساوی، محصول متناسب (Proportionate) محصول تناسبی (Proportionate) وغیرہ کی شکل مین موجود ہین،

لیکن ان سب سے بہتر طریقہ محصول متزاید یا تدریجی (Progressive Tax) کا ہے جو آج کل ہر جگہ اختیار کیا جارہا ہے، اس طریقہ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ ٹکس لگانے مین تدریج سے کام لیا جائے یعنی

(الف) ٹکس مالی حالت کے فرق کے بموجب بشرح مختلف قائم ہو، امراء پر بشرح اعلیٰ، متوسطین پر بشرح متوسط، اور غرباء پر بشرح ادنی، تاکہ تمام ٹکس ادا کرنے والے مساوی بار یا ایثار محسوس کریں۔ تشخیص جزیہ میں امراء، متوسطین، اور غرباء کے ۳ طبقے مالی حالت کے اختلاف کی بنا پر قرار دیئے گئے ہیں، اور ان پر بشرح مختلف ۱۲، ۲۴، ۴۸ درہم سالانہ یا ہر ۸۰ درہم ۲ درہم ماہوار محصول لگایا گیا ہے۔

(ب) شرح محصول مختلف ہونے کے باوجود ایک حد تک محدود ہو یعنی اس پر متواتر اضافہ نہ ہو سکے، تاکہ اضافہ آمدنی کسی دولت میں لوگوں کے لئے ضرر رسان نہ ہو، اور اجتماع دولت، بلند حوصلگی، اور کفایت شعاری کے راستہ میں نامناسب مزاحمتیں پیدا نہ ہو جائیں، یہ بالکل بدیہی ہے کہ "طلائی انڈے دینے والی مرغی کو ذبح کر ڈالنا کوئی عقلمندی کا کام نہیں"، تاہم موجودہ معاشیین محصول متزائد کے مسئلہ پر غور کرتے وقت اس چیز کو بہت کم پیش نظر رکھتے ہیں، اور اس لئے آمدنی کی مقدار بڑھنے کی حالت میں وہ برابر شرح محصول میں اضافہ کرتے جاتے ہیں، بخلاف اس کے اسلام نے دولت و افلاس کے لحاظ سے انسانی طبیعتوں کے لئے جزیہ کی جو شرح مقرر کی، وہ اگرچہ بذات خود مختلف ہے، تاہم ہر شرح محدود ہے یعنی باوجود دیگر ہر طبقہ کی آمدنی کے متعدد مدارج قرار دے کر ان کے لئے علحدہ علحدہ شرحیں قائم نہیں کی ہیں، بلکہ تمام غرباء کے لئے ایک شرح ہے، تمام متوسطین کے لئے ایک اور تمام امراء کے لئے ایک، اس سے ہر طبقہ پر جزیہ کا یکساں الگ الگ بار پڑتا ہے اور کسی خاص طبقہ کو زیادہ استطاعت کی وجہ سے جزیہ بار گراں نہیں معلوم ہوتا،

(ج) آمدنی جب تک ایک خاص مقدار تک نہ پہنچے محصول کا مطالبہ نہ کیا جائے، چنانچہ جزیہ اس شخص سے نہیں لیا جاتا، جو ۲۰۰ درہم سے کم کا مالک ہو، یا جس کی آمدنی خاندان کی پرورش کے لئے ناکافی ہو، کیونکہ ایسا شخص محصول ادا کرنے کی قابلیت ہی نہیں رکھتا، چنانچہ زکوٰۃ کے لئے بھی کم سے کم دو سو درہم کا مالک ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے،

دوسرا قانون **تیقن** ہے جس کو تعین بھی کہتے ہین، اُس کے رو سے جزیہ کی شرح ہمیشہ معین رہی ہے، جزیہ ادا کرنے والے کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق واجب الادا رقم کی صحیح مقدار کا علم ہوتا ہے، جس کی بنا پر جبر یا دھوکے سے کوئی شخص سرکاری مطالبہ سے زیادہ وصول نہین کر سکتا، جزیہ کی شرح مین تغیر و تبدل نہین ہے، اس کی ادائگی کا وقت مقرر ہے یعنی سال تمام پر وصول کیا جائے[1]، ادائگی کا طریقہ بھی بتلایا گیا ہے یعنی جانور، سامان، اور پیشہ کی ہر چیز رقم جزیہ کے عوض پیش کی جا سکتی ہے، صرف مردار، سور، اور شراب پیش نہ کرنا چاہئے، اور اگر یہ چیزین آئین تو اہل پیشہ کے ذریعہ سے ان کو فروخت کرا کر اُن کی قیمت دفتر مین جمع کرنی چاہئے، کیونکہ اس مین اہل جزیہ کو سہولت ہوتی ہے[2]،

تیسرا قانون **سہولت** ہے، جزیہ کے ذرائع اور اس کی وصولی کے اوقات جن کا دوسرے قانون مین ذکر ہوا، درحقیقت ایسے تھے کہ جزیہ دینے والون کا کوئی نقصان اور ہرج نہ ہوتا تھا، نہ ان کو کوئی دقت اور دشواری محسوس ہوتی تھی،

چوتھا قانون **کفایت** ہے، اس کے ۳ مفہوم ہین، پہلے مفہوم کے رو سے جو کچھ فراہمی جزیہ مین صرف ہوتا ہے، اس کی مقدار بمقابلہ حاصل جزیہ ادنیٰ سے ادنیٰ ہوتی ہے یعنی اس کے فراہم کرنے کے مصارف اصلی مطالبات سے کم اور بہت کم ہوتے ہین، دوسرے مفہوم کے رو سے جزیہ ادا کرنے والون کو مقدار جزیہ سے زیادہ دینا نہین پڑتا، کیونکہ وہ کاروبار مین بہت کم خارج ہوتا ہے، تیسرے مفہوم کے رو سے جزیہ افزونی دولت، اور اضافۂ مرفہ الحالی مین مانع اور مزاحم نہین ہے،

پانچوان قانون **پیداآوری** جزیہ کی رقم کی آمدنی نہایت معقول ہوتی ہے، اور اس سے مصارف حکومت کے واسطے آمدنی پیدا کرنے کا منشا حاصل ہوتا ہے، اور سلطنتون کو چھوڑ کر خود اورنگزیب کے زمانہ مین صرف گجرات سے جزیہ کی رقم جس قدر وصول ہوتی تھی، وہ سرجدونا تھ سرکار اور ہمارے معترض ارسطو دولون

---

[1] مبسوط ص ۲۰۲ ج ۱۰ [2] کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۶۹،

کو کھٹکتی ہے،

چھٹا قانون تغیر پذیری ہے، ٹکس متعدد ذرائع پر مختلف شرحون سے اس طرح قائم کرنا چاہئے کہ حسب حالات اس کی مقدار ماحصل مین اضافہ و تخفیف ہوسکے، یہ نہین کہ مصارف حکومت کے واسطے خواہ رقم زیادہ درکار ہو، یا کم ہر حالت مین ماحصل ٹکس کی مقدار وہی ایک رہے، جو کبھی خرچ کے واسطے بھی ناکافی ہو، اور کبھی زائد بچ رہے، یہ الفاظ مختصر، ماحصل ٹکس جس حد تک کمی و بیشی تصارف کی متابعت کرے بہتر ہے جزیہ مین اس شکل کے علاوہ جب کسی شہر یا علاقے سے کوئی خاص رقم طے ہو جائے ہمیشہ اس قانون کا لحاظ رکھا جاتا ہے، وہ مختلف پیشون پر مختلف شرحون سے حسب حیثیت وصول کیا جاتا ہے، اس مین کمی و بیشی کا بھی اختیار رہے، چنانچہ تخفیف جزیہ کے بعض واقعات امام ابو یوسف اور یحیی بن آدم کی تمام تصنیفات (کتاب الخراج) سے اوپر نقل کئے گئے ہین، اور معافی جزیہ کی نسبت موانیہ کا مسئلہ بھی درج کیا گیا ہے،

بیانات بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے، کہ چونکہ جزیہ ان تمام قوانین و اصول کا پابند ہے، اس لئے معاشی حیثیت سے وہ نہایت عمدہ محصول ہے، کیونکہ وہ تمام محصول جو ان اصول کے پابند نہ ہون یا کم پابند ہون معاشیین کے نزدیک ناقص ہوتے ہین، (باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریون کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آڈر آجا نہین سکتے، اس لئے کتابین بھی نہین آجاسکتین، مغربی پاکستان مین شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور، دار المصنفین کے نمایندے ہین، اُن کے یہان ہماری تمام مطبوعات ملجائین گی جن لوگون کو ضرورت ہو اُن سے منگالین، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دین،

"منیجر"

ہاروت اور ماروت

بسلسلۂ سابق

از

مولانا ابو الکلام صاحب ندوی

ہاروت اور ماروت فرشتے نہیں لیکن چونکہ اُن کی بابت خود قرآن میں ملکین کا لفظ وارد ہے اسلئے فرشتوں ہی کے ساتھ اُن کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔

لفظِ بابل کے ماتحت ہم نے وہ آیت نقل کی ہے جس میں ہاروت اور ماروت کا ذکر ہے، قرآن کے بیان کے مطابق یہ دونوں بابل کے دو معلم تھے جن سے بنو اسرائیل نے میاں بیوی کے درمیان تفرقہ ڈالنے کا ہنر سیکھا تھا جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے اُن بنی اسرائیل کے کافر ہونے کی دلیل قرار دیا ہے،

بعض وقت خود بولنے والے کسی لفظ کو اپنے عقیدہ اور تصور کے برخلاف مخاطب اور فریق بحث کے عقیدہ اور تصور کے مطابق بولتے ہیں، لغات میں اس کی نظیریں بہت ہیں، یہود حضرت عیسیٰؑ کو نہ مسیح مانتے تھے اور نہ رسول اللہ، مگر نزول قرآن کے ایام میں انھوں نے یہ کہکر ناز کیا تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسی بن مریم رسول اللہ بعینہٖ اسی طرح چونکہ یہود ہاروت اور ماروت کو الملکین کہتے تھے، اس لئے قرآن میں بھی بطرزِ طنز ان کو الملکین کہا گیا ہے،

ہاروت | بابل کے ذکر میں بتایا گیا ہے کہ یہاں دو قوموں کے آثار پائے جاتے ہیں، ایک قوم کو بنو سام اور دوسری کو سمیری قوم کہا جاتا ہے، اس دوسری قوم کا اہم ترین مرکزی شہر اُور تھا، بعد میں یہ لفظ شہر کا

مرادف بن گیا، اصل مین اس لفظ کا ترجمہ ہے روشنی، یہ قوم روشن اجرام کی پجاری تھی اور یہ شہر ایک روشن جرم فلک کا معبد ہونے کی وجہ سے اُور کہلایا، اس لفظ کو سمیریون کے یہان اس قدر اہمیت حاصل تھی، کہ اُن کے اکثر بادشاہون کے نامون مین یہ لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً

۱۔ اُورکاجانا ۲۵۰۰ء (۲) اُورلما ۲۴۰۰ء (۳) اُورنینا ۲۴۲۹ء (۴) اُورمن حرسو ۲۷۰۰ء (۵) اور زاگدو ۲۵۰۰ء، یہ پانچون سمیری بادشاہ تھے،

سمیریون کے بے نام ونشان ہوجانے کے بعد بھی بعض غیر سمیریون کے نامون مین اُور کا لفظ پایا جاتا ہے، مثلاً کنعان کے ایک اشوری فرمانروا کا نام جو ۳۰۰۰ء ق م مین گذرا ہے اور وہ ملک تھا، مصری بولی مین تا کے معنی ہین زمین چنانچہ بونت کو تانتر کہتے تھے، اور جو بادشاہ بالائی اور زیرین دونون مصرون کا بادشاہ ہوتا تھا، اس کو نب تاوی کہتے، اور تا کے معنی ہوئے ارض نور قدیم بابلی مین تا اور تو کے معنی تھے نسل اور قوم اس لئے ارتا کے معنی اُور کی قوم ہین، اسی لفظ کا دوسرا تلفظ آرتو ہے، جس پہاڑ پر حضرت نوحؑ کی کشتی ٹکی تھی، اس کا تورانی نام ارارات ہے یہ اورارتو کی بدلی ہوئی شکل ہے، یہ آرمینیہ کا کلدانی اور اشوری نام ہے، اورارتو کے معنی ہین، آرتو کی بستی، بابل کے سمیری اصل مین جہان سے بھی اس دیار مین آئے ہون، مگر آرمینیہ ہوتے ہوئے آئے تھے، اسی اورتا اور آرتو کا نام عربی لب ولہجہ مین ہاروت بنا، قرآن مین جس ہاروت کا ذکر ہے، اگر وہ نسلی حیثیت سے نہین تو مذہبی اور ثقافتی حیثیت سے اسی قوم کا ایک فرد تھا،

ماروت اشوری بادشاہ اشور بنی ہال (۶۶۸ء ق م) کے زمانہ مین عیلام مین ایک بادشاہ حکومت کرتا تھا، جس کا نام تھا اُورتا کی (حاکم ماروت) یہ پہلے اشور بنی ہال کا حلیف تھا، بعد مین کسی وجہ سے اس کا مخالف ہوگیا، اور اُس نے بابل پر جو ان دونون شاہان اشور کے ممالک مقبوضہ مین داخل تھا، حملہ کردیا، لیکن اشوریون نے شکست کھائی، اُورتا کی کے مرنے کے بعد عیلام کا بادشاہ تی اُمان ہوا جس کی

بابت اشوری تحریر بتاتی ہے، کہ وہ اپنے پیش رو دو بادشاہوں کی طرح "مثیل شیطان" تھا، تی اماں کے بعد عیلام کا حاکم اُورتاکی کا فرزند تم مارتو ہوا، یہ اشوریوں کا وفادار حلیف تھا، اس بادشاہ کا نام دو لفظوں کا مجموعہ ہے، پہلا لفظ تم ہے، جسے عربی لب ولہجہ میں تام پڑھ سکتے ہیں بابل کے عبرانی نسخوں میں یہ لفظ عموماً مرد کامل کے معنی میں آیا ہے، اور ہمیشہ نیکی اور راستی میں باکمال کو تم کہتے تھے، "نوح اپنے قرن میں صدیق (راستباز) اور تم (کامل) تھا، (تکوین ۶: ۹) اس کے نام کا دوسرا جز مارتو، عربی لب ولہجہ میں ماروت بنا، لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ قرآن میں اسی ماروت کا ذکر ہے، جو اپنے خیال میں تم یعنی مرد کامل تھا، اور جس کا باپ اُورتاکی (حاکم ہاروت) اشوریوں کی نظر میں مثیل شیطان تھا بلکہ مارتو کے لغوی معنی ہیں "انسان کی نسل" سفر تکوین میں وارد ہے، کہ "تقلیم جن کو گبور تم بھی کہا جاتا ہے نفی لوہیم اور بنات آدم کی اولاد تھے، (تکوین ۶: ۴) اس سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں دو قومیں ایک ساتھ رہتی تھیں ایک کو خداؤں کی اولاد ہونے کا ادعا تھا، اور دوسری قوم کو یہ ادعا نہیں تھا، بلکہ وہ خود کو معمولی آدم زاد کہتی تھی، اسی قوم کا نام مارتو تھا، اطراف بابل میں جو نبو سام تھے، وہ خود کو امورو کہتے تھے، یہ نام عربی لفظ امرؤ (انسان) کی قدیم شکل ہے، اسی قوم کا ذکر توراۃ میں اموری قوم کے نام سے ایا ہے بابل کے سامری بولنے والے اس قوم کو مارتو کہتے تھے، یہی نام عبرانی لب ولہجہ میں مرّدت اور عربی لب ولہجہ میں ماروت ہوگیا فلسطین میں بھی چونکہ ایک وقت مارتو، مارت، مروت اور امورو کہلانے والی قوم بستی تھی، اس لئے ایک زمانہ میں اطراف بیت المقدس کو بھی مروت کہتے تھے، چنانچہ صحیفہ میکاہ میں ہے،

"مروت کی رہنے والی اپنے اموال کے لئے کڑھتی ہے، کیونکہ خداوند کی طرف سے بلا نازل ہوئی جو یروشلم کے پھاٹک تک پہنچی، (میکہ ۱: ۱۲)

قرآن کریم میں جس شخص کا ماروت کے نام سے ذکر ہے، وہ اسی مارتو کہلانے والی قوم کا ایک فرد تھا

افسانۂ ہاروت و ماروت | قرآن مین ہاروت اور ماروت کو طوعاً فرشتے کہا گیا ہے لیکن مفسرین نے بہت سی ایسی روایتین نقل کی ہین جن کا ماحصل یہ ہو کہ یہ دونون واقعی فرشتے تھے، فرشتون نے بنی آدم کی خطاکاریان دیکھ کر خدا سے کہا کہ ہم ہوتے تو ہم سے یہ گناہ نہ ہوتے، خدا نے کہا اچھا اپنے درمیان سے دو کو امتحان کے لئے چنو، چنانچہ ہاروت اور ماروت چنے گئے، اور انسان بنکر زمین مین اترے اور ایک خوبصورت عورت پر ریجھ گئے، اس عورت کو انھون نے اسم اعظم سکھانے کے بعد اس کے کہنے سے شراب پی، بت پوجا، اور بہت سے گناہ کئے، پھر اس نے ان کو تمتع کی اجازت دی، وہ عورت اس کے بعد اسم اعظم کے زور سے آسمان پر اڑ گئی، خدا نے اسے ستارہ زہرہ کی صورت مین مسخ کر دیا، اور ان فرشتون سے کہا گیا، کہ عذاب دنیا اور عذاب آخرت مین سے ایک کو پسند کرین دونون نے عذاب دنیا کو پسند کیا، چنانچہ وہ دونون ایک تاریک کنوین مین قیامت تک کے لئے لٹکا دیئے گئے، یہ ہے متعدد روایتون کا مجموعی مفہوم، یہ تمام روایتین سیوطی نے درمنثور مین نقل کی ہین، ہم نے سب کا ملخص لے لیا ہے، دو باتون مین ان روایتون مین اختلاف ہے، ایک روایت مین اس واقعہ کا زمانہ حضرت ادریس علیہ السلام کا عہد بتایا گیا ہے، حضرت ادریسؑ طوفان نوح کے بعد پیغمبر مبعوث ہوئے اور وہ کشتی نوح کے سوارون مین سے ایک تھے، لیکن متقدمین نے ان کو حضرت نوحؑ کے مورث خنوخ سے تطبیق دی ہے، دوسری روایت مین ہے کہ ان فرشتون کے پاس خدا کا یہ پیغام کہ دنیا یا آخرت کے عذابون مین سے ایک کو پسند کر لو، حضرت سلیمان بن داؤد علیہما السلام نے بھجوایا تھا،

دوسرا اختلاف یہ ہے کہ جو عورت زہرہ بن گئی تھی، وہ ایک روایت مین ایرانی عورت تھی، اور ایک مین اسرائیلی،

قرآن کریم مین ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہین ہے، اور نہ اسے بطور تفسیر ذکر کرنے کی آیت کا کوئی فقرہ اجازت دیتا ہے، البتہ چونکہ ہاروت اور ماروت کو طوعاً خدا نے دو فرشتے کہا ہے، اس لئے

طرز کو نہ سمجھنے والے روایت کے اس حصہ کو قرآن کی تفسیر مین اس طرح شامل کر دیتے ہین کہ تھے تو وہ دونون فرشتے ہی، مگر بعد مین کافر ہوگئے، کیونکہ انھون نے نافرمانی کیا تھا، کہ اگر بنی آدم کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم سے یہ خطائین نہ ہوتین، اس لئے امتحان کی غرض سے خدا نے اُن کو انسان بناکر زمین مین اُتارا، اور وہ امتحان مین ناکام رہے، باقی قصہ کا قرآن کے کسی فقرہ سے ذرہ برابر واسطہ نہین ہے،

روایات کی نوعیت اس افسانہ کی بدولت قرآن پاک پر اعتراضات کئے جاتے ہین، اس لئے اس کی پوری حقیقت کھولنا ہمارا فرض ہے، لیکن قصہ کے سرچشمون پر بحث سے پہلے روایات کی نوعیت دکھا دینا ضرور ہے،

صحاح ستہ مین ہاروت اور ماروت کا یہ قصہ نہین ہے، مستدرک مین حاکم نے اس قصہ کی حضرت علیؓ سے تخریج کی ہے، اور حضرت ابن عباسؓ سے صرف اتنے مضمون کی تخریج کی ہے، کہ "زہرہ پہلے ایک عورت تھی، جس کو اس کی قوم والے بدبخت کہتے تھے" گو حاکم نے ان دونون روایتون کی اسناد کو شیخین کی شرط پر صحیح بتایا ہے، لیکن شیخین کا اس کو روایت نہ کرنا ہی یہ بتاتا ہے کہ اس کی سند مین ضرور کچھ نہ کچھ نقص ہے،

جہان تک حضرت علیؓ کی روایت کا تعلق ہے، حاکم کی تصحیح قابل رد ہے، عمیر بن سعید نخعی کی بابت جن سے حاکم نے حضرت علیؓ کی روایت نقل کی ہے، ابن حزم نے کتاب الملل والنحل مین لکھا ہے، کہ

"وہ مجہول ہے حضرت علیؓ سے اُس نے دو روایتین نقل کی ہین، ان دو کے علاوہ اس کی کسی اور روایت کا ہم کو علم نہین ہے، ایک تو شارب خمر کی حد سے متعلق ہے، یعنی وہ جس کی امام بخاری نے تخریج کی ہے، اور ایک ہاروت وماروت کے قصہ مین، اور یہ دونون جھوٹی روایتین ہین"

تہذیب التہذیب مین حافظ ابن حجر نے اس قول کو نقل کرکے لکھا ہے کہ افرط ابو محمد بن حزم یعنی محمد بن حزم نے افراط ومبالغہ سے کام لیا ہے، مطلب یہ ہے کہ انکی دونون روایتون کو جھوٹی قرار دینا حد سے تجاوز ہے، امام بخاری والی روایت قطعاً جھوٹی نہین ہوسکتی، رہی قصہ ہاروت وماروت والی روایت تو اس کی بابت اتنا کہہ دینا کافی ہے، انه عند هو حديث واحد عن علي في حد شارب الخمر"

یعنی ائمۂ حدیث کی رائے میں حضرت علیؓ سے انھوں نے صرف ایک ہی حدیث شارب خمر کے بارے میں روایت کی ہے،

حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کہ "زہرہ پہلے ایک عورت تھی" کی روایت وہم سے خالی نہیں ہے ممکن ہے کہ انھوں نے عربوں کے قدیم تصور کی روایت کی ہو، لیکن اسے ان کا قول سمجھ لیا گیا ہو، حضرت ابن عباسؓ کے راوی ابوعثمان النہدی آنحضرت صلعم کے زمانہ حیات میں مسلمان ہوئے، مگر زیارت کا شرف حاصل نہ کر سکے، اُن کے راوی سلیمان بن بلال التیمی کی ثقاہت پر شبہہ کرنا روا نہیں ہے، مگر ان کی اس قسم کی بعض کمزوریوں کی بنا پر اُن کی روایات کے بارہ میں عثمان بن سبیہ کا خیال تھا کہ اُن سے روایت کرنے میں حرج نہیں ہے، مگر اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا،

سیوطی نے دُرِّ منثور میں کئی کتابوں کے حوالہ سے کئی بزرگوں سے اس افسانہ کو نقل کیا ہے اور اکثر روایتیں صحابی اور تابعی کے قول پر منتہی ہوتی ہیں، ایام جاہلیت میں یہ قصہ مشہور تھا صحابہ کرام کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مشہور ماجرا سنانے کے بعد اس کے متعلق قرآن مجید کی آیتیں پڑھ دیتے تھے، اس طرح قرآن کی آیت مشہور عوام قصہ کی اصلاح کر دیتی تھی، اور سننے والے قصہ کو قرآن کی تفسیر نہیں، بلکہ قرآن کی آیت کو قصہ کے باطل حصہ کی تردید اور سچے حصہ کی تصدیق سمجھتے تھے، اس لئے اگر صحیح سند سے کسی صحابی تک کسی ایسے قصہ کی سند پہنچتی ہے جس کا قرآن سے رابطہ ہونے کے باوجود اس میں قرآن سے زائد ناقابل یقین باتیں ہیں، تو ہم کو چاہئے کہ روایت کو مسترد کرنے کے بجائے مضمون قرآن کو قصہ کی اصلاح قرار دیں، لیکن دشواری یہ ہے کہ بعض روایات میں ایسے الفاظ بھی ہیں جو اس کریہہ کہانی کے بعض اجزاء کو آنحضرت صلعم کی زبان مبارک پر بھی رکھ دیتے ہیں، ایسی روایتیں یقینی طور پر قابل تسلیم نہیں ہیں، حضرت علیؓ کی طرف منسوب روایت کو جسے حاکم نے صحیح بتایا ہے، ابن حزم نے جھوٹی کہا ہے، اور محدثین اُسے حضرت علیؓ کا قول ہی نہیں مانتے، وہ اگر درست بھی مان لیجائے

توچونکہ حضرت علی پر منتہی ہوتی ہے، اور عام عربی تصور کے مطابق ہے، اس لئے کوئی ہرج نہیں، مگر در منثور مین خطیب وغیرہ کے حوالہ سے سیوطی نے نافع کا قول نقل کیا ہے، کہ ایک سفر مین انکا اور حضرت عبداللہ بن عمر کا ساتھ ہوا اتنے مین سرخ تارا طلوع ہوا اسے دیکھ کر ابن عباس نے کہا لا مرحبا بہا ولا اھلا مین نے کہا سبحان اللہ تجھ سا سحر سا مع بیلیغ ہے، حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا ما قلت لک الا ما سمعت من رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ فرمانے کے بعد ہاروت اور ماروت کا قصہ نقل کیا ہے لیکن ابن جریر نے عبداللہ بن عمر عن کعب الاحبار سے اس قصہ کی تخریج کی ہے، اور یہی واقعہ ہے اس قصہ کی روایت مفسرین کسی شخص تک بھی منتہی کرین لیکن ان تمام روایتون کا سرچشمہ انھین کعب احبار یا کسی دوسرے عالم اہل کتاب کا قول ہوگا، قرآن مجید کی آیت کو ہاروت و ماروت اور زہرہ کی کہانی سے کوئی واسطہ نہین ہے۔ البتہ قرآن مین ان کی بابت طنزاً دو فرشتون کا لفظ ہے۔ مگر وہ واقعی فرشتے نہ تھے، بلکہ ایک ایسے ہنر کے معلم تھے جس کے سیکھنے سکھانے کو خدا نے کفر مین سلیمان علیہ السلام کے کفر کی دلیل قرار دیا ہے، اور بتایا ہے کہ خود ان کو بھی اپنی بابت فتنہ اور اپنے ہنر کی بابت کفر ہونے کا یقین تھا، چنانچہ فرمایا کہ یہ کفر سلیمان،

یعلمون الناس السحر وما انزل	آدمیون کو بھی سحر کی تعلیم کیا کرتے تھے
علی الملکین ببابل ھاروت وماروت	اور اس کی بھی جو کہ ان دونون فرشتون
وما یعلمان من احد حتی یقولا	نازل کیا گیا تھا، بابل مین جن کا نام ہاروت
انما نحن فتنۃ فلا تکفر فیتعلمون	و ماروت تھا، اور وہ دونون کسی کو
منھما ما یفرقون بہ بین المرء و	نہ بتلاتے، جب تک یہ نہ کہدیتے کہ ہمارا
زوجہ وما ھم بضارین من	وجود بھی ایک امتحان ہے، سو تو کہین

أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَيَتَعَلَّمُونَ مَا
يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَلَقَدْ عَلِمُوا
لَمَنِ اشْتَرَاهُ مَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ
مِنْ خَلَاقٍ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا
بِهِ أَنْفُسَهُمْ لَوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ

کافر مت بنائیو، سو لوگ ان دونون
سے اس قسم کا سحر سیکھ لیتے تھے جس کے
ذریعہ سے کسی مرد اور اس کی بیوی مین
تفرقہ پیدا کر دیتے تھے، اور یہ لوگ اس
کے ذریعہ سے کسی کو بھی ضرر نہین پہنچا سکتے
مگر خدا ہی کے حکم سے اور ایسی چیز ین سیکھ
لیتے ہین، جو ان کو ضرر رسان ہین اور
ان کو نافع نہین ہین، اور ضرور یہ بھی
اچھا جانتے ہین، کہ جو شخص اس کو اختیار
کرے، ایسے شخص کا آخرت مین کوئی
حصہ نہین، اور بے شک بُری ہے وہ چیز
جس مین وہ لوگ اپنی جان دے

قصہ کے سرچشمے | حضرت عبداللہ بن عمر کی طرف منسوب ایک روایت سے ظاہر ہے کہ ہاروت اور ماروت کا افسانہ مسلمانون مین کعب احبار کے ذریعہ آیا، حضرت کعب احبار یمنی اور مذہبًا یہودی تھے، ان کی طرف منسوب اقوال سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے، کہ وہ نصرانی لٹریچر سے بھی واقف اور کسی حد تک متاثر تھے، موجودہ دور کے نصرانی علماء اب تو ہاروت اور ماروت کے قرآن مین مذکور ہونے پر معترض ہین لیکن اس کے ناپسندیدہ عناصر کو تفسیر قرآن سمجھ کر اعتراض کیا جاتا ہے، خود نصرانی اور یہودی لٹریچر سے آئے،

مسلمانون کا فرشتون کی بابت یہ عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کے احکام کی نافرمانی نہین کر سکتے، اور

وہ وہی کرتے ہین جو اُن کو خداوند عالم کی طرف سے فرمایا جاتا ہے" اس عقیدہ کو اہلِ علم کے مباحث نے ایجاد نہین کیا، بلکہ قرآن مجید مین فرشتون کی بابت صریحًا یہ ارشاد ہے، قدیم نصرانیون کے خیال مین ایسے فرشتے بھی ہین جنھون نے گناہ کیا، اپنی اصلی حالت پر نہین رہے، بلکہ اپنے مقام کو چھوڑ دیا (یہوداہ کا خط درس ۶ پطرس کا دوسرا خط ۲، ۴) چونکہ قرآن مین ایسی چیز کے دو معلّمون کو خدا نے طنزًا دو فرشتے کہا ہے جس کا سیکھنا سکھانا کفر تھا، اسی لئے حضرت کعب احبارؓ نے ہاروت اور ماروت کو انہی فرشتے مین سے خیال کر لیا جن کا ذکر یہوداہ اور پطرس کے مقدس خطون مین ہے،

نصرانیون کا یہ تصور اُن کی اپنی ایجاد نہ تھا، بلکہ یہودیون کے تصور مین فرشتے دو قسم کے تھے نیک اور بد، علاوہ بریں ہر ملک کا حامی اور نگران ایک ایک فرشتہ کو مانا جاتا تھا، سفر دانیال مین ہے کہ حضرت جبریل نے ان کو خبر دی کہ

"فارس کی مملکت کا سردار ۲۱ دن تک میرے مقابلہ مین ڈٹا رہا، اور دیکھ میکائیل جو سردارون مین بڑا ہے میری مدد کو پہنچا، (۱۰: ۱۳) اور اب دیکھ مین فارس کے سردار سے لڑنے کو پھر جاؤنگا تب یونان کا سردار آئے گا، (دانیال ۱۰: ۲۰)

ان آیتون سے سمجھا گیا کہ جس طرح فارس اور ایران کے جدا جدا غیبی سردار تھے، جو میکائیل اور جبریل کے حریف تھے، اسی طرح ہر ملک کا حامی اور مددگار خدا کی طرف سے ایک فرشتہ مقرر ہے، مصر کے حامی اور مددگار فرشتہ کا نام عزیٰ تھا، چنانچہ ایک مدراس کی روایت ہے کہ جب بنو اسرائیل مصر سے نکلنے لگے،

"مصر کے موکل عزی نے تخت ازل کے سامنے عرض کیا جس قوم کو تو مصر سے نکال رہا ہے اس پر میرا حق ہے،

مگر اسرائیل کے موکل میکائیل نے سامنے آکر عزی کے تمام دلائل خاک مین ملا دئے[1]، عزی نے

---

[1] My The onlegund of Ancient Israel بحوالہ Midrach Ab - Kie gonted by yatkal 241

یہ بھی کہا تھا کہ تو نے حضرت ابراہیم سے فرمایا تھا، کہ تیری نسل ۴۰۰ برس مصر کی غلامی کرے گی، ان لوگوں نے میری قوم کی صرف ۲۰۰ برس غلامی کی ہے، اس لئے ابھی ۲۱۲ برس اور میرے لوگوں کو ان سے خدمت لینے کا حق ہے، لیکن میکائیل نے بحث کرکے قائل کر دیا، کہ یہ مدت صرف مصر میں قیام کے لئے مقرر تھی[۵۱]

عزی یعنی حمایت مصر پر مامور فرشتہ کے متعلق یہود کے تصورات ایسے تھے جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی بولی میں یہ اہل مصر کے دیوتا آمن رع کا نام تھا، اکثر وہ فراعنہ جن کا تاریخ بنی اسرائیل سے رابطہ ہے خود کو آمن رع کی نسل باور کرتے تھے،

عزی کے ایک ساتھی فرشتے کا نام عزازیل تھا، جو کہ مسلمانوں کے لٹریچر میں ابلیس کا ایک نام ہے،

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندان لعنت گرفتار کرد

سفر احبار کے مطابق نعوذ باللہ خود خدا نے اس کے لئے بکرے چھوڑنے کا حکم دیا تھا، یہودی افسانوں کے مطابق یہ دونوں فرشتے تھے جو آسمان سے زمین پر اتارے گئے تھے، ان دونوں نے بنی آدم کو ایسے جادو کی تعلیم دی کہ اس کے زور سے انھوں نے ایام انوش میں سورج اور چاند تک کو گرہن کر لیا تھا[۵۲] ہاروت و ماروت کو عربی روایتیں سحر اور جادو کا معلم بتاتی ہیں، قرآن مجید کی آیت:

يُعَلِّمُونَ النَّاسَ السِّحْرَ وَمَا أُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوتَ وَمَارُوتَ"

سے ظاہر ہے کہ سحر اور چیز ہے، اور جس چیز کی ہاروت اور ماروت تعلیم دیتے تھے، وہ اور چیز ہے، کیونکہ عربی قاعدہ سے معطوف کو معطوف علیہ کا غیر سمجھا جاتا ہے جن عربی روایات میں ہاروت اور ماروت کو معلمین سحر بتایا گیا ہے، وہ عزی اور عزازیل کو قرآن کے ہاروت اور ماروت سے تطبیق دینے کا نتیجہ ہیں،

یہودی تصور میں گھڑے ہوئے فرشتے صرف دو ہی عزی اور اسرائیل نہیں تھے، بلکہ اور بھی کئی ایک تھے، سفر تکوین میں نظم کی بابت جو حضرت نوح کے زمانہ میں دنیا کے اندر آباد تھے، یہ بتایا گیا ہے کہ وہ بنات آدم اور بنو الوہیم کی اولاد تھے، بنو الوہیم (ہر بچن ہ خدا) کے جنے ہوئے) جیسے کسی قدیم نام کا ترجمہ ہے،

---

[۵۱] حوالہ مذکورہ جلد ۲ ص ۲۸۶، [۵۲] دی لیجنڈ آف جیوز مولفہ لوئی گنزبرگ جلد ۱ ص ۱۲۵ بحوالہ متعدد کتب یہود اہ

خود کو "ابنار اللہ" کہنے والی کسی قوم کا اس نام سے ذکر ہے، یہودی روایات نے ان بنی الوہیم کو ان فرشتون مین شمار کیا ہی جنھون نے گناہ کرکے اپنے مقام کو چھوڑ دیا، اور اپنی قدیم حالت مین نہ رہے، ان مین چند کے نام یہ ہین،

"برق ایل، کوکب ایل، ارض ایل، شمس ایل، شہر ایل"

اُن کے رئیس اعظم کا نام شم حزی تھا، یہودی کہانی بولتی ہے، کہ یارد کے زمانہ مین برق ایل وغیرہ فرشتون نے جو زمین پر اُتارے گئے تھے، بنات آدم کو خوبصورت دیکھ کر کہا،

"ہم اپنے لئے صرف بنات آدم سے بیبیان چنین گے، اور ان سے اولاد پیدا کرین گے"

چنانچہ باہمی مشورہ سے انھون نے اپنے اس فیصلہ پر عمل کیا[1]،

اس افسانہ کے اندر ہاروت اور ماروت کے ایک عورت سے ملوث ہونے کا ذکر ہے، اس کی حقیقت یہی ہے، کہ قرآنی طرز کو نہ سمجھ کر بنات آدم سے ناجائز تعلقات پیدا کرنیوالے خطاکار عزی اور عزازیل کو ہاروت و ماروت سے تطبیق دی گئی،

ہاروت اور ماروت کا زمانہ ہماری روایتون نے حضرت ادریس کا زمانہ بتایا ہے، عام طور پر حضرت ادریس کو جناب حنوک سے تطبیق دی جاتی ہے، جو حضرت نوح کے مورثون مین سے تھے، یہودی افسانہ بتاتا ہے کہ جب ان گرے ہوئے فرشتون کی شرارتین حد سے گذر گئین، تو خدا نے حضرت حنوک کو ان کی تنبیہ پر مامور کیا، انھون نے عزازیل وغیرہ تمام گرے ہوئے فرشتون کو خدا کا حکم سنا دیا، جسے سُن کر وہ سہم گئے، اور حضرت حنوک کی معرفت خدا کے پاس درخواست رحم بھیجی لیکن خدا نے جواب مین کہلوایا، کہ بنی آدم کی شفاعت تم کو کرنی چاہیے تھی، نہ کہ خود تم نے ایک ابن آدم کو اپنا شفیع بنایا، اور اُن کی درخواست مسترد کر دی اور اُن کے جرائم گنوا کر یہ فیصلہ کہلا بھیجا، کہ تمھارے لئے اب آرام اور چین نہین ہے[2]"

انہی کوکب ایل، اور شہر ایل جیسے فرشتون کی بابت پطرس کا بیان ہے کہ خدا نے ان کو "نہین چھوڑا"

---

[1] دی لیجنڈز آف جیوز ج اول ص ۱۲۶ [2] ایضاً،

بلکہ تاریکی کی زنجیروں مین جکڑ کر جہنم کے حوالہ کیا، تاکہ عدالت کے دن تک اُن کی نگہبانی ہو، (۲ پطرس ۲: ۴) جناب یہودا فرماتے ہین، کہ اُن کو خدا نے ابدی زنجیرون سے جکڑ کر تاریکی مین روز عظیم کی عدالت تک رکھا ہے" (یہوداہ ۱: ۶) یہ ہین بھٹکنے والے ستارے جن کے لئے تاریکی کی سیاہی ہمیشہ کے لئے دھری ہے، (یہوداہ ۱: ۱۳) عربی روایت نے ہاروت اور ماروت کو چاہ بابل کی تاریکی مین قید کیا ہے، یہ کہانی کا ایک دوسرا رنگ تھا، یا قرآن کے ہاروت و ماروت کو جن سے سنہ ۱۰۰ اور سنہ ۲۰۰ ق م کے درمیان بنی اسرائیل بابلی فنون و علوم سیکھتے تھے، ان فرشتون سے تطبیق دینے کی بدولت اُن کے مجرمون کو جہنم کے بجائے ارض بابل مین اُتار دیا گیا،

وہ عورت جس سے ہاروت اور ماروت ملوث ہوئے تھے، اس کو ستارہ زہرہ کی صورت مین مسخ ہو جانے کے واقعہ کا اصل ماجرا یہ ہے کہ اہل بابل کے ایک دیوتا کا نام دوموزی تھا جس کا ذکر بابل مین تموز کے نام سے آیا ہے جس کے لئے عورتین نوحہ کیا کرتی تھین، اس کو دیوی ایشتر کا جسے یہین عشتر اور فلسطین مین عشتارت کہا جاتا تھا، اہل بابل کی دیو مالا مین شوہر بنایا گیا تھا، بابلی اور آشوری روایت یہ تھی، کہ دوموزی مر گیا، اور اسکی روح دیبی اللات کے ملک ارالو (بے نور) مین قید کر دی گئی، اس کے بعد عشتار نے ازدوبار (گلگامش) کو اپنا شوہر بنانا چاہا۔ مگر اس نے اُس کی درخواست قبول نہ کی، اس لئے وہ اللات کے بے نور ملک مین جا کر دوموزی کو دوبارہ زندہ کرا لائی، یہ ہے افسانہ ازدوبار کا ملخص،

تموز اور عشتار دونون دراصل آسمانی اجرام کے نام ہین، جن کو پوجا جاتا تھا لیکن انسانون کے بھی یہ نام ہوتے تھے، ان نامون کے ایک انسانی جوڑے کو ان نامون کے دیوتاؤن کا اوتار بھی مانا جاتا تھا، یہی خیال بعد مین اس شکل مین بدل گیا، کہ عشتار نام ایک عورت جس کا عربی نام زہرہ ہے، اپنے شوہر تموز سے سیکھے ہوئے جادو یا عربی روایت کے مطابق اسم اعظم کے زور سے زہرہ بن گئی،

قرآنی آیت کی تفسیر مین ان تفصیلات کے تذکرہ کی ضرورت نہین تھی لیکن چونکہ کتب تفسیر مین یہ افسانہ مذکور ہے، اور اس کی بدولت قرآن پر اعتراضات کئے جاتے ہین، اس لئے ہم کو اس قدر تفصیل سے کام لینا پڑا،

قرآن مین یقیناً ہاروت اور ماروت کو طرّاد و فرشتے کہا گیا ہے، لیکن یہ دونون یہودی لٹریچر کے گھڑے ہوئے فرشتون مین سے نہ تھے، کیونکہ اُن کے اسماء مین اُن کے نام نہین ملتے یہ دونون درحقیقت تاریخی اشخاص اور بابلی استادون مین سے دو استاد تھے جن کو ان کے ماننے والے حسن اعتقاد کی بنا پر فرشتے کہتے تھے، قرآن نے طنزاً اُن کو فرشتے کہا، اُن کے معتقدین بھی اُن کو حقیقی معنون مین فرشتے نہین کہتے تھے بلکہ اپنے گمان کے مطابق اُن کے حسن سیرت اور تقدس کے سبب سے ان کو تشبیہاً اسی طرح فرشتے کہتے تھے، جس طرح زنانِ مصر نے حضرت یوسف کی بابت کہا تھا اِنْ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کریم،

ارض القرآن حصہ اوّل

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد، ثمود، سبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے جس سے قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر، اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید و تصدیق کی ہے، ضخامت ۲۲۴ صفحے قیمت ۔

ارض القرآن حصہ دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسماعیل اصحاب الرس اصحاب الحجر، بنو قیدار، انصار اور قریش کی تاریخ اور عرب کی تجارت زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، قیمت ۔ ضخامت ۳۴۰ صفحے،

"منیجر"

الدرایۃ فی تخریج احادیث الھدایۃ

کا

ایک نادر نسخہ

از

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب اعظمی صدر مدرس مدرسہ مفتاح العلوم مئو

گذشتہ مہینہ مین، مدرسہ مفتاح العلوم (جامع مسجد شاہی، مئو ضلع اعظم گڈھ) کے کتب خانہ مین حافظ ابن حجر عسقلانی کی تحفیض نصب الرایہ لاحادیث الہدایہ کا ایک نادر اور اہم نسخہ داخل ہوا ہے، یہ اس کتاب کا نصف ثانی ہے، جو کتاب النکاح سے لے کر آخر تک کے تمام ابواب پر مشتمل ہے، ہمارے علم مین یہ نسخہ اپنی گوناگون خصوصیات کے اعتبار سے انفرادی شان رکھتا ہے، سطور ذیل مین اس نسخہ کا تعارف کرایا جاتا ہے، اس سے ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ممکن ہو کوئی صاحب علم اس کے نصف اول کا سراغ لگا سکین، اور اصحاب علم کے شکر کے مستحق ہون،

نسخہ زیر نظر تقریباً ۳۰×۲۰ کے ۱۹۰ اوراق پر مشتمل ہے، ہر صفحہ مین اکیس سطرین ہین، خطانہایت پاکیزہ ہے، کاغذ بہت دبیز اور اتنا پائدار و بہتر ہے، کہ تقریباً ساڑھے پانچسو برس گذرنے پر بھی بوسیدگی و کہنگی کا کوئی اثر اس مین نہین ہے، ابواب کے عنوانات، ہر حدیث کی ابتدا، مین لفظ حدیث یا قولہ اور ایک حدیث کے دوسرے حوالہ یا اس کے دوسرے طریق کے بیان کے لئے لفظ اخرجہ یا وروا ہ اور لہ طریق آخر وغیرہ شرح و نشانی سے لکھے ہوئے ہین،

اس نسخہ کا سنہ کتابت ۸۳۰ھ ہے، اس اعتبار سے خود مصنف کی زندگی مین اور تصنیف کے صرف تین سال بعد لکھا گیا ہے، اس لئے کہ حافظ ابن حجر کی وفات ۸۵۲ھ مین ہوئی ہے، اور درایہ کا سالِ تصنیف ۸۲۷ھ ہے،

اس نسخہ کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ابو الفتح محمد بن احمد خلیب طوخی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، یہ بزرگ نوین صدی ہجری کے مشہور عالم و کاتب ہین، حافظ ابن حجر کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین ان کا ذکر کیا ہے، وہ زرکشی، ابن الملقن اور دمیری وغیرہ کے شاگرد اور سبعہ کے قاری تھے، اور زین بن الصائغ سے کتابت کی مشق کی تھی، حافظ سخاوی فرماتے ہین کہ

"انھون نے ہمارے شیخ (ابن حجر) کی بہت سی تالیفات کی کتابت کی تھی"

حافظ ابن حجر کی مجلس املا مین ان کے امالی یہی لکھتے تھے، اور بہت تیز لکھتے تھے، اُن کی وفات ۸۳۵ھ مین ہوئی، (ضوء اللامع جلد ۷، ص ۸۸)

سخاوی کے اس بیان کی بنا پر زیر نظر نسخہ خود حافظ ابن حجر کے معتمد علیہ اور ان کی تالیفات کے ناقل و کاتب خاص کے قلم کا ہے، اور اس لحاظ سے یہ نسخہ نوادر روزگار مین سے ہے،

تیسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ نسخہ ایک زمانہ مین ہندوستان کے مشہور و نامور بزرگ و عالم و مصنف حضرت مولانا غلام یحییٰ بہاری قدس سرہ کی ملک رہ چکا ہے، اور اس پر اُن کی مہر ثبت ہے جس مین اُن کے نام کا سجع بیشرت بغلام اسمہ یحییٰ کندہ ہے، اور مہر کے اوپر مولانا کے دست خاص کی یہ تحریر ہے، ثم دخل فی ملک غلام یحییٰ البہاری فی دار الخلافۃ بالشراء،

یہ تو اس نسخہ کے ظاہری خصوصیات ہین، اسی کے ساتھ اس کی سب سے بڑی معنوی خصوصیت یہ ہے کہ حافظ ابن حجر نے اس کتاب مین بہت سی حدیثون کی نسبت یہ تحریر فرمایا ہے کہ

لم اجدہ مین نے اس کو نہین پایا،

اس نسخہ مین ہر جگہ تو نہین لیکن پھر بھی بہت سے مقامات پر کسی قدیم حنفی محدث کے مختصر تعلیقات ہین، ان تعلیقات کا خط اصل کتاب کے خط سے بہت مختلف ہے، پھر بھی بہت قدیم ہے، اور اغلب یہ ہے کہ اسی عہد کے کسی بزرگ کے تعلیقات ہین، ان تعلیقات مین ان بزرگ نے یہ بتایا ہے کہ حافظ ابن حجر کو فلان حدیث نہین ملی مگر وہ فلان فلان کتاب مین موجود ہے،

اس قلمی نسخہ کے آخری صفحہ پر حاشیہ مین ایک مٹی مٹی سی عبارت ہے، جس کے بعض الفاظ کیڑون نے چاٹ لئے ہین، اور کچھ جلد بندی کی بے احتیاطی سے کٹ گئے ہین، اس لئے اس کا پڑھنا بہت مشکل ہے، تاہم بڑی کوشش سے اس کے بعض فقرے پڑھنے مین کامیابی ہوسکی، وہ فقرے یہ ہین،

"الحمدُ للہ طالعت ھذہ النسخۃ وعلقت فی ھوامشھا مالم یجد مولفھا ..... وکتب قاسم الحنفی"

ان فقرون کو پڑھکر مین خوشی سے اچھل پڑا، اس لئے کہ ان فقرون نے ساری گرہ کھول دی، اور ان سے کاتب تعلیقات کا سراغ مل گیا، جس سے ان تعلیقات کی قیمت میری نگاہ مین بہت بڑھ گئی، یہ قاسم حنفی شیخ ابن الہمام اور حافظ ابن حجر کے بلند پایہ شاگرد، جلیل القدر مصنف اور نوین صدی ہجری کے مشہور حافظ حدیث، وفقیہ حنفی، علامہ قاسم بن قطلو بغا ہین، جن کا ذکر زائرالہ آبادی نے یون کیا ہے

آن کہ از جمع حلقہ اعلام
ابن قطلو بغاست قاسم نام

اور جنھون نے متعدد کتابون (مثلاً عوارف المعارف، الاختیار شرح المختار، اصول بزدوی، تفسیر لیث، منہاج الاربعین، الاربعین فی اصول الدین، جواہر القرآن، بدایۃ الہدایۃ، اور شرح العقائد) کی تخریج احادیث لکھی ہے، اور امام عراقی و امام زبیدی جن احادیث کی تخریج مین ناکام رہے ہین، ان کی تخریج کرکے ان کی کتابون کا تکملہ لکھا ہے، ایک کا نام اتحاف الاحیاء بما فات العراقی من تخریج احادیث الاحیاء اور دوسری

کافیۃ الالمعی بما فات الزیلعی ہی، اُن کے شاگرد علامہ سخاوی نے الضوء اللامع مین اُن کا مطول ترجمہ درج کیا ہے، اور لکھا ہے، کہ یعرف بقاسم الحنفی یعنی قاسم حنفی کے نام سے معروف ہین، سخاوی نے یہ بھی لکھا ہو کہ حافظ ابن حجر نے اُن کو الامام العلامۃ المحدث الفقیہ الحافظ کے القاب سے یاد کیا ہے، اور اعتراف کیا ہو کہ علامہ قاسم نے میری کتاب ایثار کے پڑھنے کے دوران مین خود مجھکو فائدہ پہنچایا، اور نئی باتین بتائین، اور بہت سی جگہ مجھکو متنبہ کیا، تو مین نے اصل کتاب مین اُن کی تنبیہات و فوائد کا اضافہ کرلیا، جس سے میری کتاب کی نورانیت بڑھ گئی، (ضوء اللامع ص ۱۸۵ جلد ۶)

اس عبارت کے حل ہوجانے سے اس نسخہ کی یہ عظیم الشان خصوصیت ظاہر ہوئی کہ وہ علامہ قاسم کے مطالعہ مین رہ چکا ہے، اور اس پر خود ان کے دستِ مبارک کی تعلیقات ہین،

درایہ اب سے بہت پہلے ہمارے ہم وطن عالم مولانا محمد علی ابوالمکارم صاحب مرحوم کی سعی و اہتمام سے ۱۲۹۹ھ مین طبع ہوکر شائع ہوچکی ہے، ہم چاہتے ہین کہ اس مضمون مین زیرِ نظر نسخہ سے علامہ قاسم کے تعلیقات بھی نقل کردین، تاکہ مطبوعہ نسخہ کا مطالعہ کرنے والے حضرات ان تعلیقات کو بھی پیشِ نظر رکھین، اور حافظ ابن حجر کی وسعتِ نظر کے اعتراف کے ساتھ ساتھ فوق کل ذی علم علیم کے یقین و اذعان سے بھی ذہول نہ ہو،

تعلیقات علامہ قاسم علی الدرایۃ

۱۔ حدیث لا نکاح الا بشہود کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا ہے لم ارہ بھذا اللفظ (مین نے ان لفظون کے ساتھ اس کو نہین دیکھا ہی)، اس پر علامہ قاسم فرماتے ہین، قلت اخرجہ محمد بن الحسن فی الاصل بلاغاً و وصلہ الخطیب من حدیث علی (مین کہتا ہون اس کو امام محمد نے اصل مین بلاغاً ذکر کیا، اور خطیب نے موصلاً حضرت علیؓ کی حدیث سے)

۲۔ حدیث الشیب تشاور کی نسبت حافظؒ کا ارشاد ہے لم ارہ بھذا اللفظ، اس پر علامہ قاسم

فرماتے ہیں، قلت روی الحارثی فی المسند من حدیث ابی ہریرۃ لا تنکح الثیب حتی تستأمر،

۳- ظہار کرنے والے کے حق میں ارشاد نبوی ہے، استغفر اللہ ولا تعد حتی تکفر، حافظ فرماتے ہیں کہ اس کے کسی طریق میں میں نے استغفار کا ذکر نہیں پایا، علامہ قاسم فرماتے ہیں:-

قلت رواہ محمد بن الحسن بذکر الاستغفار من مرسل طاؤس ووصلہ الحاکم بذکر ابن عباس،

۴- حدیث الحناطیبٌ کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا ہے لم اجد لہٗ علامہ قاسم فرماتے ہیں:-

قلت رواہ الطبرانی فی الکبیر عنہا قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تطیبی وانت محرمۃ ولا تمسی الحناء فانہ طیبٌ،

۵- ہدایہ میں ہے، لہریاذن علیہ السلام للمعتدۃ فی الاکتحال والدھن اس پر حافظ فرماتے ہیں، اما الاکتحال فھو فی حدیث ام سلمۃ واما الدھن فلم اجد لہٗ اس مقام پر علامہ قاسم نے لکھا ہے، قلت قولہ فی الھدایہ والدھن کلام مبتدأ من قبل نفسہ فانہ قال تنھی المعتدۃ عن الاکتحال والدھن لا یعری عن الطیب،

۶- ہدایہ میں ہے کہ حدیث فاطمہ بنت قیس کو حضرت زید و اسامہ نے بھی رد کر دیا تھا، حافظ فرماتے ہیں لم اجد حدیث زید بن ثابت واسامہ بن زید فلم اجد ھما علامہ قاسم فرماتے ہیں قلت ما عن اسامۃ بن زید رواہ الطحاوی،

۷- ہدایہ میں ہے نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تعذیب الحیوان حافظ فرماتے ہیں، لم اجد لہٗ علامہ قاسم نے لکھا، قلت الفقیہ یذکر الحدیث بالمعنی وقد روی البخاری ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم نھی عن تصبر البھائم،

۸- ہدایہ میں ہے روی سعید بن المسیب ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم امر بعتق امہات الاولاد وان لا یبعن فی دین ولا یجعلن من الثلث، حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجد لہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:- رواہ محمد بن الحسن فی الاصل،

۹- بیع امہات الاولاد میں ہدایہ کی ایک حدیث کے لئے حافظ نے بیہقی کا حوالہ دیا ہے، اس پر علامہ قاسم تحریر فرماتے ہیں، قلت ما رواہ البیہقی خلاف ما ذکر صاحب الہدایۃ والذی ذکرہ صاحب الہدایہ عند محمد فی الاصل،

۱۰- حدیث ادرؤا الحدود بالشبہات کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجد لہ، علامہ قاسم فرماتے ہیں، قلت رواہ الحارثی فی المسند من حدیث ابن عباس،

۱۱- ہدایہ میں ہے ومن زفت الیہ غیر امرأتہ وقال النسوۃ انہا زوجتک فوطئہا فلا حد علیہا وعلیہ المہر قضی بذلک علی، حافظ نے یہاں لکھا لم اجد لہ، علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ عبد الرزاق،

۱۲- حدیث لا قطع فی الطعام کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجد لہ بہذا اللفظ، علامہ قاسم فرماتے ہیں:- قلت رواہ بہذا اللفظ محمد بن الحسن فی الاصل،

۱۳- ہدایہ میں ہے وقد صح انہ علیہ السلام نہی قتل النساء والذراری، اس پر حافظ نے فرمایا لم اجد لہ ہکذا، علامہ نے فرمایا قلت روی الحاکم ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لرجل الحق خالدا ولا تقتلن ذریۃ ولا عسیفا،

۱۴- حدیث ابن عباس ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم اعطی الفارس سہمین والراجل سہما کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجد لہ، علامہ قاسم حنفی نے اس پر لکھا ہے، قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل وابو یوسف فی کتاب الخراج وابو یعلی الموصلی فی مسندہ،

۱۵- حدیث اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَاْکُلُ مِنْ صَدَقَتِہٖ (وَالْمُرَادُ وَقْفُہٗ) کی نسبت حافظ نے لکھا لم اجد لہٗ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الخصاف فی کتاب الاوقاف،

۱۶- حدیث من اشتری ارضًا فیھا نخل فالثمرۃ للبائع الا ان یشترط المبتاع کے باب میں حافظ نے فرمایا لم اجد لہٗ علامہ قاسم لکھتے ہیں قلت فی الطبرانی من حدیث ابن عمر ان رجلًا باع ارضًا فیھا ثمرتھا فقال النبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ الثمرۃ للذی ابّرھا الا ان یشترط المبتاع؛

۱۷- حدیث: لا تاخذ الا سلمك اور اس مالك کے حق میں حافظ نے لکھا لم اجدہ علامہ قاسم نے فرمایا قلت رواہ الدارقطنی بلفظ مَنْ اسلف فی شیءٍ فلا یاخذ الا ما اسلف فیہ اور اس مالہ،

۱۸- حدیث: لا تقبل شھادۃ الولد لوالدہ ولا الوالد لولدہ ولا المرءۃ لزوجھا ولا الزوج لامرأتہ ولا العبد لسیدہ ولا المولیٰ لعبدہ ولا الاجیر لمن استاجرہ کی نسبت حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ نے اس پر کہا قلت رواہ الخصاف فی کتاب ادب القضاء من حدیث عائشۃ رضی اللّٰہ عنھا،

۱۹- ہدایہ میں ہے اعمی علی لا یجوز شھادتہ علی شھادۃ رجلٍ الا شھادۃ رجلین حافظ نے فرمایا لم اجدہ علامہ قاسم نے اس کا یوں پتہ بتایا، قلت اخرجہ محمد فی الاصل بذکرہ عنہ،

۲۰- حدیث عمر اذا اقر المریض بدین جاز ذالك علیہ فی جمیع ترکتہ کی نسبت حافظ ابن حجر نے لکھا لم اجدہ اس پر علامہ قاسم نے لکھا قلت رواہ محمد بن الحسن فی الاصل عن

ابن عمرؓ واللہ اعلم،

۲۱- حدیث انّ النبی صلّی اللہ علیہ وسلّم اجاز العمری ورد الرقبی کو حافظ نے لکھا لعراجد کہ علامہ نے لکھا: قلت رواہ الامام محمد بن الحسن فی الاصل بھذا اللفظ،

۲۲- ضمان اجیر کے باب میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے اثر کو حافظ نے لکھا کہ لعزادہ، علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، کہ قلت رواہ ابن ابی شیبۃ فی مصنفہ ومحمد بن الحسن فی الاصل،

۲۳- حدیث لیس للنساء من الولاء الا ما اعتقن او اعتق من اعتقن او کاتبن او کاتب من کاتبن او دبرن او دبر من دبرن او جرّ ولاء معتقھن کی نسبت حافظ نے فرمایا لعراجد ھکذا اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت فی مسند رزین عن عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم قال میراث الولاء للاکبر من الذکور ولا یرث النساء من الولاء الا ولاء من اعتقن او اعتق من اعتقن،

۲۴- حدیث کان عمر اذا رأی جاریۃ متقنعۃ علاھا بالدرۃ وقال القی عنک الخمار یا فارا تتشبھین بالحرائر حافظ ابن حجر نے فرمایا لعراجد اس پر علامہ قاسم نے لکھا ہے، قلت تقدم فی شروط الصلوٰۃ انہ لعریفت منہ الایاد فارد لا یتوقف الحکم علیہ واللہ اعلم،

۲۵- حدیث: من آجر ارض مکۃ فکانما اکل الربا کی نسبت حافظ نے فرمایا، ھذا اکانہ تصحیف من قولہ فانما یاکل نارا اس پر علامہ قاسم نے تحریر فرمایا، قلت رواہ الدارقطنی بلفظ اکل الربا

۲۶- حدیث حریم العین خمس مائۃ ذراع وحریم بیر العین[1] اربعون ذراعًا و حریم بیر الناضح ستون ذراعًا کے باب مین حافظ ابن حجر کا ارشاد ہے، لم اجدہ ھکذا اعلامہ قاسم فرماتے ہین، رواہ ھکذا الامام محمد بن الحسن،

۲۷- ہدایہ مین ہے وتعلیم الکلب ان یترک الاکل ثلاث مرات وتعلیم البازی ان یرجع ویجیب اذا دعوتہ وھو ماثور عن ابن عباس، اس پر حافظ نے لکھا لم اجدہ، علامہ قاسم فرماتے ہین رواہ محمد بن الحسن فی کتاب الآثار،

۲۸- ہدایہ مین ہے، اجمع الصحابۃ علی ان الرھن مضمون واختلفوا فی کیفیتہ حافظ نے لکھا لم اجدہ، مگر اس کے بعد حضرت علیؓ اور حضرت عمرؓ کے آثار نقل کیے اس پر علامہ قاسم نے فرمایا قلت قد شرح المؤلف ما قال انہ لم یجدہ،

۲۹- حدیث لا یعقل العواقل عمدًا ولا عبدًا ولا صلحًا ولا اعترافًا کی نسبت حافظ ابن حجر نے فرمایا، لم ارہ مرفوعًا الا ماروی الخ اس پر علامہ قاسم نے لکھا ساقہ مرفوعًا رزین العبدری فی مسندہ،

مین نے اس نسخہ کی اطلاع علامہ زاہد کوثری کو دی تو انھون نے اس کو "فاخرۃ جدا" قرار دیا، اور منیۃ الالمعی بسافات الزیلعی کے ساتھ تعلیقات قاسم حنفی کو منگوا کر چھپوا رہے ہین،

---

[1] ھکذا فی الاصل والصواب بئر العطن،

رحمتِ عالم

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت:- مجلد عہ غیر مجلد عہ (طبع پنجم)

"نیر"

شہاب الدین محمود آلوسی

از

جناب حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب رفیق دارالمصنفین

تفسیر روح المعانی ابھی حال ہی یعنی تیرہوین صدی کے وسط کی تصنیف ہے لیکن مقبولیت کے لحاظ سے اس کو بہت سی متقدم تفسیرون پر بھی فوقیت حاصل ہے، یہ کتاب مصنف نے بارگاہ قدس کے اشارۂ غیبی پر تصنیف کی تھی، تفسیر کے مقدمہ مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے،

مصنف کے نام اور اُن کی تفسیر سے تو عام طور سے اہل علم واقف ہین، مگر ان کی دوسری تصانیف اور اُن کے سوانح حیات سے کم لوگون کو واقفیت ہے، اس لئے اردو مین ان کے حالات لکھنے کی ضرورت تھی، لیکن افسوس ہے کہ مصنف کی شخصیت اور اُن کے علمی کارنامون کی اہمیت کے لحاظ سے اُن کے حالات بہت کم ملتے ہین، تلاش سے جو معلومات حاصل ہو سکے ہین، وہ پیش کش ناظرین ہے،

خانوادۂ آلوسیین | آلوس عراق مین ایک بستی ہے جو دریاے فرات کے ساحل پر واقع ہے[1] یہ قدیم آبادی ہے، دوسری تیسری صدی ہجری مین اس کی حیثیت ضلع کے مرکزی مقام کی تھی، اس کی جانب بہت سے علما و صلحا بھی منسوب ہین، معجم البلدان مین اس کا مفصل تذکرہ موجود ہے، لیکن اس وقت اس کی حیثیت ایک قصبہ سے زیادہ نہین ہے، تیرہوین صدی مین یہان کے ایک خاندان نے علم و فضل مین بڑی شہرت و نامور ی حاصل کی، اس خانوادہ کو عام طور پر خانوادۂ آلوسیین کہا جاتا ہے، یہ خاندان علم و فضل کے لحاظ سے پورے

---

[1] معجم المطبوعات جلد ۱ صفحہ ۳،

عراق مین ایک خاص حیثیت کا مالک تھا، اور پورے اہل عراق کا مرجع علم تھا، صاحب روح المعانی اسی خاندان کے ایک فرد تھے،

نام ونسب اور ابتدائی حالات | شہاب الدین محمود نام، ابو عبداللہ کنیت تھی، ۱۵ شعبان بروز جمعہ ۱۲۱۷ھ کو آلوس مین پیدا ہوئے، اُن کے والد کا نام عبداللہ صلاح الدین تھا، جو بڑے صاحب علم وفضل تھے انہی کی آغوش فیض مین اُن کی ابتدائی تعلیم وتربیت ہوئی صاحبزادہ کو عربی اور فقہ، اور منطق کی متوسط تعلیم دینے کے بعد وہ عراق کے دوسرے علماء کی خدمت مین لے گئے، جن سے انھون نے تکمیل کی، اُن کے اساتذہ کے متعلق صاحب[1] جلاء العینین نے صرف اتنا لکھا ہے کہ

اخذ العلوم عن علماء المحققین	انھون نے محقق علماء اور اہل نظر فضلاء سے
واجلاء مدققین، (صفحہ ۲۷)	علم حاصل کیا،

لیکن کسی کے نام کی تصریح نہین کی ہے، الا لویس شیخو نے اپنی کتاب آداب العربیہ مین اُن کے ایک استاذ علاء الدین متوفی ۱۲۷۸ھ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

علاء الدین واحد شیوخ	آلوسی کے شیوخ مین ایک شیخ علاء الدین
شہاب الدین آلوسی،	بھی تھے،

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اور بھی شیوخ تھے،

ذہانت اور قوت حافظہ | بچپن ہی سے نہایت ذہین وفطین تھے، حافظہ بھی غیر معمولی پایا تھا، جلاء العینین مین ہے،

وکان ذا حافظة غریبة وفطنة	عجیب وغریب ذہانت اور حافظہ
عجیبة (صفحہ ۲)	پایا تھا،

---

[1] جلاء العینین کے مصنف شیخ آلوسی کے صاحبزادے ہین،

قوتِ حافظہ کا خود ان کے بیان کے مطابق یہ حال تھا،

ما استودعت ذهني شيئًا	ایسا نہیں ہوا کہ مین نے اپنے ذہن مین کوئی
فنانني[1]	بات رکھی ہو، اور وہ پھر ذہن سے نکل گئی ہو

اسی غیر معمولی ذہانت کا نتیجہ تھا کہ ۱۳ برس کی عمر مین ابن ہشام کی کتاب شرح قطر الندی پر حاشیہ لکھا[2] ابھی بیس برس سے بھی کم عمر تھی کہ مسند درس کے زینت بنے، اور اسی زمانہ مین صاحب تصنیف بھی ہوئے، جلاء العینین مین ہے،

وقد الف ودرس وهو دون	بیس برس سے کم ہی کے تھے، کہ صاحب درس
العشرين (ص ۲۷)	وتصنیف ہوگئے،

تلامذہ | ابتداے عمر سے لے کر آخر عمر تک افادہ وتعلیم کا سلسلہ برابر جاری رہا، اس مدت مین ہزارون تشنگان علم اُن کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوئے ہون گے لیکن افسوس ہے کہ ان کا مفصل تذکرہ نہین ملتا، اُن کے صاحبزادہ کا بیان ہے کہ

وانتفع به خلق كثير (جلاء ص۲۵)	اُن سے ایک مخلوق نے استفادہ کیا،

متفرق طور پر حسب ذیل تلامذہ کے نام ملتے ہین،

۱- ان کے دو صاحبزادے عبد الباقی سعد الدین (۲) خیر الدین ابو البرکات جو اپنے وقت کے جید علماء مین تھے اور متعدد تصانیف یادگار چھوڑی ہین، جلاء العینین خیر الدین ابو البرکات ہی کی تصنیف ہے (۳) الشیخ عبد الفتاح شواف زادہ ان کو حدیث وفقہ اور عربی ادب سے زیادہ دلچسپی تھی، ادب کی تعلیم خاص طور سے انھون نے شیخ آلوسی سے حاصل کی تھی، اُن کی متعدد تصانیف ہین، حدیقۃ الورد کے نام سے دو جلدون مین شیخ آلوسی کی سوانح حیات بھی لکھی ہے اگر کاش یہ کتاب مل جاتی تو شیخ کے مفصل

---

[1] جلاء العینین ص ۲۷ [2] ادب العربیۃ ج ۱ ص ۸۷ [3] معجم المطبوعات،

حالات اور کارنامے سامنے آجاتے (۴) محمد الاخفش، یہ شیخ کے خاص تلامذہ مین تھے، ان کی تحریری یادگارون مین شرح الفیہ زیادہ مشہور ہے (۵) عبد الفتاح الاخرس انھون نے شیخ سے اور کتابون کے علاوہ کتاب سیبویہ خاص طور سے پڑھی تھی[۱]

اثنار اس علم وفضل کے باوجود عام مجالس وعظ مین جانا پسند نہین کرتے تھے ۱۲۵۰ھ مین اُن کو جامع بغداد مین وعظ کے لئے بلایا گیا، تو بہت باردخاطر ہوا، جب زیادہ اصرار کیا گیا تو بکراہت گئے، اس وعظ مین والی بغداد بھی موجود تھا، وہ بہت متاثر ہوا، اور اس کو اسی دن سے شیخ سے ایک خاص عقیدت ہوگئی، اور اس کے بعد سے وہ برابر ان کی خدمت مین حاضر ہوتا رہا اور بعد مین بغداد کے مفتی کی حیثیت سے اُن کا تقرر کردیا، شیخ نے ۱۵ برس تک یہ خدمت نہایت حُسن وخوبی کے ساتھ انجام دی[۲]

وفات ۱۵ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ۶۳ برس کی عمر مین وفات پائی، اور حضرت شیخ معروف کرخی کے پہلو مین سپرد خاک کئے گئے، .... وفات کا صدمہ خواص اور عوام سب کو ہوا، آج بھی آپ کی قبر زیارت گاہ عام وخاص ہے[۳] متعدد شعرا نے طویل مرثیے لکھے، زندگی مین شعرا نے جو مدائح لکھے، اور موت کے بعد جو مراثی کہے گئے، ان سب کو الاب لویس نے کتابی شکل مین جمع کردیا ہے[۴] اس سے ان کی مقبولیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

اولاد واحفاد ان کے دو صاحبزادون عبد الباقی اور خیر الدین کا ذکر اوپر آچکا ہے، اُن کے علاوہ ایک اور صاحبزادے عبد اللہ بہاء الدین تھے، دوسرے بھائیون کی طرح یہ بھی صاحب علم تھے، اُن کے صاحبزادے (یعنی شیخ آلوسی کے پوتے) ابو المعانی متوفی ۱۳۴۲ھ نے علم وفضل مین باپ سے بھی زیادہ شہرت حاصل کی، متعدد قیمتی تصانیف یادگار چھوڑین، ان مین بلوغ الارب فی معرفۃ احوال العرب بہت مشہور ہے، اور چھپ کر شائع ہوچکی ہے،

اخلاق وعادات شیخ کے صاحبزادے نعمان نے ان کے ظاہری وباطنی محاسن کا نقشہ ان الفاظ مین کھینچا ہے،

وکان حُسن المنظر والمحاضرۃ نہایت خوبصورت اور خوش گفتار تھے اور

---

[۱] یہ پچھلے تین آدمیون کا ذکر آداب العربیہ مین ہے جلد ۱ صفحہ ۹۳ تا ۹۵ [۲] معجم المطبوعات ۳۰۵ جلد ۱ عینین صفحہ ۲۰ [۳] آداب العربیہ

والمفاکھۃ ورعاً تقیاً عفیفاً (جلاء ص۲۰۰) — پرہیزگار اور پاک دامن تھے،

صاحب حدیقۃ الورد لکھتے ہیں :-

کریم النفس اور اخلاق میں نادر روزگار تھے،

اریج الند کے مصنف کا بیان ہے،

ولم یسمع بمثلہ فی کافۃ الاقالیم منذ سنین عدیدۃ مع تقویٰ وصلاح ودیانۃ قویۃ وسخاء وکرم وصدقات خفیۃ (جلاء ص۲۰۰)

بہت دنوں سے ان ممالک میں ایسا صاحب علم وفضل سننے میں نہیں آیا، اس علم وفضل کے ساتھ صلاح وتقویٰ، راست بازی اور سخاوت اور پوشیدہ صدقات کرنے میں وہ اپنی مثال تھے،

فضل وکمال شیخ آلوسی کے علم وفضل کا صحیح اندازہ تو اُن کی تصانیف ہی سے ہو سکتا ہے لیکن انکے معاصرین بھی اُن کے کمالات کے معترف تھے،

ویس شیخ نے لکھا ہے،

کلف بالعلوم منذ حداثۃ سنہ وبذل النفس والنفیس فی احراز جواھرھا فی ان رغبۃ فی طلب المعارف شغلتہ عن حطام الدنیا وانستہ ھناء العیش وملاذ الحیاۃ وبرز بالعلوم الدینیۃ فصار اماماً

اوائل عمر ہی سے اُن کو علوم سے دلچسپی اور لگاؤ تھا اور علمی جواہر پاروں کے جمع کرنے میں انھوں نے اپنی جان ومال ہر چیز لگا دی تھی، طلب علم کی رغبت وشوق نے ان کو اپنی طرف اتنا مشغول کر لیا کہ وہ زخارف دنیوی اور ان لذتہائے ایام سے بھی بے نیاز ہو گئے، اس ذوق وشوق کا نتیجہ یہ ہوا کہ علوم دینیہ

فی التفسیر والافتاء وکان مع ذلک کاتبًا بلیغًا[1]

مین اُن کو پورا کمال حاصل ہوگیا، چنانچہ تفسیر اور افتاء مین اُن کی حیثیت امام کی ہوگئی، اسی کے ساتھ انشا پردازی اور بلاغت مین بھی کمال حاصل تھا،

صاحب حدیقۃ الورد جو اُن کے شاگرد ہین لکھتے ہین،

کشاف رموز الحقائق وغواص بحر الدقایق، علامۃ الفضلاء وحید الدھر بالاتفاق، خاتم المفسرین وسعد المحققین وفخر علماء المسلمین الواصل الی رتبۃ الاجتہاد ذکرہ فی البلاد (جلاء صفحہ ۲۷)

حقائق علم کا راز فاش کرنے والے اور بحر معانی کے غواص تھے، اہل فضل کی نشانی اور بالاتفاق نادرۂ روزگار تھے، خاتم المفسرین تھے اور اہل تحقیق اور علماے اُمت کیلئے سعادت اور فخر کا موجب تھے، اُن کو اجتہاد کا رتبہ حاصل تھا، تمام ممالک مین ان کا چرچا ہے،

صاحب ارتج الندا کا جو شیخ کے شاگرد ہین، بیان ہے،

وکان نادرۃ الاوان حصل العلوم النقلیۃ والعقلیۃ فتفرد بھا ودرس العربیۃ والبیان والحدیث والتفسیر ووقف علی غامضۃ العسیر... والوسیع

نادرۂ روزگار تھے، انھون نے علوم نقلیہ اور عقلیہ کی تحصیل کی اور اس مین تفرد حاصل کیا، ادب عربی، معانی وبیان تفسیر وحدیث کا درس دیا، اور انھی علوم کی مشکلات حل کرتے رہے،.....

---

[1] آداب العربیہ ج ۱ ص ۸۵،

بمثلہ فی کافۃ الاقالیم (صفحہ ۲۰) اُن کے جیسا نادرہ روزگار سننے میں نہیں آیا،

عربی نظم ونثر | عربی نظم ونثر دونوں پر پوری قدرت تھی، نثر میں ان کی قدرت پر ان کی تصانیف شاہد ہیں، صاحب آداب العربیہ ان کی تحریر کے متعلق لکھتے ہیں،

کان السید محمود سریع الخاطر ونسیج وحدہ فی قوۃ التحریر وسہولۃ الکتابۃ (ج ۱ ص ۵) — شیخ محمود نہایت درکی الفہم اور اپنے انداز تحریر اور عبارت کی سلاست وروانی میں منفرد تھے،

جلاء العینین میں ہے :-

والنثر العجیب الذی لم یسبق حسن اسلوبہ (صفحہ ۳) — ایسی اچھوتی نثر لکھتے تھے، کہ اُن کے اسلوب تحریر کی مثل ہی سے تقلید کیجا سکتی تھی،

عربی شعر وشاعری کا بھی نہایت اعلیٰ اور پاکیزہ مذاق تھا، نثر کی طرح ان کی نظم میں بھی دو خصوصیتیں یعنی رقت وسلاست زیادہ نمایاں ہیں، نمونۃً چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں، ایک موقع پر عراق کے چھوٹنے پر کہا ہے،

اھیم بآثار العراق وذکرہا — وتغدو عیونی من مسرتہا عبری
والثم اخفافاً وطئن ترابہ — واکحل اجفانا بتربتہ العطری
واسھر ارعی فی الدیاجی کواکبا — تحرّاذا سارت علی ساکنی الزورا

بغداد کی تعریف اور اس کے فراق میں کہتے ہیں،

ارض اذا مرّت بھا ریح الصبا — حملت من الارجاء مسکا اذفرا
لا تسمعن حدیث ارض بعدھا — یروی فکل الصید فی جوف الفرا
فارقتھا لا عن رضی وھجرتھا — لا عن قلی ورحلت لا متخیرا

لکنھا ساقت علی برجھا لما رایت بھا الزمان تنکرا

آخری شعر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بغداد کو انھوں نے خوشی سے نہیں، بلکہ حالات سے مجبور ہو کر چھوڑا،

علم نحو | نحو ان کا خاص فن تھا، اوپر ذکر آچکا ہے کہ کتاب سیبویہ خاص طور سے وہ پڑھایا کرتے تھے، اس فن سے اُن کی دلچسپی کا اندازہ اُن کی تفسیر سے ہوتا ہے، اس میں نحو کے جو مسائل آئے ہیں اگر ان کو الگ کر لیا جائے تو ایک مستقل کتاب تیار ہو سکتی ہے،

امر بالمعروف | امر بالمعروف اور نہی عن المنکر علماء کا خاص فریضہ ہے، شیخ آلوسی کو اس فرض کا پورا احساس تھا، اور وہ درس میں علمی و دینی خدمت کے ساتھ اس فریضہ کو بھی انجام دیتے تھے، ان کے صاحبزادے نعمان اُن کی خصوصیات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں،

والامر بالمعروف والنھی عن المنکر	امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور سُنّت
والذب عن السنۃ (جلاء ص۳)	نبوی کی طرف سے مدافعت بھی ان کی
(جلاء ص۳)	خاص خصوصیت تھی،

مسلک | پورا خانوادہ آلوسیین شافعی المسلک تھا، اس لئے شیخ آلوسی بھی شافعی تھے لیکن ان میں تشدد نہیں تھا، چنانچہ بعض مسائل میں وہ حنفی مسلک کے پابند تھے، شاید اسی وسعت کا نتیجہ تھا کہ عہدۂ افتاء پر ان کا تقرر ایک حنفی مفتی کی حیثیت سے ہوا تھا،[1]

تصانیف | شیخ کا اصل کارنامہ ان کی بیش بہا تصانیف ہیں، جن کی ... اہمیت انکی کمیت کی وجہ سے نہیں بلکہ معنوی کیفیت کے لحاظ سے ہے، اور اس کا اندازہ ان کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، اس لئے اس مضمون میں صرف اُن کے نام اور مختصر تعارف پر اکتفا کیا جاتا ہے،

---

[1] معجم المطبوعات ص۱۰۔

قیل انہ کان لا یقصر تالیفہ فی
الیوم واللیلۃ عن اقل من ورقتین
کبرتین (صف)

صاحب جلاء العینین نے اُن کی ۱۸ تصانیف کا ذکر کیا ہے، ان میں سے ۱۳ مطبوعہ ہیں،

۱- الاجوبۃ العراقیہ عن الاسئلۃ الایرانیہ :- ایران کے علمائے شیعہ نے چند سوالات کئے تھے یہ کتاب اسی کے جواب میں لکھی گئی ہے، ۱۳۱۷ھ میں آستانہ سے شائع ہو چکی ہے،

۲- الاجوبۃ العراقیۃ عن اسئلۃ الہندویہ یہ بھی چند سوالات کے جواب میں لکھی گئی ہے لیکن یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، اس کا سنہ تصنیف ۱۲۵۳ھ ہے، بغداد سے ۱۳۰۱ھ میں شائع ہو چکی ہے، اس کتاب کی ضخامت ۶۵ صفحات ہے،

۳- قطر الندی : فن نحو کی کتاب ہے، ابن ہشام نحوی متوفی ۷۶۲ھ کی تصنیف ہے، خود اس نے اس کتاب کی شرح بھی لکھی ہے، اس کتاب کی صاحب کشف الظنون نے بڑی تعریف کی ہے اس پر متعدد حواشی لکھے گئے ہیں، شیخ آلوسی نے بھی اس پر حاشیہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکا، صرف باب الحال تک لکھ پائے تھے کہ انتقال ہو گیا انکے بعد انکے صاحبزادے نعمان نے اسے پورا کیا، ۱۳۲۰ھ میں بیت المقدس سے شائع ہو چکی ہے،

۴- الخریدۃ الغیبیہ فی تفسیر قصیدۃ العینیہ، عبد الباقی موصلی نے حضرت علیؓ کی مدح میں ایک قصیدہ عینیہ لکھا تھا، مصنف نے اس کی تشریح کی ہے، قصیدہ مع تشریح ۱۲۷۰ھ میں مصر سے شائع ہو چکا ہے، اس کی ضخامت ۱۵۶ صفحات ہے،

۵- سفرۃ الزاد لسفرۃ الجہاد :- یہ جہاد سے متعلق ہے، ۱۲۷۰ھ میں مطبع دار السلام مصر نے اُسے شائع کیا ہے،

۶- الطراز المذهب شرح قصیدۃ البارالاشہب: عبدالباقی عمری کے ایک قصیدہ کی شرح ہے، مطبع جریدۃ الفلاح نے ۱۳۱۳ھ ہجری مین اسے شائع کیا ہے اسکی ضخامت ۱۹۶ صفحات ہے،

۷- غرائب الاغتراب ونزهة الالباب: مصنف نے فلسطین کا سفر کیا تھا، اس مین اسی سفر کے حالات ہین، اسی مین ان تمام علماء وصلحاء کے حالات بھی لکھ دیئے ہین، جن سے انھون نے اثنائے سفر مین ملاقات کی تھی، ۱۳۱۷ھ مین بغداد سے یہ سفرنامہ شائع ہوچکا ہے، کتاب کے شروع مین احمد شاکر آلوسی کے قلم سے مصنف کا ترجمہ بھی ہے، اسکی ضخامت ۱۵۴ صفحے ہے،

۸- الفیض الوارد: سید محمد جواد نے اپنے شیخ الشیوخ خالد الکردی النقشبندی کا ایک طویل مرثیہ والیہ لکھا تھا، یہ اس کی شرح ہے ۱۲۷۸ھ مین مطبع کاستلیہ نے شائع کیا ہے ضخامت ۲۶۴ صفحات ہے،

۹- کشف الطرۃ عن الغرۃ درء الخواص فی اوهام الخواص، ابو محمد قاسم الحریری متوفی ۵۱۶ھ کی تصنیف ہے، اس کتاب مین مصنف نے خواص کے معائب، اور اُن کے اوہام باطلہ پر بڑی اچھی بحث کی ہے، اس کتاب کی متعدد شرحین لکھی گئی ہین، دو شرحین نظم مین بھی کی گئی ہین، شیخ آلوسی نے بھی کشف الطرہ کے نام سے اس کی شرح لکھی ہے، یہ کتاب دمشق سے ۱۳۰۱ھ مین شائع ہوچکی ہے، کتاب کے شروع مین شیخ کے صاحبزادے نعمان آلوسی کا ایک مقدمہ بھی ہے، کتاب کی ضخامت ۴۰۰ صفحات ہے،

۱۰- المقامات الخیالیہ: یہ معلوم نہین ہوسکا کہ یہ کتاب کس موضوع پر ہے، بغداد یا کربلا سے شائع ہوچکی ہے،

۱۱- تشوقة المشمول: یہ سفرنامہ ہے ۱۲۶۸ھ مین مصنف نے استنبول کا سفر کیا تھا، اس مین اسی سفر کے حالات ہین،

۱۲- نشوۃ المدام فی العود الی مدینۃ السلام، یہ ہین معلوم ہوسکا کہ اس کا موضوع کیا ہے، غالباً یہ سفر سے واپسی پر بغداد کے متعلق کچھ لکھا ہے، واللہ اعلم، یہ کتاب دوبار بغداد سے شائع ہوچکی ہے،

۱۳- تفسیر روح المعانی: اُن کی زندگی کا اصلی اور سب سے اہم علمی اور دینی کارنامہ یہی تفسیر ہے، اس کی تالیف ۱۲۵۲ھ مین جب کہ مصنف کی عمر ۳۴ برس کی تھی، شروع ہوئی، اور ۱۲۷۰ھ مین اختتام کو پہنچی، یہ کتاب دوبار چھپ چکی ہے،

کتاب کے شروع مین مصنف نے لکھا ہے کہ نوجوانی ہی مین قرآن کے بہت سے حقائق و معارف اُن پر منکشف ہونے لگے، اور بہت سے دقائق اُن کے ذہن مین ایسے آئے، جو متداول تفسیرون مین نہین ملتے، چنانچہ ان کو ان دقائق و معارف کے قلمبند کرنے کا خیال پیدا ہوا، ابھی وہ اس ادھیڑبن ہی مین تھے کہ ایک رات خواب مین دیکھا کہ اللہ تعالیٰ ان کو زمین و آسمان کے لپیٹنے اور اس مین جو خلا پیدا ہوگیا ہے، اس کو پُر کرنے کا حکم دے رہا ہے، اسی حالت مین انھون نے اپنا ایک ہاتھ آسمان کی طرف اور دوسرا پانی کی طرف بڑھایا اُس کے بعد آنکھ کھل گئی، اور تفسیر لکھنے مین جو کچھ تامل و تردد تھا، وہ رفع ہوگیا، اور انھون نے اس کام کو شروع کر دیا،

کتاب کے شروع مین، فائدے دیئے ہین جن مین تفسیر کے تمام اہم مسائل آگئے ہین، مثلاً تفسیر و تاویل، تفسیر بالرای، اسمار قرآن، کلام اللہ غیر مخلوق، حروف سبعہ، جمع و ترتیب قرآن، اعجاز القرآن وغیرہ مباحث پر مختصر طور سے اچھی بحث کی ہے، پوری تفسیر ۳۰ حصون مین ہے،

اس خاندان کے دوسرے اکابر شیخ کے صاحبزادون کا ذکر اوپر آچکا ہے، جن مین ہر ایک صاحب علم و فضل تھا، اُن کے دو پوتون نے بھی اس لحاظ سے بڑی ترقی کی، ان مین ایک ابو المعانی محمود شکری ہین جن کا تذکرہ اوپر آچکا ہے، دوسرے علی علاء الدین ہین، جنھون نے پوری زندگی علم دین کی تدریس مین گذار دی تھی،

تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہین، ۱۲ ویں اور تیرہوین صدی کے اکابر کا ایک تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، مگر وہ پایۂ تکمیل کو نہین پہنچ سکا، اس کے علاوہ نحو مین ایک کتاب لکھی ہے، جو چھپ گئی ہے، ۱۲۷۱ھ مین پیدا ہوئے، اور ۱۳۴۲ھ مین وفات پائی،

شیخ آلوسی کے دو بھائی عبد الحمید اور عبد الرحمان بھی اپنے زمانہ کے ممتاز علما رین گذرے ہین، عبد الرحمن نہایت فصیح و بلیغ تھے، خطابت مین خاص طور سے مشہور تھے، اس کے علاوہ کرخت کی جامع مسجد مین زندگی بھر درس و تدریس کا کام کرتے رہے، ۱۲۸۱ھ مین وفات پائی، دوسرے بھائی عبد الحمید نابینا تھے، لیکن اپنے وقت کے بہترین ادبا و شعرا مین ان کا شمار ہوتا تھا، نہایت مقبول عوام تھے، ایک آدھ تحریری یادگارین بھی چھوڑی ہین، ۱۳۲۴ھ مین وفات پائی،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس ایڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہو گیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعہ، غیر مجلد ہے

"منیجر"

تلخیص نمبر ۲

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک

"پروفیسر رام پرشاد کھوسلا، ام اے (پنجاب) بی، اے (آکسن) پنجاب کے رہنے والے تھے، اور پٹنہ یونیورسٹی مین تاریخ کے پروفیسر تھے، تاریخ ہند پر اُن کی ایک کتاب Mughal Kingship and Nobility ۱۹۳۴ء مین انڈین پریس الہ آباد سے شائع ہوئی تھی، اس کے خاتمہ مین انھون نے جو کچھ لکھا ہے، وہ موجودہ جمہوری، اور سیکولر حکومت کے زمانہ مین مطالعہ کے لائق ہے، وہ لکھتے ہین، ص، ع"

فیض رسان بادشاہت مغلون کی بادشاہت ہندوستان کے ازمنۂ وسطیٰ کے لئے بیّن طور پر فائدہ مند تھی، ان کی حکومت مطلق العنان ضرور تھی لیکن انھون نے اس ملک کے باشندون کے قدیم حقوق مین کسی قسم کی مداخلت نہین کی، ان کی بادشاہت کے عیوب اپنی جگہ پر ہین، اور کوئی مطلق العنان حکومت کلیتہً باعث رحمت نہین ہوسکتی لیکن مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ مغلون کی بادشاہت اپنی شان و شوکت کے ساتھ اس زمانہ کے لئے بالکل مناسب تھی، اور اپنی خوبیون ہی کی وجہ سے یہ پرشکوہ حکومت ایک طویل مدت تک قائم رہی، اس خاندان مین مسلسل چھ ایسے بادشاہ گذرے جن کی شخصیتین بہت ہی اعلیٰ تھین، عام طور پر ان کی حکومت مین نرمی اور رحمدلی تھی، انھون نے کبھی اپنی فوجی قوت کو رعایا کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہوکر استعمال نہین کیا، وہ کبھی لوگون کے نجی معاملات مین دخل نہین دیتے تھے، ملک کے رسم و رواج کو کسی قانون کے ذریعہ پس پشت نہین ڈالتے تھے، نظری طور پر ان کی حکومت مطلق العنان ضرور

تھی لیکن عملی طور پر بڑی ہی فیض رسان رہی،

قیام امن پورے ملک مین ایک ایسا دبدبہ قائم تھا کہ دور دراز صوبون کے حکام بھی اُن کے خلاف سر اُٹھانے کی جرأت مشکل ہی سے کرتے تھے،

مغلون کے زمانہ مین جب کہین بدامنی ہوتی، تو سختی سے روکدی جاتی تھی، اس عہد کے حکمرانون نے امن وامان قائم کرکے ملک کو کمزور حکومت اور متزلزل نظام سلطنت کی خرابیون سے بچائے رکھا، اُن کو قوت واقتدار کی ہوس ضرور تھی لیکن اسی کے ساتھ وہ رعایا کی فلاح وبہبود کے لئے بھی برابر کوشان رہتے اگر امراء کو شاہانہ سرپرستی مین ترقی ہوئی تو ادنی درجہ کے لوگون کو بھی شاہانہ عنایتون کے بدولت خوشحالی نصیب ہوئی،

کاشتکارون کی محافظت حکومت کی جانب سے زراعت کی ترقی کے لئے بڑی کوشش اور نگرانی کی جاتی آمدنی کا بڑا حصہ زمین ہی سے حاصل ہوتا تھا، اس لئے کاشتکارون کی فلاح وبہبود کا بڑا خیال رکھا جاتا تھا جب کسی علاقہ سے فوج گذرتی تو وہان کی رعایا کی حفاظت کا پورا سامان کیا جاتا تھا، عبدالحمید لاہوری کا بیان ہے کہ شاہجہان (۱۶۳۳ء) مین لاہور جارہا تھا، تو اُس نے بخشیون کو حکم دیا کہ وہ تیراندازون کو لے کر راستہ کے ایک جانب کی حفاظت کرین اور میرآتش کو بندوقچیون کے ساتھ راستے کی دوسری سمت تعینات کیا تاکہ شاہی فوج کھیتون کی فصل کو نقصان نہ پہنچا سکے لیکن یہ بھی احتمال تھا کہ اس انتظام کے باوجود فصل کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور پہنچ جائے گا، اس لئے پہلے ہی سے دربار مشرف اور امین مقرر کردیئے تھے کہ رعایا اور ایک ہزار سے کم کے جاگیردارون کے نقصان کا معاوضہ دیا جائے، ایک بار شاہی فوج ۱۶۴۹ء مین قندھار کی طرف جارہی تھی جس سے غزنی مین کھیتون کو بڑا نقصان پہنچا چنانچہ وہان کے کاشتکارون کو اس کے معاوضہ مین دو ہزار اشرفیان دی گئین، ہر بادشاہ کاشتکارون کی بڑی پاسداری کرتا تھا، کیونکہ انہی پر حکومت کی مالی آمدنی کا انحصار تھا،

فنون کی ترقی صرف زراعت ہی کو شاہانہ سرپرستی حاصل نہیں تھی، بلکہ اس زمانہ میں دوسرے قسم کے آرٹ نے بھی بڑی ترقی کی، اور یہ ترقی بادشاہوں کی سرپرستی کے بغیر نہیں ہوسکتی تھی، یورپین سیاحوں نے اس زمانہ کے آرٹ کی بڑی تعریف کی ہے، جہانگیر کے عہد میں مصوری کو بڑا فروغ ہوا، پادری فرانیکو کا ٹرڈکا بیان ہو کہ جہانگیر کے عہد میں ایسے باکمال مصور تھے کہ جو یورپ کی مصوری کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کی نقل اس طرح اُتار دیتے تھے کہ اصل کا دھوکا ہوتا تھا،

ملک میں اعلیٰ قسم کے کپڑے بھی تیار ہوتے تھے، اس زمانہ کا مشہور کپڑا بافتہ ہالینڈ کے کپڑوں سے بہتر ہوتا تھا، اونچے طبقہ کے لوگ جو کپڑے پہنتے، ان میں طلائی اور نقرئی تار بھی استعمال کیا جاتا،

تعمیراتِ عامہ میں بڑی بڑی رقمیں خرچ کیجاتیں، ان تعمیرات کے نمونے آج بھی موجود ہیں ملک کے ہر حصہ میں محلوں، مسجدوں، حماموں، مقبروں، قلعوں اور دوسری قسم کی عمارتوں کی تعمیر کثرت سے ہوتی رہی، شاہراہوں کے کنارے مسافروں کی راحت و آسایش کے لئے سرائیں اور مسافرخانے بنائے گئے، مغلیہ عہد کی شاندار عمارتوں کے دیکھنے کے لئے آج تک دنیا کے مختلف حصوں سے سیاح آتے رہتے ہیں

علوم کی سرپرستی مغل بادشاہ علوم کے بھی بڑے سرپرست تھے، اُن کی فیاضی کا شہرہ سُن سُن کر دوسرے ملکوں کے علماء و شعراء اُن کے دربار میں کھنچے چلے آتے تھے، ان بادشاہوں میں بعض خود بھی بلند پایہ اہلِ قلم تھے، بابر کی تزک ایک علمی شاہکار ہے، اکبر نے ملک الشعراء کا ایک نیا عہدہ قائم کیا، اور سب سے پہلے غزالی اس عہدہ پر فائز ہوا، آئین اکبری میں ابوالفضل کا بیان ہو کہ اکبر کے دربار میں ایران کے بہت سے ممتاز شعراء کا اجتماع ہوگیا تھا، ان میں سے بعض شعراء کے نام یہ ہیں حکیم شفائی، نظیری نیشاپوری، ہاتفی اصفہانی، جعفر بیگ قزوینی، خواجہ حسین ہروی، حیاتی گیلانی، انیسی، خسروی، وفائی، رفیقی، غیرتی شیرازی، فسونی، نادری، قدسی، حیدری، تبریزی، اشکی، فہمی، آذری، جذبی، سنجر کاشی، نشیبی، سرمدی، قاسم ارسلان، مشہدی، بابا طالب، بابا غیوری وغیرہ،

جہانگیر شاعر بھی تھا، اور شعر و سخن کا نقاد بھی، اُس نے بھی ایک تزک لکھی ہے،

بادشاہون اور شاہزادون کے علاوہ امرا بھی علم و ادب کے سرپرست تھے، ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخاناں کی قدردانی نے شعر و سخن کی ایک اکیڈیمی ہی قائم کر دی تھی، خان زمان شعرا کا بڑا مربی تھا، غزالی نے اس کی شان مین ایک ہزار اشعار کا ایک قصیدہ لکھا، خان زمان نے اس کے ہر شعر کے صلہ مین ایک اشرفی دی، کشمیر کا صوبہ دار ظفر خان مشہور شاعر صائب کا مربی تھا، بیرم خان بھی شاعر تھا، نظیری کو اس کی سرپرستی حاصل تھی، اکبر کا رضاعی بھائی خان اعظم کوکلتاش اہل قلم تھا، سبزواری، بدخشی، جعفر بیردی، تہمی، اور مداحی وغیرہ شعرا اس کی فیاضیون کے رہین منت رہے، عرفی نے ایک قصیدہ کے صلہ مین ایک لاکھ روپے انعام پائے، امرا کے یہان برابر مشاعرے ہوا کرتے تھے، شہزادہ دانیال ہندی زبان کا شاعر تھا، شہزادہ مراد نظیری نیشاپوری کا سرپرست رہا، جہانگیر کے عہد مین طالب آملی ملک الشعرا تھا، شاہجہان نے ابو طالب کلیم کو یہ اعزاز بخشا، جہانگیر کے زمانہ مین قندھار کا صوبہ دار غازی و قاری شعرا اور علما کا بڑا دلدادہ تھا، ایران سے جو شعرا ہندوستان آتے وہ پہلے اسی کے دربار مین قیام کرتے تھے،

ملک مین بڑے بڑے کتب خانے بھی تھے، جب بابر کی فوجون نے لاہور کے پاس قلعہ ملوٹ مین داخل ہو کر اس کو لوٹنا شروع کیا، تو بابر نے وہان کے کتب خانہ کو بچا لیا، اس کو لاہور کے علم نواز غازی خان نے قائم کیا تھا،

ملک مین ماہرین فن اور شعرا کی کثرت اس کا ثبوت ہے کہ مغل بادشاہ ان فنون کی جانب سے کبھی غافل نہین رہے، جن کو امن و امان کے زمانہ مین فروغ پانا چاہیئے تھا، اُن کو جنگ و جدل سے جب بھی فرصت مل جاتی، تو رعایا کی حالت سدھارنے کی کوشش مین لگ جاتے، اُن کی آمدنی وافر تھی لیکن جو روپیہ بادشاہ کے ہاتھ مین آتا تھا، وہ مختلف ذرائع سے پھر رعایا کے ہاتھ مین پہنچ جاتا تھا،

عدل گستری | مغل حکمران عدل کو ایک مقدس فریضہ سمجھتے تھے، اُن کے زمانہ مین ادنی آدمی کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ براہ راست بادشاہ کی خدمت مین پہنچکر انصاف کا طلب گار رہو، گو اس حق کے استعمال کا موقع کم آتا تھا تاہم اس کی وجہ سے بے انصافی کی بڑی روک تھام رہتی تھی بعض اوقات یہ حق رعایا کے لئے بڑی نعمت ثابت ہوتا تھا،

مذہبی رواداری | عدل و انصاف مین اہتمام اور مذہبی رواداری کی پالیسی کی وجہ سے عوام ہمیشہ مطمئن رہے، اسلامی ریاستون مین سیاست اور مذہب کا گہرا لگاؤ رہا ہے لیکن مغلون کی مذہبی رواداری کی وجہ سے کوئی سیاسی خطرہ پیدا ہونے نہین پایا، اور کسی زمانہ مین بھی یہ کوشش نہین کی گئی کہ حکمران قوم کا مذہب محکومون کا بھی مذہب بنایا جائے، حتی کہ اورنگ زیب نے بھی حصول ملازمت کے لئے اسلام کی شرط نہین رکھی تھی، مغلون کے عہد مین (Five Act of milea) یا Conhoval Act of uni-ion act) کی کوئی مثال نہین ملتی ہے، لوگون کے ضمیر کے خلاف کوئی (Act of mity-) جیسا قانون نہین بنایا گیا، ایلزبتھ کے زمانہ مین ایک ایسا قانون تھا جس کے ذریعہ جبری طور پر عبادت کرائی جاتی تھی، مغلون کے زمانہ مین اس قسم کا جبر نہین کیا گیا،

(St Barlholomew Sofacy) کے جیسے قتل عام سے مغلون کی تاریخ کبھی داغدار نہین ہوئی، مذہبی جنگ کی خونریزی سے یورپ کی تاریخ بھری ہوئی ہے، لیکن مغلون کے عہد مین ایسی مذہبی جنگ کی کوئی مثال نہین ملتی، بادشاہ مذہب اسلام کا محافظ اور نگہبان ضرور سمجھا جاتا تھا، لیکن اُس نے کبھی اپنی غیر مسلم رعایا کے عقائد پر کوئی دباؤ نہین ڈالا، بابر سے لیکر اورنگزیب کی تخت نشینی تک مغلون کی تاریخ تنگ نظری اور فرقہ پرستی کی تلخی سے تقریباً پاک ہے،

مغلون مین دلندیزیون سے زیادہ رواداری تھی، یورپین مورخ اورم کا بیان ہے کہ دلندیزیون نے متعصبانہ مذہبی پالیسی اختیار کی تھی، اور جب مرہٹون نے عیسائی مذہب اختیار کرنے

سے انکار کیا تو بہت سے مرہٹہ خاندانوں پر بڑی سختیاں کی گئیں، ان دلندیزیوں سے سیواجی کی مخالفت کی ایک وجہ یہ بھی تھی، وہ دلندیزیوں کو اپنے مذہب کا دشمن سمجھتا تھا، اسی انتقام میں اس نے ہندوستان کے مغربی حصہ کے دلندیزیوں سے چوتھ وصول کیا،

رعایا نوازی | مغلوں کے زمانہ میں وقتاً فوقتاً جو شاہی اعلانات ہوتے رہے، اُن سے مغلوں کی رعایا پروری کا اندازہ ہوتا ہے، اکبر کہا کرتا تھا کہ ظلم ہر شخص کے لئے ناجائز ہے، اور بادشاہ کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور بھی ناروا ہے کہ وہ تو دنیا کا محافظ ہوتا ہے، جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے،

بہر کجا بی خلق خدا شب نکنم دیدہ بخواب آشنا

از پئے آسودگی جملہ تن رنج پسندم بہ تن خویشتن

اورنگزیب نے شاہ جہان کو اس کی معزولی کے بعد ایک موقع پر لکھا تھا کہ خداوند تعالیٰ اس کو کچھ عطا کرتا ہے جس میں رعایا کی حالت سدھارنے اور اُن کی حفاظت کی صلاحیت ہوتی ہے، حکمرانی کے معنی لوگوں کی نگہبانی ہے، نہ کہ تن پروری اور عیاشی،

مغل اپنے ان اقوال کا ثبوت عمل سے دیتے تھے، ان کا نظام سلطنت نہ صرف مستحکم بلکہ فائدہ مند بھی تھا، حکومت کا استحکام اور اقتدار لوگوں کے حق میں بہت مفید تھا، اسی کی بدولت ایک عرصہ تک ملک میں امن اور اقتصادی خوشحالی رہی،

مغلوں کا طرز حکومت اگرچہ مطلق العنان تھا، لیکن اس زمانہ کے لئے یہی طرز حکومت موزوں تھا، حکومت کے لئے عوام کی نمائندہ جماعت کی ضرورت سمجھی نہیں جاتی تھی، تمام لوگ اس طرز زندگی سے مطمئن تھے، جس کو وہ اپنی خواہش سے اختیار کر لیتے تھے، حکومت کا انحصار بظاہر فوجی قوت پر تھا، لیکن عملاً وہ فیض رسان تھا، رعایا کی تمام پرانی چیزیں باقی رہنے دی گئیں، ان کے رسم و رواج کو قائم رکھا گیا، جس سے ملک کو ترقی ہوتی رہی، اور لاقانونیت کو روکے رکھا گیا، امن و امان پر زیادہ

زور دیا گیا، مغلون کے شخصی استبداد مین مستعدی اور ہوشمندی تھی، اس لئے وہ کامیاب رہا، ازمنۂ وسطیٰ مین اصلی خطرہ انارکی یعنی طوائف الملوکی کا پھیلنا تھا، کسی کے ہاتھ مین تمام اقتدار کا مرکوز ہوجانا خطرہ نہین سمجھا جاتا تھا، مغلون نے ملک مین تخریبی عناصر کو کبھی بڑھنے نہین دیا، قانون کا اقتدار اعلیٰ کامیابی کے ساتھ ہر حال مین برقرار رکھا گیا، گو زیادہ تر بادشاہ کی خواہش ہی کا نام قانون ہوتا ہے لیکن لوگون نے اس زمانہ کے طرزِ حکومت کو آسانی سے تسلیم کرلیا تھا، جو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طرز اُن کے سیاسی خیالات و رجحانات کے مطابق تھا، اس لئے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ مغل مطلق العنان ضرور تھے لیکن اس کے ساتھ بڑے مدبر اور سیاست دان بھی تھے،

"ص، ع"

کثیر التصانیف مصنفین

قدیم مسلمان علما و مصنفین مین بہت سے ایسے اہلِ قلم پیدا ہوے جن کی تصانیف کی تعداد سینکڑون سے متجاوز ہے، اور ان کی تحریر کا اوسط روزانہ کئی کئی جز پڑتا ہے، ہر قوم اور ہر زمانہ مین کثیر التصانیف اہلِ قلم موجود رہے ہین، چنانچہ یورپ کے بہت سے ایسے مشہور ناول نگار ہین، جنھون نے بے شمار ناول لکھے، ڈوما نے بارہ سو جلدین لکھین، لوپ ڈی وی گا نے اٹھارہ سو ڈرامے لکھے، عورتون مین مرجوری بوون کی تصانیف مین ایک سو ساٹھ ناول ہین، وہ کبھی مرد اور کبھی عورت کے نام سے اپنی کتابین شائع کرتی تھی، مسز ہمفری وارڈ اور ایولن ایورٹ گرین ننو ناولون کی مصنفہ ہین، مسز اولی فینٹ نے ایک سو بیس ناول لکھے، ای فلپس اوپنہم کے نام سے تقریباً دو سو ناول شائع ہوے، ایک فرانسیسی اہلِ قلم ایل ہرمنٹ کے ناولون ڈرامون، افسانون اور مضامین کی تعداد سو سے زیادہ تھی، رابرٹ ہوپ مون کریف نے دو سو کتابین تصنیف کین، وہ بچون کے لئے چھوٹے چھوٹے قصے بھی اسکارٹ ار، ہوپ کے نام سے لکھا کرتا تھا، پادری اس بارنگ گولڈ نے

تین سو بیاری کتابین لکھین، ان مین بہت سی ایسی بھی ہین جو برسون کی تحقیقات کا نتیجہ ہین، مشہور ناول نگار جی۔ بی برجن نے فوتے کتابین کہ کر شہرت حاصل کی، ایڈگر والیس زود نویسی مین ضرب المثل تھا، وہ خود لکھنے کے بجاے بول کر دوسرون سے قلمبند کراتا تھا، اس نے ڈیڑھ سو ناول، چودہ ڈرامے اور ہزارون مضامین اور افسانے لکھے، اس کا خود بیان ہے کہ اُس نے ۱۹۲۷ء مین یعنی ایک سال مین چھ ڈرامے اور چھبیس ناول لکھے، ایچ جی ویلس کی تصانیف کی فہرست بڑی لمبی ہے، اس کے ناول، افسانے، اور دوسری سیاسی اور عمرانی تصانیف کی تعداد ایک سو اسی سے اوپر ہے، ارنلڈ بینٹ نے زیادہ عمر نہین پائی، اور اپنی مختصر زندگی مین ستر کتابین لکھین، سر والٹر اسکاٹ اور مسز کریک دونون نے ساٹھ ساٹھ کتابین تالیف کین، والٹے نے ایک سو چالیس کتابین اپنی یادگار چھوڑین، ایل زنک نے پچاسی کتابین تصنیف کین، ان مین بعض بہت ضخیم تھین، کون راڈ ایک دن مین ۳۵۰۰ اور ڈبلیو ڈبلیو جیکبس ۲۵۰۰ الفاظ لکھا کرتا تھا، بعض مشہور ناول نگارون نے ہزار الفاظ تک روزانہ لکھے ہین، ایڈن فل پوٹس کی عمر اسی سال سے زیادہ تجاوز کر چکی ہے، برنارڈ شا کا سن بھی نوے سال سے زیادہ ہے، اور ان دونون کی زندگی مین مختلف قسم کے مشاغل رہے ہین تاہم وہ اب تک لکھتے رہتے ہین، فل پوٹس نے بیس ناول اور بیسیون ڈرامے لکھے اور برنارڈ شا کے ڈرامے کی تعداد تو گنی جاسکتی ہے، لیکن اس کے مقالات تنقیدی مقالمین، ہجوین، بے شمار خطوط اور تقریرون وغیرہ کا شمار آسان نہین ہے، وہ بڈھا ہو چکا ہے، لیکن کام کرنے مین اب تک نہین تھکتا، ٹروپ سامنے گھڑی رکھ کر ہر تیرہ منٹ کے بعد ڈھائی سو الفاظ لکھتا ہے، وہ عموماً صبح کے ناشتے سے پہلے لکھا کرتا ہے، اُس نے جو ناول لکھے ہین، وہ بہت مفید ہین، زین گرے نے بھی بہت سی دلچسپ اور حیرت انگیز کتابین لکھین، لکھتے وقت اس مین مشین کی جیسی تیزی اور باقاعدگی ہوتی ہے، اگاتھا کرسٹی نے پچاس طلسمی ناول لکھے، جو سب کے سب بہت

مشہور ہوئے، بوتھ ٹارکنگٹن ۱۸۹۹ء سے اپنی موت تک ہر سال ایک کتاب لکھ کر شائع کرتا رہا؛ جی سی پی فرانس کی مشہور افسانہ نگار خاتون ہے، یہ کریمیا کی جنگ سے پہلے پیدا ہوئی، اور ۱۹۲۷ء تک برابر لکھتی رہی،

بہت سے ایسے اہل قلم گذرے ہین جنھون نے بہت کثرت سے لکھا لیکن بہت زیادہ مشہور نہ ہوسکے، ایک ناول نگار نے ۱۹۳۵ء اور ۱۹۳۸ء کے درمیان تیس ناول لکھے، لیکن اس نے زیادہ شہرت نہین پائی،

ص، ع

اقبال کامل

از

مولانا عبد السلام صاحب ندوی

ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ وشاعری پر اگرچہ بکثرت مضامین، رسالے اور کتابین لکھی گئین لیکن ان سے اُن کی بلند پایہ شخصیت واضح اور مکمل طور پر نمایان نہ ہوسکی یہ کتاب اس کی کو پورا کرنے کیلئے لکھی گئی ہے، اس مین ان کے مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارنامون کے اہم پہلوؤن کی تفصیل کی گئی ہے، پہلے سوانح حیات ہین، اس کے بعد ان کی اردو شاعری، پھر فارسی شاعری پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ مفصل تبصرہ کیا گیا ہے، اور اُن کے کلام کی تمام ادبی خوبیان دکھلائی گئی ہین، پھر ان کی شاعری کے اہم موضوعون یعنی فلسفۂ خودی، فلسفۂ بیخودی، نظریۂ ملیت تعلیم، سیاست، صنفِ لطیف یعنی عورت، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے، ضخامت چار سو صفحے قیمت ۷ے

"منیجر"

ادبیات

رنگِ تغزل

از

جناب عارف عباسی بلیاوی

"معارف کے ذریعہ متعدد شعراء ادبی حلقہ میں روشناس ہوئے آج ایک ایسے نوجوان و ہونہار شاعر کا تعارف کرایا جاتا ہے جس سے کم لوگ واقف ہونگے، نئے شعراء میں بہتوں نے جگر کے رنگ میں کہنے کی کوشش کی مگر وہ نقالی سے آگے نہ بڑھ سکے لیکن عارف کا تغزل جگر کے رنگ میں اتنا ڈوبا ہوا ہے کہ اگر تخلص موجود نہ ہو، تو یہ امتیاز کرنا مشکل ہے کہ یہ جگر کی غزل نہیں ہے، ابتدائی مشق میں یہ رنگِ تغزل اُن کے مستقبل کے لئے فال نیک ہے"۔ "م"

جس جگہ عشق کو احساسِ نظر ہوتا ہے
عالمِ حسن وہیں زیر و زبر ہوتا ہے

لالہ و گل کہیں خورشید و قمر ہوتا ہے
حسن ہر رنگ میں فردوسِ نظر ہوتا ہے

ایک وہ بھی طلبِ دوست کی منزل ہے جہاں
وقت خود ساتھ مرے گرمِ سفر ہوتا ہے

کعبہ بھی راہ میں ہے، جلوہ گہِ ناز بھی ہے
دیکھنا ہے کہ مرا عزم سفر ہوتا ہے

اب مٹی جاتی ہے یہ لذتِ نالہ کی بھی
کیا قیامت ہے کہ آہوں میں اثر ہوتا ہے

ہر طرف چشمِ تمنا نگراں ہے لیکن
تیرا جلوہ کہیں پابندِ نظر ہوتا ہے

وسعتِ کون و مکاں ڈوب کے رہ جاتی ہے
وہ بھی عالم کبھی اے دیدۂ تر ہوتا ہے

میری اس نیند پہ بیداری کو نین نثار آنکھ لگتے ہی ترے پاؤں پہ سر ہوتا ہے

ہائے اس سوختہ سامان کا مقدر عارف

ایک جلوہ مین جو برباد نظر ہوتا ہے

حشرِ جذبات

از جناب ثاقب صاحب کانپوری

جہانِ عشق مین یہ انقلاب کیا کم ہے قرار ہو کہ نہ ہو اضطراب کیا کم ہے

شعاعِ حسن سے رنگین نقاب کیا کم ہے کہ تیرے لطف سے تیرا عتاب کیا کم ہے

سمجھ نہ عشق مین آزار اس ودیعت کو دلِ خراب بحالِ خراب کیا کم ہے

سکونِ دل کا تو مژدہ کسی کو اور سنا ترے خیال مین یہ پیچ و تاب کیا کم ہے

ہے آشیان مین بھی بیچارگی کا اک عالم نہین قفس تو قفس کا خواب کیا کم ہے

وہ جس نے جادۂ الفت مین جان تک دیدی کسی کی راہ مین وہ کامیاب کیا کم ہے

یہی ہے عشق مین وجہ سرور کیف و نشاط حسین آنکھون مین یہ رنگِ خواب کیا کم ہے

کرون مین اپنی تباہی کا اس سے کیا شکوہ ہجوم غم مین وہ چشم پرآب کیا کم ہے

وہی ہے اب بھی ترے التفات کا عالم خرابِ عشق ترا کامیاب کیا کم ہے

نہین ہے بحر مین نظارۂ جمال اگر کنارِ آب و شبِ ماہتاب کیا کم ہے

حیاتِ عشق تھی تابندہ جس سے اے ثاقب

یہ سوچتا ہون کہ وہ اضطراب کیا کم ہے

مطبوعات جدیدہ

جامع المجددین از جناب مولانا عبدالباری صاحب ندوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۶۰ صفحے کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد ۱۔ صرتبہ:۔ شبستان قدم رسول، ہارڈنگ روڈ لکھنؤ،

اسلام چونکہ آخری اور ابدی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی نیا نبی اور اسلام کے بعد کوئی نیا دین آنے والا نہیں ہے، اور امت مسلمہ ساری دنیا کی قوموں کے لئے شاہد اور نمونہ بنائی گئی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ ہر زمانہ میں ایسے صلحاء و اخیار و مصلحین و مجددین پیدا کرتا رہا، جو اسلام اور مسلمانوں کی تجدید و اصلاح کا فرض انجام دیتے رہے، اس مفہوم کی حدیثیں بھی ہیں، اور اسلام کی تاریخ بھی اس پر شاہد ہے، اس دور کے مسلمانوں کی پوری زندگی اسلام کی شاہراہ سے ہٹ گئی ہے اور مذہب و معاشرت، حکومت و سیاست، علوم و فنون، عقائد و عبادات، معاملات و اخلاق زندگی کا ہر شعبہ اصلاح کا محتاج ہے، اس لئے یہ زمانہ بھی مصلحین و مجددین سے خالی نہیں، اور بہت سے صلحاء و اخیار اپنے اپنے نقطۂ نظر سے اصلاح و تجدید کی خدمت انجام دیتے رہے، لیکن جو جامعیت حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ کی تجدید و اصلاح میں پائی جاتی ہے، وہ کسی دوسرے مصلح میں نظر نہیں آتی انھوں نے خواص و عوام، علماء و جہلاء، عورت مرد، ہر طبقہ اور ہر صنف کے معاملات و مسائل اور مذہب و معاشرت و سیاست وغیرہ کے دقیق سے دقیق مسائل سے لے کر، روزانہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں تک کی جن کی جانب نظر بھی نہیں جاتی اصلاح فرمائی ہے، اور دین و دنیا کے جملہ معاملات کے متعلق صحیح اسلامی تعلیمات کو پیش کر کے اسلامی زندگی کا ایسا قدآدم آئینہ بنا دیا ہے جس میں ہر مسلمان اپنی صورت دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ کہاں تک

اسلام کے مطابق ہے، اور اس کے کون کون سے گوشے اصلاح کے محتاج ہیں، فاضل مرتب نے جو اس سے پہلے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ کی تصانیف و مواعظ و ملفوظات سے سلوک و تصوف کی تجدیدات کو مرتب کر چکے ہیں، اب جامع المجددین کے نام سے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی زندگی کے متعلق حضرت کی ہمہ گیر اصلاحات و تجدیدات کو مرتب فرمایا ہے، اور اپنی تعلیق و تشریح سے اس کو نہایت مؤثر و دلنشین بنا دیا ہے جس کے ذریعہ ہر مسلمان اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کی اصلاح کر کے اپنی زندگی کو صحیح اسلامی سانچہ میں ڈھال سکتا ہے، مباحث و مسائل کے تنوع کثرت اور جامعیت کا اندازہ کتاب کے مطالعہ ہی سے ہو سکتا ہے، کتاب کے شروع میں حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کے حقیقت شناس قلم سے ایک فاضلانہ اور حکیمانہ مقدمہ ہے، اس میں ایک طرف منصب تجدید کی حقیقت و ضرورت اس کی تاریخ اور حضرت مولینا رحمۃ اللہ کی تجدیدی جامعیت کی تفصیل ہے، دوسری طرف ان خطرات کو بھی دور فرمایا ہے، جو تجدید و مجددیت کے عقیدہ میں افراط و تفریط سے پیدا ہو سکتے ہیں، اور خود مولانا رحمۃ اللہ کی تحریروں سے اس کی وضاحت فرما دی ہے کہ کسی مجدد کا مجدد ہونا ذمانی اور یقینی مسئلہ نہیں ہے، اور نہ اس کے دعوی پر موقوف ہے، بلکہ خواص امت کو اس کے دینی کارناموں کی بنا پر یا خود اس شخص کو اپنی کوششوں کی مقبولیت کی بنا پر یہ گمان ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس صدی کا مجدد بنا کر بھیجا ہے (ص ۲۰) یا "مجدد کو مجدد ماننا ایمان کا ادنیٰ جز بھی نہیں ہے، خصوصاً کسی ایک زمانہ کے کسی خاص مجدد کو مجدد تسلیم کرنا بھی ضروری نہیں ہے" (ص ۲۰) بلکہ یہاں تک احتیاط فرمائی ہے، کہ "اس تالیف کا مدعا کسی شخص کی مجددیت کے دعوی کی تشہیر یا منصب تجدید کی دعوت و تلقین نہیں ہے، بلکہ یہ مصنف و مرتب (جامع المجددین) کی عقیدتمندانہ تعبیر ہے، کہ وہ حضرت (مولانا اشرف علیؒ) کی اصلاحی مساعی کو تجدیدات کے نام سے یاد کرتے ہیں (ص ۲۰)" ان تشریحات کی اس لئے ضرورت تھی کہ مجددیت کے عقیدہ میں افراط و تفریط نے بڑے بڑے فتنے پیدا کئے ہیں، اسی لئے خود حضرت مولانا رحمۃ اللہ نے بھی دوسری اصلاحات کی طرح اس عقیدہ کی

بھی اصلاح کی ضرورت سمجھی تھی، یہ کتاب اپنے گوناگون فوائد کے لحاظ سے مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق تو تھی ہی اسکے بہت سے مسائل سے غیر مسلم بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ مصنف کو اس خدمت دین کی جزائے خیر دے،

نور المنور از مولانا غوث علی شاہ صاحب قادری چشتی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۳ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت نفیس قیمت مجلد سے رغیر مجلد عار پتے :- (۱) بیت المنور چنچل گوڑہ (۲) مکتبہ ابراہیمیہ عابد روڈ حیدرآباد دکن،

اس کتاب میں مسئلہ وحدۃ الوجود کا اثبات اور اس کی تشریح کی گئی ہے، دیباچہ نگار کا بیان ہے کہ اس میں توحید حقیقی (وحدۃ الوجود) خود شناسی وحق شناسی، کا صحیح راز کتاب وسنت کے مطابق آسان فہم ہے، دوران عام جہال، غلط فہم بے تحقیق اور ادھ کچے اسلامی خیالات کے مدعیوں کی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا ہے، جو عنوان وحدۃ الوجود کے صحیح اعتبار کو جو مترادف توحید حقیقی ہے، یعنی فہم لا الہ الا اللہ اور آیت ہو میں ہے، اپنی نافہمی سے غیر اسلامی اور ہندی وغیرہ سمجھتے ہیں" راقم نے اس کتاب کو غور وتامل سے پڑھ کر سمجھنے کی کوشش کی لیکن یہ اسکا تصور فہم ہے، یا مصنف کا انداز بیان اتنا پیچیدہ ژولیدہ اور متصوفانہ کہ اس کا بیشتر حصہ سمجھنے سے قاصر رہا، یہ انداز تحریر عوام کیا خواص اور تعلیم یافتہ طبقہ کے فہم سے بھی باہر ہے جن لوگوں کو اس کا ذوق ہو وہ شاید اس چیستان کو سمجھ سکیں، اور اس میں ان کی دلچسپی کا کوئی سامان ہو اور نہ عام مسلمانوں کے لئے اس قسم کی کتابوں سے کوئی فائدہ نہیں، بلکہ ان سے گمراہی کا اندیشہ ہے اور جو لوگ توحید کے اس مقام پر فائز ہیں، اُن کے لئے اس کے اثبات کی ضرورت نہیں،

کارنامہ اسلام از جناب میاں بشیر احمد صاحب بی اے بار ایٹ لا اڈیٹر ہمایوں تقطیع اوسط ضخامت ۲۱۵ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ مکتبہ :- رسالہ ہمایوں نمبر ۳۲ لارنس روڈ لاہور،

مصنف نے جن کو تاریخ اسلام سے ذوق اور اس پر اُن کی نظر بھی ہے اس کتاب میں اسلام اور مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا ہے، اور دنیا میں اسلام کے انقلاب انگیز اثرات و نتائج مسلمانوں کے سیاسی علمی اور تمدنی کارناموں، اور تاریخ اسلام کی تمام قابلِ ذکر حکومتوں کا اجمالی نقشہ اور ان کے عروج و زوال دکھایا ہے اور قیام پاکستان تک ہندوستان کے مسلمانوں کی مختصر سرگذشت بیان کی ہے جس سے مسلمانوں کا سیاسی مدوجزر سامنے آجاتا ہے، اس کو رنگین نقشہ سے بھی دکھایا گیا ہے، کتاب کے آخر میں مرحوم اقبال کے منتخب ولولہ انگیز اشعار بھی دیدیئے ہیں، اس کے مطالعہ سے مسلمانوں کے شاندار ماضی کے ساتھ ان کا مستقبل بھی درخشاں نظر آتا ہے، البتہ وہابی سنوسی اور اتحاد اسلامی کی مذہبی اصلاحی تحریکوں میں بانی تحریک کو شامل کرنا تعجب انگیز ہے، اس کو سرے سے اسلام ہی کو کوئی علاقہ نہیں، تو اصلاح کا کیا ذکر ہے،

کلمۂ طیبہ کی حقیقت از مولانا منظور صاحب نعمانی اڈیٹر الفرقان تقطیع چھوٹی ضخامت ۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۰ پتہ:- مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ،

کلمۂ طیبہ کا حقیقی مقصد محض زبان سے اللہ تعالیٰ کی توحید اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہیں ہے، بلکہ اس مختصر کلمہ میں اسلامی عقائد و اعمال کی پوری روح پوشیدہ ہے البتہ اس کے مدارج ہیں، زبان سے اقرار اس کا ادنیٰ ترین درجہ ہے، اور آخری درجہ تفویض کامل یعنی تمام اعمال اور پوری زندگی کو مرضی الٰہی کے تابع کر دینا ہے، اس رسالہ میں اسی نقطۂ نظر سے کلمۂ طیبہ کی تشریح کی گئی ہے، اور غیر اللہ کی نفی، توحید الٰہی اور رسالت محمدی کی تصدیق کا حقیقی مفہوم و منشاء، اس کے مدارج، اس کے حصول کی تدبیر، عقائد و اعمال میں اس کے آثار و نتائج، محبت رسول وغیرہ کلمہ طیبہ کے تمام مضمرات، و متعلقات کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے، رسالہ گو مختصر لیکن نہایت مفید، اور مسلمانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، انداز بیان مؤثر و دلکش ہے،

عربی سیکھنے کا آسان طریقہ از جناب مولوی عبدالرحمٰن صاحب طاہر سورتی، فاضل دیوبند

تقطیع اوسط، ضخامت ۱۹۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۴ غیر مجلد ۳

پتہ:- انجمن ترقی عربی ہند، محمد علی روڈ بمبئی، ۳

یہ اردو مین عربی قواعد کی کتاب ہے، مصنف نے اس مین جدید طرز کے مطابق صرف و نحو کے اسباق مرتب کیے ہین، کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو عربی زبان کا صحیح مذاق اور تعلیم کا بھی تجربہ ہے، اور انھون نے اس نئی کتاب کی تالیف مین دونون امور کا لحاظ رکھا ہے، اردو مین عربی قواعد کی جتنی کتابین نظر سے گذرین ان سب مین یہ بہتر نظر آئی، اس کے ذریعہ جلد اور آسانی سے عربی زبان سیکھی جاسکتی ہے، خصوصاً جو تعلیم یافتہ اشخاص عربی سیکھنا چاہین ان کے لیے زیادہ کارآمد ہے،

نوائے حیات (حصہ دوم) از جناب یحییٰ اعظمی تقطیع بڑی، ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ،

کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد للعہ غیر مجلد ہے، پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ

ناظرین معارف جناب یحییٰ اعظمی کے کلام سے پوری طرح واقف ہون گے، کئی سال ہوئے اس کا مجموعہ نوائے حیات کے نام سے شائع ہوا تھا، اب مزید ترمیم واضافون کے ساتھ دوسرا ایڈیشن نکلا ہے، اس مجموعہ کا بیشتر حصہ منظومات پر مشتمل ہے کچھ غزلین بھی ہین، مصنف کے کلام مین بڑا اعتدال و توازن ہے، جو نئے شعراء مین کم پایا جاتا ہے، اس مین مذہبی و ملی روح بھی ہے، وطنی و قومی حرارت بھی، جذبات و تاثرات اور واقعات و مناظر کی مصوری بھی، تغزل کی رنگینی و لطافت بھی، اور مشق و ممارست کی پختگی بھی، غرض یہ مجموعہ شاعری کے تمام ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ اسم بامسمّٰی اور صاحب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

*

جلد ۶۶ ماہ ذی قعدہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ ستمبر ۱۹۵۰ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۶۲-۱۶۴

مقالات

الجزیہ	جناب مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین،	۱۶۵-۱۹۰
اعجاز القرآن	جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ،	۱۹۱-۲۱۳
ملا خیر اللہ فہندس کے چند نئے رسائل	سید سلیمان ندوی	۲۱۴، ۲۱۸

باب المراسلہ والمکاتبہ

طنز لطیف	جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری	۲۱۹-۲۲۲

استفسار و جواب

تقویم الابدان	"م"	۲۲۳، ۲۲۴

ادبیات

دورِ حاضر اور اسوۂ فاروقی	جناب یحییٰ اعظمی	۲۲۵، ۲۲۷
غزل	از جناب فضل اختر صاحب سیتاپوری	۲۲۷

باب التقریظ والانتقاد

"تعیین الارواح"	سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے	۲۲۸، ۲۳۵
مطبوعاتِ جدیدہ	"م"	۲۳۶، ۲۴۰

شذرات

افسوس ہے کہ ہماری بزم دوشین کی وہ آخری یادگار شمع بھی خاموش ہوگئی جس سے مدتون بزم کمال منور رہی یعنی ۱۱ اگست کو نواب معدیار جنگ مولینا حبیب الرحمن خان شروانی نے چھیاسی سال کی عمر مین اس خاکدان سفلی کو داع کہا عمر طبعی کو پہنچنے کے بعد موت ناگزیر ہے لیکن بعض مرنے والون کے ساتھ ایک پورا عہد اور پوری تاریخ دفن ہوجاتی ہے مولانا شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات انہی مین ہے وہ مشرقی و اسلامی تہذیب و شرافت کا نمونہ اور علم و عمل فضل و کمال دین و تقوی، وقار و متانت اخلاق و تواضع کا پیکر اور تنہا ایک عالم تھے، کامل ساٹھ سال تک مسلمانون کی قومی زندگی سے وابستہ رہے اس لئے اُن کی وفات شخصی نہین بلکہ قومی حادثہ اور ایک مرتفع کمال اور قدیم تہذیب و شرافت کا ماتم ہے

اللہ تعالیٰ نے اُن کو دنیاوی دولت و جاہت سے بھی نوازا تھا، وہ خاندانی رئیس تھے، اور اپنے اوصاف مین دور زوال کے امراء سے بالکل مختلف تھے وہ خود صاحب علم، اصحاب علم کے قدردان، علم دوست، علما نواز، اور علم و فن کے شیدائی اور سرپرست تھے اُن کی پوری زندگی علمی مشاغل مین گذری مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ان کا نمایان حصہ رہا، وہ ابتدا سے مدرسۃ العلوم مسلم یونیورسٹی اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے رکن رکین معاون و مددگار آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری انجمن ترقی اردو کے سرپرست اور مجلس دار المصنفین کے صدر نشین تھے عرصہ تک ریاست حیدرآباد کے شعبۂ امور مذہبی کی صدارت پر فائز رہے اُن کے خدمات کی فہرست بہت طویل ہے کوئی علمی و تعلیمی ادارہ انکی اخلاقی امداد و اعانت سے محروم نہ تھا، مسلم یونیورسٹی نے ان خدمات کے اعتراف مین ڈاکٹریٹ کی ڈگری عطا کی،

وہ عربی کے عالم، فارسی کے ذوق شناس، انگریزی سے واقف، اردو کے صاحب طرز ادیب اور نکتہ سنج

سخن فہم اور سخن گو تھے ان کا ادبی ذوق بڑا ستھرا اور پاکیزہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانوں کی علمی تاریخ سے انکو عشق تھا، ان کا مشغلہ خالص علمی تھا، مختلف مذہبی، علمی، ادبی اور تاریخی موضوعوں پر دو درجن سے زیادہ چھوٹی بڑی تصانیف ایک مجموعۂ مضامین مقالات شروانی اور دیوان فارسی ان کی علمی یادگار ہیں، نادر کتابوں کا بڑا شوق تھا خود اپنی تلاش و محنت اور زر کثیر صرف کرکے ایک عمدہ کتب خانہ جمع کیا، جو نوادر کتب کا بیش قیمت ذخیرہ ہے، اس کو اپنی زندگی میں مسلم یونیورسٹی پر وقف کر گئے تھے،

ان کی ذات میں جدت و قدامت کا بڑی لطیف امتزاج تھا، وہ خود پرانی تعلیم و تہذیب کی یادگار لیکن زمانہ کے حالات و ضروریات سے واقف تھے ان کا وطن علی گڈھ مغربی تعلیم کا مرکز تھا، اس لئے وہ جدید تعلیم اور نئی مفید تحریکوں کے حامی و مددگار تھے لیکن اس کے سحر سے مرعوب و مسحور نہ تھے، اور جدید تعلیم و تہذیب میں بھی اسلامی روح دیکھنا چاہتے تھے قدیم تہذیب سے والہانہ شیفتگی تھی ان کی تحریروں میں جہاں اس کا ذکر آجاتا، اور ان کی بہت کم تحریریں اس ذکر جمیل سے خالی ہوتی تھیں، ان کا قلم بے قابو ہو جاتا، اور ان کی تحریر قدیم تہذیب کا مرثیہ بن جاتی،

صورۃً خوش جمال، کشیدہ قامت، اور طبعاً نفاست و لطافت پسند تھے، وضع قطع، لباس، رفتار و گفتار نشست و برخاست ہر چیز میں تہذیب و نفاست نمایاں تھی، بڑے خوش لباس اور جامہ زیب تھے بڑھاپے کے نور نے اس میں اور زیادہ لطافت اور جذب و کشش پیدا کر دی تھی زندگی کے تمام معمولات میں وضعداری کی شان تھی پوری زندگی کسی معمول میں کوئی فرق نہیں آیا، اُن کے تعلقات بہت وسیع اور مختلف و متضاد مذاق و مشرب کے لوگوں کے ساتھ تھے، جن کو آخر تک نباہا، سیاست سے طبیعت کو ذوق و مناسبت نہ تھی، اور اس خارزار سے ہمیشہ دامن بچایا، لیکن بہت سے اصحاب سیاست سے اُن کے دوستانہ تعلقات تھے جو برابر قائم رہے اور ان پر اختلاف رائے و خیال کا اثر نہ پڑنے پایا، مولانا شبلی مرحوم سے اُن کے بڑے گہرے اور مخلصانہ تعلقات تھے، جو اُن کے بعد دارالمصنفین کے حصہ میں آئے اور

آخر تک برابر قائم رہی، وہ دارالمصنفین کے محض قانونی صدر نہ تھے، بلکہ اس کے اور اس کے کارکنون کیساتھ ان کو دلی تعلق تھا، چنانچہ ہر سال مین کئی مرتبہ اس اجڑے دیار مین آنے کی زحمت گوارا کی، جب آتا ہوتا تو بلا لحاظ عمر و مرتبہ ہر شخص کی قیامگاہ پر جاکر ملتے، اور بڑی شفقت و محبت سے خیریت و حالات پوچھتے اب اس وضعداری کی مثال کہان ملیگی

مرحوم کی ذات پر ایک عزیز دور اور اس کی خصوصیات کا خاتمہ ہو گیا جس کا ذکر اب صرف تاریخ کے اوراق مین ملے گا، اللہ تعالیٰ اس مرقع کمال کی تربت پر رحمت و مغفرت کے پھول برسائے اَللّٰھُمَّ صَبِّبْ عَلَیْہِ شَآبِیْبَ رِضْوَانِکَ بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ۔

دارالمصنفین کے ساتھ مرحوم کے گوناگون تعلقات تھے، اس لئے آیندہ کسی نمبر مین انکے تفصیلی حالات پیش کئے جائینگے

اخبار نوائے وقت لاہور کے ایک نوٹ سے معلوم ہوا تھا کہ سیوہارہ کے کسی تاجر کتب نے سرآقبال مرحوم کی بعض کتابین چھپوالی ہین لیکن پھر اخبار الجمعیۃ کے بیان سے معلوم ہوا، کہ کتابین حیدرآباد کے کسی تاجر نے چھپوائی تھین اور سیوہارہ کے تاجر نے صرف اُن کے ٹائٹل چھپوائے ہین، جس نے بھی کتابین چھپوائی ہون ہندوستان کے کسی شخص کا پاکستان کی کتابین چھپوانا صریحاً نازیبا اور بڑا اخلاقی جرم ہے، اگر یہ صورت قائم رہی تو ہندوستان اور پاکستان دونون کے مصنفون اور علمی و تجارتی اداروں کو بڑا نقصان پہنچے گا، اور قانونی بندش کے بغیر محض اخلاقی اثر سے اس کا انسداد نہین ہو سکتا، امید دونون ملکون کا نفع و نقصان اس سے متعلق ہے اس لئے انکی حکومتون کو اس کی جانب توجہ کرنا چاہئے، اور ایسا قانون بنا دینا چاہئے کہ ایک ملک کی کتابین بغیر اجازت کے دوسرے ملک مین نہ چھپ سکین، اور اخبارات کو ایسے جری اور بددیانت ناشرون کا پردہ فاش کرنا چاہئے، کہ اس سے کچھ تو اُن کو عبرت حاصل ہو،

مقالات

الجزیہ

(۳)

از مولانا سعید انصاری صاحب سابق رفیق دار المصنفین

یہ ثابت ہونے کے بعد کہ جزیہ موجودہ معاشی معیار سے ایک بہترین محصول ہے، آیندہ یہ دکھایا جائیگا کہ اسلام کے علماے معاشیات نے اس پر کس حیثیت سے بحث کی ہے، ہم نے جہاں جزیہ کے سات نظریات بیان کئے ہیں، وہیں مبسوط کے حوالہ سے یہ بھی دکھایا ہے کہ جزیہ کی حیثیت محصول مکان کی ہے، یہ حیثیت کس طرح نمایاں کی گئی ہے؟ اس کا جواب آگے آتا ہے،

معاشیات کے متعدد مسائل کی طرح محصولِ مکان کی بحث بھی معمول سے زیادہ پیچیدہ اور توجہ طلب ہے تاہم مختصراً بعض اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے، محصول سے مراد مکان کی ملکیت کا خراج ہے، لیکن اسلام نے غیر مسلموں کے ساتھ جو رعایتیں کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ مکان کو غیر مسلم کی ملکیت[1] تصور کرتے ہوئے بھی وہ اس سے ملکیت کا محصول طلب نہیں کرتا، بلکہ سکونت کا محصول مانگتا ہے، اس طرح زمین کے متعلق مکاندار کی اصل پوزیشن کو قائم رکھتے ہوئے بھی اسلام وصولی محصول کے وقت اس کو کرایہ دار[2] فرض کرلیتا ہے،

---

[1] مبسوط ص ۱۸ جلد ۱۰ اقاما لیسکن دار نفسہ یہ مصنف کا نظریہ ہے، [2] ایضاً ص ۱۸ جلد ۱۰ ولا یمکن من اسکنی فی دارا لغیر الا بکراء یہ معاشی علماء کا خیال ہے،

اور اس پر ہلکا ٹکس لگاتا ہے، پھر دوسری رعایت یہ بھی ہو کہ ۲۰۰ درہم سے کم آمدنی والے پر کرایہ کا کوئی محصول نہین اور وہ مستثنی ہے،

مسلمان معاشی علما نے محصولِ مکان کے نظریہ کو اس طرح بیان کیا ہے کہ فقیر کو مکان کے لئے ایک درہم (چار آنہ) ماہوار دینا کافی ہے، متوسط الحال کو اس سے زیادہ کی ضرورت ہے' اس لئے اس کا دوگنا (دو درہم یا آٹھ آنے ماہوار) ہونا چاہئے، اور جو بہت بڑا غنی ہو، اس کی بھی یہی حالت ہو، (یعنی اس کو متوسط الحال سے بھی زیادہ بڑے مکان کی ضرورت ہوتی ہو) اس لئے دو درہم کا دوگنا چار درہم یا ایک روپیہ ماہوار اس کا کرایہ ہونا چاہئے، یہ نظریہ مبسوط (ص ۸، جلد ۱۰) مین درج ہے، اور اس کو پڑھ کر صاف معلوم ہوتا ہے کہ مکان کو مالی حالت کا معیار فرض کیا گیا ہے،

گذشتہ عنوان مین جن چھ قانونون کا حوالہ دیا گیا ہے، جزیہ محصول مکان ہونے کے بعد بھی ان کا پابند نظر آتا ہے، مثلاً اس کی بنیاد اوری یہ ہے کہ ۲۰۰ درہم سے کم مالیت والون پر عائد نہ ہونے کے باوجود اس کی مقدار معقول رہتی ہے، کفایت یہ ہو کہ اس کی فراہمی مین زیادہ خرچ نہین پڑتا، نہ مقدار معین سے زیادہ دینا پڑتا ہے نہ ترقی دولت اور مرفہ الحالی مین مزاحم ہے، کیونکہ اس کی شرح مناسب ہو، عدل یہ ہو کہ کرایہ مکان (دراصل خود مکان) کی حیثیت مکاندار (اب کرایہ دار) کی مالی حالت کے مطابق ہے، (بلکہ دراصل مکان کی حیثیت کرایہ سے بدرجہا زیادہ ہے) تغیر پذیری یہ ہے کہ معاشی ترقیون کے ساتھ مکانات کی قیمت اور کرایہ بڑھتا رہتا ہے، تعین خود اختیاری ہے، سہولت ظاہر ہے،

کیا جزیہ فرقہ وارانہ محصول ہو؟ | معاشیات مین یہ بھی معیوب سمجھا جاتا ہے کہ کسی ملک مین فرقہ وارانہ محاصل قائم کئے جائین، ہمارے ملک کے سفری پرندے جو بقول مسٹر ہولینڈ ہندوستان کے ذریعہ انگلستان کو تونگر بنانا چاہتے ہین[1]

---

[1] مالیات عامہ اور ہمارے افلاس کے اسباب ص ۳۷، از جے سی، کمان، ربا ایم اے، بی ایس سی، مترجمہ قاضی محمد حسین بجواله انڈین اوننگ ٹاک،

اسلام کو اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہین کہ اوس نے فرقہ وارانہ محصول غیر مسلمون پر قائم کیا تھا، اور اس طرح معاشی حیثیت سے ایک فاش غلطی کی تھی، نظریۂ تولیت کے یہ مبلغین جب اس الزام کا اعادہ کرتے ہین تو ان کے چہرون پر فرحت وانبساط کی لہرین دوڑنے لگتی ہین، ہم الزامی جواب کے طور پر اگرچہ اس سلسلہ مین انگلستان کی تاریخ کے اس دور کو پیش کرسکتے ہین، جس مین ٹیوڈر خاندان حکمران تھا، لیکن ایسا کرنے سے صرف ایک عیب کی پردہ پوشی ہوگی، جس کو ممکن ہے کہ معاشیین کے لائق اور تعلیم یافتہ دماغ اپنی توہین خیال کرین، اس لئے ہم اصل حقیقت پر متوجہ ہوتے ہین،

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ محصول کا مفہوم ادا کرنے کے لئے عربی زبان مین دو لفظ پہلے سے موجود تھے، خراج اور جزیہ، اور دونون فرقہ داری اور ذلت کے مفہوم سے خالی تھے، اسلام کے بعد زمین کے محصول کا اصلاحی نام خراج رکھا گیا، جو (Land Tax) کا مرادف ہے، انسانون کی آمدنی کے محصول (Income Tax) کے دو نام رکھے گئے،

(۱) اگر وہ بیسکیڑہ کی شرح یا دوسری شرحون سے قائم کیا گیا ہو، اور اس کا طریقہ آج کل کے محصول مجموعی (Graded Taxation) کا ہو تو اس کا نام زکوٰۃ ہے، اور یہ مسلمانون سے لیا جاتا ہے) اس مین بہت سی چیزون کی زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اور بحیثیت مجموعی زکوٰۃ دینے والون پر مساوی بار پڑتا ہے،

(۲) اور اگر محصول مجموعی کے طرز پر ہونے کے باوجود مختلف طبقون کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے مختلف شرحون سے قائم کیا گیا ہو، تو اس کا نام جزیہ ہے، اور غیر مسلمون سے لیا جاتا ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ اور جزیہ کے نامون کا فرق، فرقہ وارانہ جذبات کی وجہ سے نہین پیدا ہوا بلکہ شرح محصول کے اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہے، جس طرح انکم ٹکس، ہاؤس ٹیکس، امپیریل ٹیکس، پرسنل اینڈ فرنیچر ٹیکس وغیرہ علٰحدہ علٰحدہ نام شرحون کے مختلف ہونے کی وجہ سے رکھے گئے ہین،

کیا جزیہ بھاری محصول ہے؟ زکوٰۃ اور جزیہ کا بلا واسطہ متزاید محصول جو اسلام نے مسلمان اور غیر مسلموں پر لگایا تھا، اگرچہ شخصی حکومتوں کے زمانہ میں رائج نہیں ہو سکتا، تاہم یہ اسلام کا حیرت انگیز معجزہ ہے کہ اس کے تمام ادوارِ حکومت (یعنی جمہوریت و شخصیت) میں یہ محصول ہمیشہ قائم رہا، اور آج کل کے سرمایہ داروں کے علی الرغم اوس زمانہ کے دولتمندوں نے اوس کو بطیب خاطر برداشت کیا، اس محصول کا تقرر دو مختلف اصول کو پیش نظر رکھ کر ہوا ہے،

(۱) اسلامی سلطنت چونکہ مسلمانوں کی قومی سلطنت تھی، اس لئے محصول متزاید (Progressive Tax) کی وہ شکل اختیار کی گئی جس میں آمدنی کے اضافہ کے ساتھ ساتھ محصول کی رقم برابر بڑھتی جاتی ہے گو شرح ایک ہی رہتی ہے، اور اس محصول کا بار دولت مند طبقہ پر زیادہ پڑتا ہے،

(۲) اسلامی سلطنت چونکہ غیر مسلموں کی قومی سلطنت نہ تھی، اس لئے محصول متزاید کی دوسری شکل پسند کی گئی جس میں ہر طبقہ کی الگ الگ حسب حیثیت ایک ایک شرح ہوتی ہے، تاکہ مجموعی طور پر کسی ایک طبقہ پر زیادہ بار نہ پڑے، اور رقم محصول میں شرح کی وجہ سے اضافہ نہ ہو سکے،

چونکہ یہ دونوں محصول (زکوٰۃ اور جزیہ) آج کل کی اصطلاح میں انکم ٹکس (Income Tax) کہے جا سکتے ہیں، اس لئے مناسب ہوگا کہ انکم ٹکس سے جزیہ کا موازنہ کیا جائے تاکہ معترضین کو یہ نظر آئے کہ آج کل کا یہ مقبول ٹکس اسلام کے اس ناپسندیدہ محصول پر کیا فضیلت رکھتا ہے؟

انکم ٹکس کی شرح ۱۹۱۶ء تک یہ تھی،

ہزار سے لے کر دو ہزار سے کم تک	۴ پائی فی روپیہ
۲ ہزار " ۵ ہزار " "	۵ " "
۵ ہزار " ۱۰ ہزار " "	۶ " "
۱۰ ہزار " ۲۵ ہزار " "	۹ " "

۲۵ ہزار سے لے کر زیادہ	ارفی روپیہ،

۱۹۱۷ء مین سوپر ٹیکس ([illegible]) حسب ذیل ہوگا،

۲۵ ہزار سے لیکر ۵۰ ہزار تک	۱ ارفی روپیہ،
۵۰ ہزار سے ایک لاکھ	۲ ر ر
ایک لاکھ سے ڈیڑھ لاکھ	۲ ر ر
ڈیڑھ لاکھ سے دو لاکھ	۳ ر ر
دو لاکھ سے لیکر ڈھائی لاکھ تک	۳ ر ر
ڈھائی لاکھ سے اوپر	۴ ر ر

یہ بھی واضح رہے کہ اس مین عورتین، بچے، پاگل، بوڑھے، اپاہج، اور ہر صاحب آمدنی جو اکیس[1] سے اوپر کما تا ہو سب شامل ہین، ٹیکس سے کوئی مستثنیٰ نہین ہے، البتہ جو ایک ہزار روپیہ سے کم آمدنی رکھتے ہین، وہ مستثنیٰ ہین، خواہ تندرست ہون یا بیمار، عورتین ہون یا مرد، بوڑھے ہون یا بچے،

جزیہ کی شرح یہ تھی، اور ہمیشہ یہی رہی،

فاضل رقم ۵۰ تک	۵ سالانہ
۵۰ سے لے کر ڈھائی ہزار تک	۱۰ سالانہ
ڈھائی ہزار سے اوپر	۲۰ ر ر

یہ بھی خیال رکھنا چاہیے کہ عورتین، بچے، اور مخبوط الحواس جزیہ سے بالکل مستثنیٰ تھے، ان کے علاوہ اور لوگ جن کا کاروبار چلتا ہو خواہ اس کو وہ خود چلاتے ہون، یا کارندون کے ذریعہ سے انجام پاتا ہو،

---

[1] معارف، انکم ٹیکس کی موجودہ شرح اس سے کہین زیادہ ہے، جو شاید مضمون نگار کو معلوم نہ ہو سکی، اس حساب سے انکم ٹیکس کا بار ۱۰۰ کی شرح سے بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے،

جزیہ ادا کرتے تھے،

فرض کیجئے کہ ایک شخص کے پاس ایک ہزار روپیہ ہے، تو وہ پائی فی روپیہ کے حساب سے اس کو سال مین عشر ۱/۴۰ انکم ٹکس ادا کرنا پڑے گا، حالانکہ اس کے جزیہ کی رقم صرف سے رسالانہ ہوگی، اسی طرح اگر ایک شخص کے پاس پانچ لاکھ روپیہ ہین تو ان کا انکم ٹکس ۴ر فی روپیہ کے حساب سے ایک لاکھ پچیس ہزار روپیہ ہوگا، اور جزیہ صرف عشر!

ناظرین انصاف فرمائین کہ سوا لاکھ کی رقم گران ہے یا بارہ روپیہ! اور انکم ٹکس رعایا کے لئے سہل و مفید ہے یا جزیہ ؟

جزیہ کا اثر معاشیات اسلام پر | شاید اس موازنہ سے یہ خیال پیدا ہو کہ جزیہ کا بار امرا پر بہت کم پڑتا تھا لیکن متوسطین اور غربا اس کے بار کے نیچے دبے ہوئے تھے، اس لئے سلطنتِ اسلامیہ کی معاشی حالت کا سرسری طور پر جائزہ لینا مناسب معلوم ہوتا ہے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ غیر مسلم اسلامی سلطنت کے زیر سایہ معاشی حیثیت سے کس حالت مین زندگی بسر کرتے تھے،

مسٹر ہوبسن (J. A. Hobson) نے کام اور دولت (Work & Wealth) مین اندازۂ تونگری کے لئے پیمانۂ زر کے بجائے انسانی خوشحالی کے ایک درجہ کو پیمانہ بنانا پسند کیا ہے[۱] لیکن اسلام نے ایک درجہ کے بجائے انتہائی درجہ کو پیمانہ بنانا اپنا نصب العین قرار دیا تھا، چنانچہ امیر المومنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پایۂ تخت کے ایک دور افتادہ صوبہ (عراق کی سب سے کمزور آبادی (بیوہ عورتون) کی بہترین معاشی حالت کو وفات سے ۴ روز قبل ان الفاظ مین بیان فرمایا تھا،[۲]

"اگر خدا نے مجھکو زندہ رکھا تو مین اہل عراق کی بیوہ عورتون کو ایسی حالت مین چھوڑ جاؤنگا،

---

[۱] مالیات عامہ، ہمارے افلاس کے اسباب ص، انڈجے سی، کمان رپا مترجمۂ قاضی محمد حسین [۲] صحیح بخاری کتاب المناقب باب قصۃ البیعۃ

کہ میرے بعد اُن کو کسی شخص کی امداد کی احتیاج باقی نہ رہے گی"،

اور آئندہ خلیفہ کو جن اُس وقت جب وہ بستر مرگ پر تھے، غیر مسلموں کے متعلق یہ وصیت فرمائی تھی[1]،

"اور میں اس کو اُن لوگوں کے حق میں وصیت کرتا ہوں، جن کو خدا اور رسول کا ذمہ دیا گیا ہے کہ اُن سے جو معاہدہ ہے وہ پورا کیا جائے، اور اُن کی حمایت میں لڑا جائے، اور اُن کو اُن کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہ دیجائے"

ان احکام اور اعلانات کا نتیجہ یہ تھا کہ بعد کے زمانہ میں ہمیشہ غیر مسلم رعایا کی خوشحالی کا خیال رکھا گیا،

جزیہ کی شرح جس قدر کم تشخیص کی گئی تھی، اس کا بیان ابھی ہو چکا ہے، تاہم جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، جزیہ کی یہ شرح مجموعی آبادی کی معاشی حالت کا اندازہ کر کے تخمینی دولت و ثروت کے لحاظ سے سہولت مقرر ہوئی تھی ورنہ اندرونی طور پر بعض صوبوں میں گذشتہ معیار دولت کے علاوہ بعض اور معیار بھی پائے جاتے تھے، اور انہی کے مطابق جزیہ وصول کیا جاتا تھا، اسی بنا پر شمس الائمہ سرخسی نے مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) میں لکھا ہے، کہ

"یہ ممکن نہیں ہے کہ مال کا کوئی (صحیح) اندازہ کیا جا سکے، کیونکہ وہ شہروں کے (حالات کے) مطابق مختلف ہوتا ہے"

اس کا یہ مطلب ہے کہ غربا، متوسطین اور امرا کی دولت کا جو معیار ۲۰۰، ۱۰ ہزار، اور زیادہ کی شکل میں قائم کیا گیا ہے، وہ دراصل غربت و تمول کا کوئی صحیح معیار نہیں ہے، کیونکہ بعض صوبے زیادہ متمول ہیں، بعض اُن سے کم، اور بعض ان سے بھی کم، اس لئے ہر جگہ کا معیار بالکل مختلف ہوگا، اسی نکتہ کا خیال کر کے امام ابو جعفر (طحاوی) کہتے ہیں[2]،

"ہر شہر کا عرف معتبر ہے جس شخص کو لوگ اپنے شہر میں فقیر یا متوسط، یا غنی شمار کریں، وہ ویسا ہی سمجھا جائے گا، اور یہی صحیح مذہب ہے"۔

---

[1] صحیح بخاری کتاب الجنائز باب ما جاء فی قبر النبی ﷺ [2] فتاوائے عالمگیری ص ۲۴۴، ج ۲

اس نقطۂ نظر کے مطابق تشخیص جزیہ مین جو تغیر پیدا ہوا، وہ سطور ذیل سے ظاہر ہوگا،

پہلی صدی ہجری مین شام کا صوبہ ذرائع آمدنی زیادہ رکھتا تھا، اس لئے زیادہ خوشحال تھا، یمن کا صوبہ معاشی حیثیت سے اس کی برابری نہین کرسکتا تھا، اس لئے دونون صوبون کے جزیہ کی شرح مختلف رکھی گئی، شام مین فی کس ۴ دینار سالانہ اور یمن مین ایک دینار سالانہ وصول کیا جاتا تھا، اس کا سبب جب مشہور تابعی مجاہد سے دریافت کیا گیا، تو بولے کہ

"دولت مندی کی بنا پر ایسا کیا گیا"[1]

پانچوین صدی کے آخر مین اسلامی سلطنت کے دو اور صوبون عراق، اور ترکستان کی معاشی حالت کے متعلق ایک تصریح ملتی ہے، شمس الائمہ سرخسی، مبسوط (ص ۸، ج ۱۰) مین لکھتے ہین کہ

"عراق مین پچاس ہزار کا مالک متوسط الحال سمجھا جاتا ہے، اور ہمارے ملک مین دس ہزار درہم کا مالک غنی شمار کیا جاتا ہے، اس لئے اس کا فیصلہ امام کی رائے پر چھوڑنا چاہئے"

اس تصریح کا منشا یہ ہے کہ صوبون کے معیار دولت کا صحیح اندازہ امام کرسکتا ہے اور وہی شرح جزیہ کو مالی حالت پر منطبق کرنے کا بھی مجاز ہے، مثلاً جس صوبہ مین ۲۰۰ درہم سے لے کر ۱ ہزار تک کا مالک متوسط سمجھا جاتا ہے، وہان وہ اس رقم پر چھ روپیے سالانہ جزیہ دیگا لیکن عراق مین چونکہ پچاس ہزار کا مالک بھی متوسط ہے، اس لئے وہان پچاس ہزار پر چھ روپیے لئے جائین گے، اور اس کے اوپر بارہ درہم جو امراء کی شرح جزیہ ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ جس قدر کسی صوبہ کی استعداد پیداوار بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر جزیہ کا بار ہلکا ہوتا جاتا ہے، اور یہ اسلامی حکومت کی منفعت بخش پالیسی کا ایک بین ثبوت ہے، (موجودہ انکم ٹکس مین جس قدر استعداد پیداوار بڑھتی ہے انکس کا بار بہت زیادہ ہوتا جاتا ہے، جو اخیر مین ناقابل برداشت ہوجاتا ہے)

---

[1] صحیح بخاری کتاب ابجاد باب الجزیہ والموادعۃ،

سرجادوناتھ سرکار کا مغالطہ | پروفیسر جدوناتھ سرکار نے اپنی تاریخ دانی کے زعم میں جزیہ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس میں پے در پے بہت سی غلطیاں کی ہیں، جن کا دور کرنا ضروری ہے، سب سے پہلی غلطی بلکہ سب سے بڑا ظلم یہ ہے کہ انھوں نے جزیہ کا نام (Doll Tax) رکھا ہے، جو نہ صرف غیر مسلموں بلکہ خود انسانیت کے لئے باعث ننگ ہے، پروفیسر صاحب نے اگر یہ لفظ خود ایجاد کیا، یا اس کے استعمال میں علماے یورپ کی تقلید پسند کی، تو یہ ان کا ذاتی فعل ہے، لیکن اگر اس کا جواز کسی اسلامی سند کی بنیاد پر ہے، تو واضح ہونا چاہئے کہ طبری وغیرہ نے جو "جزیۃ الجماجم" یا "جزیۃ الرؤوس" کا لفظ لکھا ہے، وہ علم نہیں ہے، یعنی اس ٹکس کا یہ نام نہیں ہے، بلکہ اس ٹکس سے پہلے چونکہ زمین کی پیداوار اور محصول کا ذکر آگیا ہے، اور اخیر میں اس کا نام آیا ہے، اس لئے دوسری پیداوار مثلاً گیہوں، جو، ترکاریوں وغیرہ کی طرح انسانوں کا تذکرہ بھی ضروری تھا، کیونکہ ذکر کے بغیر یہ کیونکر معلوم ہوسکتا تھا، کہ کس چیز کا محصول ہے؟ اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ذہن میں رہنی چاہئے کہ طبری نے یہ الفاظ نوشیروانی محصول کے تذکرہ میں لکھے ہیں، اس لئے اسلامی عہد کے جزیہ کی نسبت اُن کا اطلاق ثبوت طلب ہے،

دوسرا مغالطہ | دوسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھوں نے جزیہ کی رقم کا نہایت غلط اندازہ لگایا ہے، اور جزیہ کی مقدار کی زیادتی کو مثال کے طور پر گجرات کے صوبہ میں ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ وہاں سالانہ پانچ لاکھ روپے کی آمدنی تھی[1]، اور اس کی شکل یہ اختیار کی ہے کہ اَنڈیا آف اورنگ زیب کے بیان کے مطابق (جس کا حوالہ حاشیہ ص ۴، ۲ تاریخ اورنگزیب میں ہے،) تقریباً ۱۶۹۵ء (۱۱۰۷ھ) میں گجرات کی تحصیل محض یا محاصل خام (Gross Revenue) ۱۲۵ لاکھ روپیہ (ایک کروڑ پچیس لاکھ روپے) سالانہ تھی جس میں اور جزیہ کی آمدنی میں ۳ ½ فیصدی کا تناسب ہے، جو اُن کے نزدیک بہت زیادہ ہے اس کے متعلق چند باتیں عرض کرنا ہیں،

---

[1] مرآۃ احمدی ص ۴، ۳، ج ۱

(۱) گجرات کے جزیہ اور اس کے تناسب پر تمام ہندوستان کے جزیہ اور اس کے تناسب کو قیاس نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ گجرات میں اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی، تاہم پنجاب، کشمیر، اور سندھ وغیرہ میں مسلمان زیادہ آباد تھے، اس لئے ان صوبوں میں جزیہ کی آمدنی کم اور نہایت کم ہوگی، اور تناسب بھی ۲½ فیصدی سے بہت کم ہوگا،

(۲) گجرات کے جزیہ کا تناسب دکھاتے وقت گجرات کی زکوٰۃ کا تناسب" بھی دکھانا چاہئے تھا، کیونکہ بقول پروفیسر صاحب (ص ۲۷۴ ج ۳) گجرات میں بہت زیادہ مسلمان آباد تھے،

(۳) زکوٰۃ کی شرح بجائے فی صدی ہے، اور وہ مختلف قسم کے چیزوں سے وصول کی جاتی ہے، اسلئے مسلمانوں کی ایک بڑی آبادی میں اس کی مقدار گجرات کے جزیہ کی رقم کے قریب قریب ہو سکتی ہے، اور تناسب بھی شاید وہی ہو سکتا ہے، اس بنا پر اورنگزیب پر مسلمانوں کی پاسداری اور ہندوؤں کی طرف سے ذاتقانی کا الزام غلط ہے،

(۴) گجرات کے جزیہ اور محاصل خام کا تناسب صرف ۲½ فیصدی ہے، جو بہت کم ہے لیکن پروفیسر صاحب اس پر بھی متحیر ہیں، حالانکہ اگر اُن کو محصولوں کی اس تعداد اور تناسب کا علم ہوتا، جو آج کل حکومت برطانیہ کے اندر رائج ہیں، تو اُن کی حیرت سکون و خاموشی سے بدل جاتی، مثلاً مطالبات وطن (Home Charges) کی رقم کو لیجئے، جو ہر سال انگلستان چلی جاتی ہے، وہ پرتھ ناتھ بنرجی کی تصریح کے مطابق، مجموعی مداخل (یعنی دو ارب ایک کروڑ روپیہ) میں چالیس فی صدی سے زیادہ ہے[1]، افیون، نمک، اسٹامپ، جنگی و آبکاری، ابواب، کروڑ گیری، انکم ٹیکس رجسٹری، جنگلات، ریلوے وغیرہ سے پچاس کروڑ روپیہ سے زیادہ وصول ہوتا ہے، جو مجموعی مداخل (دو ارب ایک کروڑ) کا کم از کم پچیس فی صدی ہے، (یہ واضح رہے، کہ اورنگزیب کے زمانہ میں آج کل

---

[1] معاشیات ہند ص ۲۹۵، مترجمہ مولوی محمد الیاس برنی،

کی طرح کثرت سے محصول نہ تھے، بلکہ اکثر محصول معاف کر دیئے گئے تھے،) جزیہ کو اگر فوجی محصول مانا جائے، (جیسا کہ بعض علماء کا خیال ہے) تو اس ۳½ فی صدی محصول کا موازنہ اس ۳۲ کروڑ روپے سالانہ سے کرنا چاہئے، جو ہندوستان کے فوجی انتظام پر حکومتِ برطانیہ صرف کرتی ہے، اور جو محاصل خالص (Net Revenue) کا ۴۲ فی صدی ہے[1]،

غالباً محصولوں کی یہ تعداد اور تناسب حیرت دور کرنے کے لئے کافی ہوگا،

تیسرا مغالطہ | تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ انھوں نے اشخاص کی آمدنی سے جزیہ کی شرح کا تناسب معلوم کرکے یہ نتیجہ نکالنے کی کوشش کی ہے، کہ غرباء پر اس کا بہت زیادہ بار پڑتا تھا، اس کے لئے انھوں نے غریب کی شرح چھ روپیے فی صدی، متوسط کی چھ فی صدی سے ۴ فی صدی تک (یعنی ۲۰۰ درہم سے ۱۰ ہزار درہم تک حسبِ مدارج) اور امیر کی عاشر فی ہزار شرح بتلائی ہے (صفحہ ۲۰۵ جلد ۳) اگرچہ آج بھی امراء کے بہ نسبت غرباء پر محصول کا بار جس قدر زیادہ پڑتا ہے، اس کی شہادت میں فرد در لیڈ مسٹر میکڈانلڈ، سابق صدر اعظم ... حکومتِ برطانیہ کے اقوال گورنمنٹ آف انڈیا، میں درج ہیں، اور سر اے کولن، اور سر ولیم ہنٹر وغیرہ نے بھی اس کے متعلق اظہار خیال کیا ہے، تاہم موجودہ انکم ٹکس کی شرح سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے، چنانچہ اس کی شرح ایک ہزار روپیہ سے لے کر ۲ ہزار سے کم تک ۱½ پائی فی صدی پچیس ہزار سے زیادہ کی ۴ فی صدی، ۵۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی ۵ فی صدی اور ڈھائی لاکھ سے اوپر کی ۶ فی صدی ہے، اس کو دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ جزیہ کی سب سے کم شرح (بقول پروفیسر صاحب) ۱/۴ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی سب سے کم شرح ۱۳/۴ پائی فی ہزار ہے، اسی طرح جزیہ کی سب سے زیادہ شرح ساٹھ فی ہزار ہے، لیکن انکم ٹکس کی آخری شرح ۱۵۰ فی ہزار ہے، ان اعداد سے پتہ چلتا ہے کہ جزیہ میں اگر ایک طبقہ کسی قدر زیادہ بار برداشت کرتا تھا، تو انکم ٹکس میں ہر طبقہ

---

[1] محاصل خالص ۵، کروڑ اور محاصل خام ایک ارب ۲۰ کروڑ ہے دیکھو معاشیات ہند صفحات ۲۷۷، ۲۷۸، ترجمۂ برنی، یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے،

محصول کے بارگران سے دبا ہوا ہے، اور جزیہ مین غربا اگر محصول سے کچھ پریشان ہوسکتے تھے، تو انکم ٹکس سے امرا اس سے کہین زیادہ پریشان ہو سکتے ہین، شاید پروفیسر صاحب بار کے اس "تناسب" کو حساب لگاتے وقت بھول گئے تھے،

اگر تمام طبقون کو یکجا کرکے اس بار کا اوسط نکالا جائے، تو جزیہ کا اوسط صرف ۴ فی صدی ہوتا ہے (کیونکہ متوسطین کا سب سے کم اوسط یہی ہے) لیکن آج کل محصول کا بار اوسط آمدنی کے نو فیصدی (یعنی لغہ فیصدی) رہتا ہے،[1] ناظرین ۴ فی صدی اور لغہ فی صدی کے تناسب پر غور فرمائین،

سر جادوناتھ نے غربا کے متعلق جو تین لکھا تھا، ہمارے "ارسطو" نے اس پر ایک پرلطف شرح تصنیف فرمائی ہے، "ارسطو کہتے ہین"، تقریباً ۲۰ سال مین ساری جائداد ہی غائب غلہ ہو جائے گی" (آریہ گزٹ) اُن کی خدمت مین یہ عرض ہے کہ

(۱) معاشیات کے رو سے جزیہ پر جہان نظر ڈالی گئی ہے، وہان یہ لکھا ہے کہ چونکہ جزیہ بلا واسطہ تنزایدٹکس ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ شرح کے اضافہ کے ساتھ ساتھ آمدنی کا بھی اضافہ ہو، مثلاً اگر ایک شخص کے پاس پہلے سال ۲۰۰ درہم موجود ہین، تو وہ غربا کا جزیہ (۱۲ درہم) ادا کرے گا لیکن اگر اس کے پاس آیندہ سال صرف ۵۰ درہم رہ گئے ہین، تو اس سے کچھ نہ لیا جائے گا، اسی طرح اگر ایک متوسط نے پہلے سال ۲۰۰ درہم جزیہ ادا کیا، اور آیندہ سال اس کا سرمایہ فقرا کے برابر ہوگیا تو اس سے متوسط کا جزیہ وصول نہ کیا جائے گا، بلکہ فقرا کا محصول لیا جائے گا، اس کی تصریحات فقہ کی کتابون مین موجود ہین، اس بنا پر جزیہ کی وجہ سے جائداد کے تلف ہونے کا خطرہ نہین،

(۲) جزیہ مین غریب پر پہلے سال جو بار پڑتا ہے وہ آمدنی کا سولھوان حصہ ہے یعنی پچاس پر سے لیکن انکم ٹکس مین پہلے ہی سال امیر کی آمدنی کا چوتھائی حصہ (شرح اعلیٰ مین) نکل جاتا ہے یعنی ۵ لاکھ پر سوا لاکھ، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ غریب پر جزیہ سے تباہی (اگر آمدنی مین اضافہ نہو) بتدریج اور دیر مین آتی ہے، اور انکم ٹکس پہلے ہی سال امیر کی کمر توڑ دیتا ہے،

---

[1] معاشیات ہند پروفیسر ناتھ بنرجی ص ۲۷۹، مترجمہ مولوی الیاس برنی،

(۳) جزیہ سے غریب طبقہ زیادہ متاثر ہوتا ہے، اور متوسطین و امرا پر کچھ اثر نہیں پڑتا، لیکن انکم ٹکس میں سب سے زیادہ امرا تباہ ہوتے ہیں، اور متوسطین و فقرا بھی بربادی سے محفوظ نہیں رہتے،

(۴) بیس سال میں اگر جزیہ پچاس کی جائداد یا آمدنی کو برباد کر سکتا ہے، تو اسی قدر عرصہ میں انکم ٹکس ۵ لاکھ کی رقم اور جائداد پر پانی پھیر سکتا ہے،

چوتھا مغالطہ چوتھا مغالطہ، تیسرے مغالطہ کی دوسری شکل ہے یعنی اونھوں نے جزیہ کی شرح اور غلہ کے نرخ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غریب طبقہ مظلومی کی انتہائی حد تک پہنچا ہوا تھا کیونکہ ایک غریب کی شرح ٹکس اس کے سال بھر کے مصارفِ طعام کے برابر تھی، (تاریخ اورنگ زیب جلد ۳ صفحہ ۲۷۰)

اس "تاریخی دیانت" کی "تحلیل" کے لئے حسب ذیل امور ذہن نشین ہونے چاہئیں،

(الف) جیسا کہ مسٹر ڈبلیو، ایچ، مورلینڈ نے "ہندوستان وفاتِ اکبر کے وقت"[۱] میں لکھا ہے، آج کل ہندوستان کی اوسط آمدنی تین صدی قبل کی حالت سے زیادہ نہیں ہے،

(ب) بقول مسٹر پرمتھ ناتھ بنرجی اس زمانہ میں جماعتِ کثیر کی سالانہ آمدنی کا اوسط صرف اٹھارہ شلنگ یعنی للعہ روپئے کسی ہے، (معاشیاتِ ہند مترجمہ برنی ص ۴۰)

(ج) مورلینڈ کی تصریح کے مطابق اگرچہ عہد مغلیہ و برطانیہ میں آمدنی کے اوسط کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے، تاہم اجناس کے نرخ میں سات گنے کا فرق پیدا ہو گیا ہے، (اکبر تا اورنگ زیب[۲])

(د) سنہ ۱۶۲۳ء (مطابق سنہ ۱۰۳۳ھ) کے نرخ سے ایک من گیہوں کی قیمت ایک روپیہ تھی رہا شی

---

[۱] مترجمہ مولوی حبیب الرحمن خان ایم اے، ال ال بی باسم "ہند کی معاشی حالت شہنشاہ اکبر کی وفات کے وقت" ص ۲۹۲ [۲] مترجمہ مولوی سید ہاشمی فرید آبادی، باسم معاشی حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب" ص ۲۴۵ ص ۲۴۶،

حالاتِ ہند از اکبر تا اورنگ زیب، مترجمہ ہاشمی ص ۲۴۶ لیکن ۱۹۳۳ء (۱۳۵۲ف) کے نرخ سے اس کی قیمت چار روپیہ ہے، (سات گنے کا فرق اس لئے نہیں ہے کہ ہم نے مغلیہ کے گران نرخ اور برطانیہ کے ارزان نرخ کو لیا ہے،)

(ج) محصولِ زمین بزمانۂ اکبر کے لحاظ سے، ۱۰ بسوہ کی مالگذاری ۴ من تھی، (۱۰ بسوہ مین ۴ من ۲۰ ار غلہ بآسانی پیدا ہوسکتا ہے، مالگذاری ثلث پیداوار ہوتی تھی، دیکھو آئین اکبری ص ۲۰۷ ج ۱) اور آج کل کے مطابق عا رہے، (بحساب للعہ رفی بیگھہ)

(د) اگرچہ اورنگزیب کے زمانہ مین محصول کا بار فی کس وہ نہ تھا، جو آج کل ہے، کیونکہ اُس نے بہت سے محصول معاف کردیے تھے تاہم اس زمانہ کے سرکاری حساب کے مطابق ہم دونون زمانون (مغلیہ و برطانیہ) مین محصول کا بار فی کس عا ۴ پائی فرض کئے لیتے ہین،

اب یہان سے ۳ طریقہ پر حساب شروع ہوتا ہے،

(۱) اگر غلہ کے مصارف فی کس ۴ من ۲۰ ار سالانہ (بحساب ۱۰ ریومیہ) رکھے جائین، تو عا ۱۲ ر سالانہ آمدنی والا شخص عہدِ مغلیہ مین للعہ کا غلہ عا ۵ مالگذاری اور عا ۱۱ ۴ پائی محصول ادا کرکے ہر ۵ پائی کپڑے وغیرہ کے لئے بچا سکتا تھا لیکن عہد برطانیہ مین وہ عا ۷ کا غلہ عا ر مالگذاری اور عا ۱۱ ۴ پائی محصول دیکر ۱۱ ۴ پائی کا قرضدار ہوجائے گا،

(۲) اگر غلہ کا حساب فی کس ۹ من رکھا جائے، جو سرکار نے (تاریخ اورنگزیب ص ۲۰۰) رکھا ہے، تو عہدِ مغلیہ مین للعہ کا غلہ عا ۱۱ مالگذاری (ایک بیگھہ کی) اور عا ۱۱ ۴ پائی محصول پر خرچ کرنے کے بعد وہ صرف پانچ آنے دس پائی کا قرض دار ہوتا ہے جس کو وہ معمولی سی محنت سے ادا کرسکتا ہے، لیکن عہد برطانیہ مین ۳۶ کا غلہ للعہ ر مالگذاری (ایک بیگھہ کی) اور عا ۱۱ ۴ پائی محصول پر صرف کرکے وہ عا ۱۱ ۴ پائی کا قرض دار ہوجائے گا، جو سال بھر کی آمدنی کا پورا دوگنا ہے، اور جس کو وہ سال بھر محنت کرکے بھی ادا

نہین کر سکتا،[1]

(۳) اگر جزیہ اور انکم ٹکس وغیرہ کا اوسط نہ نکالا جائے، بلکہ ان کی پوری شرح کے مطابق پوری رقم فرض کر لی جائے، تو عہد مغلیہ مین للعہ کا غلہ پر مالگذاری، اور ۲ سے ۲ جزیہ ادا کرکے ۹ پائی پس انداز ہونگے، اور سر جادوناتھ کے حساب سے اس رقم کو دوگنا کرکے بھی وہ صرف دس آنے ۶ پائی کا قرضدار ہوگا لیکن عہد برطانیہ مین ۱۳/۴ کا غلہ، مالگذاری اور ۱۳/۴ پائی انکم ٹکس ادا کرکے وہ ۱۳/۴ پائی کا قرضدار ہوجائے گا (واضح ہو کہ محصول مین صرف انکم ٹکس کی رقم رکھی گئی ہے، اور بہت سے محصول جو اس زمانہ مین ادا کرنا پڑتے ہین، ان کا حساب نہین لگایا گیا ہے) اور جادوناتھ صاحب کے حساب سے اس پر للعہ سالانہ کا ایسا وزنی بوجھ پڑے گا جس سے چند ہی سال مین اس کی ایک ہزار کی آمدنی یا جائداد بالکل ہی غائب ہوجائے گی، اس سے ایک بات اور ثابت ہوتی ہے، جزیہ والا ۵ کی جائداد یا آمدنی مین جس قدر مطمئن تھا، انکم ٹکس والا ۱۰۰ ہزار کی آمدنی یا جائداد مین بھی اتنا مطمئن نہین ہے، (جزیہ اور انکم ٹکس بالترتیب ۵ اور ہزار سے کم پر نہین ہین)

پہلے اور تیسرے حسابون کے لحاظ سے عہد مغلیہ مین نصف آمدنی سے کچھ کم رقم پس انداز رہتی ہے، دوسرے حساب کے رو سے پانچ آنے دس پائی، کا قرض رہتا ہے جو ۳۰ ویں حصہ سے کسی قدر زائد ہے بخلاف اس کے عہد برطانیہ مین پہلے اور تیسرے حساب کے مطابق سال کی پوری آمدنی صرف غلہ کے لئے بھی کافی نہین ہوتی، بلکہ للعہ کی مزید ضرورت ہوتی ہے، اور مالگذاری و محصول وغیرہ کے لئے علحدہ قرض لینا پڑتا ہے، جو دوسری صورت حساب مین سالانہ آمدنی کا پورا دوگنا، اور تیسری صورت حساب

---

[1] معارف :- یہ مضمون کئی سال پہلے کا لکھا ہوا ہے، جب یہ ہوش ربا گرانی نہ تھی، ورنہ اگر آج کل کے نرخ سے حساب لگایا جائے، تو ۹ من غلہ کی قیمت دو سو روپیے کے قریب ہوئی، اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے،

کی ایک شکل مین تین گنے سے کچھ اوپر ہو جاتا ہے[1]

ان حسابات سے ظاہر ہوگا کہ سرکار نے جو یہ لکھا ہے کہ جزیہ مین غریب طبقہ کے سال بھر کے مصارف طعام غائب ہو جاتے تھے، وہ کسی حسابی اصول پر مبنی نہین ہے، بلکہ ایک ساحرانہ خطابت ہے، جو صرف عوام پر اثر ڈالنے کے لئے کام مین لائی گئی ہے!

پانچوان مغالطہ | پانچوان مغالطہ جزیہ کی "تحصیل" کے متعلق ہے، جس کو انھون نے سخت تحصیل سے تعبیر کیا ہے، اور اس سلسلہ مین چند واقعات لکھ کر یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ جزیہ کی وصولی مین اورنگ زیب کے حکم سے اتنا تشدد ہوتا تھا کہ غیر مسلم رعایا شورش، مظاہرہ، بلکہ بعض اوقات بغاوت پر آمادہ ہو جاتی تھی،

اس مغالطہ مین پہلی قابلِ اعتراض بات یہ ہے کہ باقاعدہ تحصیل کو "سخت" تحصیل کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، اور امیر عبدالکریم محصلِ جزیہ برہان پور کو سخت وصول کنندہ (Strict collector) کے لقب سے یاد فرماتے ہین، حالانکہ جس کتاب سے یہ واقعہ لکھا گیا ہے، اس مین میر عبدالکریم کے متعلق یہ الفاظ آئے ہین،

"میر عبدالکریم را کہ ضابطہ داستادزادۂ پادشاہی شد و بکلیۂ فضیلت و دیانت آراستہ بود"

(خافی خان ص ۲۷۸ ج ۲)

کیا ضابطہ، ہشیار اور باقاعدہ شخص کو سخت (Strict) کہتے ہین؟

دوسری چیز یہ ہے کہ پروفیسر جادوناتھ نے جزیہ کی سخت تحصیل کا تو ذکر کیا ہے، لیکن اس کے اسباب کا ذکر غائب کر دیا ہے، جو تاریخی دیانت کے خلاف ہے، (تفصیل آگے آتی ہے)

تیسری قابلِ گرفت بات یہ ہے کہ پروفیسر صاحب نے ان واقعات کو بالکل فراموش کر دیا ہے جو

---

[1] اور ہندوستان کی آزادی اور قومی حکومت کے زمانہ مین اس حساب سے زندگی بسر کرنے کی کوئی صورت ہی نہین ہے۔

انہی کے ماخذون مین جزیہ کی "نرم تحصیل" کے متعلق مذکور ہین، مثلاً مرأۃ احمدی (ص ۳۲۱ ج ۱) مین "اورنگزیب" کا دیوان صوبہ کے نام یہ حکم مذکور ہے،

"نیز حکم والا بنام دیوان صوبہ ورود یافت کہ کسانیکہ بعد وضع جزیہ پیش انداوے آن یکسال برآنہا گذشتہ دسال دوم درآمدہ باشد اگر بے تساہل متصدیان سال اول نداوہ باشد موافق قول ابی حنیفہ رحمہ اللہ اصل را اعتبار نمودہ، جزیۂ سال اول از آنہا نگیرند، وجزیۂ سال دوم بگیرند، واگر از راہ تمرد جزیۂ سال اول ادا نکردہ باشد، موافق صاحبین ہر دو سال از آنہا ستانند"

اس سے زیادہ رعایت کیا ہو سکتی ہے کہ تحصیلدارون کے مطالبہ کے باوجود اگر غیر مسلمون نے جزیہ نہین دیا ہے، تو وہ معاف کیا جاتا ہے، بشرطیکہ یہ معلوم ہو جائے کہ جزیہ نہ دینا سرکشی کے باعث نہ تھا! (یہ گرہ آگے کھولی جائے گی)

خود پروفیسر صاحب نے اپنی کتاب کے حاشیہ (ص ۲۷۳) مین ایشور داس ناگر کی کتاب فتوحات عالمگیری (باب ۳) سے نقل کیا ہے کہ

"شہنشاہ (اورنگ زیب) نے حیدرآباد فتح کرنے کے بعد وہان ایک سال کے لئے جزیہ، سائر اور تمام محاصل معاف کر دیئے، کیونکہ گورنر نے یہ اطلاع دی تھی کہ رعایا غربت کی وجہ سے محصول ادا کرنے کے قابل نہین ہے، اور اگر محصول لیا گیا تو ملک برباد ہو جائے گا"

ایشور داس ناگر گجرات کے "شیخ الاسلام" کے دفتر مین ملازم تھا، اور پٹن مین رہتا تھا، اس کی کتاب کو سرکار نے اپنی تاریخ (جلد اول) کے دیباچہ مین مستند قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود انھون نے متن مین اس واقعہ کا ذکر نہین کیا ہے، بلکہ حمید الدین خان نیچہ کی احکام کے حوالہ سے (جس کا سرکار نے انگریزی مین ترجمہ کیا ہے) اس کے متضاد یہ واقعہ لکھا ہے کہ

"چونکہ جزیہ کی تحصیل کا کام سختی سے ہوتا تھا، اس لئے ہندو تاجر دکن کو چھوڑ کر چلے گئے، اور غلہ کی کمی فوجِ شاہی میں محسوس ہوئی، اس وقت اورنگزیب نے امراء کی راے کے مطابق دکن کا جزیہ معاف کیا"

حیرت ہو کہ اس روایت کے استناد اور پہلی روایت کے عدم استناد کی نسبت کوئی راے نہ رکھنے کے باوجود سرکار نے خواہ مخواہ اس روایت پر کیونکر اعتماد کر لیا ؟ کیا ایک مورخ کی حیثیت سے تحقیق کی ذمہ داری اُن کے سر نہ تھی !

ان گوشوں کے بعد اب اصل مغالطہ کی جانب توجہ کیجاتی ہو لیکن اُس کے متعلق کچھ عرض کرنے سے پیشتر سرکار کی حسب ذیل عبارت پیشِ نظر رہنی چاہئے،

"قدیم مسلم فرمانروایانِ ہند کے زمانہ میں جزیہ برہمنوں کو مستثنیٰ کر کے تمام ہندوؤں پر مقرر ہوا تھا، جو اس مبتذلانہ اور مسالمانہ نظام میں معاف رکھے گئے تھے، جس کو سندھ میں محمد بن قاسم نے پیدا کیا تھا، فیروز شاہ نے اپنی پیرانہ سالی میں اس امتیازانہ کو مسترد کر دیا، اور برہمنوں پر دوسرے کفار کی طرح محصول لگایا، اکبر کی دانشمندانہ سیاست دانی نے اس محصول کو منسوخ کر دیا اور ذلت کی ایک ہیجان انگیز علامت کو رعایا کی اکثریت سے ہٹا دیا، ایک صدی کے بعد اورنگزیب نے اس سیاست کو پلٹ دیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۰، ۲۷۱)

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ آغازِ حکومتِ اسلامیہ سے لے کر عہدِ اورنگزیب تک برابر ہندوستان میں جاری رہا، صرف اکبر کی حکمتِ علی کے سبب سے سو برس تک اس کا نفاذ نہیں ہوا، اورنگزیب نے پھر قدیم دستور کے مطابق اس کو جاری کر دیا،

اب سوال یہ ہو کہ وہ محصول جو ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد کے وقت سے تھا، اور جس پر غیر مسلم رعایا نے کبھی شور نہیں مچایا، آخر اس کی کیا وجہ ہے کہ اورنگزیب کے زمانہ میں اس کے متعلق ناراضی پیدا

ہوئی ؟ بلاشبہہ فیروز شاہ نے جب برہمنوں پر جزیہ تشخیص کیا تھا، تو اُن کی طرف سے "پُر امن نافرمانی" ہوئی تھی اور بھوک ہڑتال چند روز تک قائم رکھی گئی تھی، لیکن چونکہ برہمنوں کا جزیہ سے استثنا سلاطین قدیم کی غلطی تھی، اس لئے فیروز شاہ نے کچھ پروا نہ کی، اور خود ہندوستان نے برہمنوں کو سمجھا کر بھوک ہڑتال سے باز رکھا[1]، اور پھر عرصہ تک جزیہ کے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی گئی، لیکن اورنگزیب کے زمانہ میں دفعتہً ایک ہیجان پیدا ہوا جس نے ملک کے متعدد حصوں میں آگ لگا دی، فیروز شاہ کے زمانہ کے برہمن تو اپنی امتیازی شان قائم نہ رہنے پر ناراض تھے، اورنگزیب کے زمانہ کے ہندوؤں کو کس بات کا گلہ ہو سکتا تھا ؟

علامہ شبلی مرحوم نے مضامین عالمگیر (ص ۴۰) میں اس سوال کا یہ جواب دیا ہے، کہ چونکہ یہ محصول (جزیہ) ایک مدت سے موقوف ہو چکا تھا، اوس کا نئے سر سے قائم کیا جانا کیونکر گوارا ہو سکتا تھا ؟ لیکن جب یہ واقعہ ہے کہ جزیہ نہایت قدیم محصول تھا، اور ہندوستان صدیوں سے اس کا عادی تھا، اور اورنگزیب نے ۱۰۶۹ھ سے لے کر ۱۱۰۰ھ تک تمام خلافِ شریعت محصول اور نذرانے بند کر دیئے تھے[2]، اور اُن کے بجائے نہایت خفیف محصول (جزیہ) ۱۰۹۱ھ میں جاری کیا تھا تو پھر اِس محصول کی اتنی شدید مخالفت اور اس کے خلاف بغاوتیں سمجھ میں نہیں آتیں،

سر جادوناتھ سرکار نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ محصول "ذلت" کی ایک علامت تھی، جس سے بغض وحسد کے جذبات میں ہیجان پیدا ہوتا تھا، نیز تحصیل کی شدت بھی مظاہروں اور بغاوتوں کا باعث تھی، آخری بات کا جواب اسی عنوان میں اور پہلی چیز کا گذشتہ صفحات میں آچکا ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان بغاوتوں سے اسلامی سیادت کی مخالفت مقصود تھی، ہم نے اوپر لکھا ہے کہ بلا واسطہ ٹکس سے سیاسی بیداری پیدا ہوتی ہے، اور جزیہ اس کا شاہد عدل ہے کہ اس کی وجہ سے یہ بیداری ہندوؤں میں پیدا ہوئی، سب سے پہلے فیروز شاہ کے زمانہ میں برہمنوں نے سیاست میں قدم رکھا،

---

[1] تاریخ فیروز شاہی حنیف ص ۳۸۲، ۳۸۳ [2] یہ واقعات خافی خان نے لکھے ہیں، اور الفنسٹن کی تاریخ میں اس کا تذکرہ کیا ہے،

اور ہمارے اس زمانہ کے لیڈروں کی طرح اُس زمانہ میں بہت سے لیڈر پیدا ہوگئے جنھوں نے پر امن ترک موالات کا مقاطعۂ جوعی کی شکل میں آغاز کیا جس سے شہر کے تمام ہندوؤں کو اُن سے ہمدردی پیدا ہوئی بعد میں شاید آگے چل کر یہ چنگاری اندر اندر سلگ کر اور بھڑکتی لیکن اکبر کی حکمت عملی نے اس کے ضرر سے محفوظ رہنے کے لئے خود اس محصول ہی کو موقوف کر دیا[۵۱] اور یہ آگ کچھ عرصہ کے لئے دب گئی اور اورنگزیب کے زمانہ میں راجپوتانہ کے راجپوتوں اور مہاراشٹر کے مرہٹوں نے از سر نو اس آگ کو ہوا دی، جس پر جزیہ کی دوبارہ تشخیص نے تیل کا کام دیا، اور سیواجی، مہارانا جیتور اور راجہ جسونت[۵۲] وغیرہ نے سلطنت مغلیہ کے خلاف وہ فضا پیدا کی کہ راجپوتانہ کی طرح دکن بھی اس سے متاثر ہوا، اور مختلف مقامات میں مخالفت کی آگ بھڑک اٹھی سیواجی نے جزیہ کے متعلق بارگاہ سلطانی میں جو خط بھیجا تھا، اس کو سرجادوناتھ نے نقل کیا ہے[۵۳]، راجپوتانہ کے راجاؤں کی سرکشی کے واقعات خافی خان وغیرہ نے قلمبند کئے ہیں، گجرات والوں کی مخالفت کا پتہ اس فرمان شاہی سے چلتا ہے، جو دیوان صوبہ کے نام آیا تھا، اور مرآۃ احمدی کے حوالہ سے اوپر نقل ہو چکا ہے، برہانپور اور دکن کے ہنگاموں کا تذکرہ خافی خان میں ہے، اور سرکار نے بھی اس کا حوالہ دیا ہے،

---

۵۱ مگر اس کے بجائے اور دوسری قسم کے محصول بڑھا دیے، جن پر ہمیشہ مغلوں کے عہد حکومت میں اورنگزیب کے زمانہ تک عمل رہا ۵۲ خافی خان ص ۲۶۱، ۲۶۲، ج ۲، ۵۳ سیواجی کے اس خط کے متعلق سخت اختلاف ہے، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ میں اس کو سیواجی کی طرف منسوب کیا ہے، ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے مسودہ میں شمبھوجی کا نام آیا ہے، آرم (Orme) کے اقتباسات میں جسونت سنگھ اور ٹاڈ (Tod) نے مہاراجہ راج سنگھ کا نام لیا ہے، شمبھوجی اور جسونت تو تاریخوں کی وجہ سے خارج از بحث ہو جاتے ہیں، البتہ اندرونی شہادت اور خود نوشت سوانحی تفصیلات راج سنگھ کے بجائے سیواجی پر منطبق ہوتے ہیں، رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مسودہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ خط کا مضمون نیلا پر بھو نے بنایا تھا جو سیواجی کا فارسی کاتب تھا لیکن تحریر کا انداز

ان واقعات کی روشنی مین جزیہ کی تحصیل مین باقاعدگی، یا پروفیسر جدوناتھ کے الفاظ مین تشدد کا سبب کچھ اور معلوم ہوتا ہے، جس کو ہم بہ تفصیل لکھتے ہین،

(۱) **مقاومتِ مجولہ**: اورنگ زیب کے زمانہ مین ہندوؤن نے آزادی کے لئے جو لڑائی شروع کی، اس کی ابتدا "فیرفدشاہی" برہمنون کی تقلید مین مقاومتِ مجولہ یا پرامن تارک موالات سے کی گئی، سرجادوناتھ نے لکھا ہے، کہ ۲ر اپریل ۱۶۷۹ء یکم ربیع الاول ۱۰۹۰ھ سے تمام سلطنت مین جزیہ کا قانون نافذ ہوا، جب یہ خبر پھیلی تو دلی اور مضافات کے صدہا ہندو جمع ہوکر جہانگیر کے کنارے قصر شاہی کے سامنے جاکر کھڑے ہوے، اور جزیہ کی منسوخی کے لئے شور مچایا، اس کے بعد جمعہ کے دن نماز کے وقت باب قلعہ سے لے کر جامع مسجد تک سڑک پر دلی شہر اور چھاؤنی کے ہندو کھڑے ہوے اس کے بعد بھی چند روز تک یہ سلسلہ جاری رہا، اسی زمانہ مین سیواجی کا خط آیا، (تاریخ اورنگزیب ص ۲۷۱، ۲۷۲) ظاہر ہے کہ ان شورشون مین جزیہ کی آمدنی کم ہوگئی ہوگی،

(۲) **بغاوت**: چونکہ عالمگیر کی رعایا مسلح تھی، اس پرامن مقابلہ نے جنگ کی شکل بہت جلد اختیار کرلی، اور رانا راج سنگھ والی جے پور اس تحریک کا سرگروہ بن گیا، رانا کو سیواجی نے اپنے خط مین ہندوؤن کا سردار لکھا ہے، (تاریخ اورنگ زیب ص ۲۸۹، Appendix VI) **سیواجی** جیسے سے مخالف تھا، اور ہر ہٹہ حکومت کا خواب دیکھ رہا تھا، وہ بھی اس تحریک مین شامل ہوا، اورنگزیب کے نام ایک سخت لکھا، ان دو کے علاوہ راجپوتانہ کے بہت سے راجا مخالف ہوگئے، پھر دکن کی رعایا بگڑ گئی، اور ایسی سرکشی اختیار کی کہ تحصیلدارون کے تقاضہ کے باوجود جزیہ دینا بند کر دیا، خافی خان لکھتا ہے،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۸۴) بتلاتا ہے کہ اس خط مین بہت سے ٹکڑے الحاقی ہین، اس کا لکھنے والا اورنگزیب کا معاصر اور کمزور حریف سیواجی نہین معلوم ہوتا، بلکہ آج کل کا "مصلح" اور ملک کا "نجات دہندہ" سیواجی معلوم ہوتا ہے، اس کے علاوہ اس خط مین راج سنگھ کو ہندوؤن کا لیڈر کہا گیا ہے، اور اس جملہ پر خود سرجادوناتھ کو بھی اعتراض ہے، اور جنوری ۱۹۰۸ء کے ماڈرن ریویو مین انھون نے اس پر تنقید بھی لکھی ہے اس لئے اس خط کی صحت بہت مشکوک، ناقابلِ اعتبار بلکہ جعلی ہے،

"ازانکہ کفار بلدہ و پرگنات در اداے جزیہ بسیار بہ سختی یا منصوب کردۂ پادشاہی پیش می آمدند و ہیچ پرگنہ نبود کہ رعایا بہ امداد فوجداران و مقدمان سرکش جنگ و ہنگامۂ فساد ننماید"

(صفحہ ۲۷۸، جلد ۲)

گجرات کی رعایا میں بھی بعض ایسے سرکش موجود تھے، چنانچہ "شہنشاہ" کے فرمان بنام دیوان صوبہ میں یہ فقرہ بھی ہے،

"واگر از راہ تمرد جزیۂ سال اول ادا نکردہ باشد" (مراۃ احمدی ص ۳۲۱ ج ۱)

غور کرو! وہ رعایا جو سلطنت کے تحصیلداروں کے ساتھ زیادتی کرے، سرکش چودھریوں، اور فوجداروں کے جتھوں میں شامل ہو کر آمادۂ فساد رہے، اس کا جزیہ نہ دینا، کیا غربت اور مسکنت کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ ایسی سرکش رعایا کے متعلق اگر اورنگزیب نے یہ حکم دیا کہ تحصیلداروں کی مستعدی اور طلب و تقاضے کے باوجود جس نے جزیہ نہ ادا کیا ہو، اور سرکشی کی نیت بھی نہ رہی ہو، تو اس کا جزیہ (بقایا) معاف کر دیا جائے، اور جس نے سرکشی سے جزیہ بند کیا ہو، اس سے وصول کیا جائے، تو اس میں کیا بے انصافی ہوئی؟ اور اگر یہ بے انصافی تھی، تو سر جدوناتھ کو "انصاف" کی کوئی مثال تاریخ ہند سے پیش کرنی چاہیے تھی۔

سر جدوناتھ نے اعتراض کیا ہے کہ دکن کی رعایا سے بجبر جزیہ وصول کیا جاتا تھا، بے شبہہ میر عبدالکریم کے ساتھ سوار اور پیادے گئے تھے، اور کوتوال کو بھی حکم پہنچا تھا کہ "جو ادائے جزیہ میں سستی کرے، اس کو سزا دی جائے" (خافی خان ص ۲۷۸، جلد ۲) اس کی وجہ یہ تھی کہ دکن کی رعایا تحصیلداروں پر سختی کرتی تھی، اور سرکش فوجداروں اور چودھریوں سے اس معاملہ میں مدد لیتی تھی، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، جسے معترض نے نظر انداز کر دیا ہے،

اس سرکشی کی وجہ سے جزیہ کی آمدنی پر جو اثر پڑا تھا، اس کا اندازہ صرف ایک صوبہ (دکن) کے ایک واقعہ سے کرنا چاہیے، میر عبدالکریم امین جزیہ برہان پور، بارگاہ سلطانی میں اطلاع دیتے ہیں،

"جزیہ تمام بلدۂ برہان پور سال گذشتہ بیست وشش ہزار روپیہ داخل خزانۂ سرکار گشتہ خانہ زاد در مدت سہ ماہ از پور جات نصف بلد و یک لک وہشت ہزار روپیہ عائد سرکار ساختہ" (خافی خان ص ۲۷۹)

آدھے شہر کے مواضعات سے تین ماہ میں ایک لاکھ ہزار روپیہ وصول ہوا، جو میر عبدالکریم کے حسن انتظام کا نتیجہ تھا، حالانکہ اُن سے پیشتر برہان پور کے تمام مواضعات کا سالانہ جزیہ ۲۶ ہزار وصول ہوا تھا، پروفیسر سرکار کے نزدیک یہ حاکم کی سختی کا نتیجہ تھا، حالانکہ خافی خان کے مطابق یہ اس وصف کا کرشمہ تھا، جو لفظ "ضابطہ" کے اندر جھلک رہا ہے، "ضبط" کے معنی ہیں کسی چیز کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنا،

(۳) **رقم جزیہ کی معافی**:- تیسری چیز جس نے جزیہ کی آمدنی پر اثر ڈالا یہ تھی کہ بعض رحم دل اور سادہ لوح مسلمان حکام نے ہزاروں ہندوؤں کو غیر مستطیع سمجھ کر جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا تھا، حالانکہ وہ غیر مستطیع نہ تھے، ان حکام میں سے ایک **امانت خان** بھی تھا، خافی خان (ص ۳۰۷، ۳۰۸) اس کے متعلق لکھتا ہے

"آثار وزرے رشید خان دیوان خالصہ کربا امانت خان پارۂ سوے مزاج بچشمی داشت، پروانہائے معافی جزیہ راکہ امانت خان باوست آویزہائے مختلف ہنود نوشتہ میداد و بادشاہ در اجرائے جزیہ نہایت تقید بود از نظر گذرانیدہ، عرض نمود کہ از نصف ہنود بیشتر را امانت خان سند عدم مزاحمت جزیہ دادہ خلاف مرضی بظہور آمد"

اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کی آبادی کے نصف سے زائد حصہ کو جزیہ سے مستثنیٰ کر دیا گیا تھا، پھر آمدنی کیوں کم نہ ہو جاتی؟

اورنگزیب نے اسی موقع پر امانت خان سے فرمایا تھا کہ

"در مقدمات دیگر مالی و ملکی آنچہ سند معافی بمردم می دہند، مختار ید، اما جزیہ کہ ہزار دشواری بر کفار جاری ساختہ ایم، معاف نمودن آن بدعت، و باعث برہم خوردن بندوبست جزیہ می گردد" (خافی خان)

سرکار نے اس فرمان کو اورنگزیب کی سختی اور وصولی جزیہ میں تشدد پر محمول کیا ہے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ جزیہ کی آمدنی بہت کم رہ گئی تھی، اور انکم ٹکس کے طور پر غیر مسلموں کا وہی ایک محصول تھا، اس لئے بادشاہ نے تاکید کی کہ اور معاملات میں معافی کی سند دینے کا اختیار ہے لیکن جزیہ میں ایسا نہیں کرنا چاہئے سرکار نے بغاوت دشواری اور "بدعت" کے الفاظ کو بڑی اہمیت دی ہے لیکن اس میں کیا چیز خلاف واقعہ ہے؟ کیا شورشوں، بغاوتوں اور مظاہروں نے جزیہ کے نفاذ میں دشواری نہیں پیدا کی تھی؟ اور کیا پرانے اور صحیح دستور کو اٹھا دینا بدعت (نئی بات) نہیں ہے؟

ناظرین! گذشتہ تینوں صورتوں سے بخوبی اندازہ ہوا ہوگا کہ جزیہ کے باقاعدہ نظم و نسق کا کیا سبب تھا؟ واقعات شاہد ہیں کہ پرانا من مقابلہ "بغاوتوں اور جزیہ کی معافی کے سبب سے آمدنی کم ہو گئی تھی، اس لئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا تھا، سر جادوناتھ نے سبب کو مسبب اور مسبب کو سبب قرار دیکر معاملہ کو بالکل الٹ دیا ہے، انھوں نے لکھا ہے کہ چونکہ محکمہ میں سختی تھی، اس لئے گذشتہ واقعات پیش آئے، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ چونکہ واقعات پیش آئے اسلئے محکمہ کو باضابطہ کیا گیا،

بعض اور غلط فہمیاں گذشتہ پانچ بڑے مغالطوں کے علاوہ پروفیسر جادوناتھ کی بعض خوش فہمیاں اور بھی ہیں، مثلاً

(۱) جزیہ اشاعت اسلام کا ذریعہ تھا، اس کا جواب اگرچہ علامہ شبلی مرحوم نے نہایت معقول اور دلچسپ دیا ہے کہ

"ایسا ہلکا ٹکس جس کی تعداد اس قدر قلیل تھی،.... کیا دنیا میں ایک شخص نے بھی اوس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا؟ اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضائع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہئے"

(مقالات شبلی مضمون الجزیہ ص ۲۳۰ ج ۱)

لیکن یہ جواب معترض کے لئے اس بنا پر کافی نہین ہے، کہ وہ ساری ذمہ داری عالمگیر کے ضعیف کاندھے پر ڈالنا چاہتے ہین، وہ مآثر عالمگیری کے حوالہ سے یہ دکھانا چاہتے ہین کہ اس محصول (جزیہ) کا مقصد اسلام کی اشاعت اور کفر کا ازالہ تھا، حالانکہ یہ مقصد اگر تسلیم بھی کر لیا جائے تو یہ کہان سے نکلتا ہے کہ عالمگیر کی یہ رائے تھی، جزیہ کا فرمان اگر بلفظہٖ موجود ہو، اور یہ ثابت ہو جائے کہ الفاظ خود عالمگیر نے لکھوائے تھے تو بے شبہہ یہ استدلال صحیح ہوگا لیکن عمالِ حکومت کے منشی اور محرر یا اوس زمانہ کے مورخ اپنے جذبات کو اگر فرامین شاہی یا اپنی عبارتون کی تمہید مین ظاہر کرین، تو اُن کا ذمہ دار عالمگیر کیسے قرار پائے گا؟ مآثر عالمگیری یا مرآۃ احمدی جس کو بھی اٹھا لیا جائے، الفاظ خود مصنفین کے ہین، اس لئے عالمگیر اُن کی بنا پر مورد الزام نہین ہو سکتا،

(۲) جزیہ زائد ٹکس تھا جس سے صرف مسلمان محفوظ تھے، یہ غلط ہے اورنگزیب نے جزیہ کی طرح وصولی زکوٰۃ کا فرمان بھی نافذ کیا تھا، جو مرآۃ احمدی وغیرہ مین درج ہے، اس لئے پروفیسر صاحب کے الفاظ کو ذرا بدل کر یون بھی کہا جا سکتا ہے کہ "زکوٰۃ زائد ٹکس تھا جس سے صرف ہندو محفوظ تھے"

(۳) ملازمین سلطنت جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اس خیال مین سرکار اور ارسطو مختلف ہین، ارسطو نے فوج مین امرائے جزیہ کی موجودگی سے جن کا ذکر ۱۲ر جولائی ۱۷۰۲ء (۱۱۱۴ھ) کے اعلان مین ہے، یہ استدلال کیا ہے کہ فوج مین ہندوؤن سے جزیہ وصول کیا جاتا تھا، ورنہ امرائے جزیہ کی موجودگی کے کوئی معنی نہین ہین، لیکن مرآۃ احمدی (ص ۳۱۴ ج ۱) مین اورنگ زیب کے اس حکم کی موجودگی مین جو عنایت اللہ خان مہتمم جزیہ کے نام ہے،

"از ملازمان سرکار دولت مدار مواخذہ نکند و سوائے آن از جمیع ذمیان مطابق شرع شریف بگیرد"

ارسطو کے خیال کی کوئی اصلیت نہین رہتی، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ نہ نقدی صورت

ہیں ملازمین سلطنت سے جزیہ لیا جاتا تھا، اور نہ خدمت کی صورت میں، بلکہ اُن کی خدمات پر اُن کو الٹا معاوضہ ملتا تھا، فوج میں امراے جزیہ کی موجودگی کے ایک اور معنی بھی ہو سکتے ہیں یعنی امیر جزیہ کے ساتھ امداد کے لئے فوج ہو، جیسا کہ میر عبدالکریم کے ساتھ فوج بھیجی گئی تھی، کیونکہ رعایا باغی تھی، اور یہ تو بہر صورت ممکن ہے، کہ فوج میں جزیہ کا کوئی دفتر ہوتا ہو تاکہ باغی علاقوں کے قبضہ میں آنے کے بعد جزیہ وصول کیا جا سکے،

(باقی)

ضروری اعلان

سکہ کے اختلاف اور بعض دوسری دشواریوں کی بنا پر فی الحال ہندوستان اور پاکستان کے درمیان وی پی اور منی آرڈر آجا نہیں سکتے، اس لئے کتابیں بھی نہیں آجا سکتیں، مغربی پاکستان میں شیخ مبارک علی صاحب تاجر کتب اندرون لاہوری دروازہ لاہور، دارالمصنفین کے نمایندہ ہیں، اُن کے یہاں ہماری تمام مطبوعات مجائیں گی، جن لوگوں کو ضرورت ہو اُن سے منگالیں، اور جن اصحاب کے ذمہ معارف کا چندہ باقی ہے، مہربانی کرکے اُسے بھی شیخ صاحب کے پاس بھیج دیں،

"منیجر"

تاریخ سندھ

مؤلفہ مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی وسنوی سابق رفیق دارالمصنفین

اس میں سندھ کا جغرافیہ مسلمانوں کے حملہ سے پیشتر کے مختصر اور اسلامی فتوحات کے مفصل حالات خلافت راشدہ کے زمانہ سے لیکر آٹھویں صدی ہجری تک سندھ جن جن حکومتوں کے ماتحت رہا، اُن کی پوری تاریخ اور ان تمام دوروں کے نظام حکومت، علمی و تمدنی حالات اور رفاہ عام کے جو جو کام انجام پائے، ان سب کی پوری تفصیل ہے، ضخامت ۴۰۰ صفحے، قیمت ۷ے،

"منیجر"

اعجاز القرآن

اور

اس کے وجوہ اور دیگر متعلقہ امور

از

جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ

عم محترم جناب مولانا سید محمد بدرالدین علوی صاحب نے اسلامک کلچر حیدرآباد دکن کی فرمایش پر اس مقالے کو انگریزی زبان میں لکھا تھا، مضمون کی اہمیت کی وجہ سے بعض اصحاب نے اصرار کیا کہ اس کو اردو کے سانچے میں ڈھال کر ناظرین معارف کی خدمت میں پیش کیا جائے، موصوف نے اسے منظور فرما کر مجھے ترجمے کی خدمت پر مامور فرمایا، میں نے کوشش کی ہے کہ حتی الوسع اصل کی خوبی ترجمے میں باقی رہے لیکن اگر اس کے باوجود کوئی نقص رہ گیا ہو تو اس کو میری ناتجربہ کاری پر محمول کیا جائے اس لئے کہ یہ میری پہلی علمی کوشش ہے"

"محمد فخرالدین علوی بی اے علیگ"

کلام پاک کو اپنے متبعین کی بے نظیر عقیدت حاصل ہے، بہت سے مسلمانوں نے پوری کتاب کو حرف بحرف حفظ کرنے کے علاوہ اپنی ساری زندگی مختلف طریقوں پر اس کی خدمت کے لیے وقف کر دی، ان کے لئے کلام پاک علوم کا گنجینہ رہا ہے، محض پچھلے علوم ہی کا نہیں، بلکہ ان نئے علوم کا بھی جن کا سرچشمہ صرف قرآن ہی ہے، قرآن پاک کے علوم پر بحیثیت مجموعی اور ہر فن پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں، اس مضمون میں

ان سب کا مفصل ذکر ممکن نہین، اس لئے اس مضمون مین صرف اعجاز قرآنی پر بحث کی جائے گی، کہ اس کی مثال پیش کرنے سے کیون انسان قاصر رہا ہے،

اس علم کی ابتدا، اور ترقی قرآن خود اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ اس جیسی کوئی چیز پیش کرنی محال ہے اور مندرجۂ ذیل آیات اس دعوی کا اعلان کرتی ہین،

(۱) فلیاتوا بحدیث مثلہ،	پس ان کو اس جیسا اسلوب بیان پیش کرنا چاہئے،
(۲) قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات،	کہہ دو کہ اس جیسی دس سورتین بنا کر لائین،
(۳) وان کنتم فی ریب مما نزلنا	اگر تمھین اس مین کچھ شبہ ہے، جو ہم نے اپنے
علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ	بندے پر نازل کیا تو اس جیسی ایک سورۃ
وادعوا شہداءکم،	بنا لاؤ، اور اپنے حمایتیون کو بھی بلا لو،

نزول وحی کی تیئیس سالہ مدت مین اس تحدی کا نہ تو کسی مخالف نے مقابلہ کیا، اور نہ اس جیسا کلام پیش کیا، اس طرح قرآن شریف کے اعجاز کا عقیدہ قائم ہو گیا، جو تیسری صدی ہجری کی ابتدا تک اسی صورت سے قائم رہا، تا آنکہ معتزلہ پیدا ہوئے، ان کا خیال تھا کہ قرآن کی بلاغت کے مثل لانا ممکن ہے،

اس زمانہ کے عوام عربی زبان مین مہارت نہ رکھتے تھے، اور بلاغت کا کیا ذکر وہ جملے کی صحیح و غلط شکل مین بھی تمیز نہ کر سکتے تھے، اس لئے اہل سنت نے پیش بندی کے طور پر وجوہ اعجاز تشریح کے ساتھ بیان کرنے کی ضرورت محسوس کی، اس موضوع پر پہلے مصنف محمد بن یزید واسطی متوفی ۳۰۶ھ تھے، ان کے بعد مشہور عالم الجاحظ متوفی ۲۵۵ھ ہوئے جنھون نے اس موضوع پر کتاب لکھنے کا ذکر خود اپنی کتاب الحیوان مین کیا ہے، ان کے بعد رمانی نحوی متوفی ۳۸۲ھ کا نمبر آتا ہے، اسی زمانے کے ایک دوسرے محدث خطابی متوفی ۳۸۸ھ ہوئے، جنھون نے اس موضوع پر لحاظ اعداد کے بحث کی ہے، علامہ باقلانی متوفی ۴۰۳ھ اس موضوع پر بہترین مصنف تسلیم کئے گئے ہین،

متاخرین مین سے جنھون نے اس موضوع پر لکھا ان مین مشہور متکلم امام فخر الدین رازی متوفی ۶۰۶ھ، ابن ابی الاصبع متوفی ۶۵۴ھ ..... ابن سراقہ شاطبی متوفی ۷۳۱ھ قابلِ ذکر ہین کشف الظنون سے معلوم ہوتا ہے کہ انھون نے اس موضوع پر بلحاظ اعداد کے بحث کی ہے، زملکانی ۷۲۷ھ، دورِ حاضر کے مصری عالم مصطفیٰ صادق رافعی نے بھی اس موضوع پر کتاب لکھی ہے، ایسے علما جنھون نے اس موضوع پر سرسری طور پر قلم اٹھایا، اتنے زیادہ ہین کہ اُن کی صحیح تعداد بیان نہین کی جا سکتی، ان مین ایسے جنھون نے اس موضوع پر بہت لطافت کیساتھ عالمانہ انداز مین تبصرہ کیا ہو مندرجۂ ذیل ہین :-

(۱) ماوردی متوفی ۴۵۰ھ جنھون نے رسالہ اعلام النبوۃ مین اس مسئلہ کو بہت خوبی کے ساتھ لکھا ہے،

(۲) علامہ عبد القاہر جرجانی متوفی ۴۷۱ھ علم بلاغت کے بانی عالم جن کی کتاب دلائل الاعجاز مین قرآن مجید کے اعجاز پر خاص طور پر توجہ دی گئی ہے،

(۳) قاضی عیاض اندلسی متوفی ۵۴۴ھ کی کتاب الشفا نے قبولیتِ عامہ حاصل کی بہت سے علما نے اُس کی شرحین لکھین،

جیسا کہ ابھی ظاہر ہوگا، یہ مضمون علامہ جرجانی، علامہ باقلانی، ماوردی اور قاضی عیاض کی تصانیف سے ماخوذ ہے،

قرآن شریف کے اعجاز کے معنی علامہ جرجانی نے اس اعجاز کی تشریح اس طرح کی ہے،

قرآن پاک کی طرف سے عربون کو اس بات کی دعوت دی گئی تھی کہ وہ اس جیسا کلام پیش کرین لیکن انھون نے اس دعوت کو قبول نہین کیا، اور اس سے روگردانی کرکے تلوار سے لڑنا پسند کیا، اگر قرآن پاک کی مثال لانا اُن کے بس کی بات ہوتی، تو یہ اُن کے لئے بمقابلہ لڑائی کے زیادہ آسان تھا، یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت ہے کہ قرآن پاک کی وہ کونسی خصوصیت تھی

جس نے اہلِ عرب کو اس کی نظیر لانے سے قاصر رکھا؟ کیا وہ قرآن مجید کے صحیح، عمدہ اور خوبصورت مضامین تھے یا محض الفاظ؟ اگر دوسری صورت اختیار کی جائے تو ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے، کہ الفاظ کی وہ کونسی خصوصیت تھی جس کی مثال وہ نہ لا سکے؟ ان سوالات کے جوابات حسبِ ذیل ہوں گے،

قرآن شریف کے مخالفین نے اس کی شستگی الفاظ، اُن کی ترتیب، بیان کی خصوصیات، آیات کا غیر معمولی آغاز و اختتام، الفاظ کی روانی، واقعات کا بیان، اسلوب نصیحت اور یاد دہانیوں اور دلائل کو خوب دیکھا، اور اس کی ایک ایک سورہ اور ایک ایک آیت پر غور کیا، مگر ایک لفظ بھی ایسا نہ پایا جو اپنی جگہ پر غیر موزوں ہو، یا جس پر اعتراض کیا جا سکتا ہو، اور اس میں ترمیم کیجا سکتی ہو، ان خصوصیات کی وجہ سے کسی شخص کو بھی اس کی مثال لانے کی ہمت نہ پڑی، علامہ جرجانی کے جوابوں کا خلاصہ یہ ہے کہ الفاظ اور مضامین دونوں نے مجموعی طور پر وہ خوبی پیدا کر دی، جس نے کلام پاک کو ناقابلِ مثال بنا دیا،

علامہ جرجانی ایک طویل بحث کے بعد مندرجۂ ذیل آیت کی خوبیوں کی تشریح کرتے ہوئے اپنے بیان کی توضیح کرتے ہیں کہ

وقیل یا ارض ابلعی ماءک ویا سماء	کہا گیا کہ اے زمین اپنا پانی سوکھ لے اور
اقلعی وغیض الماء وقضی الامر	اے آسمان پانی کو روک لے پانی کم ہو گیا
واستوت علی الجودی وقیل بعدا	اور حکم کی تعمیل ہو گئی، اور کشتی جودی کی پہاڑی
للقوم الظالمین ۰	پر رک گئی، اور کہا گیا کہ ظالموں پر لعنت ہو،

ان آیات کا حُسن اُن کے الفاظ اور جملوں کی مخصوص ترتیب سے ظاہر ہے، موقع کی اہمیت کی وجہ سے زمین کو حرفِ ندا سے پکارا گیا ہے، یا ایتھا سے نہیں، اُس کے بعد آگے اور پیچھے کے الفاظ سے قطع نظر کرتے ہوئے ابلعی کو لیجئے، یہاں پانی کو کافِ خطاب سے منسوب کیا گیا ہے، جو زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے، یہ طرزِ خطاب بڑی خوبی کیساتھ منتخب کیا گیا ہے، اور ابلعی الماء کا سادہ طریقہ نہیں اختیار کیا گیا، اس کے بعد آسمان کو

پکارا گیا، اور اس کو اپنا کام انجام دینے کا حکم دیا گیا ہو، اس کے بعد تعمیل حکم کی خبر بصیغۂ مجہول یہ ظاہر کرنے کے لئے دی گئی ہے، کہ پانی خود اپنے اختیار سے زمین میں جذب نہیں ہوا، بلکہ ایسا خدا کے حکم سے ہوا، پھر تعمیل حکم کے بیان سے واقعہ کی تائید لائی گئی ہے، اور اس کشتی کے بیان سے جس کا اس سے پہلے کوئی ذکر نہیں ہو اس واقعہ کا فائدہ اور انجام بتایا گیا ہے، بلاغت کی رو سے یہ طرز بیان واقعہ کی عظمت کو ظاہر کرتا ہے، آخر میں لفظ قیل کو دوبارہ استعمال کیا گیا ہے، تاکہ جملے کے آغاز کے ساتھ مطابقت ہو جائے، یہ تمام خوبیاں سننے والے کے دماغ پر عظمت طاری کرتی ہیں محض سادہ الفاظ کی مدد سے ہی نہیں بلکہ ان عجیب و غریب مضامین سے بھی جو ان الفاظ سے ادا کئے گئے ہیں،

علامہ جرجانی نے اپنی رائے کو اسی کتاب میں ایک اور جگہ زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ

"جب عربوں کو یہ چیلنج دیا گیا کہ وہ قرآن پاک کی مثل بنا لائیں، اس وقت اُن کو قرآن کی وہ مخصوص خوبیاں جو اپنی عبارتوں میں وہ نہیں پیدا کر سکتے تھے، ضرور معلوم رہی ہوں گی، کیونکہ یہ بات ہے کہ کوئی شخص اپنے فعل کے کسی خاص پہلو کی طرف اشارہ کئے بغیر دوسرے آدمی سے یہ کہے کہ تم میری طرح اس کام کو نہیں کر سکتے، قرآن کی یہ خاص خوبی محض اس کے الفاظ حروف اعراب اور مسجع جملوں ہی میں مخصوص نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ تو عربوں کے نزدیک کوئی مشکل بات نہ تھی، اس لئے وہ خوبی محض ترتیب الفاظ ہی ہو سکتی ہے جو ایسے مضامین کو ادا کرتی ہے جو نزول قرآن سے پہلے نامعلوم تھے"

یہاں علامہ جرجانی اپنے بیان کی تائید میں اشتعل الراس شیبًا کی تشریح کی ہے، جس کا مطلب یہ ہو کہ سر ضعیف العمری سے چمک اٹھا تاوقتیکہ کلمہ راس کو معرف باللام نہ بنایا جائے، اور اس کو اشتعل کا فاعل نہ قرار دیا جائے، اور دونوں کلموں کے ساتھ شیبًا کو حالت نصبی میں بصورت نکرہ اضافہ نہ کیا جائے"

جملے مین کوئی خوبی نہین پیدا ہوگی کیونکہ جو مضمون یہان ادا کیا گیا ہے وہ اسی طرز کے ساتھ مخصوص ہے'

وجوہ اعجاز | علامہ باقلانی کی رائے کے مطابق قرآن کے اعجاز کی تین خاص وجوہ ہین، انھون نے آخری وجہ کو دس قسمون مین تقسیم کرکے کل تعداد بارہ تک کر دی ہے' ماوردی نے اُن کی تعداد بیس قرار دی ہے' قاضی عیاض چار وجہین بتاتے ہین، مگر آٹھ کا اضافہ کرکے انھون نے بھی تعداد بارہ تک پہنچا دی ہے' ان سب کی میزان چوالیس ہوتی ہے، جن کا خلاصہ حسب ذیل ہے :-

(۱) الفاظ کی صحت اور ان مین آپس کی ایسی مشابہت جو عربون کی رسائی سے باہر تھی' اہل عرب زبان مین غیر معمولی مہارت کے باوجود بھی قرآن کی مثال پیش نہ کرسکے، حالانکہ یہ دعوی ۲۳ سال تک قائم رہا، ولید بن مغیرہ نے جو مکہ کا بڑا آدمی تھا، آنحضرت صلعم کو آیہ

انّ اللہ یامُرُ بالعَدل — بیشک اللہ انصاف کرنے کا حکم دیتا ہے'

پڑھتے ہوئے سُن کر کہا، اُس بیان مین مٹھاس اور حُسن ہے' اُس کا زیرین حصہ پانی مین ڈوبا ہوا اور بالائی حصہ پھلون سے لدا ہوا ہے، اور یہ انسان کا کلام نہین ہے' ایک بدوی کسی شخص کو آیت

فاصدع بما تؤمر — تمھین جس امر کا حکم دیا گیا ہے' اس کا اعلان کرو'

تلاوت کرتے ہوئے سُن کر سجدے مین گر گیا، اور کہا کہ مین اس کی فصاحت کے سامنے سجدہ کر رہا ہون' ایک رومی بطریق نے جو اچھی عربی جانتا تھا کسی مسلمان کو یہ آیہ پڑھتے سنا،

وَمَنْ یُطِعِ اللہَ وَرَسُولَہ ویخشی — کامیاب ہونے والے وہی لوگ ہین جو

اللہ ویتقہ فاُولٰئک ھُمُ الفائزون — خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت اور خدا کا...

تو کہا کہ صرف ایک آیت مین دنیا و آخرت کے وہ تمام مسائل موجود ہین، جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئے تھے،

(۲) قرآن شریف کی حیرت انگیز عبارت اور اس کا غیر معمولی طرز بیان جو مختلف مضامین سے

متعلق ہونے کے باوجود عربوں کے مروجہ طرز بیان سے علیحدہ تھا، ان کے مروجہ طرز میں صرف دو چیزیں تھیں، نثر اور نظم، نثر کی دو قسمیں تھیں، مسجع اور غیر مسجع، نظم کی بہت سی قسمیں تھیں، شاعری بلند پایہ فن تھا، لیکن نثر ہر ایک کے بس کی تھی، قرآن اُن میں سے کسی قسم کی نثر یا شاعری سے مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ آیات کے آخری حروف شعر کے قافیوں اور نثر کے سجع سے مختلف تھے، ان بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ قرآن نے ایک نیا اسلوب بیان ایجاد کیا، جو اہل عرب کے بس سے باہر تھا، اور معصر اہل عرب اس حقیقت کو ماننے پر مجبور ہوئے،

(۳) عرب میں ایسے بلیغ کلام کا وجود نہ تھا جس میں نازک خیالات اور پختہ حقائق بیان کئے گئے ہوں، اور اسالیب بیان میں طول کے باوجود باہم مشابہت بھی ہو، یہ صحیح ہے کہ عقلا نے اچھے اچھے جملے بھی کہے، اور شعراء نے اشعار بھی، مگر ان جملوں اور اشعار میں اختصار کے باوجود بھی خامیاں موجود تھیں، اس کے برعکس قرآن پاک ہر قسم کے نقائص سے پاک ہے،

(۴) قرآن شریف کے طرز ادا میں نہ کوئی اختلاف ہے اور نہ بیان میں کوئی نقص ہے، اگرچہ اس میں قصے، نصیحتیں، دلائل، حقائق، قوانین، معذرت، وعدے، وعید، محاسن اخلاق کی تعلیم اور دوسرے مختلف قسم کے مضامین ہیں، اور کسی ایک تحریر میں ان تمام خوبیوں کا مجتمع ہونا ناممکن ہے، مختلف لوگ بیان کی مختلف شاخوں میں ماہر ہوتے ہیں، مثلاً شاعر جو مدح کرنے میں ماہر ہو وہ ہجو کا ماہر نہیں ہو سکتا، اور جو شخص ہجو نگاری میں بلند پایہ ہوگا، وہ مدح میں کمتر ہوگا، اگر بعض مرثیہ گوئی میں بہتر ہیں، تو دوسری اصناف شاعری سے بے بہرہ ہیں، بعض رجز میں مہارت رکھتے ہیں، تو دوسرے اقسام پر قادر نہیں بعض اونٹوں اور گھوڑوں کے اوصاف، رات کے سفر، باغ، شراب اور جذبات کی مصوری کرنے میں استاد مانے گئے ہیں، اگر امرالقیس سواری کا بیان کرنے میں مشہور ہے، تو نابغہ ڈرانے اور ترغیب دلانے میں ماہر ہے، اسی طرح تقریروں پیاموں اور دوسرے قسم کے بیانات میں اختلاف ہے،

ایک شخص اپنی دلچسپی کے کسی خاص مضمون مین اپنے ہنر کا مظاہرہ کرسکتا ہے لیکن جب وہ کسی اور موضوع کو ہاتھ لگاتا ہے تو پیچھے رہ جاتا ہے، اور اس کی عبارت کی خامی نمایان ہو جاتی ہے، اسی بنا پر مندرجۂ بالا شعرا جن کی برتری اُن کے خاص مضامین مین مسلم ہے دوسرے مضامین مین کمتر سمجھے گئے ہین، ایک ہی جملہ جس میں کوئی بندش نہ ہو، ادا کرنے والون کے اختلاف سے اختلاف پذیر ہو جاتا ہے، قرآن پاک اپنی تمام تفصیلات مین ایسی مضبوط قوت کا حامل ہے، جو تمام نقائص سے پاک ہے کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پیش کیجا سکتی جس مین قرآن پاک اپنی فصاحت کے یکسان معیار کو قائم نہ رکھ سکا ہو، ایک ہی مضمون کو بار بار دہرانے مین طرز بیان کا یکسان رہنا ناممکن ہوتا ہے لیکن قرآن مضامین کی تکرار کے باوجود بھی اپنے معیاری طرز بیان سے کبھی نہین ہٹتا، اور اپنی بلاغت قائم رکھی،

(۵) فصحا کی عبارتون مین جہان وہ مختلف جملون اور خیالات کو آپس مین ملاتے اور جدا کرتے ہین، ایک نمایان بے ضابطگی پائی جاتی ہے، اُن کی یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہے، جب وہ اپنی زبان کے اسالیب بیان کے مطابق کسی مضمون کو اس کے ابتدائی درجہ سے آغاز کرکے انتہا تک پہنچاتے ہین، یا اس کے برعکس انتہا سے ابتدا مین لیجاتے ہین، یہ خامی اس وقت بھی ظاہر ہوتی ہو جب کسی مضمون کو زیادہ دلچسپ بنانے یا کسی مضمون کو غیر دلچسپ اور مشکل بنانے کی کوشش کرتے ہین لیکن قرآن مین اس قسم کی کوتاہی نہین بلکہ اس کے ہر قسم کے بیانات مین مناسبت ہے،

(۶) آیات قرآنی کی ساخت سے تین خصوصیات ظاہر ہوتی ہین،

(الف) الفاظ کا اس طریقہ سے استعمال کہ وہ موثر ہون،

(ب) خیالات کی ایسی جامعیت جو ابتدا ہی سے واضح ہین، اور ان کے سمجھنے کا دارومدار آیت کے اختتام پر نہین ہے، اور خیالات اور الفاظ مین بھی مطابقت ہے، اس مین نہ کمی ہے اور نہ زیادتی،

(ج) آیات کی ساخت مین حسن ہے، اور غیر موزون بندشون کا کہین وجود نہین، اوزان مین مشابہت ہے،

(۷) عربی زبان مین متعدد اسالیب بیان ہین، مثلاً تفصیل و تطویل، اختصار، اجماع، افتراق اور استعارہ وغیرہ، یہ تمام اصناف قرآن پاک مین موجود ہین، جب اُن کے قرآنی استعمال کا مقابلہ دوسرون سے کیا جاتا ہے، تو یہ ظاہر ہوجاتا ہے کہ قرآن کا طرز بیان انسانی طاقت سے بالاتر ہے،

(۸) قرآنی خیالات جو مذہب اور شرع کی بنیاد ہین، اس استدلال و مباحثہ اور ایسی اہم اخلاقی نزاکت اور عمدگی کے ساتھ بیان کئے گئے ہین کہ اس کی مثال انسانی کلام مین ملنا ناممکن ہے، اس مین اگر بہت سے معمولی اور جانے بوجھے ہوئے خیالات ہین، تو بہتیرے نئے اور غیر معمولی بھی ہین، جدید خیالات کے مقابلہ مین جانے بوجھے ہوئے خیالات کے لئے الفاظ منتخب کرنا آسان ہے، اور معمولی تخیل کے لئے بہت عمدہ الفاظ کے استعمال کے مقابلہ مین بلند اور بہترین تخیل کے لئے بہترین الفاظ کا استعمال زیادہ مناسب ہے، اسی کے ساتھ اگر الفاظ خیالات کے مطابق ہون، اور خیالات الفاظ کے اور دونون اپنی جگہ پر بے مثال ہون جیسا کہ قرآن مین ہے، تو اس کی ندرت اور کمال فصاحت مین کوئی شبہہ نہین ہوسکتا،

(۹) کلام کا اصل حسن اس وقت ظاہر ہوتا ہے جب کسی نظم یا نثر مین اس کا اقتباس دیا جائے، اور اس وقت اس کی خوبی ہیرے کی طرح چمکے، قرآنی اقتباسات کو جب اس کلیہ پر منطبق کیا جاتا ہے، تو انکی خوبی اور نمایان ہوجاتی ہے، اور وہ دوسرے کلام مین نگینہ کی طرح چمک اٹھتے ہین،

(۱۰) عربی مین حروف تہجی ۲۹ ہین، اور قرآن کی وہ سورتین جو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہین، ۲۹ ہین، اور ان حروف مقطعات کی تعداد جو ان مین لائے گئے ہین، ۱۴ ہے، شاید ایسا اس لئے ہو کہ قرآن اُن کی زبان کے الفاظ سے مرکب ہے، یہ حروف بعد کے نحویون کی رائے کے مطابق دو قسم کے ہین، مہموسہ اور مجہورہ، وس مہموسہ ہین، اور باقی انیس مجہورہ، دونون قسمون مین سے نصف نصف سورتون

کے شروع مین لائے گئے ہین، حروف کی ایک اور تقسیم بھی ہے حلقی و غیر حلقی، پہلے حروف تعداد مین چھ ہین، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین لائے گئے ہین، ایک تیسری تقسیم بھی ہے شدیدہ اور مطبقہ، اس قسم کے اعتبار سے بھی دونون قسمون کے نصف نصف حروف سورتون کے شروع مین موجود ہین، یہ تقسیمین نزول قرآن کے بہت بعد دریافت ہوئی ہین، اس لئے اس متاخر انکشاف کے مطابق سورتون کا افتتاح اس بات کا کھلا ہوا ثبوت ہو کہ قرآن انسان سے بالاتر ہستی کا کلام ہے،

(۱۱) قرآن کا طرز بیان سادہ آسان اور غیر مانوس بندشون اور الفاظ سے پاک ہے، اس کی ترکیب مین کہین گنجلک نہین، اس کے مضامین ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے، خواہ وہ عالم ہو یا جاہل، مگر اس سادگی کے باوجود بھی قرآن کی مثال نہین لائی جاسکتی کسی بھی انسانی کلام مین یہ خوبی نہین پائی جاتی، جیسا کہ پہلے مذکور ہوا، اچھے شاعرون کی نظمون تک مین غیر مانوس الفاظ اور دور افتادہ خیالات بہت پائے جاتے ہین، اور اُن کی ساری کی ساری نظمون مین یکسانی نہیں پائی جاتی، اور ان مین اچھی، بُری، اور اوسط درجہ ہر قسم کی عبارتین ہین،

(۱۲) طویل مضامین اور خیالات بڑی خوبی کے ساتھ مختصر طریقہ سے ادا کئے گئے ہین، مثلاً آیہ:-

لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ ۔ یعنی قصاص مین تمھارے لئے زندگی ہے،

کا القتل انفی للقتل سے موازنہ آیہ کی برتری ثابت کرتا ہے اس کی دوسری مثال

وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى اَنْ اَرْضِعِيْهِ فَاِذَا خِفْتِ عَلَيْهِ فَاَلْقِيْهِ فِي الْيَمِّ وَلَا تَخَافِيْ وَلَا تَحْزَنِيْ اِنَّا رَآدُّوْهُ اِلَيْكِ وَجَاعِلُوْهُ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۔

یعنی ہم نے موسیٰ کی ماں پر وحی بھیجی کہ اس کو دودھ پلاؤ، اور جب تم اس کے بارے مین خوف زدہ ہو تو سمندر مین پھینک دو، ڈرو مت اور نہ رنجیدہ ہو، ہم اُس کو تمھارے پاس ضرور واپس لائین گے، اور اس کو پیغمبرون مین

ہی، اس آیت مین دو امر و نہی کے صیغے، دو خبرین اور دو بشارتین ہین،

(۱۳) ایک ہی سلسلہ مین مختلف اقسام کے مضامین کا یکجا کرنا جو انسانی طاقت سے باہر ہے، قرآن مین بعض وقت یہ خوبی ایسے الفاظ کے استعمال سے پیدا کی گئی ہے جن کی مختلف تشریحات ممکن ہین،

(۱۴) اطلاعات اور پیشین گوئیان جو آیندہ سچی ثابت ہوئین، مثلاً یہود کا دعویٰ کہ مخالفین کبھی بھی قرآن کی مثال لانے مین کامیاب نہ ہون گے یا جنگ بدر کے بارے مین کفار کی شکست کی پیشینگوئی،

(۱۵) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قدیم صحیفون سے ناواقف تھے، آپ کو اُن لوگون سے ملنے کا بھی کبھی اتفاق نہین ہوا جن کو ان صحیفون کا علم تھا، مگر قرآن مین پچھلی قومون کے قصے ابتدائے آفرینش یعنی آدم و حوا کا قصہ، اُن کا جنت مین قیام اور پھر وہان سے نکلنا، طوفان نوح اور فرعون کے قصے، انبیاء علیہم السلام کی سوانح اور خصوصیت کے ساتھ ان واقعات کا تفصیلی بیان موجود ہے، جن کے بارے مین امتحاناً دریافت کیا گیا تھا، یہ تمام بیانات اصلی واقعات کے مطابق تھے، اُن کی بنیاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پچھلے علم پر نہ تھی

(۱۶) لوگون کے دلون کے راز جن کو وہ چھپاتے تھے، اور جنھین کوئی بھی معلوم نہ کر سکتا تھا، قرآن نے کھول دیئے، مثلاً

اِذْ هَمَّتْ طَّائِفَتَانِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا،	یعنی جب تم مین سے دو گروہون نے بزدلی دکھانے کا ارادہ کیا،
اور:- وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ اِحْدَى الطَّائِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ	وہ وقت یاد کرو جب اللہ نے تم سے وعدہ کیا کہ ان دو مین سے ایک گروہ تمھارے لئے ہوگا، اور تم نے یہ چاہا کہ تمھارے لئے وہ گروہ ہو جو غیر مسلح ہے۔

یہان جن رازون کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ظاہر نہین تھے،

(۱۷) قرآن مین علم وحکمت کے ایسے اصول موجود ہین جن سے عرب نابلد تھے،

(۱۸) قرآن مین خالق کے وجود، اس کی توحید اور معاد کے ثبوت اور دوسری جماعت سے مقابلہ اور اس کی تردید کے لئے ایسے ایسے دلائل پیش کئے گئے ہین جن کو ایک امی خود اپنی انسانی کوشش سے پیش نہین کرسکتا،

(۱۹) مضامین کو بخوبی کے ساتھ ایسے آسان طریقہ سے بیان کرنا کہ سہولت بیان کی وجہ سے کلام میں عامیانہ پن پیدا نہ ہو، اور غیر مانوس مضمون بھی مشکل نہ معلوم ہو، جملے کی ساخت مین آسانی اس کو عامیانہ بنادیتی ہو اور نادر ترکیبون کا استعمال مشکل بنا دیتا ہے، دونون کا یکجا ہونا غیر مانوس تصور کیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک نے ان تمام باتون کو بڑی خوبی سے نباہا ہے، اور جہان بھی آسان اور نادر مضمون کو یکجا کیا گیا ہے، وہان ان مین پوری مطابقت ہو اور کوئی اجنبیت نہین معلوم ہوتی،

(۲۰) قرآن کو یاد کرنا اور اس کو اپنے حافظہ مین محفوظ کرلینا آسان ہے، اس لحاظ سے دنیا کی کوئی کتاب یا صحیفہ قرآن کی برابری نہین کرسکتا، قرآن کو حفظ کرنے مین کسی شخص کی خصوصیت نہین، خواہ وہ عرب ہو یا عجم، بالغ ہو یا نابالغ، ہر ایک بڑی آسانی کے ساتھ یاد کرلیتا ہے، ابتدائے اسلام ہی سے ایسے لوگون کی ایک بڑی جماعت ہوتی آئی ہے، اور اب بھی موجود ہے، جس نے قرآن کو حفظ کیا ہے، اور کرتی ہے،

(۲۱) قرآن ایک غیر فانی معجزہ ہے، جو ابدالآباد تک رہے گا،

(۲۲) قرآن شریف مین رعب کا ایک ایسا عنصر ہے، جس سے سننے والون اور خصوصیت کے ساتھ کفار کے دل بہت مرعوب ہوتے ہین، جیسا کہ محدثین کے روایت کردہ واقعات سے ثابت ہوتا ہے،

جبیر بن مطعم سے روایت ہے کہ انھون نے کفر کی حالت مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو مغرب کی نماز مین سورہ طور کی تلاوت کرتے سنا، جب آپ اس آیت پر پہنچے،

أَمْ خُلِقُوا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ أَمْ هُمُ الْخَالِقُونَ کیا اُن کی تخلیق بغیر کسی خالق کے ہوئی ہے

.....اَمْ هُمُ یا وہ خود اپنے خالق ہین یا وہ اپنے (تقدیری)

الْمُصَيْطِرُونَ، معاملات کے خود مالک ہین"

تو اُن کا دل ہیبت سے لرز گیا، اور وہ سمجھے کہ اب قلب کی حرکت بند ہوئی، اس طرح اُن کے دل مین ایمان راسخ ہوگیا،

(۲۳) قرآن کے مختلف حصے ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت و مطابقت رکھتے ہین، اور اس مین مختلف اقسام کے مضامین کا ایک خوبصورت امتزاج ہے، اور جب اس کا انداز بیان ایک موضوع سے دوسرے کی طرف جاتا ہے، تو اس تبدیلِ موضوع مین بھی خوبی ہوتی ہے، اور بے لگاؤ نہین معلوم ہوتا، حالانکہ دونون مضمونون مین بڑا اختلاف ہوتا ہے، قرآن پاک کی ایک ہی سورہ مین جو مختلف مضامین پیش کئے ہین کہین بھی کوئی خلا، یا بے تعلق تبدیلی نہین معلوم ہوتی، قرآن پاک جگہ جگہ اپنے موضوع کا رُخ وعدے سے وعید کی طرف، ترغیب سے ترہیب کی طرف، ماضی سے مستقبل کی طرف، قصون سے امثال کی طرف اور حکم سے نزاع کی طرف بدلتا ہے، لیکن اس سے مضمون مین کوئی ناموافقت نہین پیدا ہوتی، جو نہایت ہی مشکل امر ہے، اور موضوع بدلتے وقت غیر موزونیت کا ہونا لازمی ہے، اسی لئے بہت سے شعراء ایسے مواقع پر ناکام رہتے ہین، بحتری گو عمدہ بندش اور خوبی بیان مین مشہور ہے لیکن جب وہ غزل سے مدح کی جانب آتا ہے تو اس تبدیلی کو وہ مناسب طور پر نباہ نہیں سکتا، اور اس مین ناکام رہتا ہے،

(۲۴) قرآن پاک کی نقل و روایت مین اس توجہ سے کام لیا گیا ہے، کہ اس کے الفاظ، مضامین و ترتیب مین تغیر کا کیا ذکر حرکات تک مین بھی ذرہ برابر تغیر نہین ہوا، ہر زمانے اور ہر ملک کے لوگون کی بس یہی کوشش رہی، کہ قرآن پاک اُن کے پاس بعینہٖ اسی حالت مین بغیر ذرہ برابر تغیر کے محفوظ رہے جس مین ان تک پہنچا،

(۲۵) آیات کے چھوٹے اور بڑے ہونے سے قرآن مجید کے مخصوص طرز بیان مین کسی قسم کا فرق نہین پیدا ہوتا، انسانی کلام مین اس قسم کا تفاوت ہونا لازمی ہے،

(۲۶) قرآن مجید کے پڑھنے اور سننے والے اس سے کبھی نہیں گھبراتے، اور یہ ان کے لئے ہمیشہ تازہ اور نیا رہتا ہے، جو انبساط اور حُسن بیان کا نتیجہ ہے، یہ خوبی کسی کلام میں نہیں پائی جاتی، خواہ وہ کتنا ہی شیریں کیوں نہ ہو،

(۲۷) جب ایک شخص بلاغت کے مطالعہ میں مشغول ہوتا ہے، تو وہ اس میں ماہر ہو جاتا ہے، اور فصاحت میں عبور حاصل کر لیتا ہے، یہی فصاحت اس کے مطالعہ کو وسیع کرتی ہے، لیکن قرآن پاک اُس شخص کو فصیح و بلیغ نہیں بناتا، جو اس کو مسلسل پڑھتا رہتا ہے، اور اس میں لگا رہتا ہے، یہ خصوصیت صرف اس کے اعجاز کی وجہ سے ہے (تاکہ دوسری بلاغت کی کتابوں سے ممتاز رہے)

(۲۸) قرآن شریف پر اگر کوئی بھی اضافہ کیا جائے، تو بڑی آسانی کے ساتھ تمیز کی جا سکتی ہے، اور اگر الفاظ میں کوئی تبدیلی کیجائے، تو وہ بھی فوراً ظاہر ہو جاتی ہے، اور چھپائی نہیں جا سکتی،

(۲۹) قرآن کے مخالفین اس کی مثال لانے سے قاصر رہے، باوجود یکہ اس کا یہ دعوی اب بھی قائم ہے، اور اس کی مثال لانے سے اپنی نا قابلیت کا اعلان کرنے پر مجبور ہو گئے،

ان کا حصہ کچھ کلام نہ آیا، اور انھوں نے اس کی مثال لانے سے مایوس ہو کر تلوار سے لڑنے کو ترجیح دی جس کے نتیجہ میں اُن کے آدمی قتل و غارت ہوئے اور قیدی بنائے گئے،

(۳۰) علامہ ماوردی کے نزدیک سب سے آخری وجہ الصرفہ ہے یعنی خود قرآن نے اپنی مثال لانے سے مخالفین کا منہ پھیر دیا، اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا قرآن کی مثال لانا اُن کے بس ہی میں نہ تھا یا یہ کہ ان میں اس کی صلاحیت تھی، مگر سلب کر لی گئی تھی، پہلا عقیدہ معتزلہ کا ہے اور دوسرا اہل سنت کا، چونکہ یہ فلسفیانہ نازک مسئلہ ہے، اس لئے میں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا،

کیا قرآن میں سجع ہے؟ پچھلے صفحات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ قرآن پاک کا ایک جداگانہ طرز بیان ہے جسے نہ تو نثر کہا جا سکتا ہے، اور نہ نظم اب اس کی تفصیل پیش کیجاتی ہے، نثر چونکہ عموماً مسجع ہوتی تھی اس لیے پہلے

اسی کو لینا چاہئے اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ قرآن میں سجع ہے یا نہیں، علماء کی ایک جماعت جو سجع کو حسن بیان اور فصاحت کا جزو تصور کرتی ہے، اس خیال کی ہے کہ قرآن میں سجع ہے، اس کی دلیل یہ ہے کہ آیت

قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَمُوْسٰى، ہم ہارون اور موسیٰ کے رب پر ایمان لائے،

میں ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھا گیا ہے، حالانکہ معکوس ترتیب عموماً استعمال ہوئی ہے، جیسا کہ دوسری آیتوں میں ہے، مگر یہ تبدیلی (یعنی ہارون کو موسیٰ سے پہلے رکھنا) سجع کی غرض سے کی گئی ہے، سجع کا تقاضا ہے کہ اس جگہ الف مقصورہ ہو، یہاں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ تغیر بے ارادہ ہوا ہے، جیسا کہ اس جگہ کے لئے کہا جاتا ہے جہاں کوئی قرآنی آیت وزن شعری کے مطابق پڑ گئی ہو جس کی مثالیں بہت ہیں،

علامہ باقلانی کی رائے سجع کے خلاف ہے، وہ لکھتے ہیں، "قرآن میں سجع ہونے کی جو یہ دلیل پیش کیجاتی ہے وہ پوری طرح صحیح نہیں معلوم ہوتی، اول یہ کہ قرآن میں اگر سجع ہوتا، تو وہ عربوں کے طرز بیان سے جدا گانہ نہ ہوتا، اور اس صورت میں اس کی مثال لانا ممکن ہوتا، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن کا سجع بھی غیر ممکن المثال ہے لیکن قرآن کو شعر ماننے کی صورت میں بھی یہی کہا جا سکتا ہے، اور اس کے انکار کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، اور پھر اس کے کوئی معنی نہ رہ جائیں گے کہ قرآن شعر میں ہے، دوسرے یہ کہ سجع شاعری کی بنیاد ہے، یعنی وہ شاعری کا پہلا درجہ تھا جس نے بڑھتے بڑھتے شاعری کی موجودہ صورت اختیار کر لی، قرآن میں شاعری کی مذمت اور اس سے احتراز کا اعلان اس شدت سے کیا گیا ہے کہ دونوں میں دور کا تعلق بھی نہیں مانا جا سکتا، اور قرآن میں سجع ماننے کی صورت میں اس تردید کا زور باقی رہنا مشکل ہو جائے گا، تیسرے یہ کہ جاہلیت کے کاہن سجع سے واقف تھے، خود قرآن شریف اور حدیث نبوی

وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ، یعنی کسی کاہن کی تصنیف نہیں ہے،

دونوں نے اس کا انکار کیا ہے، ایک مرتبہ کچھ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے، اور آپ سے جنین کے بارے میں کہا:-

کیف ندی من لا شرب ولا اکل	اس کا انتقام کیسے لیں جس نے کھایا نہ پیا،
ولا صاح فاستھل لیس دمہ	اور نہ آواز کی، کیا اس کا خون بغیر انتقام
قد یطل،	کے رہے؟

آنحضرت صلعم نے جواب میں فرمایا:-

"اسجاعۃ کسجاعۃ الجاھلیۃ	یعنی کیا یہ جاہلیت کی سی سجع ہے، یا کاہنوں
او اسجعا کسجع الکھان	کی سی،

اس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم سجع کو بُرا سمجھتے تھے،

اب ان آیات کا سوال رہ جاتا ہے جو بظاہر سجع معلوم ہوتی ہیں، لیکن درحقیقت وہ سجع نہیں ہیں، بعض لوگوں پر قرآنی ترکیب سجع کے طرز کی ضرور ہے، مگر وہ حقیقۃً سجع نہیں، سجع کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں الفاظ کی اہمیت زیادہ ہوتی ہے اور معنی و مضامین کی کم، اور قرآن میں زیادہ اہمیت معنی کی ہے، اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے،

اس کے علاوہ سجع جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا، ایک مخصوص طرز ادا کا نام ہے جس میں اگر ذرا بھی بے توجہی سے کام لیا جائے، تو کلام انشائی بے جوڑ ہو جاتا ہے، اور اس کی ساری فصاحت خاک میں مل جاتی ہے، جیسا کہ اگر شاعری میں اس کے اصول کا خیال نہیں کیا جاتا، تو وہ شعر نہیں رہ جاتا، اور اس کی فصاحت بھی ختم ہو جاتی ہے، بعض آیات قرآنی جن کو مسجع کہا گیا ہے، وہ دراصل سجع کے اصولوں کے مطابق نہیں ہیں، کیونکہ اُن کے بعض جملے چھوٹے اور بعض لمبے ہیں کہ سجع کا حرف اس وقت آتا ہے، جب کہ دوسرا جملہ پچھلے کا دوچند ہو جاتا ہے، جو سجع کے لئے پسندیدہ اور فصاحت کے خلاف ہے، اس سے قرآن کی فصاحت میں فرق آ پڑے گا، جس کو اس کے فصحا نہیں مجنون کہتے، اگر ایسا ہوتا تو فصحائے عرب خاموش نہ رہتے، انھوں نے یقیناً اعتراض کیا ہوتا، اور اس کو سحر کبھی نہ کہتے، اس لئے سجع کو آیات قرآنی پر منطبق نہیں کیا جا سکتا،

آیاتِ قرآنی کے آخری حروف فواصل خود اپنی جگہ پر ایک مخصوص طرز کے ہیں، ان میں اور سجع و شعر کے قافیہ میں کوئی چیز مشترک نہیں، ایک آیت میں ہارون کو اوّل اور موسیٰ کو بعد میں اور دوسری جگہ اس کے برعکس رکھنے کی وجہ سجع نہیں، بلکہ اس سے مقصود ایک مفہوم اور ایک ہی قصّہ کو مختلف الفاظ میں بیان کرنا ہے، جو لوگ فنِ بیان کے ماہر ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ اور مختلف طریقوں سے بیان کرنا کتنا مشکل ہے، اس میں فصاحت کا قائم رکھنا مشکل ہو جاتا ہے، قرآن پاک نے ایک ہی قصّہ کو مختلف الفاظ اور مختلف پیرایوں میں بار بار بیان کرنے کے باوجود اپنی فصاحت کے معیار کو قائم رکھا ہے اور تکرار کی وجہ سے اس کی بلاغت میں کہیں بھی خامی نہیں پیدا ہوئی، اور یہ نوع بھی اس خوبی کا ایک رُخ ہے جس نے قرآن کو معجزہ بنایا، الفاظ کو آگے پیچھے رکھنے کا مقصد دوسرا ہے، اور سجع سے فواصل کی یہ ظاہری مشابہت آیاتِ قرآنی کو حقیقۃً سجع کے زمرے میں نہیں لا سکتی،

قرآن شاعری نہیں شاعری کے تمام اصناف عربوں میں عام تھے، یہاں تک کہ لڑکے بھی نظمیں کہا کرتے تھے، اور اس میں کوئی دقت نہیں محسوس کرتے تھے، پچھلے صفحات میں یہ بات بار بار کہی جا چکی ہے کہ قرآن پاک کا طرزِ بیان شاعری سے مختلف ہے، اور یہ فرق قرآن کے معجزہ ہونے کی وجہ ہے ورنہ اگر قرآن شعر ہوتا تو اس کی مثال لانا ممکن ہوتا،

قرآن بڑے زور و قوت سے اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ وہ شعر نہیں ہے، حسب ذیل آیات اس کی شاہد ہیں،

(۱) وَمَا عَلَّمْنَاهُ الشِّعْرَ :- ہم نے رسول کو شعر نہیں سکھایا،

(۲) وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ :- اور یہ کسی شاعر کا کلام نہیں،

قرآن پاک کی آیتوں میں یہ کہا گیا ہے، کہ کفار نے یہ اعتراض کیا تھا کہ قرآن پاک ایک شاعر کا کلام ہے، اس اعتراض کی تحقیق بہت آسان ہے، اس کی بنیاد یہ ہے کہ جب مخالفین قرآن اس کے طرزِ بیان

پر متحیر ہوئے، تو اُن کو بے اصل اعتراضات پر مجبور ہونا پڑا، چنانچہ انھون نے کبھی کہا کہ یہ شاعری ہے، اور کبھی دعوی کیا کہ کسی کاہن کا کلام ہے، علامہ باقلانی کا خیال ہے کہ ان اعتراضات سے مقصد یہ تھا کہ وہ قرآن پاک کو شاعری ہی کی کوئی صنف سمجھتے تھے، (مگر پورے طور پر نہین) جس سے وہ آشنا نہ تھے، اس پر شعر کا اطلاق انھون نے اس وجہ سے کیا تھا کہ قرآن فطرت کا گہرا مطالعہ کرتا ہے، یعنی جس معنی مین فلسفیون نے شعر کو لیا ہے اگرچہ اہل عرب کے نزدیک شاعری کی تعریف دوسری تھی، ایک اور ضعیف وجہ یہ بھی بیان کی جاسکتی ہے کہ عوام نے اوزان شعر سے ناواقفیت کی بنا پر قرآن پاک کو شعر کہہ دیا،

قرآن مین ایسی آیات بھی ہین جو وزن مین مصرعہ سے مطابقت رکھتی ہین، علامہ باقلانی نے ان آیات کو مع اوزان کے پیش کیا ہے، اختصار کے خیال سے یہان صرف ایک مثال پیش کی جاتی ہے،

وجفان کالجواب وقدور راسیات	اور پانی کے بڑے بڑے برتنون جیسی ناندین
. . . . .	اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی دیگین، (سلیمان
. . . . .	کے تابع جنات اُن کے لئے بنایا کرتے تھے)

لیکن اس اعتراض کے جواب سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ شعر کہتے کسے ہین، شعر کی تعریف ہو کہ

"وہ کلام جو ارادۃً مقفیٰ رکھا گیا ہو، اور جو وزن پر منطبق ہو، اور جو اپنی جگہ پر مکمل تخیل پیش کرنے کیساتھ ساتھ ایک سے زیادہ اشعار پر مشتمل ہو شعر کہا جاتا ہے"

اس سے ظاہر ہوا کہ شعر کے لئے دو شرطین ہین ایک یہ کہ وزن اور قافیہ ارادۃً ہو، اور دوسری یہ کہ اس مین ایک ایسے زیادہ اشعار ہونے چاہئین، اور قرآن پاک کی بعض آیات غیر ارادی طور پر علم عروض کے مطابق ہین، جیسے بعض اوقات روزمرہ کی گفتگو مین بھی اتفاقاً کوئی فقرہ شعر کے وزن پر ہو جاتا ہے، جیسے کوئی کہے :

اغلق الباب واتنی بالطعام	یعنی دروازہ بند کرو اور میرے لئے کھانا لاؤ،

یا:- اسقنی الماء یا غلام سریعًا، یعنی اے لڑکے مجھے پانی جلدی پلا،

یہ جملے وزن کے مطابق ہین، مگر ایسا ارادۃً نہین کیا گیا، اس لئے اُن کو شعر نہین کہا جاسکتا، اس کے علاوہ دوسری شرط کہ شعر مین ایک سے زیادہ بیت ہونی چاہئین، قرآن پاک کی آیات پر منطبق نہیں ہوتی، دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر قرآن شعر ہوتا، تو یہ حقیقت یقیناً مخالفین قرآن کے علم مین ہوتی، اور بغیر کسی پس و پیش کے وہ یہ سمجھتے کہ قرآن شعر ہے، اور یہ ناقابل قیاس ہے کہ پچھلے لوگون نے وہ سمجھا جس کو معاصرین نہ سمجھ سکے تھے، ایک اور جواب یہ ہے کہ اگر مخالفین قرآن نے اس کو شاعری سمجھا ہوتا، تو انھون نے اس کا مقابلہ کیا ہوتا، کیونکہ تمام اصناف شاعری پر انھین قدرت حاصل تھی، قرآن شریف کی مثال لانے سے اُن کی عاجزی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ وہ قرآن کو شاعرانہ کلام تصور نہ کرتے تھے،

قرآن کے معارضین | تاریخ مین ایسے چند لوگون کے نام بھی ملتے ہین، جنھون نے پچھلی ۱۴ صدیون کے دوران مین یا تو خود قرآن کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی یا دوسرون نے اُن کی تصنیف کو قرآن کے مقابلہ مین پیش کیا، ایسے لوگ دو قسم کے ہین (۱) وہ جنھون نے پیغمبری کا ڈھونگ رچایا، اور جھوٹا الہامی کلام بھی پیش کیا (۲) وہ جنھون نے محض فن کی حیثیت سے کچھ لکھا، اور انھون نے یا دوسرون نے سمجھا کہ اس کو قرآن شریف کے مقابلہ مین پیش کیا جاسکتا ہے پہلی قسم کے لوگون مین پانچ نام لئے گئے ہین، اُن کے اس مشن کا نتیجہ خود ان کے انجام سے ظاہر ہے، ان مین سے دو تو بغیر کسی کامیابی کے مارے گئے، دو مسلمان ہو گئے، اور پانچوان اپنی معمولی حالت پر آگیا،

(۱) مسیلمہ یمامہ کا رہنے والا تھا جس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری ایام مین پیغمبری کا دعویٰ کیا، اُس نے مدینہ آنے اور اسلام قبول کرنے کے بعد یہ ڈھونگ رچایا، اس سے اس کا مقصد بادشاہت کا حصول تھا، چنانچہ اُس نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین صلح کی یہ شرط پیش کی کہ آپ اس کو اپنا شریک بنالین یا اپنا جانشین مقرر کر دین، اس کا یہ دعویٰ تھا کہ رحمان نامی فرشتہ اس پر قرآن لایا تھا جس مین فصلین اور

جملے تھے، اس کا دعوی تھا کہ منصب پیغمبری بھی کہانت کا جزو ہے، اس لئے اس کا کلام کاہنوں کی سجع کے مشابہ تھا، اس کا نمونہ یہ ہے:-

الفیل ما الفیل وما ادراک ما الفیل (یعنی ہاتھی! ہاتھی کیا ہے، اور تم نے یہ کیسے
لہ ذنب وبیل وخرطوم طویل، جانا کہ ہاتھی کیا ہے، اس کے ایک سخت دم ہے
اور لمبی سونڈ،

اس نمونے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا را کلام احمقانہ اور ذلیل خیالات سے بھرا ہوا تھا، اس کے انجام نے ثابت کر دیا کہ نہ وہ پیغمبر تھا اور نہ اس کا کلام وحی تھا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد خلیفہ اول نے ایک بہت بڑی فوج بھیجکر اس کا خاتمہ کرایا، اس نے اپنا کوئی نام لیوا نہ چھوڑا، جو اس کا ذکر زندہ رکھتا اور صرف مسلمانوں کی تاریخوں میں اس کا ذکر آتا ہے۔

(۲) اسود عنسی اس کا نام ابہلہ تھا، یمن کا رہنے والا تھا، اپنی فصاحت و بلاغت، خطابت، شاعری سجع اور کہانت میں مشہور تھا، اس نے آنحضرت صلعم کے آخری عہد میں دعوی کیا کہ اس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوتی ہے لیکن اس وحی کے قرآن ہونے کا دعوی نہیں کیا، جب مفروضہ وحی اس پر نازل ہوتی تو وہ اپنے سر جھکا لیتا، اور تھوڑی دیر بعد اپنے سر کو اٹھا کر کہتا، وہ (خدا) مجھ سے یہ باتیں کہتا ہے، یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے چوبیس گھنٹے قبل مارا گیا،

(۳) طلیحہ بن خویلد قبیلہ اسد کا آدمی تھا، اور عرب کے بہادروں میں گنا جاتا تھا، وہ اپنے قبیلے کے وفد کے ساتھ ۹ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا، اس کے پورے قبیلہ نے اسلام قبول کر لیا، جن میں وہ بھی تھا، جب وہ وطن واپس آگیا، تو پیغمبری کا دعوی کر بیٹھا، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اپنے قبیلہ میں بڑا مرتبہ حاصل کر لیا، اس کا دعوی تھا کہ کوئی ذوالنون نامی اس پر وحی لاتا تھا، لیکن اس نے بھی اس کو قرآن نہیں کہا، اس کے ساتھ کچھ فصیح لوگ تھے، جو اس کا اتباع

محض فرقہ بندی کے جذبہ اور بادشاہت حاصل کرنے کی غرض سے کرنے لگے، اس کی صرف ایک وحی یا قوت نے نقل کی ہے، خلیفہ اوّل نے اس کی سرکوبی کے لئے ایک فوج بھیجی، فریقین مین جنگ ہوئی، اور انجام کار طلیحہ شکست کھاکر ملک شام کو بھاگ گیا، اس کے بعد پھر مسلمان ہو گیا، اور جنگ قادسیہ میں بڑی شجاعت دکھلائی،

(۴) قبیلہ تمیم کی ایک عورت سجاح بنت حارث اپنے ننہالی خاندان بنو تغلب مین رہتی تھی، یہ قبیلہ عیسائی تھا، سجاح نے اُن کے مذہبی گیت یاد کرکے آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد پیغمبری کا دعوی کر دیا، قبیلہ کے چند لوگون نے اس کی پیروی کی، ان کو ساتھ لے کر اس نے خلیفہ اوّل کا مقابلہ کیا، راستہ مین بعض قبیلون سے لڑی اور بعض سے صلح کی، اسی زمانہ مین مسیلمہ کی قوت بھی بڑھ رہی تھی، وہ سجاح کے اس پروپیگنڈے کا حال سُن کر خوفزدہ ہوا، اور اس سے مل کر شادی کا پیام دیا، سجاح نے منظور کر لیا، اور دونون کی شادی ہو گئی، سجاح نے بھی اپنی وحی کے قرآن ہونے کا دعوی نہین کیا بلکہ اسود اور طلیحہ کی طرح اس کا صرف یہ عقیدہ تھا کہ اس پر وحی نازل ہوتی ہے اور کچھ مسجع عبارت بھی تیار کر لیتی تھی، مسیلمہ کے قتل کے بعد اس نے اپنا دعوی ترک کر دیا، اور دوسری مرتبہ اسلام مین داخل ہو کر اپنی بقیہ زندگی ایک مسلمان کی حیثیت سے گذار دی،

(۵) مشہور شاعر احمد بن الحسین متنبی نے جو ۳۵۴ھ مین مارا گیا، اپنی زندگی کے ابتدائی ایام مین پیغمبری، اور اپنے اوپر ایک قرآن نازل ہونے کا دعوی کیا، کچھ لوگ اُس کے پیرو ہو گئے، لیکن بعد مین وہ اس دعوی سے باز آگیا، اور اپنی بقیہ زندگی ایک معمولی انسان کی طرح گذار دی،

دوسری قسم کے لوگون مین چار نام بتائے گئے ہین :-

(۱) نضر بن حارث یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمعصر تھا، اس کی لڑائی کے اشعار حماسہ مین درج ہین، اُس نے پیغمبری کا دعوی تو نہین کیا، لیکن کچھ لوگون کا خیال تھا کہ اُس نے اہل عجم کی تاریخ اور ان کے

ایسے قصے بیان کرکے جن سے عرب بالکل واقف نہ تھے، قرآن کا مقابلہ کیا، اس دعویٰ کی حماقت کی بنا پر کسی مؤرخ نے اس کی عبارتوں کا نمونہ تک دینا گوارا نہیں کیا،

(۲) ابن مقفع اپنے زمانہ کا فصیح و بلیغ مصنف تھا کہا جاتا ہے کہ اس نے کچھ عرصہ تک اپنے آپ کو قرآن کے مقابلہ کے لئے وقف کر دیا لیکن پھر جو کچھ لکھا تھا، چاک کر دیا، اور اس کو ظاہر کرنے میں بھی شرم محسوس کرنے لگا، دہریوں کا خیال ہے کہ اس کی الدرۃ الیتیمہ قرآن کے مقابلہ میں لکھی گئی تھی، یہ ایک چھوٹا سا رسالہ ہے، جو متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس امر کا کوئی تاریخی ثبوت نہیں ہے، کہ ابن مقفع نے کبھی قرآن کے مقابلہ کا دعویٰ کیا ہو یہ محض دہریوں کی من گھڑت ہے کہ اُس نے قرآن کا مقابلہ کیا تھا، اُس کی وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ مذہب کے بارے میں متہم تھا،

(۳) راوندی موسوم بہ احمد بن یحییٰ ابو الحسین متوفی ۲۹۳ھ یہ بھی دہریہ تھا، اُس نے مذہب کے خلاف بہت سی کتابیں لکھیں، اور کہا جاتا ہے کہ التاج لکھ کر قرآن کا مقابلہ بھی کیا، ابو الفدار کا بیان ہے کہ مسلمان علماء نے راوندی کے تمام دلائل کی تردید کی، خاص کر اس دعویٰ کی کہ اُس نے قرآن کا مقابلہ کیا مگر اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ اُس نے قرآن کے مقابلہ کے لئے التاج لکھی تھی، قیاس یہ ہے کہ اُس نے دوسری کتابوں کی طرح اس میں بھی اعجاز قرآنی کے خلاف دلائل پیش کئے ہوں گے، معری نے اپنی کتاب الغفران میں راوندی کی التاج کے بارے میں لکھا ہے:

واما التاجه فلا يصلح ان يكون نعلاً وهل تاجه الا كما قالت الكاهنة اُتٌ وتُفٌ:	رہی اس کی کتاب التاج تو وہ جوتی ہونے تک کے قابل نہیں، اس کی کتاب التاج کی کوئی حقیقت نہیں، بجز اس کے جیسا کہ کاہنہ نے اس پر تف کیا ہے،

(۴) ابو العلاء معری متوفی ۴۴۹ھ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس نے الفصول والغایات فی

فی مجاراۃ السور والآیات لکھ کر قرآن کا مقابلہ کیا، لیکن معری پر دہریون کا یہ ایک بے بنیاد الزام ہی، اس الزام کے خلاف ایک بین ثبوت یہی موجود ہے کہ خود معری نے اپنی کتاب الغفران مین اپنے خیالات کا یون اظہار کیا ہے،

واجمع ملحد ومهتد ان هذا الكتاب	ملحد اور مومن سب ہی اس بات پر متفق ہین
الذی جاء به محمد صلی الله علیه	کہ محمد کی لائی ہوئی کتاب اپنے معجزے کی وجہ
وسلم کتاب بهر بالاعجاز ولقی	سے سب پر چھاگئی، اور اپنے دشمن کا مقابلہ
عدوه بالارجاز ماحوی علی	سزا دہی کے ساتھ کیا، یہ کتاب کسی خاص
مثال ولا اشبه غریب الامثال	نمونے پر تیار نہین کی گئی، غیر مانوس طرز بیان
ما هو بالقصد الموزون ولا بالرجز	سے مشابہت نہین رکھتی، یہ نہ تو مقفی نظم ہی اور
ولا شاکل خطابة العرب ولا	نہ رجز، اسے نہ تو عربون کی خطابت سے کوئی
سجع الکهنة،	مشابہت ہی اور نہ کاہنون کی سجع سے"،

اس کے علاوہ جو کتاب قرآن کے مقابلہ مین پیش کی گئی ہے، اس کا نام الفصول والغایات ہی اور یہ الفاظ "فی مجاراۃ السور والآیات" محض تہمت کی بنیاد پر اضافہ کرتے گئے ہین،

مصر کے ایک جدید رسالہ الزہراء جلد اول ص ۳، ۱۰، ۳۱، اور ۵۸۹ مین اس کتاب کا ذکر آیا ہی، اس مضمون کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا طرز قرآن شریف سے بالکل مختلف ہی، معری پر قرآن کے مقابلہ کا الزام لگانا بالکل غلط ہے، ذاتی اور ملحدانہ خیالات سے قطع نظر اس نے قرآن کے بارے مین بڑی عمدہ رائے دی ہی،

رحمت عالم

مدرسون اور اسکون کے طالبعلمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،
قیمت مجلد ۱ غیر مجلد عہ
"منیجر"

مُلّا خیر اللہ مُہندس کے چند نئے رسائل

از

سید سلیمان ندوی

استاد مُلّا احمد معمار کے جس نے لال قلعہ، جامع مسجد دہلی اور تاج محل کی عمارتیں بنوائی تھیں، اور انکی فاضل دنامور اولاد کے احوال پر جو مقالہ میں نے کچھ سال پہلے ادارۂ معارفِ اسلامیہ لاہور میں پیش کیا تھا، اور جو بعد کو معارف میں چھپ کر شائع ہوا، وہ بظاہر اس قدر مکمل تھا کہ اس میں اضافہ کی گنجایش نہ تھی لیکن چونکہ تلاش و تفحص برابر جاری رہی، اس لئے ان میں سے بعض کی مزید تصنیفات ہاتھ آتی رہیں، جن کی بنا پر اُن کے متعلق معلومات کا اضافہ ہوتا رہا، چنانچہ مضمون مذکور کے چھپنے کے بعد مُلّا لطف اللہ مہندس کی تصانیف میں ایک نیا رسالہ بیانیہ ندوہ کے کتب خانہ[1] میں ملا جو فصاحت و بلاغت کے فن میں فارسی میں شاہزادی زیب النساء کے لئے مصنف نے تصنیف کیا تھا، خیال آتا ہے کہ معارف میں اس پر ایک مختصر مضمون حوالۂ قلم ہو چکا ہے، ندوہ ہی کے کتب خانہ میں اتفاق وقت سے لطف اللہ کے بیٹے مرزا خیر اللہ مہندس کے رسالوں کا ایک قلمی مجموعہ[2] کئی سال ہوئے کہ نظر سے گذرا تھا، میں نے اس کی یادداشت لے لی تھی، لیکن اس کی تکمیل اس لئے نہ ہو سکی کہ دل و دماغ اب ان مباحث سے اُچاٹ ہو چکے ہیں، اور اب کوئی اُمنگ طبیعت پر غالب ہے مگر ظاہر ہے کہ مدت کا چڑھا ہوا رنگ ایک دم زائل بھی نہیں ہو سکتا، چنانچہ ابھی ایک صاحب نے "مضامین سید سلیمان ندوی"

---

[1] نواب صدیق حسن خان کی کتابوں میں،

[2] واحد علی سندیلوی کی کتابوں میں،

کے نام سے میرے میں بچیس مضمونوں کا مجموعہ چھاپا ہے، اس مین یہ مقالہ نظر آیا، تو خیال ہوا کہ اس کا تتمہ بھی لکھ کر چھاپ دیا جائے کہ تحقیق کے میدان مین ایک قدم کی اور وسعت پیدا ہو جائے،

رصد خانہ محمد شاہی کے نگران ملا خیر اللہ قدس کے رسائل کا یہ مجموعہ تین رسالون پر مشتمل ہے، پہلا طب مین ہے، دوسرا تصوف مین، اور تیسرا نجوم مین، اس سے یہ معلوم ہوا کہ مرزا موصوف نہ صرف ہندسہ اور تعمیر مین ید طولی رکھتے تھے، بلکہ وہ طبیب بھی تھے، صوفی بھی تھے اور منجم بھی، اب ذیل مین تینون رسالون کا تھوڑا تھوڑا حال لکھا جاتا ہے،

۱- پہلے رسالہ کا نام السبع الثوابت ہے یہ طب مین ہے اور عربی زبان مین ہے، دیباچہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن کے کسی معاصر طبیب نے السبع السیارات کے نام سے سات مسلون کی تحقیق مین ایک رسالہ لکھا تھا اسی لئے اس کا نام السبع السیارات رکھا تھا، مرزا خیر اللہ نے اس کے جواب مین السبع الثوابت کے نام سے یہ رسالہ لکھا ہے، رسالہ مین جن سات مسلون پر بحث ہے، وہ یہ ہین، دور سر کی حقیقت، دوا کے معتدل کے معنی، خلط کی تعریف، اخلاط کی تعداد، مرکب اور مفرد اعضاء کے بیان مین کھوپڑیون کے کچھ حصہ مین کیا کھو کھلا پن ہے، اور حیز عمر کی حقیقت،

رسالہ کی تالیف کی تاریخ ۱۱۱۵ھ مین لکھی ہے،

۲- دوسرے رسالہ کا نام الرسالۃ القدسیہ فی مذہب الصرفیۃ الحقیقیۃ ہے یہ تصوف مین وحدۃ الوجود کی تحقیق مین ایک عربی رسالہ ہے، جس مین اس مسئلہ کے باب مین چند شکوک کا ازالہ کیا گیا ہے، رسالہ کی تاریخ تالیف ۱۱۱۸ھ ہے،

۳- تیسرے رسالہ کا نام مدخل ہے، یہ فارسی نظم مین نجوم کا رسالہ ہے، اس رسالہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مرزا موصوف شاعر بھی تھے، اس رسالہ کے شروع مین اس رسالہ کے نظم کرنے کے سبب مین

لہ پتہ: شفیق احمد، سکونت گلان، بہار شریف پٹنہ اور محمد سلیمان اشرف ۲۶ بتیا پوکھر روڈ کلکتہ ۱۴،

اپنے خاندان کا کچھ حال لکھا ہے، جو درج ذیل ہے،

فی سبب نظم الرسالہ

بندۂ ذرہ وار خیر اللہ — کہ نہ دارد بہ اہل دنیا راہ
لیکن از محض فضل لطف و عطا — شاہ والا نژاد بحر سخا
بازوے دادرزمین و زمان — وارثِ حاکم کین و مکان
مرشدِ فیض بخش، دین پرور — قبلۂ اہل حق بلند اختر

دوسرے شعر میں "لطف و عطا" میں ایک خاص لطف ہے، لطف اللہ مصنف اُس کے باپ کا اور عطاء اللہ اس کے چچا کا نام تھا،

تیسرے اور چوتھے شعروں میں غالباً ولی عہد سلطنت یا کسی شہزادہ کے نام کی طرف اشارہ ہے، یہ نظم ۱۱۵۰ھ میں لکھی گئی ہے، جیسا کہ آگے آتا ہے، یہ زمانہ محمد شاہ کا ہے، اس لئے اس کے شہزادوں میں سے کسی کی طرف اشارہ ہوگا، اس وقت اُس کے شہزادوں کے نام پیش نظر نہیں، اس لئے تعیین نہ کر سکا،

اس کے بعد ایک مختصر باب "فی معرفۃ اصل المؤلف و التاریخ" کے عنوان سے ہے، جس میں مؤلف نے اپنے بزرگوں کا حال بتایا ہے،

بہ ہندوستان شہیر در افواہ — والد این فقیر لطف اللہ
کسب این علم از پدر فرمود — نادر العصر آن کہ احمد بود
ہست از علم این حقیر نحیف — در ریاضی رسالہ ہاے شریف
در ریاضی ہمین برادر من — چند تصنیف ہست در ہر فن
ہم ازین ذرہ دار تصنیفات — ہست گر رنج جمل و اد نجات

در ہزار است و یکصد و پنجاہ نظم این چند گوہر دل خواہ

پہلے شعر مین مصنف نے اپنے باپ لطف اللہ مہندس کا نام لیا ہے، دوسرے مین اپنے دادا نادر العصر احمد کا نام بتایا ہے، پھر اپنی اور اپنے بڑے بھائی کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے، بڑے بھائی کا نام نہین بتایا ہے، مگر مقالہ کے گذشتہ نمبر مین اس کا نام مذکور ہے، یعنی ملا امام الدین مؤلف تصریح الافلاک،

اس مجموعہ کے آخر مین ہے :-

"از تصانیف نادر العصر معلم عالمیان مرزا ابو الخیر عرف خیر اللہ غفرلہ و نبہ تقلہ"

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ خط اسی کے دست و قلم کا ہے،

کل تصنیفات کی تاریخون کے موازنہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۱۱۸ھ سے ۱۱۶۵ھ تک تقریباً چالیس برس تک اس کا قلم مختلف علوم و فنون کی کتابون کی تصنیف مین رواں رہا ہے، چنانچہ ذیل مین اس کی تصنیفات کے سنین یکجا لکھدیئے جاتے ہین،

۱- الرسالۃ القدسیۃ	۱۱۱۸ھ	۴- مدخل فی النحو	۱۱۵۰ھ
۲- السبع الثوابت	۱۱۱۹ھ	۵- تقریب التحریر	۱۱۶۱ھ
۳- شرح زیج محمد شاہی	۱۱۴۰ھ کے بعد	۶- حاشیہ شرح بست باب	۱۱۶۵ھ

اب تک تو ہمین یہ معلوم تھا کہ یہ خاندان پہلے لاہور مین تھا، پھر یہ دہلی چلا آیا، لیکن اس مجموعہ مین مرزا خیر اللہ مہندس کے نام کے ساتھ بانگرمئو لکھا ہے، بانگرمئو کانپور کے پاس موجودہ ضلع اناؤ کے حدود مین ایک بستی ہے، سمجھ مین نہین آتا کہ مرزا خیر اللہ کا تعلق بانگرمئو سے کیونکر پیدا ہوا، کیا یہ مان لیا جائے کہ دلی کے احمد شاہی یا نادر شاہی ہنگامہ سے گھبرا کر یہ پورب کے امن کے مقام مین چلا آیا تھا، مگر یہ بہت ہی مشکوک بات ہے،

امام الدین کا تتمہ امام الدین ریاضی بن ملا لطف اللہ ہندس بن ملا احمد معمار کی تصنیفات کے ذکر میں حاشیہ شرح جغمینی کا ذکر آیا ہے، امام الدین نے اپنی کتاب تصریح میں اپنے اس حاشیہ کا خود حوالہ دیا ہے دیکھئے تصریح ص ۱۳، و ۲۴، مطبوعہ مجتبائی،

امام الدین نے تصریح میں (ص ۱۵ مجتبائی) اپنے ایک اور رسالہ کا نام لیا ہے، جس کا ذکر گذشتہ مضمون میں نہیں آیا ہے، اور وہ اضافہ کے قابل ہے، زمین کے کروی ہونے پر زمین کی سطح پر بڑے بڑے اونچے پہاڑوں اور گہرے غاروں کی بنا پر اعتراض کیا گیا ہے، اُس کے جواب میں محقق طوسی اور قطب شیرازی نے کہا ہے کہ دنیا کے سب سے بڑے پہاڑ کی اونچائی کی نسبت زمین سے ایسی ہے، جیسے ایک ہاتھ کے کرے کے قطر کو جو کے عرض کے سات دین حصہ سے اس لئے وہ لحاظ کے قابل نہیں محقق رومی نے شرح جغمینی کے حاشیہ میں اس جواب پر اعتراض کیا ہے، امام الدین نے اس کے جواب میں یہ رسالہ لکھا ہے،

نوائے حیات

طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہیں، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن میں بہت سی نئی غزلوں اور نظموں کا اضافہ ہوا اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع میں مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبسوط مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے،

قیمت :- مجلد للعصر، غیر مجلد ہے

"منیجر"

باب المراسلات والمکاتبہ

طنزِ لطیف

از

از جناب وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری حکومت صوبہ متحدہ

راج رشی ٹنڈن جی نے چند دنوں سے ہندو مسلمانوں میں ازدواج کی تحریک شروع کی ہے، اس کی مصلحت جو بھی بیان کیجائے لیکن ٹنڈن جی کے خیالات کے پیشِ نظر اس کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ شادی بیاہ کے ذریعہ مسلمانوں کو ہندوؤں میں ضم کر لیا جائے یا کم از کم ان کا کلچر بدل کر اُن کی امتیازی حیثیت ختم کر دیجائے، وحید احمد صاحب پارلیمنٹری سکریٹری نے بھی اس تحریک کے بارے میں پانیر میں اپنے خیالات ظاہر کئے تھے جن سے بظاہر ٹنڈن جی کی تجویز کی تائید ہوتی تھی، اس لئے ہر طرف سے اس کی مخالفت ہوئی، حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے بھی اس کی مخالفت میں شذرات لکھے تھے اب وحید احمد صاحب کا بیان ہے کہ ان کا مضمون طنزیہ و مزاحیہ تھا، اور اس میں انھوں نے ٹنڈن جی کی تجویز کا مذاق اُڑایا تھا، اس کو سنجیدگی پر محمول کرنا معترضین کا قصورِ فہم ہے لیکن تعجب اتفاق ہے یا معترضین کی بدذوقی کہ ان میں سے کسی کو بھی طنز اور سنجیدگی میں امتیاز نہ ہو سکا، اور سب نے اسے سنجیدگی پر محمول کر کے اس کی مخالفت میں مضامین لکھے، لیکن لکھنے والے کو اپنی تحریر کی تشریح کا زیادہ

حق ہے اس لئے ہم کو وحید احمد صاحب کے بیان کے ماننے مین تامل نہین ہی، اور اس سے مسرت ہوئی کہ الحمدللہ اس مسئلہ مین وہ جمہور مسلمانون کے ہم عقیدہ ہین، وہ اپنا یہ جواب اخبارات مین بھی شائع کرا چکے ہین، اس کے بعد معارف مین اس کی اشاعت کی ضرورت نہین تھی لیکن ان کا اصرار ہے اس لئے شائع کیا جاتا ہے، باقی انھون نے مسلمانون کی جس ذہنیت اور احساس کمتری کی جانب اشارہ کیا ہے اس کو وہ ہم سے بہتر سمجھتے ہین ع :-

این سخن را چہ جواب است تو ہم میدانی

البتہ اس دعا مین ہم اُن کے ساتھ شریک ہین، کہ "اللہ تعالیٰ مسلمانون کو قوتِ ایمانی عطا فرمائے" آمین

"م"

جناب محترم ایڈیٹر صاحب رسالہ معارف :-

السلام علیکم،

رسالہ معارف مین مختلف فرقون مین شادیان" والا بصیرت افروز نوٹ دیکھا، مسرت ہے کہ ایک مغالطہ کی وجہ سے ایک خاص مسئلہ پر روشنی ڈالنے کی زحمت آپنے گوارا فرمائی لیکن افسوس ہے کہ اس نوٹ کی بنیاد میرے پانیر والے مضمون پر رکھی گئی ہے، اگر آپ اجازت دین، اور گستاخی معاف کردین تو مین وثوق سے کہہ سکتا ہون کہ میری تحریر پر آپ کی نظر سے نہین گذری، بلکہ کسی اور صاحب نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا ہوگا، ورنہ نہ اس قدر مغالطہ پیدا ہوتا، اور نہ آپ کو سخت تکلیف پہنچتی، مین کہہ سکتا ہون کہ آپ کی اس سخت تکلیف کے باعث وہ سخن فہم ہین جنھون نے آپ کو وہ مضمون سُنایا، اور مین نہین ہون، مگر باین ہمہ مجھے سخت ایذا ہوئی، اور میری گردن شرم سے جھکی جارہی ہے، اس امر کی کہ باعثِ تکلیف مین نہین ہون میرے مضمون کی وضاحت بہترین شہادت ہوسکتی ہے،

آپ کا آخری قیاس صحیح ہے جو آپنے میرے مضمون سے سمجھا کہ ٹنڈن جی کی یہ تحریک مسلمانون کی

امتیازی حیثیت کو ختم کرنے کے لئے تھی، یہی احساس تھا جس کے ماتحت وہ مضمون لکھا گیا تھا، میرے مضمون کی سرخی تھی Tandon ji: The grand mughal = یہ سرخی بولتی ہوئی تھی، اس کا ترجمہ "مغل اعظم ٹنڈن جی" نہیں ہو سکتا، بلکہ "ٹنڈن جی مغل اعظم کے بھیس میں" ہو سکتا ہے، اردو میں میں نے اپنے اس مضمون کی سرخی "ٹنڈن جی کی اپج" رکھی تھی، اور یہ مضمون قومی آواز اور ذوالقرنین میں شائع ہوا تھا، مذاق سلیم اور فراست ان سرخیوں سے ثابت کر رہی ہیں کہ مجھے اکبر اعظم پر بھی اعتراض تھا، چہ جائیکہ ٹنڈن جی، اب میں اس کو کیا کروں کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ میں ٹنڈن جی کو اعزازی لقب اکبر کا دے رہا ہوں، میں نے اس مضمون میں مزاح اور طنز آمیز ظرافت سے کام لے کر ٹنڈن جی کو جواب دیا تھا کہ اکبر نے بھی یہی تحریک شروع کی تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے ہم مذہب اس سے خفا ہو گئے، مگر تاریخ میں اس کا نام محفوظ ہو گیا، اسی طرح ٹنڈن جی سے اُن کے ہم مذہب خفا ہو جائیں گے، اور راج رشی کا لقب چھین لیں گے، مگر تاریخ میں اُن کی خوبیاں یادگار رہیں گی، ابھی تک ٹنڈن جی زبان و کلچر پر طبع آزمائی فرما رہے تھے، اب اس نئی تحریک سے ان کے گذشتہ منصوبوں کی تردید خود بخود ہو جاتی ہے، کیونکہ مشترکہ شادی سے نئی زبان اور نئے کلچر اب وجود میں آئیں گے، لیکن مسرت ہے کہ غلط روی نے ٹنڈن جی کو صحیح راستہ پر لگا دیا، اور یہ نئی تحریک شروع کر دی، ..... مسلمانوں کے یہاں اہل کتاب سے شادی کا جواز پہلے سے موجود ہے، اب مسلمان اگر کسی طرح یہ ثابت کر سکیں کہ ہندو اہل کتاب ہونے کے اہل ہو سکتے ہیں، تو ہم ان کی تحریک کو لبیک کہنے کو تیار ہو سکتے ہیں، ..... ہر قوم اور ہر زمانہ میں نبی بھیجے گئے ہیں، ہندوستان میں بھی کوئی نبی آیا ہو گا، ..... وغیرہ وغیرہ،

ملاحظہ ہو کہ باہمی شادی پر مسلمانوں کے متعلق کتنے بریک لگا کر میں نے بات کہی ہے، گویا اس امر میں میں مفتی و مفسر نہیں بنا ہوں، بلکہ مستفسر کے حدود میں رہا ہوں،

لہ معارف :- مذکورہ انگریزی فقرے کا یہ مفہوم صرف مضمون نگار ہی کے ذہن میں آ سکتا تھا،

یہ تشنگفتہ دھکی مین نہین سمجھ سکتا کہ متانت و سنجیدگی کا کبھی بھی پہلو اختیار کر سکتی ہے، اس اظہار کے بعد باعث مغالطہ ہونے کا مجھے اعتراف ہے لیکن مین نہین سمجھ سکتا کہ مسلمان کی ذہنیت کو کیا ہو گیا ہے، احساس کمتری کی مثال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ نظر قطعی بند ہو کر رہ گئی ہے، لہذا تمنا اور دعا ہے کہ خداوند کریم مسلمانون کو اپنی رحمت سے قوت ایمانی مرحمت فرمائے، اور اُن کے صدقہ مین مجھ گنہگار کو، آمین،

مجھے امید ہے کہ میری اس معذرت اور وضاحت کا تذکرہ رسالہ معارف مین شائع فرما کر میری خفت و ندامت کو دور کرنے کی سعی فرمائیے گا،

نیازمند :- "وحید احمد"

انتخابات شبلی

یعنی

مولانا شبلی کی شعر العجم اور موازنہ کا انتخاب جس مین ان کلام کے حسن و قبح اور عیب ہنر اور شعر کی حقیقت اور اصول تنقید کی تشریح کی گئی ہے،

(مرتبہ :- سید سلیمان ندوی)

ضخامت :- ۲۲۰ صفحے

قیمت :- دو روپے چار آنے

"منیجر"

استفسار و جواب

تقویم الابدان

قاضی نورالدین حسین صاحب
رائچند و دیپ چند لائبریری بھروچ بمبئی

مکرمی جناب مدیر صاحب معارف اعظم گڈھ،
سلام مسنون

براہ کرم ذیل کے استفسار کا جواب بذریعۂ معارف تحریر فرما کر مشکور فرمائیں، صوبۂ گجرات کے ایک قصبہ انکلیسر (ضلع بھروچ) میں ایک رئیس سید محمود علی بن سید غلام علی انعامدار صاحب کے کتب خانہ میں طب کی ایک عربی قلمی کتاب تقویم الابدان مصنفہ و مرتبہ یحیٰی بن عیسی بن جزلہ (کتابت ۸۸۵ھ) کا نایاب نسخہ ہے، حضرت قبلہ .... مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ نے مذکور کتاب کے متعلق نقوش سلیمانی میں اپنے سفرنامہ میں ذکر فرمایا ہے، اس راقم الحروف نے بھی معارف کے گذشتہ جولائی ۱۹۲۸ء کے پرچہ میں ضمیمہ گجرات کے کتب خانہ کے عنوان والے مضمون میں حکیم روح اللہ بھروچی جہانگیری کے کتب خانہ کی کتاب کے ذکر میں اس کا ذکر کیا ہے، لہٰذا اس کتاب کے کہاں کہاں نسخے موجود ہیں، اور آیا یہ کتاب طبع ہوئی ہے یا نہیں، وہ تحریر فرما کر مشکور و ممنون فرمائیں، مذکورہ کتاب حسب ذیل حصص میں منقسم معلوم ہوتی ہے، ۹ × ۱۵ جلد دلون میں واضح خط سے لکھی گئی ہے، کل صفحات ۲۰۲ ہیں،

(۱) تقویم الابدان (نقوش سلیمانی میں تقویم الادویہ مسطور ہے) صفحہ ۹۶،

(۲) مختصر لجالینوس فی علاج الامراض ومزاج الطبائع ..... الخ صفحہ ۱۲

(۳) تقویم الصحت بالاسباب ر ر صفحہ ۴۲

(۴) تقویم الادویہ المفردۃ والاغذیہ ر ر صفحہ ۵۳

کاتب (۱) حمد بن عمر بن جبار، ابتدا بسم اللہ کے بعد ..... کتاب تقویم الابدان، بعد ادویۃ الامراض المجتمعۃ فی ثلاثۃ اجناس متشابھۃ والیۃ ..... والازمنۃ والبلدان .... الخ

اختتام:- تم کتاب تقویۃ الابدان بعون اللہ تعالیٰ وحسن توفیق علی ید الفقیر الی رحمۃ اللہ تعالیٰ وغفرانہ (۱) حمد بن عبد الجبار الورزقنی وقد وقع فراغ تحریرہ فی منتصف ذی القعدۃ سنہ ثمان وثمانین وخمسمایۃ والحمد للہ ربّ العالمین والصلوٰۃ ..... اجمعین،

معارف: تقویم الابدان کوئی نایاب کتاب نہیں ہے، اس کا ایک حصہ چھپ بھی چکا ہے، اس کی تصحیح سلیمان الدخیل نے کی تھی، اور امیر بن الرشید امیر نجد کے ایجنٹ رشید پاشا نے ۱۳۳۳ھ میں دمشق میں اس کو چھپوایا تھا، ہندوستان کے بہت سے کتب خانوں میں اس کے قلمی نسخے پائے جاتے ہیں، پٹنہ لائبریری، کتب خانہ ریاست رامپور اور سبحان اللہ لائبریری مسلم یونیورسٹی میں اُس کے قلمی نسخے موجود ہیں، اور کتب خانوں میں بھی ہوں گے، اس کتاب کا لاطینی ترجمہ بھی ۱۵۳۲ء میں اسٹراسبرگ سے شائع ہو چکا ہے،

لغاتِ جدیدہ

چار ہزار جدید عربی الفاظ کی ڈکشنری مع ضمیمہ مسعود عالم صاحب ندوی

قیمت عہ ضخامت ۲۵۰ صفحے، "منیجر"

ادبیات

دورِ حاضر

اور

اُسوۂ فاروقی

از جناب یحییٰ اعظمی

بنا عدل و اخوت کی جہان میں جس نے محکم کی — وہ جس نے زندہ سنت کی شہنشاہِ دوعالم کی
تمنا سرورِ دیں کو تھی جس کے خیر مقدم کی — ضرورت ہے جہان کو پھر اُسی فاروقِ اعظم کی

کہ ظلمت ہر طرف چھائی ہے پھر باطل پرستی کی
گرہ حد ہو گئی ہے نوعِ انسانی کی پستی کی

کوئی بھی انتہا ہو اس کے اخلاقی ذمائم کی — کہ انسان سے کہیں بہتر ہو اب حالت بہائم کی
کرے شرح آہ کوئی کس طرح اسکے مظالم کی — کہ آغشتہ بخون ہے داستان اس کے جرائم کی

کیا ہو تازہ اُس نے عصرِ نو میں دورِ چنگیزی
ہے کھیل اس کا یتیموں اور معصوموں کی خونریزی

صف آرا ہیں گھٹائیں نیرِ حق کے مقابل میں — نہ جانے کاوشیں کب کی بھری ہیں قلبِ باطل میں
تشتت رونما ہے ملتِ بیضا کی محفل میں — پریشانی سی ہے ہر بندۂ توحید کے دل میں

غریبو! ہو نہ وہ عہدِ سلف کی شان باقی ہے
نہ اس کا نص لاتحزن پہ اب ایمان باقی ہے

جہان مین کیا یہی مسلم کے جینے کا قرینہ ہے — کہ خودداری کا اس کی چور چور آبگینہ ہو
پڑا موجِ بلا مین آکے اُمت کا سفینہ ہے — تشیمن خوف غیر اللہ کا مومن کا سینہ ہو

اکھڑتا جا رہا ہے پائے عزم استوار اس کا
کہ شیرہ بن گیا ہے رزمِ ہستی سے فرار اس کا

نہین کیا یاد اسے لَا تَقْنَطُوْا کی نصِ قرآنی — نہین کیا یاد اُسے کم مِّن فِئَۃ کا عہدِ ربانی
بتائے کوئی پھر ہو کس لئے یہ ضعفِ ایمانی — رہی ہے اس سے پہلے کیا یہی شانِ مسلمانی

نہین گے تم کو ایک ایک حرف سے اس کے سبق اب بھی
کتب خانون مین ہین تاریخ ماضی کے ورق اب بھی

مسلمان کے لئے یہ دورِ دور سرفرازی ہے — کہ رنج و ابتلا مومن کی شانِ امتیازی ہو
حقیقت مین اسی کا سب یہ فیض کارسازی ہو — کہ دنیا مین ابھی تک سرخرو دین حجازی ہو

ملا ہو بہرہ اس کو روے گلگون شہادت سے
کہ تاریخ اس کی ہو تابندہ تر خونِ شہادت سے

ہمارے کارنامون سے ہے دہر آج تک پر آوازہ — حنین و بدر کی ہے داستانِ فخر ابھی تازہ
زمانہ کو ہو پھر زورِ یداللّٰہی کا اندازہ — خداوندا مرتب کردے پھر ملت کا شیرازہ

ہمارے بازوؤن مین پھر وہی اگلی سی قوت دے
وہی جوشِ شجاعت دے وہی ذوقِ عزیمت دے

اٹھا دے پھر کوئی فاروقِ یدبیضا عصر حاضر سے — جہان مین کر دے بزمِ عدل و صدق آراستہ پھر سے
نہین کچھ بھی یہ مشکل تیری قدرت کے مظاہر سے — خداوندا ابھی ممکن ہے تیرے دستِ قادر سے

عمر جیسا جلیل القدر پھر دنیا مین پیدا کر
جلالِ عہدِ فاروقی جہان مین پھر ہویدا کر

سکھا دے جو جہانِ نو کو آئینِ جہانبانی — بتا دے جو زمانہ کو رموزِ فقر و سلطانی
وہ جس کا شہرۂ آفاق دورِ عدلِ لاثانی — بلند اک بار پھر کر دے مقامِ نوعِ انسانی
ہو قلبِ دہر پر سکہ رواں اس کی جلالت کا
مساوات و اخوت کا صداقت کا عدالت کا

غزل

از جناب فضل اختر سیتاپوری

سما گیا ہے کچھ ایسا جمالِ جانانہ — مری نگاہ میں رقصاں ہے آئینہ خانہ
تری نگاہ وہی ہے اثر جداگانہ — کہ جس سے ہے کوئی دیوانہ کوئی فرزانہ
فروغِ سجدۂ اخلاص کا یہ عالم ہو — کہ بڑھ کے چومے قدم کعبہ ہو کہ بتخانہ
حیات اس پہ نہ ہنستی ہے اور نہ روتی ہے — نکل گیا حدِ فرزانگی سے دیوانہ
حیات و مرگ کے پھر اٹھ کھڑی ہوئی جھگڑے — یہی ہے حشر یہی حشر کا ہے افسانہ
اب اس مقام پہ ہے عشق کی جنوں خیزی — کہ حسنِ یار ہوا آپ اپنا دیوانہ
کبھی یہ سوچتا ہوں کاش وہ مرے ہوتے — کبھی یہ کہتا ہوں اچھا ہی جو نہیں بیگانہ
چراغ لے کے بڑھا رہنمائی کو شعلہ — قریب شمع دکھائی دیا جو پروانہ
سکون حسن کا اور بیقراریاں دل کی — ہر ایک چیز کا اسلوب ہے جداگانہ
ہیں رازِ عشق چھپاتا ہوں اور نہیں چھپتا — مرا سکوت بنا جا رہا ہے افسانہ
پیامِ یار تو دیتی ہیں دھڑکنیں دل کی — نگاہِ شوق سناتی ہے دل کا افسانہ
کرشمہ اس نگہِ مست کا ہے یہ اختر
چھلک رہا ہے جو چھلکا ہوا تھا پیمانہ

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمٰن ایم اے رفیق دارالمصنفین

ہندوستان کے صوفیۂ کرام میں حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کا مرتبہ سب سے زیادہ بلند ہے ان ہی کے فیوض سے ہندوستان اسلام کے نور سے منور ہوا، اور ان کے وصال کو سات سو برس سے زیادہ گذرے، لیکن ان کی روحانی برکات کا سرچشمہ ابھی تک جاری ہے، مگر افسوس ہے کہ اب تک فارسی یا اردو زبان کی کسی کتاب میں اُن کے مبسوط حالات زندگی نہیں ملتے، تذکروں میں زیادہ تر یا تو اُن کے کشف و کرامات یا اُن کے اوراد و وظائف کی تفصیلات ملتی ہیں، اب سے پہلے ان ہی چیزوں کی زیادہ تلاش رہتی تھی، اسی لیے تذکرہ نویس اُنہی کی تفصیل لکھ کر اپنے ناظرین کی تشنگی بجھاتے تھے، لیکن اب جب کہ زمانہ کا ذوق بدل گیا ہے، صوفیۂ کرام سے عقیدت رکھنے والا گروہ ان کی سیرت اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو جاننے کا زیادہ خواہاں ہوتا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے حالات زندگی پر اب تک جتنا کچھ لکھا گیا ہے وہ چند اوراق

لہ ملنے کا پتہ:- منیجر شعبۂ اشاعت معتمدی گدڑی شاہی انجمن جمعۃ الوداع، اجمیر شریف: قیمت ۱- صر

سے زیادہ معین پھیل سکا ہے، معلومات کی کمی کی وجہ سے ایک اہل قلم اپنے کو چند اوراق ہی میں محدود کر دینے پر مجبور پاتا تھا لیکن ہم جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے معین الارواح میں حضرت خواجہ صاحب کے مفصل اور مبسوط حالات لکھنے کی کوشش کی ہے،

کتاب کے شروع میں جناب ڈاکٹر ظہور الحسن شارب ایم اے پی ایچ ڈی، ڈائرکٹر اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ آف آرٹس اینڈ لیٹرس کا طویل دیباچہ ہے، پھر فاضل مؤلف کا معروضہ ہے، جس میں ان کتابوں کا بھی ذکر ہے جن کو ماخذ کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جدید ذوق کے مطابق اگر ان ماخذوں کے مصنفین کے نام اور سنین تالیف بھی لکھ دیئے جاتے، تو بہتر تھا، فاضل مؤلف نے اپنی محققانہ کتاب میں مسالک السالکین کا حوالہ کثرت سے دیا ہے لیکن یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس کی تصنیف ہے، اور کس زمانہ میں لکھی گئی ہے، شاید یہ تیرہویں صدی ہجری ہی کی تصنیف ہے، حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے میں .... حال کی کسی تصنیف کو بکثرت استعمال کرنا احتیاط کے خلاف ہے،

ماخذوں کے سلسلہ میں فاضل مؤلف نے ان کتابوں کی بھی فہرست دی ہے، جو ان کو دستیاب نہیں ہو سکیں ان میں خیر المجالس، مونس الارواح، مرآۃ الاسرار، تواریخ فیروز شاہی (شاید ضیاء الدین برنی و شمس سراج عفیف کی تاریخ فیروز شاہی مراد ہو) .....

.... اور اکبر نامہ اور سیر العارفین کے نام بھی ہیں، یہ کتابیں تو ایسی ہیں کہ تھوڑی سی تلاش اور جستجو کے بعد ہمارے کتب خانہ میں مل سکتی تھیں،

حاشیہ میں ماخذوں کا حوالہ دیتے وقت صفحوں کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے، صرف کتابوں کے نام لکھ دیئے گئے ہیں، آج کل کی تحقیق و تدقیق میں صفحوں کا حوالہ دینا ضروری سمجھا جاتا ہے، فاضل مؤلف اگر صفحوں کا بھی حوالہ دیدیتے، تو ان کی تحقیق میں وزن پیدا ہو جاتا،

پوری کتاب چھ حصوں میں منقسم ہے، پہلے حصہ میں سوانح مبارکہ، دوسرے میں سیرۃ مقدسۂ میسر

مین حلقۂ ارادت" چوتھے مین آپ کی درگاہ اور مراسم، پانچوین مین آپکے درباری اور چھٹے مین "تاریخ اجمیر" درج ہے،

پہلے حصہ مین حضرت خواجہ کے سوانح حیات سنہ وار لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، جو آج تک حضرت خواجہ کے کسی سوانح نگار نے نہین کی، گو ان سنین کے تعین کرنے مین فاضل مؤلف نے زیادہ تر قیاسات ہی سے کام لیا ہے، جو ممکن ہے کہ صحیح ہون، اور اگر ان مین تسامح بھی ہو گیا ہو، تو آیندہ جب کوئی اہل قلم حضرت خواجہ کی سوانح عمری لکھنے کی کوشش کرے گا، تو ان سنین سے اس کو واقعات قلمبند کرنے مین بڑی مدد ملے گی،

کتاب کے مطالعہ سے حضرت خواجہ کی سیاحت کا بہت ہی واضح نقشہ سامنے آجاتا ہے، فاضل مؤلف کی تحقیق ہے کہ حضرت خواجہ اپنی سیاحت کے دوران مین چار بار ہندوستان آئے، ممکن ہے یہ صحیح ہو، کہا جاتا ہے کہ وہ ۵۶۱ھ مین ہندوستان تشریف لائے، اور اُن کا وصال ۶۳۳ھ مین ہوا، اکہتر برس کے طویل وقفہ مین بہت ممکن ہے کہ وہ ہندوستان سے کئی بار باہر تشریف لے گئے ہون، اور پھر واپس آئے ہون، اُن کے بارہ مین تو مشہور ہے جیسا کہ فاضل مؤلف نے بھی لکھا ہے کہ وہ اجمیر سے ہر سال حج کے لئے جاتے تھے (صفحہ ۵۶) حج سے واپسی مین بلاد اسلامیہ کی سیاحت بھی کرتے ہون، اس لئے اس سے انکار نہین کیا جاتا کہ وہ چار بار ہندوستان نہین تشریف لائے ہون گے، لیکن اس سلسلہ مین فاضل مؤلف نے جو دلائل دیئے ہین وہ اطمینان بخش نہین،

حضرت خواجہ کے پہلی بار ہندوستان آنے کے ذکر کے سلسلہ مین لکھتے ہین،

"غزنین سے روانہ ہو کر آپ پہلی بار بروایت متواتر تاریخ ۱۰ محرم الحرام ۵۶۱ھ ہندوستان مین تشریف فرما ہوئے، اس وقت خسرو ملک بن خسرو شاہ غزنوی (جو بہرام شاہ کا پوتا تھا) لاہور مین حکمران تھا، (ماخوذ از تاریخ فرشتہ وغیرہ)

مگر اس زمانہ مین چونکہ رونق اسلام صرف لاہور اور ملتان تک تھی، اور یہی ہر دو مقامات شمالی ممالک سے آنے جانے کے لئے قیام و سیر کے قابل تھے، اس لئے قرین قیاس ہے کہ اس

در دو ہند کے موقع پر آپ صرف لاہور و ملتان تک ہی تشریف لائے؟

(ماخوذ از تاریخ فرشتہ)

مذکورۂ بالا دعوی کی تائید تاریخ فرشتہ سے نہیں ہوتی، تاریخ فرشتہ میں جو کچھ ہے وہ یہ ہے:-

"و خود بغزنین آمد و شمس العارفین عبد الواحد را کہ پیر شیخ نظام الدین ابو المؤید ست دریافتہ بلاہور آمد و از آنجا بدہلی تشریف آورد، چون اژدہام خاص و عام از حد گذشت آن بزرگوار ازان متنفر بود، ہر آئینہ از آنجا نیز متوجہ بلدۂ اجمیر شد، دوہم ماہ محرم سنہ ۵۶۱ھ احدی و ستین و خمسمائۃ) سایہ وصول برآن خطہ انداخت و سید السادات سید حسین المشہور بخنگ سوار کہ شیعہ مذہب بود بصلاح و تقوی آراستہ در سلک اولیاء اللہ انتظام داشت و سلطان قطب الدین ایبک او را داروغۂ آن بلدہ ساختہ بود قدوم شیخ را با عزاز و اکرام تلقی فرمود، چون از علم و تصوف و اصطلاحات صوفیہ بہرۂ تمام داشت صحبت خواجہ را نعمت شمرد و دانستہ اکثر اوقات مجلس شریف حاضری شد و بسیارے از کفار اجمیر ببرکت انفاس آن پیر طریقت بشرف ایمان مشرف گشتند و آنانکہ ایمان نیاوردند محبت خواجہ را در دل جائے دادہ پیوستہ فتوح بے حد و حد بحضرت او می فرستادند و خواجہ در عہد شمس الدین التمش دو مرتبہ جہت دیدن مرید خود قطب الدین بختیار کاکی، بدہلی تشریف بردہ" (جلد دوم ص ۲۷۷)

فرشتہ کے مذکورۂ بالا اقتباس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت خواجہ غزنین سے لاہور اور لاہور سے دہلی آئے، یہاں لوگوں کا ہجوم بڑھا، تو اس جگہ سے متنفر ہو کر اجمیر کی طرف روانہ ہوئے اور وہاں بتاریخ ۱۰ محرم ۵۶۱ھ پہنچے، پھر فرشتہ یکایک سید حسین مشہدی کا ذکر کرتا ہے، جن کو سلطان قطب الدین ایبک نے اجمیر کا داروغہ مقرر کیا تھا، سلطان قطب الدین ۶۰۲ھ میں تخت نشین ہوا، فرشتہ نے اکتالیس برس کے وقفہ کے حالات کو صرف ایک سطر میں قلمبند کر دیا ہے، لیکن مذکورۂ بالا اقتباس سے

معین الارواح کے فاضل مؤلف کا یہ دعویٰ ثابت نہیں ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو لاہور اور ملتان تک آکر پھر مراجعت فرمائی، فرشتہ کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ لاہور اور دہلی ہوتے ہوئے اجمیر میں آکر قیام پذیر ہو گئے،

حضرت خواجہ کے دوسری بار ورود ہند کے سلسلہ میں فاضل مؤلف رقمطراز ہیں،

"حسب دلیل العارفین آپ کے ورود ہند کے وقت اجمیر ہندوؤں کی ملکیت تھی، اور حسب مسالک الممالک لیکن و تاریخ فرشتہ وغیرہ اجمیر میں پرتھوی راج کی حکومت تھی، اور یہ وہ زمانہ تھا کہ جب شہاب الدین غوری نے پرتھوی راج پر آخری بار حملہ کر کے اجمیر فتح کیا اور پرتھوی راج کو زندہ گرفتار کیا چونکہ یہ واقعہ بالاتفاق ۵۸۸ھ میں ہوا ہے اس لئے آپ کا دوسری بار ورود ہند ۵۸۸ھ میں ہونا ثابت ہے"

حضرت خواجہ ۵۶۱ھ یا ۵۸۸ھ میں اجمیر آئے، تو دونوں سنہ میں اجمیر ہندوؤں ہی کی ملکیت تھی، لیکن اجمیر کا ہندوؤں کی ملکیت ہونا یہ ثابت نہیں کرتا کہ حضرت خواجہ دوسری بار ہندوستان آئے،

"ورود ہند بار سوم" کے بارہ میں فاضل مؤلف تحریر فرماتے ہیں،

"صاحب سیر العارفین کا بیان ہے کہ جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (۶۰۲ھ) میں واصل بحق ہوا اس زمانہ میں آپ دار دلاہور ہوئے"

فاضل مؤلف نے اپنے معروضہ میں لکھا ہے کہ اُن کو سیر العارفین دستیاب نہیں ہو سکی، (ص ۵) اس لئے خیال ہوتا ہے کہ مذکورۂ بالا بیان سیر العارفین کے دیکھے بغیر قلمبند کیا گیا ہے، عاجز راقم کے پیش نظر اس وقت سیر العارفین کا اردو ترجمہ ہے جو ۱۹۱۱ء میں شمس المطابع سے چھپ کر شائع ہوا ہے، اس میں حضرت خواجہ کے اجمیر شریف میں نزول اجلال کا ذکر ان الفاظ میں ہے :-

"بعد ہ خواجہ صاحب شہر غزنی کی طرف متوجہ ہوئے اور شیخ عبد الواحد غزنوی پیر شیخ

نظام الدین ابو المؤید کے ہین وہ اس جگہ موجود تھے، اُن سے ملاقات کی، پھر وہان سے روانہ ہوکر لاہور مین آئے، اس ایام مین پیر علی ہجویری قدس سرہٗ ..... کا انتقال ہوچکا تھا لیکن شیخ حسین زنجانی کہ پیر شیخ سعد الدین حمویہ قدس سرہٗ کے ہین، زندہ تھے، اُن سے اور خواجہ صاحب سے بے حد دوستی اور محبت ہوگئی، کچھ دنون تک وہان قیام فرماکر پھر وہان سے متوجہ دار الخلافہ دہلی کے ہوئے، جب اس مقام مبارک پر پہنچے، چند عرصہ تک وہان قیام فرمایا، وثاق متبرکہ جناب خواجہ صاحب کا اس مقام پر پہنچا جہان کہ قبر شیخ رشید کی ہے، اور آج تک اس زمانہ کی نشانیون مین سے اُن کی مسجد کی محراب اب تک قائم ہے، غرضکہ دہلی مین ہجوم خاص وعام اہل اسلام کا خواجہ صاحب کے گرد بہت ہوا، تب آپنے طرف دار الخیر اجمیر کے سفر کیا اگرچہ اس زمانہ مین اجمیر شریف مین اہل اسلام کی رونق شروع ہوگئی تھی، لیکن غلبہ کفار نابکار کا آس پاس اجمیر شریف کے بہت تھا، اس زمانہ کے خلیفہ وقت سلطان قطب الدین ایبک نے سیادت پناہ میر سید حسین مشہدی کو اجمیر شریف مین داروغگی کی خدمت پر ممتاز فرمایا تھا، (حصہ اول ص ۱۲)

سیر العارفین کے مندرجۂ بالا اقتباس سے کہین ثابت نہین ہوتا کہ حضرت خواجہ اس وقت لاہور وارد ہوئے جب معز الدین سام غزنی جاتے ہوئے (سنہ ۵۸۲ھ) مین واصل بحق ہوا،

ورود ہند بار چہارم کے بارہ مین فاضل مؤلف ارقام فرماتے ہین،

حسب خزینۃ الاصفیا بموجب ارشاد حضرت قطب صاحب جب آپ خراسان سے ہندوستان وارد ہوئے، اس وقت قباچہ بیگ اور کفار مغلون کے درمیان جنگ شعلہ زن تھی، اور قطب صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی استعانت باطنی سے قباچہ بیگ نے فتح پائی، چونکہ حسب منتخب التواریخ یہ جنگ قطب الدین ایبک کے انتقال کے بعد قباچہ بیگ اور کفار مغلون سے سنہ ۶۱۱ھ مین ہوئی

لہذا غریب نواز کا چوتھی بار وارد ہندوستان ہونے کا سال بھی یہی ہے"

مذکورۂ بالا بیان خزینۃ الاصفیا کی حسب ذیل روایت سے مرتب کیا گیا ہے جو حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ذکر میں درج ہے،

"نقل است کہ وقتیکہ خواجہ معین الحق والدین از خراسان وارد ہندوستان شد، خواجہ قطب الدین بختیار و شیخ جلال الدین تبریزی باتفاق ہم دیگر باشتیاق ملاقات شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی در ملتان تشریف بردند، روزے ہر سہ بزرگوار در یک مجلس تشریف داشتند کہ قباچہ بیگ حاکم ملتان بخدمت حاضر آمدہ عرض کرد کہ لشکر کفار مغل برائے تسخیر ملتان آمدہ اند، و لشکر بے شمار دارند، و مرا طاقت مقابلہ و مجادلہ بایشان نیست برائے خدا امداد فرمایند، اتفاقاً خواجہ قطب الدین دران وقت تیرے بدست خود داشت حوالہ حاکم ملتان کرد و فرمود کہ این تیر بوقت شب در لشکر دشمن بینداز و فارغ بنشین، قباچہ ہمچنان بعمل آورد در لشکر دشمن متفنے نماند کہ زخم مرباو نرسیدہ باشد، و ہمہ کفار بفرار نہادند" (ج ۱ ص ۲۶۰)

خزینۃ الاصفیا کی مندرجۂ بالا روایت غالباً سیر الاقطاب (ص ۱۴۹) سے لی گئی ہے، سیر الاقطاب کے بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت بختیار کاکی اپنے مرشد کے ساتھ ہندوستان نہیں آئے، انھوں نے یہ خبر سنی کہ حضرت خواجہ خراسان سے ہندوستان جا رہے ہیں، تو مرشد کے شوق ملاقات میں وہ بھی ہندوستان روانہ ہو گئے، ملتان پہونچے، وہاں سے دہلی آئے اور دہلی سے مرشد کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت مانگی لیکن اُن کو حکم ملا کہ وہ وہیں قیام کریں، لیکن دلیل العارفین (مجموعۂ ملفوظات حضرت خواجہ معین الدینؒ) کے بیان کے مطابق حضرت خواجہ قطب الدین ہندوستان اور پھر اجمیر اپنے مرشد کی معیت میں آئے، دلیل العارفین کی مجلس بازدہم میں ہے،

"چوخواجہ دریں خواہد رسید چشم پر آب کرد، فرمود مسافر می شوم، جائیکہ مدفن ما خواہد بود

یعنی در اجمیری روم ہر کسے را وداع کردہ و دعا گو بر در راہ بودیم، بعد ازان در اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر رسیدیم و آن روز اجمیر از ان ہند و آن معمور و آباد و مسلمانی چنان نبود، چون قدم مبارک خواجہ انجا رسید، چندان اسلام ظاہر شد، کہ ان را حد نبود" (ص ۵۵-۵۴)

اب سمجھ میں نہیں آتا کہ دلیل العارفین کی روایت کیا سیر الاقطاب اور خزینۃ الاصفیاء کے بیانات کو قابل قبول سمجھا جائے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے ذکر میں خزینۃ الاصفیا، کا ایک بہت ہی واضح بیان ہے جس سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت خواجہ، ۱۱ محرم ۵۶۱ھ میں اجمیر وارد ہوئے، اور وہیں مستقل قیام فرما کر رشد و ہدایت اور اشاعت اسلام کا سلسلہ شروع کر دیا، وہ بیان ملاحظہ ہو،

"من بعد حضرت خواجہ از بخ بغزنین آمد و بعد حصول صحبت شمس العارفین کہ ذکر آن سابق مذکور شد فائز لاہور شد تا دو ماہ مزار پر انوار مخدوم علی علوی ہجویری لاہوری قدس سرہ معتکف ماند بعد حصول فوائد باطنی از لاہور روانہ دہلی گشت و چندے در دہلی قیام پذیر ماند بتاریخ دہم ماہ محرم سال پانصد و شصت و یک رونق افزائے دار الخیر اجمیر گشت و در آنجا اول شخصی کہ شرف ارادت آنحضرتؐ مشرف شد میر سید حسین خنگ سوار بود کہ اول ازان مذہب شیعہ داشت و بعد ازان تائب شدہ مرید گشت و بمراتب اعلیٰ رسید، و من بعد ہزار در ہزار از صغار و کبار بخدمت آن محبوب کردگار حاضر شدہ، مشرف بشرف اسلام و ارادت آنحضرت شدند بحدیکہ چراغ اسلام در ہندوستان بطفیل این خاندان عالی شان روشن گشت" (ج ۱ ص ۲۵۹)

عاجز راقم کے ان معروضات سے معین الارواح کے لائق مؤلف کو یہ اندازہ ہوا ہوگا کہ انھوں نے حضرت خواجہ کے چار بار ہندوستان آنے کے سلسلہ میں جو دلائل پیش کئے ہیں وہ صحیح نہیں ہیں،

(باقی)

سفرنامۂ ناصر خسرو

ہزار سال پہلے از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد للعہ رپیہ:- انجمن خدمۃ التربیۃ دار العلوم دیوبند،

مسلمانوں کے دورِ عروج میں اُن کو علمی تلاش و تحقیق اور نئے نئے انکشافات اور اس کے لئے سیر و سیاحت کا شوق اتنا غالب تھا کہ انھوں نے اس زمانہ میں جب سفر میں بڑی دشواریاں تھیں، زمین کا چپہ چپہ چھان مارا، اور اس زمانہ کی معلوم دنیا کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جہاں اُن کے قدم نہ پہنچے ہوں یورپ کے برف پوش پہاڑ، افریقہ کے تپتے ہوئے صحرا، اور ایشیا کے مرغزار کیسان اُن کی جولانگاہ تھے، ان میں سے بہت سے اہلِ علم و قلم سیاحوں نے اپنے سفر کے مشاہدات و نتائج کتابی شکل میں قلمبند کئے، ان میں سلیمان تاجر، بزرگ بن شہریار، ابن بطوطہ و ناصر خسرو کے سفرنامے، ابو جعفر خوارزمی، ابن رستہ، ابن خرداذبہ، ابن الفقیہ ہمدانی، ابن حوقل، اصطخری، بشاری مقدسی اور ادریسی وغیرہ کے جغرافیے چھپ کر شائع ہو چکے ہیں جو اس زمانہ کے جغرافی اور تمدنی حالات کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں، فاضل مصنف نے جن کا ہمہ گیر ذوق نئے نئے رنگ میں اپنا جلوہ دکھاتا رہتا ہے، قدیم سفرناموں اور جغرافیہ کی کتابوں کی مدد سے آج سے ہزار سال پہلے کے عنوان سے ایک مسلسل مضمون لکھا تھا، جو غالباً رسالہ دار العلوم میں شائع ہوا تھا، اسی کو کتابی شکل میں شائع کر دیا گیا ہے، اس میں ہزار سال پہلے کے ہندوستان، چین، عراق، ایران، ترکستان اور شمالی افریقہ کے بعض علاقوں کے مذہبی معاشرتی، تمدنی اور علمی حالات اور دوسرے عجائب و نوادر کی جھلک دکھائی گئی ہے، اس لحاظ سے یہ کتاب مفید بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن غالباً

مضامین کی تحریر کے وقت کتاب کی شکل میں اُن کی اشاعت کا خیال نہیں تھا، اس لئے اس موضوع سے سے متعلق معلومات کا پورا استقصاء اور مضامین میں ترتیب نہیں ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فاضل مصنف کو دورانِ مطالعہ میں جو معلومات حاصل ہوتے گئے، ان کو قلم برداشتہ لکھتے گئے، اور ناشرین نے اسی طرح انکو شائع کردیا، ورنہ مصنف جیسے وسیع النظر کے قلم سے یہ کتاب اس سے زیادہ جامع اور مرتب شکل میں ہوتی لیکن موجودہ شکل میں بھی وہ بہت مفید اور دلچسپ ہے،

اشتراکیت روس کی تجربہ گاہ میں | مرتبہ جناب اصغر علی صاحب عابدی تقطیع اوسط ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ہے پتہ مکتبہ نشاۃ ثانیہ معظم جاہی مارکیٹ حیدرآباد دکن،

کمیونسٹ، اشتراکی نظام کو دنیا کے سارے سیاسی و معاشی مشکلات کا حل، حریت و آزادی عالمگیر انسانی و معاشی مساوات کا سب سے بڑا علمبردار اور مادی پہلو سے انسانیت کا نجات دہندہ سمجھتے ہیں، ممکن ہے کارل مارکس، انجلس اور لینن کی متخیلہ اشتراکیت میں یہ خوبیاں رہی ہوں لیکن سوویٹ حکومت میں جو اشتراکیت عملاً قائم ہے، اس میں سرمایہ داری نظام سے بھی زیادہ خرابیاں ہیں جس کا اعتراف سچے کمیونسٹوں تک کو ہے، اور اس کے متعلق انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں بہت سے مضامین لکھے گئے ہیں، مرتب نے اُن کو اس کتاب میں جمع کردیا ہے، ان میں دلائل و شواہد سے دکھایا گیا ہے کہ موجودہ روسی اشتراکی نظام سیاست و معاشیات اور اخلاق و معاشرت ہر پہلو سے بدترین استبدادی نظام ہے، اس میں کسی قسم کی مساوات کا وجود نہیں بلکہ شخصی آزادی تک مفقود ہے، اور وہ ساری اخلاقی قدریں ختم کردی گئی ہیں جن کو دنیا اب تک مانتی چلی آتی ہے، اور خود اس کے نظام اخلاق کی بنیاد تمام تر جبر و استبداد، مکر و فریب اور حیوانیت پر ہے، اس کتاب سے روس کی اشتراکیت کی پوری قلعی کھل جاتی ہے، اور وہ خصوصیت کے ساتھ ان نوجوانوں کے مطالعہ کے لائق ہے، جو اشتراکیت کے سراب کو چشمۂ حیوان سمجھتے ہیں،

کلیل مین غلیل از جناب ناطق گلاوٹھوی تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۰۱ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ ار پتہ:- کوثر بک ڈپو معسکر بنگلور،

عرصہ ہوا رسالہ خیام لاہور مین یہ بحث چھڑی تھی کہ حالی کے اس شعر

حالی اب آؤ پیروی مغربی کرین بس اتباعِ متحفی و میر کر چکے

مین پیروی مغربی سے کیا مراد ہے یورپ کے خیالات کی تقلید یا مغربی شاعری کی، اس بارہ مین ادیبون اور سخن سنجون کی رائین مختلف تھین، جناب ناطق کے نزدیک یورپ کے خیالات کی تقلید مراد تھی، اور اس صورت مین مغربی کی "ی" کو مولانا حالی کی غلطی پر محمول کرنا ناگزیر تھا، لیکن اس سلسلہ مین انھون نے اُن کی شاعرانہ حیثیت اور شاعری پر بھی تنقید کر ڈالی ہے اور سندس کی مخالفت کے زمانہ کی یہ روایت بھی نقل کر دی کہ وہ مولانا آسی کی تصنیف ہے، اس پر اعتراضات ہوئے، اس کے جواب مین انھون نے جو خط اڈیٹر خیام کے نام لکھا تھا، اس کو کلیل مین غلیل کے فیصح نام سے شائع کیا ہے، اس مین حالی اور دورِ جدید کے دوسرے شعرا، ادیبون اور نقادون کی نااہلیت، پارٹی بندی، رشک و رقابت، پروپیگنڈے اور اس قبیل کے دوسرے مسائل پر جو ندکورۂ بالا امور سے متعلق ہو سکتے ہین، اپنے خیالات ظاہر کئے ہین، اور اس لپیٹ مین بعض پرانے اساتذہ تک آگئے ہین، شعر و ادب مین مصنف کے صاحب نظر ہونے مین کلام نہین، انھون نے موجودہ زمانہ کے معیارِ علم و شاعری کے متعلق بہت سی باتین صحیح لکھی ہین، اگر وہ سنجیدگی سے ان مسائل پر بحث کرتے، تو اُن کی یہ تحریر وقیع اور غور و توجہ کی مستحق ہوتی، لیکن غیر سنجیدہ اور حریفانہ انداز تحریر، دوسرون کی تنقیص کے ساتھ خود اپنے قلم سے اپنے کمالات کے اظہار کی بنا پر یہ کتاب بھی پارٹی بندی اور پروپیگنڈے کے دائرے مین آگئی ہے، مصنف نے ایک دلچسپ روایت یہ بھی نقل کی ہے، کہ مسدس حالی کی تصنیف مین سرسید کی محنت اور کاوش کو زیادہ دخل تھا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسدس اُن کی تصنیف ہے، ایا کم از کم اس پر اُن کی اتنی اصلاح ہے کہ گویا ان کی

تصنیف سمجھنا چاہیے، جن لوگوں کو سرسید اور حالی سے واقفیت ہے، وہ اس قسم کا تصور بھی نہیں لاسکتے، سرسید کو شعر و شاعری سے کیا علاقہ، اور اگر یہ مراد ہے کہ مسدس کے خیالات سرسید کے ہیں، تو یہ بھی صحیح نہیں، مولانا حالی مسلمانوں کے تدوجزر اور ان کی ترقی و تنزل کی تاریخ سے سرسید سے کم واقف اور ان کی زبون حالی سے ان سے کم متاثر نہیں تھے کہ مسدس کے خیالات کو سرسید کا القا سمجھا جائے یہ اور بات ہے کہ مسدس سرسید کی تحریک سے لکھی گئی ہو یا اسکی تصنیف کے دوران میں مولانا حالی سرسید سے بھی اصلاح و مشورہ کرتے رہے ہوں، لیکن اس سے مسدس کو سرسید کی جانب منسوب نہیں کیا جا سکتا، اس قسم کا علمی افادہ و استفادہ اہل علم میں عام ہے، بہرحال یہ کتاب لطف و دلچسپی سے خالی نہیں ہے، نام کی جدت و فصاحت خصوصیت کیساتھ حسن ورق کا نمونہ ہے،

جمہوریۂ ہند کے دستور اساسی کی خاکہ | از جناب محمد ہاشم صاحب قدوائی ایم اے لکچرار شعبہ پولیٹیکل سائنس مسلم یونیورسٹی تقطیع اوسط ضخامت ۲، صفحے کاغذ، کتابت و طباعت بہترقیمت عہ، پتہ:- ایجوکیشنل ہاؤس سول لائن شمشاد بلڈنگ علی گڈھ،

جمہوریہ ہند کے دستور کا متن خاصہ ضخیم ہے، اور غالباً ابھی اردو میں اس کا ترجمہ نہیں ہوا ہے، لائق مرتب نے اردو میں اس کا خلاصہ لکھا ہے، اس میں دستور کی مختصر تاریخ اس کی خصوصیات، شہریت، اس کے حقوق و فرائض، ملکی پالیسی کے اصول، ہند یونین کے اجزاء اور اس کا نظام مرکزی حکومت، پارلیمنٹ، ریاستوں، ریاستی مجالس قانون ساز، عدلیہ، ہائیکورٹ، ماتحت عدالتوں، پبلک سروس کمیشن وغیرہ سے متعلق دستور کے تمام آئین و قوانین کا پورا خاکہ آگیا ہے، زبان صاف اور سلیس ہے یہ کتاب مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے طلبہ کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن عام اردو خوانوں کے مطالعہ کے لائق بھی ہے،

حبیب خدا، چاند ستارے اور مہاجرین و انصار، از جناب الیاس احمد صاحب بھی

تقطیع اوسط، ضخامت علی الترتیب ۱۹۲، ۱۶۰، ۱۶۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت عار

عہ، عہ، پتہ :- اردو گھر چنہ مارٹن روڈ کراچی،

بچکانی کتابوں کے مصنف کی حیثیت سے مجیبی صاحب کو خاص شہرت حاصل ہے، انھوں نے مسلمان بچوں کی اخلاقی تعلیم و تربیت کے لئے دارالمصنفین کی کتابوں کی مدد سے سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، خلفاے راشدین اور صحابۂ کرام کی سیرت پر متعدد مختصر اور مفید کتابیں لکھی ہیں، جو بہت مقبول ہوئیں مذکورۂ بالا تینوں کتابیں اُن کے نئے اڈیشن ہیں، اس میں مصنف نے بہت سے مفید اور نئے اضافے کئے ہیں، جیسا کہ ان کتابوں کے نام سے ظاہر ہے، پہلی کتاب سیرت نبوی پر ہے، دوسری خلفاے راشدین اور تیسری اکابر مہاجر و انصار صحابہ کے حالات ہیں، ان میں ان بزرگوں کے سوانح کے ساتھ اُن کی زندگی کے اخلاقی پہلو اور اُسوۂ حسنہ کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا ہے، زبان بہت صاف، سادہ اور آسان اور اندازِ بیان بچوں کے ذوق کے مطابق، یہ پورا سلسلہ مسلمان بچوں کے پڑھانے کے لائق ہے،

زندگی کے سایے، مترجم بلال احمد مرحوم، تقطیع اوسط، ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، قیمت مجلد عار، پتہ :- لاجپت رائے اینڈ سنز اردو بازار دہلی،

امریکہ کی مشہور افسانہ و ناول نگار خاتون پرل بک کو چین سے بڑی دلچسپی ہے، وہ وہاں رہ بھی چکی ہیں، اور چینی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر انھوں نے بہت سے افسانے لکھے ہیں، زندگی کے سایے اُن کے سات افسانوں کا ترجمہ ہے، ایک افسانہ اطالوی افسانہ نگار اگنیز یوسلونے کا ہے، یہ سب افسانے دلچسپ اور خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں کے پڑھنے کے لائق ہیں جن کو چین میں امریکہ کی سیاست سے دلچسپی ہو، کتاب کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم مترجم نے کل ۱۹ سال کی عمر پائی جس میں عموماً قلم پکڑنا بھی نہیں آتا، ترجمہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اگر وہ زندہ رہتے، تو ادبی صف میں نمایاں جگہ حاصل کرتے لیکن موت نے اس کا موقع نہیں دیا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ ذی الحجہ ۱۳۶۹ھ مطابق ماہ اکتوبر ۱۹۵۰ء عدد ۴

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۴۲ - ۲۴۴

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت	مولانا عبد السلام ندوی	۲۴۵ - ۲۶۲
اجتماعیات کا قرآنی تصور	جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی	۲۶۳ - ۲۸۰
مولانا عبد الملک نبیانی	ڈاکٹر سید باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبہ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی،	۲۸۱ - ۲۸۸
تاریخ یمن کا ایک ورق	جناب مولانا ابو الجلال ندوی	۲۸۹ - ۲۹۸

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کی ایک جھلک	ڈاکٹر راجندر پرشاد	۲۹۹ - ۳۰۳

ادبیات

فطرت اور مرد مومن	جناب شہ زور کاشمیری	۳۰۴ -
غزل	جناب سید شاہ ولی الرحمٰن صاحب ڈپٹی کلکٹر آرہ	۳۰۵

باب التقریظ و الانتقاد

"معین الارواح"	سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم۔ اے علیگ	۳۰۶ - ۳۱۵
مطبوعات جدیدہ	"م"	۳۱۶ - ۳۲۰

شذرات

کانگریس کی صدارت مین ٹنڈن جی کی کامیابی کو فرقہ پرستون نے اپنی فتح سمجھا اور بڑی خوشیان منائین کہ اب کانگریس پر بھی ان کا قبضہ ہوگیا، قوم پرستون کو تشویش پیدا ہوئی کہ دیکھین فرقہ وارانہ مسائل مین کانگریس کی پالیسی پر اس کا کیا اثر پڑتا ہی لیکن ہندوستان کی فلاح کا صرف ایک راستہ ہی سیکلر حکومت تمام فرقون کے حقوق مین قانونی اور عملی یکسانیت، قومی اتحاد و یکجہتی، اور پاکستان و ہندوستان کے تعلقات مین خوشگواری، اسکے علاوہ جو راستہ بھی اختیار کیا جائیگا وہ ملک کو ہلاکت اور بربادی کیطرف لیجائیگا، اسلیے اگر ٹنڈن جی ملک کے سچے ہی خواہ ہین تو انکو بھی اپنا نقطۂ نظر بدلنا پڑے گا۔

کانگریس کی صدارت کے بعد اگرچہ انکا لب و لہجہ بدل چلا ہی اور ادھر انھون نے جو تقریرین کی ہین ان مین وہ محض فرقہ پرست، مسلم آزار اور پراچین بھارت کے نمایندے نہین معلوم ہوتے، بلکہ انکی زبان سے غیر مذہبی حکومت، مختلف فرقون کے حقوق مین مساوات، مسلمانون کے تحفظ اور ہندو مسلم اتحاد کی اصطلاحین نکلنے لگی ہین، بلکہ بعض تقریرون مین تو اپنے محبوب مشن کلچر کے متعلق یہانتک کہا ہی کہ ہندوستانی کلچر ہندو مسلمانون نے مل کر بنایا ہی، اور انکا اور انکے وطن الہ آباد کے مسلمانون کا کلچر ایک ہی، اگر وہ بھی اسکو مانتے ہین تو پھر انکے اور مسلمانون کے نقطۂ نظر مین کوئی اختلاف نہین رہ جاتا، مسلمان بھی یہی کہتے ہین کہ ہندوستانی کلچر وہی ہے جو ہندو مسلمانون کے میل جول سے بنا ہے، اور جسمین دونون کے اثرات ہین اور اسی کو ہندوستان کا مشترک کلچر ہونا چاہیے، لیکن ٹنڈن جی کی زبان سے ہندو کلچر کا نعرہ بھی نکل جاتا ہی، اس نعرہ کیساتھ ہندو مسلم اتحاد کی اپیل بے معنی ہی، اگر وہ حقیقۃً اتحاد چاہتے ہین تو یہ نعرہ چھوڑ دینا چاہیے، اتحاد کے معنی ہندون مین ضم ہوجانے کے نہین ہین، اس کے بغیر بھی اتحاد ہوسکتا ہی اور ہو کر رہے گا، ٹنڈن جی کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ مسلمان ہندوستان ہی مین رہینگے، اور پورے اتحاد و قومی کے ساتھ اپنا مستقل وجود بھی قائم رکھینگے،

ٹنڈن جی کو ہندوستان کی سب سے بڑی قومی جماعت کی قیادت سپرد کیگئی ہے، انھیں اپنے کو اسکا اہل ثابت کرنا چاہیے اور اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں چھوڑ دینی چاہئیں، کانگریس تمام فرقوں کی نمایندہ جماعت کہی جاتی ہے، اور مسلمان اب بھی ہندوستان کی سب سے بڑی اقلیت ہیں، اسکے علاوہ صدارت کی کامیابی میں ٹنڈن جی کو مسلمانوں کے ووٹوں کی بھی ضرورت ہے، اسلیے انکی نمایندگی بھی کرنا انکا قانونی اور اخلاقی فرض ہے، غلط نقطۂ نظر ہمیشہ نہیں چل سکتا، یا اسکو صحیح کرنا ہوگا یا ملک کو تباہی کے حوالہ کرنا ہوگا، ٹنڈن جی کے محب وطن ہونے میں شبہہ نہیں، اسلیے کیا عجب ہے کہ صدارت کی ذمہ داری انکے خیالات کی تصحیح کردے، حق و صداقت میں بڑی طاقت ہے، اگر ہمت و جرأت سے مقابلہ کیا جائے تو باطل اسکو مغلوب نہیں کرسکتا اور بالآخر فتح حق ہی کی ہوگی، ناسک کانگریس کے فیصلے اس کے شاہد ہیں، ٹنڈن جی کو بھی ان فیصلوں کی پابندی کا عملی ثبوت دینا چاہیے،

گائے اور زبان کے بارہ میں بھی ان کے خیالات میں اصلاح کی ضرورت ہے، ہندی کے حکومت کی زبان ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اردو کو مٹا دیا جائے، اسکے بعد بھی ملکی زبان کی حیثیت سے اسکو زندہ رہنے کا حق ہے، اسلیے اگر ٹنڈن جی اردو دشمنی چھوڑ دیں تو انکا کیا حرج ہے، گائے کی اقتصادی اہمیت سے انکار نہیں، ہندوستان ایک زرعی ملک ہے، یہاں گائے کی نسل کو ترقی دینے کی ضرورت ہے، اسی بنا پر اسکو قدیم ہندوستان میں مذہبی تقدس کا درجہ دیا گیا تھا، لیکن اس اہمیت کو اسکی حد کے اندر رکھنا چاہیے، اسکو ملکی مفاد پر ترجیح نہ دینا چاہیے، ایک طرف ٹنڈن جی کی عقل پرستی کا یہ حال ہے کہ وہ اس ترقی کے دور میں الہامی اور مذہبی کتابوں کی ہدایات ماننے کیلیے تیار نہیں ہیں، دوسری طرف انکی قدامت پرستی یہ ہے کہ گائے کے تقدس کو ٹھیس لگانا گوارا نہیں اور اسکے لیے وہ ربڑ اور کرمچ کے جوتے اور نواڑ کے بستر بند استعمال کرنے کو کروڑوں روپے کا اقتصادی نقصان برداشت کرنے کیلیے آمادہ ہیں، اپنی ذات کیلیے وہ اس سے بھی زیادہ سادگی اختیار کرسکتے ہیں، ربڑ کے جوتے کے بجائے لکڑی کی کھڑاویں، رسی کے بستر بند اور کھاروے کے تھیلے استعمال کریں، لیکن ملکی بلکہ فوجی ضروریات کو تو گائے کے لیے قربان نہیں کرسکتے، کیا فوجی سپاہیوں کو بھی وہ ربڑ اور کینوس کے جوتے پہنا کر انکی کمر میں نواڑ کی پٹیاں باندھ کر میدان جنگ میں بھیجیں گے، ان کے اسلحہ سوت کی ڈوری سے کسے اور کینوس کے تھیلوں میں رکھے جائیں گے، ان کے گھوڑوں کی لگامیں، رسی کی چارجامے نمدے کے اور ساز نواڑ کا ہوگا، یہ فوج کیا ہوگی عجوبہ روزگار ہوگی،

اس کے علاوہ چمڑا تو ضروریات زندگی مین ہے، اور اس زمانہ مین تو اس کی اہمیت اور زیادہ بڑھ گئی ہے ہزارون لاکھون بوڑھے بیل اور ناکارہ گائین کہان جائین گی، ان کے چارہ کا کیا انتظام ہوگا، رہے مسلمان تو وہ خود ہی گاؤکشی چھوڑ چکے ہین اس لیے اب ٹنڈن جی کو ان کے بجائے ہندوون کو روکنا چاہیے، جو بوڑھی گائین قصابون کے ہاتھ خفیہ بیچدیتے ہین،

صوبہ بمبئی اگرچہ اردو زبان کے مرکز یوپی اور دہلی سے دور ہے، اور وہان کی صوبائی زبانین گجراتی اور مرہٹی ہین لیکن ہر زمانہ مین وہان اردو زبان و ادب کا چرچا اور شعر و شاعری کا مذاق رہا ہے اردو کے بہت سے اخبارات و رسالے نکلتے ہین، اردو کی خدمت کے لیے متعدد ادبی ادارے قائم ہین، ان مین مشہور انجمن اسلام کی خدمات خصوصیت کے ساتھ اہم ہین، اسی سلسلہ مین ڈاکٹر بذل الرحمٰن صاحب مرحوم پرنسپل اسمٰعیل کالج بمبئی نے ۱۹۴۷ء مین اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا تھا، اس کا مقصد گجرات کے قدیم اردو ادب کی تحقیقات، وہان کے کتب خانون مین اس کے قلمی نوادر کی تلاش اور ان کی فہرست کی ترتیب، اردو کے ریسرچ اسکالرون کی علمی اعانت ہے، یہ ادارہ وقتاً فوقتاً اردو کے فضلا سے مقالات بھی پڑھاتا رہتا ہے، اسکے لائق کارکنون نے گذشتہ جنوری سے ایک سہ ماہی رسالہ نوائے ادب کے نام سے جاری کیا ہے، اسکا مقصد تقریباً وہی ہے جو پرانی انجمن ترقی اردو کے رسالے کا تھا، اس وقت تک اس کے تین نمبر نکل چکے ہین، اور ہر نمبر اردو زبان و ادب سے متعلق مفید مضامین و معلومات پر مشتمل ہے، اسکے روح رواں ہمارے پرانے رفیق پروفیسر سید نجیب اشرف صاحب ندوی اور ڈاکٹر محمد ابراہیم صاحب ڈار ہین، امید ہے کہ ان دونون صاحب ذوق فضلا کی نگرانی مین یہ رسالہ ترقی کریگا، اور رسالہ اردو کے پاکستان منتقل ہوجانے سے جو کمی ہوگئی ہے وہ پوری ہوجائے گی۔

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبدالسلام ندوی

"کلام مجید لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، اس کے لفظی اور ظاہری اعجاز پر گذشتہ مہینہ مولانا سید بدرالدین صاحب علوی کا مفید مضمون شائع ہو چکا ہی لیکن ارباب بصیرت کی نگاہ مین اس کا اصلی اعجاز معنوی ہے جس نے دلون کی کایا پلٹ دی اس لئے اس مہینہ اعجاز القرآن کے اس پہلو پر مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا فاضلانہ مقالہ شائع کیا جاتا ہے تاکہ دونون پہلو سامنے آجائین،

"م"

اعجاز قرآنی کے ثابت کرنے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہی کہ اعجاز قرآنی کی نوعیت کیا ہے ؟

معجزہ چونکہ دلیل نبوت ہے اور دلیل کی قسمین اور اُن کے آثار و نتائج مختلف ہوتے ہین، اس لئے معجزہ کی بھی مختلف قسمین ہین،

ا بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین جن سے صرف مدلول علیہ کا علم ہو جاتا ہے لیکن اُن سے دل مین ترغیب و ترہیب یا دوسرے قسم کا اور کوئی جذبہ نہین پیدا ہوتا،

مثلاً اگر ایک شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر کچھ لوگ موجود ہین جن سے اُس کا کوئی تعلق نہین

تو اس سے اس مقام پر اُن لوگون کے موجود ہونے کا علم تو اس کو ہو جائے گا، لیکن اس کے دل مین اُن لوگون کے بغض و محبت کا کوئی جذبہ پیدا نہ ہوگا، پیغمبرون کے عام مادی معجزے اسی قسم مین داخل ہین کہ اُن سے صرف اُن کی صداقت کا علم ہوتا ہے، اگرچہ اُن کی صداقت کے تسلیم کر لینے کے بعد اُن کے اوامر و نواہی اور وعد و وعید کو بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ اُن کے معجزات کا بالذات نہین، بلکہ بالواسطہ اثر ہے، خود ان معجزات مین ترغیب و ترہیب کا کوئی عنصر شامل نہین،

۲۔ اس کے بخلاف بعض دلیلین ایسی ہوتی ہین، جو مدلول علیہ کے علم کے ساتھ ترغیب و ترہیب، بغض و محبت کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہین، مثلاً اگر اسی شخص سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دوست و احباب، اعزہ و اقارب اور اہل و عیال موجود ہین تو اس کو اس مقام پر صرف اُن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل مین اُن کی محبت کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ بے اختیار ان سے ملنے کا مشتاق ہوگا،

اسی طرح اگر اس سے یہ کہا جائے کہ فلان مقام پر تمھارے دشمن یا ڈاکو موجود ہین، جو تم کو مار ڈالینگے یا تمھارا مال لوٹ لینگے، تو اس کو صرف دشمنون اور ڈاکوؤن کی موجودگی ہی کا علم نہ ہوگا، بلکہ اس کے دل مین خوف کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ وہان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا،

قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے اور اس حیثیت سے اس کو تمام گذشتہ پیغمبرون کے معجزات پر فضیلت حاصل ہو کہ وہ صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت ہی پر دلالت نہین کرتا، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی بتاتا ہے کہ خدا نے پیغمبرون کے پیروؤن کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ اُن کی کیونکر مدد کی؟ اُن کو دشمنون سے کیونکر بچایا؟ دنیا مین کیونکر اُن کا بول بالا کیا؟ اور آخرت مین اُن کو کس طرح سرفراز کیا؟ اس کے بخلاف جن لوگون نے پیغمبرون کی تکذیب کی، وہ کیونکر تباہ و برباد کئے گئے اور دین و دنیا مین مستوجب لعنت ہوئے؟ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہوگا، کہ جن لوگون کے سامنے اس قسم

کا معجزہ پیش کیا جائے گا، اُن کے دل مین پیغمبر کی صداقت کے یقین کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوگا، اور وہ اس کے اوامر و نواہی کی پابندی کی طرف خود بخود مائل ہون گے۔

علامہ ابن تیمیہ ان دونون قسم کی دلیلون کا فرق بیان کرنے کے بعد دوسری قسم کی دلیل کے متعلق لکھتے ہین :-

وَهٰذِهِ الطَّرِيقُ اكمل وابلغ	مقصد کے حاصل کرنے کا یہ کامل ترین اور
فی حصول المقصود فانها	موثر ترین طریقہ ہے، کیونکہ وہ پیغمبرون
تفید العلم بصدقهم و	کی صداقت کے علم کے ساتھ اُن کی پیروی
الرغبة فی اتباعهم والرهبة	کی رغبت دلاتا ہے، اور ان کی مخالفت
من خلافهم،	سے ڈراتا ہے،

یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بڑے بڑے مجمعون مثلاً عید مین سورۂ قاف اور سورۂ اقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ اور جمعہ مین سورۂ قاف پڑھتے تھے، کیونکہ ان سورتون مین توحید، اصول دین اور نبوت اور معاد کے اثبات کے ساتھ پیغمبرون کے پیرودن اور اُن کے مخالفین کا حال بھی بیان کیا گیا ہے[1]

اس لئے قدرتی طور پر ان واقعات کا اثر پڑتا ہے، اور لوگون کے دلون مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانے کے ساتھ ترغیب و ترہیب کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ دوسری قسم کی یہ دلیل جس کی بہترین مثال قرآن مجید ہے پہلی دلیل کی طرح بالکل سادہ نہین ہوتی، بلکہ اس مین ترغیب و ترہیب کے عناصر بھی شامل ہوتے ہین، اس لئے یہ دلیل جس قدر زیادہ موثر ہوگی، اُسی قدر اُس کی معجزانہ حیثیت زیادہ نمایان ہوگی، اور قرآن مجید اس حیثیت

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۴ ص ۲۷۳، ۲۷۴،

سے حد اعجاز تک پہونچ گیا ہے، چنانچہ خداوند تعالیٰ خود کہتا ہے،

وَلَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل
جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	کرتے، تو تو اس کو دیکھتا کہ خدا کے خوف
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ (الحشر-۳)	سے دب جاتا اور پھٹ جاتا،

اگرچہ قساوت قلبی کی وجہ سے کفار نے اُس کے معجزانہ اثر کو قبول نہیں کیا، تاہم اُن کو یہ یقین تھا کہ یہ ایک موثر کلام ہے، اس لئے اُس کے اثر کے روکنے کے لئے بعض سیفسانہ تدبیریں اختیار کیں، مثلاً

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا	اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن
لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ	کو سنو ہی مت، اور اُس کے بیچ میں غل
تَغْلِبُوْنَ (حم السجدہ کا ۴)	مچا دیا کرو، شاید تم ہی غالب رہو،

امام رازی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ "کفار کو یہ معلوم تھا کہ قرآن مجید لفظ و معنی دونوں حیثیتوں سے کامل ہے، اور جو شخص اس کو سنے گا، وہ اُس کے الفاظ کی جزالت سے واقف ہوجائیگا، اور اس کی عقل اس کے معانی کا احاطہ کرے گی، اور وہ یہ فیصلہ کردے گی کہ یہ کلام حق ہے اور اسکا قبول کرنا ضروری ہے، اس لئے انھوں نے لوگوں کو اُس کے سننے سے روکنے کے لئے یہ تدبیر نکالی کہ آپس میں یہ کہنے لگے کہ اس قرآن کو نہ سنو اور جب وہ پڑھا جائے تو شور و غل کرو، اشعار پڑھو اور دوسری قسم کے خرافات بکو تاکہ قاری کی قرأت میں گڑبڑی پیدا ہوجائے۔ قریش باہم ایک دوسرے کو یہی سمجھاتے تھے، اور اس کا مقصد یہ تھا، کہ اس طریقہ سے لوگ قرآن کا مطلب نہ سمجھ سکیں"۔

قرآن مجید کے اس معجزانہ اثر کے متعلق متعدد شہادتیں موجود ہیں، مثلاً کفار و مشرکین پر تو اس کا یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ قرآن مجید کی آیتوں کو سن کر اسلام کی طرف مائل ہوتے تھے، اور اُن کے دلوں میں اسلام کے قبول کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا تھا، چنانچہ صحیح بخاری باب الہجرۃ میں ہے کہ

جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کفار مکہ کے مظالم سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کرنی چاہی، اور مقام برک الغماد تک پہنچ گئے، تو راستے مین ابن الدغنہ جو عرب کے ایک بڑے قبیلہ کا سردار تھا مل گیا، اور پوچھا کہ "کہان کا قصد ہے"، انھون نے کہا کہ مجھکو میری قوم نے گھر سے نکال دیا ہے، اب دنیا مین گھوم پھر کر اپنے خدا کی عبادت کرون گا" لیکن ابن الدغنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اخلاقی فضائل گن کر کہا کہ "تم جیسا شخص گھر بار سے نکالا نہین جا سکتا، مین تمھارا ضامن ہوتا ہون، واپس چلو اور اپنے شہر مین اپنے خدا کی عبادت کرو"

چنانچہ ابن الدغنہ نے سرداران قریش کو اس پر راضی کر لیا، اور انھون نے اس کی ضمانت کو اس شرط پر منظور کر لیا، کہ "وہ اپنے گھر ہی مین اپنے خدا کی عبادت کرین اور قرآن اور نماز پڑھین، لیکن اس کا اعلان نہ کرین، کیونکہ ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف مائل ہو جائینگے" اس شرط پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے چند روز تک عمل کیا لیکن اس کے بعد اپنے گھر کے صحن مین انھون نے ایک مسجد بنائی جس مین نماز پڑھتے تھے، اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، جس کا یہ اثر ہوتا تھا کہ مشرکین کی عورتین اور اُن کے بچے اُن کے اوپر ٹوٹے پڑتے تھے، اور ان کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اس منظر کو دیکھ کر کفار گھبرا گئے، اور ابن الدغنہ کو بلا کر کہا کہ "ہم نے ابوبکر کو صرف اس شرط پر پناہ دی تھی کہ وہ اپنے گھر مین خدا کی عبادت کرین لیکن انھون نے اس حد سے آگے قدم بڑھایا ہے، اور اپنے گھر کے صحن مین ایک مسجد بنا لی ہے، اور کھلم کھلا اس مین نماز ادا کرتے ہین، اور قرآن پڑھتے ہین، ہم کو خوف ہے کہ ہماری عورتین اور ہمارے بچے اسلام کی طرف نہ مائل ہو جائین، تم اُن کو منع کر دو، اگر وہ صرف اپنے گھر مین عبادت کرنے پر اکتفا کرنا چاہین تو کر سکتے ہین لیکن اگر وہ علانیہ عبادت کرنا چاہتے ہین تو تمھاری ضمانت کو منسوخ کر دین"، ابن الدغنہ نے اُن کے سامنے یہ مطالبہ پیش کیا، تو انھون نے اس کو نامنظور کر دیا، اور اُس کی ضمانت منسوخ کر دی،

لیکن باوجود اس شور وغل اور روک تھام کے قرآن مجید کے اثر کا کلیتہً ازالہ نہ ہو سکا، اور متعدد لوگ قرآن مجید کے اثر سے اسلام کی طرف مائل ہوئے، اور متعدد لوگوں نے اس کے اثر سے اسلام قبول کیا، مثلاً:-

حضرت عثمان بن مظعونؓ کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ آیت اُتری،

انَّ اللّٰہَ یَامُرُ بِالعَدلِ وَالاِحسَانِ	خدا عدل واحسان اور قرابتداروں کے
وَاِیتَاءِ ذِی القُربٰی وَیَنھٰی عَنِ	ساتھ سلوک کرنے کا حکم دیتا ہے، اور
الفَحشَاءِ وَالمُنکَرِ وَالبَغیِ یَعِظُکُم	بدکاری، بُرائی اور ظلم سے روکتا ہے، وہ
لَعَلَّکُم تَذَکَّرُونَ،	اس لئے یہ نصیحتیں کرتا ہے کہ شاید تم
(نحل-۳)	لوگ اس کو قبول کرلو،

تو اس کے سننے کے ساتھ ہی ایمان اُن کے دل میں گھر کر گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُن کو محبوب[1] ہو گئے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مغرب کی نماز میں سورۂ طور پڑھ رہے تھے، جب اس آیت تک پہنچے،

اَمْ خُلِقُوا مِنْ غَیرِ شَیءٍ اَمْ ھُمُ	کیا یہ لوگ خود بخود پیدا ہو گئے؟ یا یہ
الخَالِقُونَ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ	لوگ خود پیدا کرنے والے ہیں؟ کیا
وَالاَرضَ بَل لَا یُوقِنُونَ اَمْ	آسمان اور زمین کو انھی لوگوں نے
عِندَھُم خَزَآئِنُ رَبِّکَ اَمْ	پیدا کیا ہے؟ سچ یہ ہے کہ اُن کے
ھُمُ المُصَیطِرُونَ،	دل میں ایمان نہیں، کیا اُن کے پاس
(طور-۲)	خدا کے خزانے ہیں؟ کیا یہ لوگ سربراہ کار ہیں

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۳۱۰،

اور حضرت جبیر بن مطعمؓ نے اُس کو سُنا تو اُن کا دل اُڑنے لگا، اور وہ اسلام کی طرف مائل ہو گئے[1]

حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ شاعر اور اپنی قوم کے سردار تھے، وہ مکہ مین آئے، اور سرداران قریش سے ملے، تو اُن لوگون نے کہا کہ تم شاعر اور اپنی قوم کے سردار ہو، اس لئے ہم کو خوف ہے کہ یہ شخص (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) تم سے ملے، اسکی بعض باتین تم کو متاثر کر دین، کیونکہ اوس کی باتین جادو کا اثر رکھتی ہین اور وہ اُن کے ذریعہ سے باپ، بیٹے، اور میان بی بی مین جدائی ڈال دیتا ہے، سرداران قریش نے بار بار اس پر اصرار کیا، تو انھون نے دل مین ٹھان لیا کہ مین مسجد مین داخل ہون گا، تو کان بند کرونگا، چنانچہ انھون نے کان مین کپڑا ٹھونس لیا، اور مسجد کے اندر گئے، اس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے، وہ آپکے قریب کھڑے ہو گئے، اور بے ساختہ قرآن مجید کی بعض آیتین سن لین تو دل مین کہا کہ مین ہوشیار آدمی ہون، اور بُرے اور بھلے مین امتیاز کر سکتا ہون، مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتین ضرور سنون گا، اگر وہ اچھی ہین تو اُن کو قبول کرون گا، ورنہ اُن سے احتراز کرون گا، اب کان سے کپڑا نکال کر پھینک دیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے قرآن مجید سننے لگے اُن کا بیان ہے کہ مین نے کبھی اس سے بہتر کلام نہین سُنا، چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیٹے تو وہ بھی ساتھ ہو لئے، اور آپ کے گھر کے اندر گئے، اور قریش کی ممانعت کا پورا واقعہ سنا کر کہا باوجود اس ممانعت کے مین نے بے ساختہ آپ کی بات سُن لی اور مجھے یقین ہو گیا کہ وہ حق ہے میرے سامنے اپنا دین اور اپنے اوامر و نواہی پیش کیجئے، آپ نے اُن کو دعوت اسلام دی اور وہ مسلمان ہو گئے[2]

اسلام لانے سے پہلے حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایذا رسانی کے لئے نکلے لیکن مسجد مین آپ کی زبان مبارک سے چند آیتین سنین اور اُن سے متاثر ہوئے، پہلے تو اُن کے دل مین چند شکوک پیدا ہوئے، اور قریش کی طرح دل مین یہ خیال پیدا ہوا کہ آپ شاعر ہین، کاہن ہین، لیکن جب آپ

---

[1] صحیح بخاری کتاب التفسیر تفسیر سورۂ طور مع فتح الباری [2] استیعاب تذکرہ حضرت طفیل بن عمرو الدوسیؓ

سورہ ختم کر چکے، تو یہ تمام شکوک دور ہو گئے، اور اسلام ان کے دل میں پوری طرح جاگزین ہو گیا[1]

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفرؓ نے جب سورہ کھیعص کی ابتدائی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو وہ رو پڑا اور اس کی داڑھی تر ہو گئی، پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور توراۃ ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں[2]

اشخاص سے الگ کفار کی جماعت کی جماعت قرآن مجید کے اثر سے متاثر ہو کر اسلام لائی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا چرچا ہوا، تو بیس عیسائی آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور اُن کو قرآن مجید پڑھ کر سُنایا، تو اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے، اور اسی وقت اسلام قبول کر لیا[3]

حضرت ابو عبیدہ بن جراح، حضرت ابو سلمہ بن عبد الاسدؓ، حضرت ارقم بن ابی الارقمؓ اور حضرت عثمان بن مظعون رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور آپ نے اُن کو دعوتِ اسلام دی اور قرآن مجید کی آیتیں پڑھ کر سنائیں، تو اُن لوگوں نے فوراً اسلام قبول کر لیا[4] لیکن مسلمانوں پر قرآن مجید کا اثر اس سے بھی زیادہ سخت ہوتا تھا، خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے،

تقشعر منه جلود الذين يخشون	جس سے ان لوگوں کے جو اپنے رب
ربهم ثم تلين جلودهم و	سے ڈرتے ہیں، بدن کانپ اٹھتے ہیں،
قلوبهم الى ذكر الله،	پھر اُن کے بدن اور دل نرم ہو کر اللہ کے
(زمر-۳)	ذکر کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں،

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے اپنی دادی سے پوچھا کہ صحابۂ کرام جب قرآن مجید پڑھتے تھے تو اُن کا کیا حال ہوتا تھا؟ بولیں وہی جس کو خدا نے اُن کا وصف قرار دیا ہے یعنی اُن کی آنکھیں

---

[1] مسند ابن حنبل جلد ۱ ص ۲۰۲ [2] ایضاً جلد ۱ ص ۲۰۲ [3] ابن ہشام مطبوعہ مصر ج ۱ ص ۳۱۲،
[4] اسد الغابہ تذکرہ ابو سلمہ بن عبد الاسد،

دشکبار ہوجاتی تھین، اور اُن کے بدن کانپنے لگتے تھے۔

اس اثر پذیری کا نتیجہ یہ تھا کہ قرآن مجید نے صحابۂ کرام کے دلون مین خوف وخشیت کا ایک مستقل جذبہ پیدا کردیا تھا، اس لئے وہ ہر وقت اس کے خوف سے کانپتے رہتے تھے، حضرت عبداللہ رضؓ ابن عمرؓ کا بیان ہے کہ عہد نبوت مین ہم لوگ اس خوف کے مارے عورتون سے ہنسی خوشی کی باتین نہین کرتے تھے کہ مبادا اس بارے مین کوئی آیت نازل نہ ہوجائے،

صلح حدیبیہ مین حضرت عمرؓ نے بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک سوال کیا جواب نہ ملا تو آگے نکل گئے اور دل مین خوف پیدا ہوا کہ کہین انکے بارے مین کوئی آیت نہ نازل ہوجائے ایک دن رسول اللہ صلعم کعبہ کی دیوار کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے، حضرت ابوذر غفاریؓ آگئے، تو آپنے اُن کو دیکھ کر فرمایا ھُمُ الخاسرون یعنی وہ لوگ گھاٹے مین ہین، وہ گھبرا گئے کہ میرے بارے مین کوئی آیت تو نازل نہین ہوئی،

بالخصوص جن آیتون مین کسی فعل پر عذاب کی دھمکی دی جاتی تھی، صحابۂ کرام اُن سے اور بھی زیادہ خوف زدہ ہوتے تھے، چنانچہ جب یہ آیت نازل ہوئی،

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ	جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہین، اور
الْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ	ان کو خدا کی راہ مین صرف نہین کرتے ان
اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ	کو سخت عذاب کی بشارت دو

تو تمام صحابہ پر گویا مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی آیت کی تلاوت فرما رہے تھے، حضرت مالک بن ثعلبہؓ کا جو ایک دولتمند صحابی تھے، گذر ہوا، تو آیت کو سُن کر اُن پر غشی طاری ہوگئی، ہوش مین آئے، تو خدمت مبارک مین حاضر ہوکر عرض کی کہ یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان کیا یہ آیت اُن لوگون کی شان مین نازل ہوئی ہے، جو سونا چاندی جمع کرتے ہین، ارشاد ہوا، ہان" بولے شام تک مالک کے پاس ایک درہم اور ایک دینار بھی نہ ہوگا، چنانچہ

شام تک انھوں نے اپنی کل دولت خیرات کر دی، قرآن مجید کا یہی اثر ہے جس کو خطابی نے قرآن مجید کی ایک وجہ اعجاز قرار دیا ہے، اور اس نکتہ آفرینی پر اُن کو ناز ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں قرآن مجید کے وجہ اعجاز کے متعلق ایک بات کہتا ہوں جس سے اور لوگوں نے غفلت برتی ہے، اور وہ اس کا وہ اثر ہے جو قلب و روح پر پڑتا ہے، کیونکہ قرآن کے علاوہ کوئی کلام خواہ وہ نظم میں ہو یا نثر میں باوجود خوف و ہیبت پیدا کرنے کے دل میں لذت و حلاوت کی وہ کیفیت نہیں پیدا کرتا، جو قرآن مجید پیدا کرتا ہے[1] خود خداوند تعالیٰ فرماتا ہے :-

"لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ" - اللّٰه نزل احسن الحديث كتابا متشابها مثاني تقشعر منه جلود الذين يخشون ربهم"

اس کے بجائے اور انبیاء کے بعض معجزے تو بالکل بے اثر تھے مثلاً حضرت سلیمان علیہ السلام کے یہ معجزے :-

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ وَ مِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ	اور ہم نے حضرت سلیمان علیہ السلام کا زور کی ہوا کو تابع بنا دیا تھا کہ وہ اُن کے حکم سے اوس سرزمین کی طرف چلتی تھی، جس میں ہم نے برکت کر رکھی ہے، (مراد ملک شام سے) اور ہم ہر چیز کو جانتے ہیں اور بعضے بعضے شیاطین ایسے تھے کہ سلیمان کے لئے (دریاؤں میں) غوطہ لگاتے تھے (تاکہ موتی نکال کر دیں) اور وہ اور اور کام بھی اس کے علاوہ کیا کرتے تھے اور
(انبیاء - ۶)	

---

[1] اتقان ج ۲ ص ۱۲۱

وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّرَوَاحُهَا شَهْرٌ وَاَسَلْنَا لَهٗ عَيْنَ الْقِطْرِ وَمِنَ الْجِنِّ مَنْ يَّعْمَلُ بَيْنَ يَدَيْهِ بِاِذْنِ رَبِّهٖ وَمَنْ يَّزِغْ مِنْهُمْ عَنْ اَمْرِنَا نُذِقْهُ مِنْ عَذَابِ السَّعِيْرِ يَعْمَلُوْنَ لَهٗ مَا يَشَآءُ مِنْ مَّحَارِيْبَ وَتَمَاثِيْلَ وَجِفَانٍ كَالْجَوَابِ وَقُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ

(سباء - ۲)

اور ہم نے سلیمان (علیہ السلام) کے لئے ہوا کو مسخر کر دیا کہ اُس کی صبح کی منزل ایک مہینہ بھر کی اور اس کی شام کی منزل ایک مہینہ بھر کی، ہوتی اور ہم نے اُن کے لئے تانبے کا چشمہ بہا دیا، اور جنات ہیں بعضے وہ تھے، جو اُن کے آگے کام کرتے تھے اُن کے رب کے حکم سے اور ... وہ جنات اُن کے لئے وہ چیزیں بناتے تھے جو اُن کو منظور ہوتا، بڑی بڑی عمارتیں اور مورتیں اور لگن جیسے حوض اور دیگیں جو ایک ہی جگہ جمی رہیں اے داؤد کے خاندان والو تم سب شکریہ میں نیک کام کیا کرو، اور میرے بندوں میں شکر گزار تھوڑے ہی ہوتے ہیں

وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ،

(ص - ۳)

اور جنات کو بھی اُن کا تابع کر دیا، یعنی تعمیر بنانے والوں کو بھی اور غوطہ خوروں کو بھی اور دوسرے جنات کو بھی جو زنجیروں میں جکڑے رہتے تھے،

تابع اور متبوع دونوں کے قلب و روح میں کوئی مذہبی اور اخلاقی اثر نہیں پیدا کرتے، بلکہ محض اُن کو منصب نبوت ہی سے کوئی تعلق نہیں ہے، کیونکہ جن و شیاطین کی یہ اطاعت پیغمبرانہ اطاعت نہ تھی، بلکہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے شاہانہ اقتدار کا نتیجہ تھی، اور وہ اُن سے اُسی طرح کام لیتے

جس طرح غزوات میں گرفتار ہونے کے بعد کافر قیدیوں سے لیا جاتا ہے[۵۱]،

البتہ جن وشیاطین حضرت سلیمان علیہ السلام کی جو اطاعت کرتے تھے، وہ اس اطاعت سے مختلف تھی، جو وہ کاہنوں اور جادوگروں کی کرتے تھے، کیونکہ کاہنوں اور جادوگروں کو جن وشیاطین ناجائز کاموں میں مدد دیتے تھے،

لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام اُن سے جائز اور مُباح کام لیتے تھے، اس لئے یہ ایک دنیوی احسان تھا جس پر خدا کا شکر گذار ہونا چاہئے[۵۲]،

غرض معجزہ کی یہ وہ قسم ہے جو شرعاً نہ محمود ہے نہ مذموم، اس سے اگر کوئی جائز فائدہ حاصل ہوجاتا ہے، تو وہ ایک احسان کی صورت اختیار کرلیتا ہے، ورنہ ایک فعل عبث اور تماشا بن جاتا ہے[۵۳]، مثلاً اگر کوئی شخص بلا ضرورت شیر کے اوپر سوار ہوتا ہے، یا پل کے موجود ہوتے ہوئے پانی کے اوپر چلتا ہے، تو یہ ایک فعل عبث اور محض تماشا ہے[۵۴]،

لیکن معجزہ کی ایک قسم اور ہے، جو اُس سے اعلیٰ واشرف ہے، اور وہ صاحب معجزہ اور اسکے پیروؤں کو نیکی اور پرہیزگاری پر آمادہ کرتی ہے،

معجزہ کی یہی قسم منصب نبوت سے براہ راست تعلق رکھتی ہے، اور قرآن مجید اسی قسم کا معجزہ ہے، جناب نے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بھی اطاعت قبول کی تھی، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بھی مطیع ہوئے تھے، لیکن دونوں اطاعتوں کے نتائج مختلف تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کی شاہانہ اطاعت سے ان کو ثروت وخواری کے سوا کچھ نہیں ملا، لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ اطاعت کا جو نتیجہ ہوا اس کو قرآن مجید نے خود انہی کی زبان سے اس طرح بیان کیا ہے،

---

۵۱ کتاب النبوات لابن تیمیۃ، صفحہ ۳۱۱،

۵۲ کتاب المعجزات والکرامات لابن تیمیہ، صفحہ ۲، ۵۳ ایضاً صفحہ ۴، ۵۴ ایضاً صفحہ ۱۲

قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ اَنَّہُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْٓا اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا یَّھْدِیْٓ اِلَی الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِہٖ وَلَنْ نُّشْرِکَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا،

(جن - ۱)

آپ کہئے کہ میرے پاس اس بات کی وحی آئی ہے، کہ جنات میں سے ایک جماعت نے قرآن سُنا، پھر انھوں نے کہا کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سُنا ہے جو راہ راست بتلاتا ہے، تو ہم تو اُس پر ایمان لے آئے، اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک

وَاِذْ صَرَفْنَآ اِلَیْکَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ، فَلَمَّا حَضَرُوْہُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا فَلَمَّا قُضِیَ وَلَّوْا اِلٰی قَوْمِھِمْ مُّنْذِرِیْنَ، قَالُوْا یٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا کِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْہِ یَھْدِیْٓ اِلَی الْحَقِّ وَاِلٰی طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ، یٰقَوْمَنَآ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰہِ وَاٰمِنُوْا بِہٖ یَغْفِرْ لَکُمْ مِّنْ ذُنُوْبِکُمْ وَیُجِرْکُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ،

(احقاف - ۴)

اور جب ہم جنات کی ایک جماعت کو آپ کی طرف لے آئے جو قرآن سنتے تھے، غرض جب وہ لوگ قرآن کے پاس آپہنچے تو کہنے لگے کہ خاموش رہو پھر جب قرآن پڑھا جا چکا تو وہ لوگ اپنی قوم کے پاس خبر پہنچانے کے واسطے واپس گئے، کہنے لگے کہ اے بھائیو! ہم ایک کتاب سن کر آئے ہیں جو موسیٰ کے بعد نازل کی گئی ہے، جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے، حق اور راہ راست کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اے بھائیو! تم اللہ کی طرف بلانے والے کا کہنا مانو اور اس پر ایمان لاؤ، اللہ تعالیٰ تمھارے گناہ

ان دونون اطاعتون کا مقابلہ کرکے علامہ ابن تیمیہ کتاب النبوات مین ایک موقع پر لکھتے ہین کہ جن وانس کے ساتھ ہمارے پیغمبر کا معاملہ حضرت سلیمان علیہ السلام وغیرہ کے معاملہ سے زیادہ مکمل ہے کیونکہ یہ لوگ حضرت سلیمان علیہ السلام کی اطاعت شاہانہ اقتدار کی وجہ سے کرتے تھے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت پیغمبرانہ اطاعت تھی[1] دوسرے موقع پر لکھتے ہین کہ حضرت سلیمان علیہ السلام جنون کو فرمانبردار بنا کر اُن سے جو مباح کام لیتے تھے لیکن ہمارے پیغمبر اُن کو خدا پر ایمان لانے اور اس کی عبادت کرنے کی دعوت دیتے تھے اس لئے آپ کی پیروی کرکے وہ سعادت مند ہوگئے تھے اور یہ پیغمبر کے لئے اور ان کے لئے زیادہ کامل ترین طریقہ ہے[2] لیکن بہت سے معجزے ایسے بھی ہوتے ہین جن کا اثر خود صاحب معجزہ پر بھی پڑتا ہے اور دوسرون پر بھی وہ اثر ڈالتے ہین لیکن باین ہمہ قرآن مجید کے روحانی اثر کے مقابلہ مین اُن کا درجہ بہت کم ہے، علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ خداوند تعالیٰ کے کلمات کی دو قسمین ہین

۱۔ ایک کلمات کونیہ جن مین تمام کائنات داخل ہے، انبیاء کے مادی معجزے ان ہی مین شامل ہین،

۲۔ دوسرے کلمات دینیہ جن مین قرآن، خدا کی شریعت اور اس کے اوامر و نواہی شامل ہین اور پیغمبر کا کام یہ ہے کہ اس کا علم حاصل کرے، اور اس پر عامل ہو جس طرح کلمات کونیہ کے متعلق بندہ کا کام یہ ہے کہ تکوینی امور کا علم حاصل کرے، اور اُن پر اثر ڈالے،

پہلی قسم کے معجزات سے تکوینی امور کا اور دوسری قسم کے معجزات سے شرعی امور کا علم حاصل ہوتا ہے، پہلی قسم کے معجزات مادیات پر اثر کرتے ہین، اور دوسری قسم کے معجزات شریعت پر، اور جس طرح پہلی قسم کے معجزات کا خود صاحب معجزہ پر تو یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ پانی پر چل سکتا ہے ہوا مین اُڑ سکتا ہے، اور آگ کے اندر گھس سکتا ہے، اور دوسرون پر وہ اُن کے ذریعہ سے یہ اثر

---

[1] کتاب النبوات ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۱۰۰

ڈال سکتا ہے کہ ان کو بیمار کرسکتا ہے، اُن کو تندرست بنا سکتا ہے، اُن کو مار ڈال سکتا ہے اور اُن کو محتاج اور دولت مند بنا سکتا ہے، اسی طرح دوسری قسم کے معجزات کا صاحب معجزہ پر یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ خود خدا اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے اور آداب و سنت کا پابند ہو جاتا ہے پھر دوسروں پر وہ یہ اثر ڈالتا ہے کہ اُن کو خدا اور اُس کے رسول کی اطاعت کا حکم دیتا ہے، اور لوگ شرعی حیثیت سے اس کی اطاعت کرنے لگتے ہیں لیکن معجزات کا تعلق جہاں تک علم و قدرت سے ہے، اگر وہ موجود نہ ہوں، تو اس سے کسی مسلمان کو کوئی دینی نقصان نہیں پہنچتا، اگر ایک شخص کو غیبی امور کا علم حاصل نہ ہو اور مادیات اس کے زیر اثر نہ ہوں، تو اس سے خدا کے نزدیک اس کا درجہ کم نہیں ہو سکتا، لیکن اگر کوئی شخص امور دینیہ کا پابند نہ ہو، تو اس سے اس میں ایک ایسا نقص پیدا ہو جائیگا جس سے یا تو وہ عذاب کا مستحق ہوگا یا ثواب سے محروم رہے گا، کیونکہ دین کا علم حاصل کرنا اور اس کی تعلیم اور اس کی پابندی کا حکم دینا ایسی چیز ہے جس سے آدمی کو خدا کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے اور وہ اُس کے ثواب کا مستحق ہوتا ہے، لیکن کائنات کا علم حاصل کرنا اور اس پر اثر ڈالنا، تو اس سے یہ چیزیں اسی وقت حاصل ہوتی ہیں، جب وہ دین میں شامل ہوں ورنہ کبھی کبھی اس سے آدمی گمنگار بھی ہو جاتا ہے[1]

معجزات پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اُن سے پیغمبروں کا دعوائے نبوت ثابت نہیں ہوتا، مثلاً جو شخص دعوائے نبوت کرتا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ میں معاش و معاد کا سیدھا راستہ دکھاتا ہوں لیکن وہ اس کی دلیل یہ پیش کرتا ہے کہ میں لاٹھی کو سانپ بنا سکتا ہوں، تو یہ دلیل گو کتنی ہی عجیب و غریب ہو، لیکن اس کو دعوی کے ساتھ کیا مناسبت ہے؟ اس کا یہ دعوی تو صرف اسی وقت ثابت ہو سکتا ہے، جب وہ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتیں بتائے اور

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۸، ۹،

لوگون کو ان کا پابند بنائے، لیکن یہ اعتراض کلمات کونیہ یعنی مادی معجزات پر ہوتا ہے، کلمات دینیہ یعنی قرآن مجید پر نہین ہوتا، کیونکہ وہ نہایت تفصیل کے ساتھ معاش و معاد کی تمام اصلاحی صورتین بتاتا ہے اور لوگون کو ان کا پابند بناتا ہے، اس لئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوی نبوت کے ساتھ نہایت گہرا ربط و تعلق رکھتا ہے، بلکہ وہی آپ کا دعوی بھی ہے، اور دلیل بھی،

علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہین کہ قرآن مجید جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کر آئے وہی خداوند تعالی کی شریعت اور اس کے دینی کلمات ہین، اور وہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی دلیل بھی ہے، دعوت بھی ہے، اور معجزہ بھی ہے[1]،

بہرحال قرآن مجید ایک معجزۂ ناطق ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی شہادت دیتا ہے وہ زبان قال ہو لیکن اور انبیا کے مادی معجزے صرف زبان حال ہین، زبان قال نہین، وہ پانی کے اوپر چلنے ہوا مین اڑنے اور آگ مین گھسنے کی طاقت تو نہین پیدا کرتا، لیکن نیک کامون پر عمل کرنے کی طاقت پیدا کرتا ہے، جو دین و دنیا دونون مین مفید ہین، مثلاً جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی،

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ	تم لوگ جب تک اپنی محبوب ترین چیزون
(آل عمران - ۱۰)	کو نہ صرف کروگے نیکی کو ہرگز نہین پاسکتے،

تو حضرت ابو طلحہؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور کہا کہ "خدا ہمارا مال مانگتا ہے آپ گواہ رہئے کہ اریحا مین میری جو زمین ہے ہین اس کے نام پر وقف کرتا ہون"، زمانہ جاہلیت مین عرب کی عورتین نہایت بے پروائی کے ساتھ ڈوپٹہ اڑھتی تھین، اس لئے سینہ اور سر وغیرہ کھلا رہتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ	عورتون کو چاہئے کہ اپنے ڈوپٹون کو سینے پر ڈال لین

---

[1] المعجزات والکرامات ص ۱۰،

اس کا یہ اثر ہوا کہ عورتوں نے اپنے تہ بند اور متفرق کپڑوں کو پھاڑ کر دوپٹے بنائے اور اپنے آپ کو سیاہ چادروں سے اس طرح ڈھانپ لیا کہ حضرت عائشہؓ کے قول کے موافق یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن کے سر کوؤں کے آشیانے بن گئے ہیں،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے، تو لوگ ناپ جوکھ میں سخت خیانت کرتے تھے، اس پر سورہ ویل للمطففین نازل ہوئی، اور لوگ دیانت سے کام لینے لگے،

اصحابِ صفہ کی معاش کا بہت کچھ دارومدار انصار کی فیاضی پر تھا، یہ لوگ کھجور کے خوشے لاکر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، اصحابِ صفہ آتے تھے، اور چھڑی سے اُن کو ہلاتے تھے، جو کھجوریں ٹپک پڑتی تھیں اُن کو کھا لیتے تھے، لیکن انصار میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جو سڑے گلے خوشے لاکر لٹکا دیتے تھے اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

یاایھا الذین آمنوا انفقوا من طیبات	مسلمانو! اپنی بہترین کمائی اور بہترین
ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض	پیداوار سے صدقہ دو، بُرے مال کو
ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون،	خیرات نہ کرو،

اس کے بعد دفعۃً اس حالت میں انقلاب پیدا ہوگیا، اور تمام لوگ بہترین کھجوریں لانے لگے،

اسلام کے فرائض و اعمال میں جہاد سب سے خطرناک کام ہے لیکن صحابۂ کرام کو قرآن مجید ہی کے اثر نے جہاد پر آمادہ کیا تھا، اور اسی اثر کی بدولت وہ سخت سے سخت جنگی خطرات میں ثابت قدم رہتے تھے، ایک بار قسطنطنیہ میں رومیوں سے مسلمانوں کا مقابلہ ہوا، رومی بالکل قسطنطنیہ کی دیوار کے متصل صف زن تھے، ایک مسلمان نے جرأت کرکے حملہ شروع کیا، تو لوگ پکارے "ہاں ہاں اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالتے ہو" حضرت ابوایوب انصاریؓ ساتھ تھے، بولے "یہ آیت تو ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جب اسلام نے قوت حاصل کرلی تو ہم لوگ اپنی معاش کے کام

دھندے مین مشغول ہوگئے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی،

وَانفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ (بقرہ-۳۴) اور خدا کی راہ مین خرچ کرو اور اپنی جانون کو ہلاکت مین نہ ڈالو،

اس لئے اصلی ہلاکت یہ ہے کہ ہم معاش کے کاروبار مین مشغول ہو جائین، اور جہاد کو چھوڑ دین، راوی کا بیان ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی، حضرت ابو ایوب انصاری ہمیشہ بصروف جہاد رہے، یہان تک کہ قسطنطنیہ مین وفات پاکر مدفون ہوئے، جنگ یمامہ مین جب حضرت سالمؓ کو علم عطا کیا گیا، تو ایک شخص نے کہا کہ ہم کو آپ کی جان کا خوف ہے، اس لئے جھنڈا دوسرے کے ہاتھ مین دینا چاہتے ہین، بولے تو مین اس حالت مین قرآن مجید کا بہترین حامل ہون گا، چنانچہ انھون نے علم کو داہنے ہاتھ مین لیا، جب وہ کٹ گیا، تو بائین ہاتھ مین لیا، وہ بھی کٹ گیا، تو علم کو سینے سے چمٹا لیا، اور یہ آیت پڑھنے لگے،

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ... وَكَأَيِّن مِّن نَّبِيٍّ قَاتَلَ مَعَهُ رِبِّيُّونَ كَثِيرٌ، (آل عمران-۱۵) محمد صرف ایک پیغمبر ہین .... اور بہت سے پیغمبر گذرے ہین جن کے ساتھ ہو کر بہت سے علماء نے جنگ کی ہے،

(باقی)

رحمتِ عالم

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت. ضخامت .. ۲ صفحے،

قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

مینیجر

اجتماعیت کا قرآنی تصور

از

جناب مولوی حیدر زمان صاحب صدیقی

کائناتِ ہستی فطرت کی عجوبہ زایون اور جدت طرازیون کی آماجگاہ ہے اور اس جہانِ رنگ و بو کی ہر چیز کچھ اس طرح کی حسین و پرکشش واقع ہوئی ہے کہ اس مین نظر حقیقت شناس کو زندگی کی لطیف تر حقیقتین اُبھری اور نکھری ہوئی دکھائی دیتی ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حسن جلوہ طراز اور ایک ہی نور جہان تاب ہی جو پوری کائنات کو اپنے جلو مین لئے ہوئے ہی، سحن گلشن کا حسین منظر ہو، یا نی دور تک صحرا کی تا بحد نظر وسعت، شہری زندگی کی ہنگامہ پرور اور رنگین محفلین ہون، یا دشت وحشت خیز کی خاموش، اور پرسکون خلوتین، صبح حیات کی مسکراہٹین ہون، یا شام زندگی کی وحشتناکیان، آبشارون کا سمع نواز ترنم ہو یا رعد و برق کی خوفناک کڑک، بزم طرب شادی کے نغمہ ہائے مسرت ہون، یا مجلس تعزیت کی دلگداز آہین، یہ سب کچھ دل خود آگاہ و حقیقت شناس کی نظر مین ایک ہی سلسلۂ وجود کی مختلف کڑیان ہین، ایک ہی نور مطلق پر اُن کی انتہا ہوتی ہے،

وفی الارض آیات للموقنین وفی	زمین اور خود تمہارے وجود مین اہل یقین
انفسکم افلا تبصرون،	ایمان کے لئے نشانیان ہین، کیا تم دیکھتے
(الذّاریات)	نہین ہو ؟
ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ	بلاشبہہ اس مین نصیحت و عبرت ہے اس کیلئے

قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ، جو اپنے پہلو مین حساس دل رکھتا ہے،

(ق) یا پوری طرح متوجہ ہو کر کان ... لگاتا ہے،

ارض وسما کی یہ کائنات جو روز مرہ ہمارے مشاہدہ مین آتی ہے، اس کی ہر چیز بظاہر منفرد اور تنہا وجود رکھتی ہے اور اپنے کام اور وظائف طبعی کے لحاظ سے دوسری اشیائے عالم سے بالکل الگ تھلگ محسوس ہوتی ہے مگر پردۂ مجاز کو سامنے سے ہٹا کر حقیقت پر نگاہ ڈالئے تو چشم بینا ایک وسیع تر اور آفاقی نظام کائنات کا مشاہدہ کرتی ہے، اور ہر وجود مشخص دراصل اس کائناتی نظام کا ایک جزو لاینفک ہے، عالم لاہوتی ہو، یا کائنات ناسوتی محفل انجم ہو، یا جہان نباتات ارضی، نظام سحاب و باد و باران ہو، یا سلسلۂ کوہ و بیابان غرض اس عالم کی ہر چیز ہمہ گیر نظام کائنات کی ایک کڑی ہے، یا دنیا کے اس عظیم ترین کارخانہ کا ایک پرزہ ہے جس کا وجود و بقا کارخانہ کے وجود و بقا پر موقوف ہے،

قرآن کریم بار بار عناصر کائنات کی ماہیت اور ان کی اجتماعی تاثیر و افادیت مین غور و فکر کی دعوت دیتا ہے، عالم افلاک، عالم جو سما اور ہمارے جہان رنگ و بو کے اہم عناصر کو ایک ساتھ ذکر کرتا ہے جس سے ان اشیاء کے معنوی اور افادی تعلق و ربط کا اظہار ہوتا ہے، بلکہ بیشتر مقامات مین قرآن خود ہی اشیائے عالم کے باہم افادی تعلقات کو اپنے مخصوص اسلوب بیان مین نوکر کرتا ہے،

اَلَمْ تَرَ اِلٰى رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ	کیا آپ نے اپنے رب کی طرف نہین دیکھا کہ اس
شَآءَ لَجَعَلَهٗ سَاكِنًا ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ	نے سایہ کو کیسے پھیلایا، اگر وہ چاہتا تو اسکو
عَلَيْهِ دَلِيْلًا، ثُمَّ قَبَضْنٰهُ اِلَيْنَا	ٹھہرا دیتا، پھر ہم نے سورج کو اس پر دلیل
قَبْضًا يَّسِيْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ	قرار دیا، پھر آہستگی سے ہم نے اس کو اپنی
الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا وَّجَعَلَ	طرف کھینچ لیا، خدا کی ذات نے تمہارے لئے
النَّهَارَ نُشُوْرًا، وَهُوَ الَّذِيْ اَرْسَلَ	رات کو لباس اور نیند کو راحت بنایا، اور

الرِّيَاحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهِ
وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَاءِ مَاءً طَهُورًا
لِنُحْيِيَ بِهِ بَلْدَةً مَيْتًا وَنُسْقِيَهُ مِمَّا
خَلَقْنَا أَنْعَامًا وَأَنَاسِيَّ كَثِيرًا،

اُسی نے زمین کے اندر پھیل جانے کی غرض
سے دن بنایا، وہی ذات ہے جس نے ہواؤں
کو بھیجا، جو اس کی رحمت کی بشارت دینے والی
ہیں، اور ہم نے آسمان سے پاکیزہ پانی اُتارا،
تاکہ ہم اس کے ذریعہ مردہ بستیوں کو آباد کریں
اور یہ پانی اپنی مخلوق میں سے چارپایوں اور
بہت سے لوگوں کو پلائیں،

(الفرقان - ۵)

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللَّهَ يُزْجِي سَحَابًا ثُمَّ يُؤَلِّفُ
بَيْنَهُ ثُمَّ يَجْعَلُهُ رُكَامًا فَتَرَى الْوَدْقَ
يَخْرُجُ مِنْ خِلَالِهِ وَيُنَزِّلُ مِنَ السَّمَاءِ
مِنْ جِبَالٍ فِيهَا مِنْ بَرَدٍ فَيُصِيبُ بِهِ
مَنْ يَشَاءُ وَيَصْرِفُهُ عَنْ مَنْ يَشَاءُ
يَكَادُ سَنَا بَرْقِهِ يَذْهَبُ بِالْأَبْصَارِ

(النور)

کیا تم نے نہیں دیکھا کہ اللہ تعالیٰ بادلوں
کو چلاتا ہے، پھر اُن کو جمع کرتا ہے پھر اُن کو
تہ بہ تہ رکھتا ہے، پھر تم دیکھتے ہو کہ اُن کے
اندر سے بارش نکلتی ہے، اور پہاڑوں کی
بلندی کی جانب سے برف (جو فضا میں ہوا
سرد سے منجمد ہوتی ہے) اتارتا ہے، پس یہ
برف جس پر چاہتا ہے اُتارتا ہے اور جس سے
چاہتا ہے، پھیر لیتا ہے قریب ہے کہ بجلی (جو بادلوں
کے ٹکراؤ سے پیدا ہوتی ہے) کی چمک آنکھوں کی

عالم ارض و سما کے اس وسیع تر نظام افادہ و اشتراک اور اُس کے حسین و جمیل مناظر میں اہل بینش کے لئے جو چیز وجہ کشش ہے وہ یہ ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز ایک فوق الفطرت طاقت کے زیر اثر اپنی منزل مقصود کی جانب رواں دواں ہے، چاروں طرف نگاہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ ذرہ سے لے کر بڑا

تک، آب جو سے لے کر سمندر تک، زمین کی پستی سے لے کر آسمان کی بلندی تک عالم نباتات سے لے کر حیوانات تک، مہ و انجم تک کائنات کی ہر چیز اطاعت شعاری اور اثر پذیری کا عجیب و غریب مرقع ہے، گویا وہ کیف و مستی کے عالم میں متوالانہ وار آستانۂ دوست کی جانب بڑھ رہی ہے،

وابرح مایکون الشوق یوما

اذا دنت الخیام من الخیام

غلط کار لوگوں نے اسلام کو بس اتنا ہی سمجھ رکھا ہے کہ وہ چند آداب و مراسم کا مجموعہ ہے، یا دوسرے مذاہب کی طرح کا ایک مذہب ہے، جو صرف چند اخلاقی اصول و قوانین ہی کی پونجی اپنے پاس رکھتا ہے اور عصر حاضر کے کچھ حواس باختہ اور خود ساختہ مفسرین اسلام کو نازی ازم اور فیسی ازم کی طرح کا ایک خالص قوم پرستانہ نظام سیاست، اور قرآن کو محض سیاسی دستور اور بین الملی قوانین (انٹرنیشنل لاز) کا منشور تصور کرتے ہیں، لیکن قرآن حکیم کا دعویٰ یہ ہے کہ اسلام پوری کائنات کا مذہب ہے، ایک ہمہ گیر اور آفاقی نظام اطاعت ہے کائناتی دستور حیات ہے اور عالم کون و مکان کا کوئی گوشہ اس کے تصرف سے باہر نہیں ہے،

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم	کیا وہ اللہ کے دین کو چھوڑ کر
من فی السمٰوٰت والارض طوعا	دوسرا دین اختیار کرتے ہیں؟ حالانکہ آسمان
وکرھا والیہ یرجعون،	اور زمین کی تمام چیزیں صرف اللہ کی اطاعت
(آل عمران)	گذار ہیں، اور ان کو بالآخر اسی کی طرف

دراصل اسی نظام اطاعت اور سرشتۂ اجتماعیت سے اس عالم کا بناؤ سنگار اور حسن بہار آفرین قائم ہے، بلکہ سرے سے اس کا وجود و بقا ہی اس کا رہین احسان ہے، اور جو چیز اس آفاقی نظام سے کٹ جاتی ہے اس کا انجام بہر حال خسران و نامرادی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے،

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن	جو اسلام کو چھوڑ کر کسی دوسرے دین کو تلاش

يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين، (آل عمران)

کرے گا تو وہ بارگاہ خداوندی میں ہرگز قبول نہ ہوگا، اور انجام کار وہ نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا،

بلکہ ایسی چیز کے لئے آغوش عدم کے سوا کوئی جگہ ہی نہیں ہے، درخت کا پتہ جب تک اپنے نباتاتی نظام سے وابستہ ہے، اس وقت تک وہ اپنے خوبصورت وجود کو قائم رکھ سکتا ہے، لیکن جونہی وہ اس نظام سے کٹا پاؤں کی رگڑ سے ذرہائے خاک میں تحلیل ہوا، یا ہوائے تند و تیز اس کو اڑا کر کہیں سے کہیں لے گئی، دریا کی طوفانی موج اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے لیکن کب تک؟ جب تک کہ وہ اپنے مرکز وجود سے ملک حاصل کر رہی ہے لیکن اس سے کٹ کر وہ اپنے وجود ہی کو باقی نہیں رکھ سکتی،

غرض اسلام اپنے وسیع تر مفہوم کے اعتبار سے پوری کائنات کا ضابطہ و دستور اور نظام اطاعت ہے اور کائنات کی ہر چیز اس نظام کے زیر اثر جہان کی تعمیر اور ممکنات حیات کو اجاگر کرنے میں مصروف کار ہے،

خلافت آدم کا مفہوم | نوع انسانی اسی عظیم انسان کارخانہ قدرت کا ایک فعال اور موثر عنصر ہے، عالم امکان کے پے بہ پے ہنگامے ایجاد و تخلیق کی نو بہ نو حسن آفرینیاں اور جہان رنگ و بو کے رنگا رنگ نقش و نگار انسان ہی کے وجود موثر کے حیرت زا کرشمے ہیں، اگر اور سب کچھ ہوتا اور انسان نہ ہوتا تو نہ جانے یہ دنیا کس طرح کی بے ڈھنگی اور وحشت انگیز ہوتی، آخر یہ حضرت انسان ہی تو ہیں جس کی پیدائش پر دیار عشق میں ہنگامہ و شور اٹھا، جہان حسن میں تہلکہ بپا ہوا، اور فطرت نے ممکنات وجود کی تمام راہیں اس کے لئے وا کر دیں،

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد — حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاک جہان مجبور — خود گرے خود شکنے خود نگرے پیدا شد

یہ سچ ہے کہ عالم وجود کی زیب و زینت اور سوز و ساز انسان ہی کے دم سے ہے لیکن خود انسان کیا ہے اور عالم امکان میں اسکا مقام موقف کیا ہے؟ یہی وہ اہم مسئلہ ہے جس کے حل ہو جانے سے انسانی تصور اجتماع

کی حقیقت خود بخود ہی آشکاف ہو کر سامنے آجائے گی،

قادر مطلق نے جب کائنات کو پیدا کیا، تو ایک ایسی ہستی کا پیدا کرنا بھی ضروری ہوا جو اپنی طبعی اور فطری قوت تخلیق سے انواع کائنات میں تصرف کر سکے، اس کا آہنی عزم ویرانوں کو آباد کرے، دیاؤں سے نہریں نکال کر خشک زمینوں کو شاداب کرے، سورج کی تمازت سے دہکتے ہوئے دشت وصحرا کو کشت گل ولالہ میں تبدیل کرے، خوش منظر اور بارونق شہروں کی بنا ڈالے اور اس کا علمی وتحقیقی جوہر اشیاء کی صلاحیتوں کو اجاگر کرے، موالید وعناصر کی مدد سے نئے نئے اکتشافات کو منظر عام پر لائے، سمندر کی تلاطم خیز موجوں کو مسخر کرے، ہوا پر اپنا تسلط جمائے، یہاں تک کہ ارض وسما کی ناپائدار کنارو ستیں اسکے زیر نگیں ہو جائیں اور وہ اپنے علم وعمل سے کائنات پر حکمرانی کرے، اسرار فطرت کی آگہی کیساتھ عالم وجود کی ہر شے کو منشائے قدرت کے مطابق کام میں لائے اور اس میں کوئی ایسا تصرف نہ کرے جو نظم کائنات کے فساد واختلال کا باعث ہو، بلکہ وہ ایسا تصرف کرے جس سے کائنات کے حسن ذاتی میں پہلے سے زیادہ چمک دمک پیدا ہو اور کوہ وبیابان اس کی بہار آفرینیوں سے مہک اٹھیں،

حاصل یہ ہے کہ خلاق عالم نے اس کائنات کو ایک خاص مقصد کے تحت پیدا کیا ہے، اور اس کے ارتقاء کے لئے کچھ قوانین طبعی بنا دیئے ہیں، تاکہ ان کے زیر اثر کائنات کی مختلف انواع اپنے نوعی وجود وتشخص کی حفاظت وصیانت میں مصروف کار ہیں، لیکن ان انواع کی ترکیب سے کارخانہ فطرت میں حسن ودلکشی پیدا کرنے، ان کو خلاق عالم کے منشاء کے مطابق وسعت عطا کرنے اور زیادہ سے زیادہ منفعت بخش بنانے کے لئے ایک باشعور اور صاحب ارادہ ہستی کی ضرورت تھی، اور اس مقصد کے لئے خداوند عالم نے انسانوں کو پیدا کیا،

تو شب آفریدی چراغ آفریدم — سفال آفریدی ایاغ آفریدم
بیابان وکہسار وراغ آفریدی — خیابان وگلزار وباغ آفریدم

من آنم کہ از سنگ آئینہ سازم من آنم کہ از زہر نوشینہ سازم (اقبالؒ)

اس لئے انسان کا نصب العین حیات صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اسرار فطرت کی ٹوہ لگائے اور حقائق کائنات کی جستجو میں اپنی علمی اور عملی قوتیں صرف کرے، بلکہ اس کا مقصد وجود یہ ہے کہ وہ اسرار فطرت کی دریافت اور حقائق اشیاء کے انکشاف سے، اپنے لئے ایک ایسی راہ پیدا کرے جس سے اشیائے عالم اور قوانین فطرت میں زیادہ سے زیادہ ہم آہنگی پیدا ہو۔ اور خالق عالم کے زیر اثر اپنے علم و عمل کے کارنامے انجام دے۔ اطاعت احکام کے معنی یہ ہوئے کہ خدا نے قرآن میں انسان کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے شعور و ارادہ کو استعمال کرکے علم و عمل سے کام لیتا ہوا فطرت کے [illegible] بہیئت مجموعی طور پر یہ حق مطلق انسان کو حاصل ہے کسی خاص گروہ یا فرد سے مخصوص نہیں ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ کسی وقت کے اس کارخانہ میں حق یونہی مفت [illegible] کے لئے [illegible] کی ضرورت ہوا کرتی ہے، اس کو وہ کام میں نہیں لاتے بالکل یہی حال خلافت کا ہے کہ اس منصب کو حاصل کرنے کی راہیں تمام انسانوں کے لئے یکساں وا کر دی گئی ہیں لیکن اس کو علم و عمل کی صلاحیتوں سے مشروط کر دیا گیا ہے، چنانچہ قرآن حکیم نے ایک جگہ ذکر خلافت کے بعد علم کا ذکر کیا ہے،

وَعَلَّمَ آدَمَ الْأَسْمَاءَ كُلَّهَا، خدا نے آدم کو حقائق اشیاء کا علم

(بقرہ) عطا کیا،

اور ایک دوسرے مقام پر خلافت کو عمل سے مشروط کیا گیا ہے،

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ	پھر ہم نے دوسری قوموں کے بعد تم کو زمین
مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ	میں خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تم کیسے عمل
(سورۂ یونس)	کرتے ہو

زمانہ حال کے خود ساختہ شارحین اسلام کے نزدیک خلافت، حکومت و اقتدار کی ہم معنی ہے اور وہ ہر جگہ خلافت کا یہی مفہوم لیتے ہیں لیکن یہ اُن کی تنگ نظری ہے، خلافت دراصل ایک اعلیٰ و برتر مقام بندگی ہے، شرفِ انسانیت کی معراج ہے، علم و عمل اور فضائل اخلاق کی وہ پاکیزہ ترمنزل ہے، جو عصرِ حاضر کے کوتاہ نظر اور ہوا پرست انسان کے تصور میں بھی نہیں آسکتی، ؎

با تو چہ گویم کہ تو مجنون نئی!

یعنی خلافت آدم کا حقیقی مفہوم یہ ہے کہ انسان کو ابتداے آفرینش سے یہ قوت عطا ہوئی ہے کہ وہ خدائی صفاتِ کمال کا مظہرِ اتم بن کر کائناتِ ارض کا نظم و نسق اپنے ہاتھ میں لے لے اور زندگی کے پورے کاروبار کو منشاے خداوندی کے مطابق چلائے،

نائبِ حق در جہان بودن خوش است	بر عناصر حکمران بودن خوش است
نائبِ حق بچو جانِ عالم است	ہستی او ظلِّ اسمِ اعظم است
از رموزِ خود کل آگاہ بود	در جہان قائم بامر اللہ بود
ذاتِ او توجیہ ذاتِ عالم است	از جلالِ اُو نجاتِ عالم است

زندگی را می کند تفسیر نو

می دہد این خواب را تعبیر نو

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ نیابت کے معنی اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ نائب فرائض مفوضہ کو اس طرح

انجام دے جس طرح اُس کے منسوب عنہ نے اس کو ہدایت کی ہے، اور اس ہدایت نامہ سے سرمو انحراف نہ کرے، اگر وہ اس سے انحراف کرتا ہو تو وہ اصولاً اپنے منصب نیابت کا اہل نہیں رہتا، کیونکہ یہ حق مشروط ہے اور انتفاء شرط انتفاء مشروط کو مستلزم ہے،

لہٰذا خلافت دراصل حکومت و اقتدار کی ہم معنی نہیں ہے، البتہ حکومت و اقتدار کو مستلزم ہے لیکن حکومت و اقتدار خلافت کو مستلزم نہیں ہے یعنی جس گروہ انسانی کو منصب خلافت عطا ہوگا، حکومت و اقتدار کی مسند بھی اُسے حاصل ہوگی لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جس قوم کو حکومتی اقتدار حاصل ہو، وہ منصب خلافت سے بھی سرفراز ہو، گویا خلافت ایک عظیم القدر مقام حریت ہے، جو اس عالم رنگ و بو میں نہیں سما سکتا، بلکہ وہ سپہر نیلگوں اور جہان انفس و آفاق کو محیط ہے،

نکتہ ہا گویمت روشن چو دُر تا شناسی امتیاز عبد و حر

عبد گردد یا وہ در قید و نہار در دلِ حُر یا وہ گردد روزگار (اقبال)

آج اہل مغرب میں بہت کم سہی لیکن کچھ لوگ اس رمز سے آشنا ہو چکے ہیں کہ سیاست و اجتماع، حکومت و اقتدار کی بنیادیں جب تک ہمہ گیر انسانی بلکہ کائناتی قدروں پر نہ اٹھائی جائیں گی، عالم انسانیت کو امن و فراغت کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہو سکتا، چنانچہ پروفیسر چوڈ اور یہودی النسل فلسفی اسکوٹ سموئل اور دیگر کئی علماء و مفکرین نے بار بار اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ زندگی کے دوامی اور متقل عقائد و افکار ہی انسانی زندگی کو صحیح راہ پر ڈال سکتے ہیں، اور اس طرح اس مادی زندگی میں ایک خوشگوار اور پُرامن انقلاب رونما ہو سکتا ہے لیکن جس حقیقت کو ہم خلافت کی مقدس اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں، دراصل اسی طرح کے عالمی، آفاقی اور ہمہ گیر تصورات پر مبنی ہے، اور خلافت کا حقیقی منصب یہ ہے کہ اس کی نظر میں کسی ایک انسانی طبقہ یا کسی ایک خطہ ارضی کی فلاح و بہبود اور اصلاح و تعمیر کوئی نہیں ہے، بلکہ وہ ہر انسان اور ہر ملک کی فلاح چاہتی ہے، جہاں بھی اس کو بگاڑ نظر آتا ہے،

اس کو سنوارتی ہے، جہاں فساد کا ظہور ہوتا ہے اسکی اصلاح کرتی ہے، جہاں ظلم و قہر سے انسانیت مغلوب ہوتی ہے، وہاں اس کا دامن عدل و انصاف سے بھر جاتا ہے، اور جہاں فسق و معصیت کی وبا پھوٹتی ہے وہاں وہ تقویٰ و صلاح کا تریاق مہیا کرتی ہے غرض خلافت کیا ہے؟ سراپا برکت و خیر، سراسر عدل و انصاف اور یہ ہمہ جود و اصلاح و تعمیر کی پیامبر

اجتماع انسانی کا قرآنی تصور ان تصریحات کے بعد ہم اصل مقصد کی طرف آتے ہیں، کہ انسانی اجتماعیت کا حقیقی مؤسس کیا ہے، اور یہ کس طرح کے فکری عناصر سے ترکیب پاتی ہے؟ دراصل قرآن عزیز کے نزدیک مجتمع انسانی کی فکری اساس کائنات کے وہی ہمہ گیر اور غیر متزلزل قوانین ہیں، جو انسان کے علاوہ جہان ارض و سما میں ہر لمحہ جاری و ساری ہیں، اس لئے یہ اصول اجتماعیت ازلی و ابدی ہیں لیکن اُن کی خارجی اور عملی تشکیلیں کی ابتدا حضرت آدم کی پیدائش سے ہوتی ہے، جب کہ اُن کو پیدا کرنے کے بعد منصب خلافت سے نوازا گیا یعنی حضرت آدم کو خلافت کا جلیل القدر منصب عطا ہوا، سلسلہ اجتماعیت کی پہلی کڑی ہے اور خلافت کا مفہوم ہی اس خاص نوعیت کے تصور اجتماع کی نشان دہی کر رہا ہے، کیونکہ خلافت کا لفظ انسانوں کی سیاسی و تمدنی اور اجتماعی ہیئت و ذات پر دلالت کرتا ہے [illegible] پہلے پہل انسان میں اجتماعیت کی شعور ہی موجود نہ تھا اور وہ پیدا ہونے کے بعد رفتہ رفتہ اس شعور کو کھو کر گذارا کرتا تھا، قرآن حکیم جو اس کائنات میں آخری صحیفہ فطرت ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ انسان اول ہی کو اجتماعیت کے بنیادی اصول بتائے گئے تھے، اور پھر تاریخ کے ہر دور میں ان ہمہ گیر اصول اجتماع میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی، اور ان کی خارجی تشکیلات بڑھتی پھلتی اور بدلتی رہی ہیں،

غرض قرآن حکیم کے نزدیک وحدت انسانیت یا اجتماعیت کی اساس ایک ایسا پاکیزہ اور مقدس اخلاقی نصب العین ہے، جو راہی الیعین سے وراء الورٰی ہے، اور وہ اس تصور و اجتماع کی بنیادوں پر انسانی سوسائٹی کی تعمیر کرنا چاہتا ہے، اور یہی وہ تصور حیات ہے جس سے انسان کو پہلے دن ہی آگاہ

کر دیا گیا تھا لیکن جہاں تک کہ مادی نظریہ ہائے اجتماع کا تعلق ہے، وہ انسانوں کی عقل خود بین کی جدت کوشیوں اور حفاظ پرستیوں کی پیداوار ہیں، اور سراسر غیر فطری ہیں لیکن سطور بالا میں جس تصور اجتماع کا ذکر ہوا ہے وہ دینی تصور اجتماع ہے، اور اسکی اساس عالمگیر اور محیط کل اصول حیات ہیں جو کسی مخصوص نسل و قبیلہ یا قوم و وطن سے اختصاص نہیں رکھتے اور اس کے برعکس انسانی تصورات اجتماع قبیلہ و نسب اور قوم و وطن کی حد بندی پر مبنی ہیں اور نسل انسانی کو بے شمار چھوٹے چھوٹے نسلی طبقوں اور وطنی قومیتوں میں تقسیم کرنیوالے ہیں۔

یہ بات ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اجتماعیت کا احساس انسان کا طبعی اور نفسیاتی احساس ہے، اور کارگہ عالم میں انسان کو زندگی کے مرحلہ اول پر ہی اس سے دوچار ہونا پڑتا ہے یعنی جب وہ شکم مادر سے باہر آتا ہے، تو اسی وقت سے اجتماعیت کا جذبہ اپنا کام شروع کر دیتا ہے، اور پھر وہ جس قدر نشو و نما کے مرحلے طے کرتا چلا جاتا ہے، اسی قدر اس کے علائق میں توسیع ہوتی چلی جاتی ہے، یہاں تک کہ وہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے آپ کو ایک وسیع تر حلقہ علائق میں جکڑا ہوا پاتا ہے، اور یہاں پہنچکر اس کو گرد و پیش کے اجتماعی [illegible] تصورات سے سابقہ پڑتا ہے، اور وہ یا تو ایک گیر رشتہ اخوت دینی میں منسلک ہو جاتا ہے یا وہ محدود اور سطحی علائق کے تنگ دائرہ میں سمٹ کر رہ جاتا ہے،

انسانوں کے بنائے ہوئے تصور اجتماع کو مختلف ارتقائی مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، چنانچہ پہلے پہل انسان نے دینی تصور اجتماع کے علی الرغم قبیلہ و نسب کو اجتماعی تعلقات کا محور قرار دیا، اور رفتہ رفتہ تعلقات میں وسعت پیدا ہوتی گئی، اور پھر انسان نے وطن اور وطنی قومیت (نیشنلزم) کو اپنا منتہائے مقصود بنا لیا، اور یہاں پہنچ کر اس کی حرکت رک گئی ہے اور آج وطنی قومیت نے اُس کے دل و دماغ پر اس طرح تسلط جما لیا ہے، کہ اس کی نظر میں انسانیت کا مقدس رشتہ کوئی حقیقت ہی نہیں رکھتا، ایک قوم دوسری قوم پر درندوں کی طرح پل پڑتی ہے، اس کے گوشت سے شکم پُر کرتی، اُس کی ہڈیوں سے اپنے مستقبل کی بظاہر شاندار عمارت تعمیر کرتی اور اُس کے خون سے اس عمارت کے گل بوٹے اور نقش و نگار بناتی ہے، غرض اس تباہ

کے ہاتھوں آج انسانیت بستر مرگ پر کراہ رہی ہے،

فکر انسان بت پرستے بت گرے ہر زمان در جستجوے پیکرے
باز طرح آذری انداخت است تازہ تر پروردگارے ساخت است
کاید از خون ریختن اندر طرب نام او رنگ است و ہم ملک و نسب
آدمیت کشتہ شد چون گوسفند پیش پائے این بت نا ارجمند

مغرب کی نشاۃ ثانیہ نے جب مذہب کے خلاف محاذ قائم کیا، اور مذہب کو ہمیشہ کے لئے خارج البلد قرار دے دیا، تو یہ ناگزیر ہوا کہ اس خلا کو کسی دوسرے تصور زندگی سے پُر کیا جائے، یعنی کوئی ایسا تصور زندگی ڈھونڈھ نکالا جائے، جو قوم کے سیاسی اور معاشی ارتقار کے لئے ایک قوی تر اور مضبوط تر محرک کا کام دے سکے لیکن اس کا انسانی ذہن گرد و پیش کے جن مخصوص طبعی حالات سے گذر رہا تھا، اُن کے تفاعل نے انسان کو تہذیب حاضر کے نو تراشیدہ بت (ملک و وطن) کے آگے سرنگوں کر دیا، یہ زمانہ اٹھارویں صدی کے اوائل کا زمانہ تھا، جب کہ وطنیت ایک سیاسی عقیدہ اور مستقل تصور مملکت کی حیثیت سے منظر ظہور پر آئی، اور اُس نے ماضی کے تمام اجتماعی تصورات کو کالعدم قرار دیا، اس وقت سے آج تک وطنیت کا زہرناک تصور اقوام حاضرہ کی سیاست و معیشت کی روح رواں ہے اور وطنی قومیتوں کی سرفرازی کا مضبوط محرک بنا ہوا ہے، لیکن اس کے ساتھ اُس نے انسانی قدروں کو جس طرح رسوا کیا ہے، اس کی چند مثالیں گذشتہ عالمگیر جنگوں اور تقسیم ہند کے بعد کی وحشتناکیوں میں دیکھی جا سکتی ہیں،

دراصل وطن سے انسان کو ایک نسبت ہوتی ہے اور وہ نفسیاتی طور پر اُس سے محبت کرتا ہے اسکے ریگ زاروں، بیابانوں، کہساروں، دریاؤں اور چمنستانوں میں اس کے لئے ایک مخصوص کشش ہوتی ہے، لیکن انسان کی پاکیزہ اور آزاد فطرت اس بات سے ابا کرتی ہے کہ وہ زمین کے کسی خطہ کو جو خاص اس کی رہائش اور تمتع کے لئے بنایا گیا ہے، اپنا کعبۂ مقصود بنالے، آخر انسان کو اسی لئے تو نہیں پیدا کیا گیا کہ وہ

بتیون مین اپنے آپ کو گم کردے ؟ حضرت اقبال نے اس ضمن مین کیا خوب نکتہ بیان کیا ہے

با وطن اہل وطن را فتنہ است	زانکہ از خاکش طلوع ملت است
اندرین نسبت اگر داری نظر	نکتہ بین تر مو باریک تر
گرچہ از مشرق برآید آفتاب	با تجلیہاے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوز درون	تا ز قید شرق و غرب آید برون
برد مد از مشرق خود جلوہ مست	تا ہمہ آفاق را آرد بدست

فطرتش از مشرق و مغرب بری است

گرچہ او را در زر وے نسبت خاوری است

جدید تصور اس نئی وطنی شریعت مین قوم اور مملکت ایک ہی معنون کے دو عنوان ہین یعنی ملک مین بسنے والے انسان ایک سیاسی وحدت کی صورت اختیار کرلیتے ہین، تو اُن کی اس ہیئت مملکت کا نام دیا جاتا ہے، اور دوسری حیثیت سے اسی کو قوم (نیشن) بھی کہا جاتا ہے گویا ہو یا قوم اس کا بنیادی اور حقیقی محرک وجود وطنیت کا تصور ہے، اور عہد حاضر مین افراد انسانی شتراک و تعاون کی بہترین صورت یہ ہے کہ قومیت اور اسٹیٹ کا مصداق الگ الگ نہ ہو، ملک کے رہنے والے لوگ خواہ عقیدہ و مسلک کے لحاظ سے کتنے ہی گروہون مین بٹے ہوے ہون لحاظ سے کہ وہ ایک آزاد خطہ زمین مین اپنی جداگانہ سیاسی تنظیم رکھتے ہین، اُن کی اس ہیئت اجتماعیہ مملکت (اسٹیٹ) سے موسوم کیا جاتا ہے، اور چونکہ ان مین اتحاد وطن کا رشتہ موجود ہے، اس لئے قل اور جداگانہ قوم ہین، رہا عقیدہ اور مسلک کا معاملہ تو وہ ان کی پرائیوٹ زندگی سے تعلق رکھتا ن کی قومیت پر قطعاً اثر انداز نہین ہوتا، گویا مملکت کا جدید تصور مذہب اور اخلاق کو نہ صرف ثانوی ہے بلکہ انسانون کی اجتماعی زندگی کے ہنگامون سے دور اور گھر کی چار دیواری یا عبادت گاہون

میں محدود رکھنا چاہتا ہے، وہاں تک ریاست و مملکت کا تعلق ہے، وہ ایک با اقتدار اور معصوم سیاسی ادارہ ہے جو اخلاقی قدروں کی پابندی سے آزاد ہے اور اخلاقی قدروں کی پابندی اس کے لئے ضروری نہیں ہے، اس کو ان کی خلاف ورزی کی ضرورت پیش آئی ہے، بلکہ وہ خود ایک قدر ہے اور ایک ایسی چیز کہ جو چیز بھی اس کے مقابلہ میں آئے وہ مغلوب اور جس کو وہ مٹا دے وہ خطا ہے،

یہ ریاست اور دین کی تفریق جدید تصور تو بہت بعد کی پیداوار ہے، لیکن اس کی بنیاد بہت پہلے سے پڑ چکی تھی، [illegible] نے اس کو باقاعدہ فلسفیانہ شکل دی، اس نے ریاست کو اس شکنجہ سے آزاد کیا، اور بالکل ایک نئے تصور مملکت کی طرح ڈالی، جس میں اقتدار اعلیٰ کا تصور، مملکت کا عروج و اقتدار اور اس کی خوشحالی ہے، اس راہ میں جو چیز بھی حائل ہو اس کو مٹا دینا چاہئے خواہ وہ مذہب و اخلاق ہی کیوں نہ ہو، یہاں اگر مذہب و اخلاق سے مملکت کی [illegible] کے حصول میں مدد ملتی ہو تو محض اس غرض کے لئے [illegible] ایک فریب کار انہ نقطۂ نظر اور سیاسی حکمت عملی (پولیٹیکل سٹنٹ) کے طور پر ہی ہونا چاہئے، وہ مقصد بالذات مملکت ہی کو تصور کیا جائے، بلکہ اس کے نزدیک سیاسی مقصد کے حصول کے لئے بہت سے بڑے بڑے اخلاقی جرائم بھی بہت ثواب ہے، جب کہ اس سے مملکت کو کوئی طرح کا فائدہ پہنچ سکتا ہو اور جہاں کسی اخلاقی مقصد کی خاطر مملکت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، وہاں یہ اخلاقی مقصد اس کے نزدیک ناقابل معافی گناہ ہے،

مغرب کی تاریک فضا میں جب یہ نئی آواز گونجی تو جو لوگ اہل کلیسا کی کارستانیوں غرض پرستیوں اور اوہام طرازیوں سے سخت نالاں تھے، اور کلیسا و شاہی کے باہمی تصادم سے خطرناک ذہنی کشمکش میں مبتلا تھے، انھوں نے میکیاولی کے اس نئے دین کو بہت آسانی سے قبول کر لیا، بالخصوص وقت کے بادشاہوں نے اس سے جی بھر کر فائدہ اٹھایا، اور کلیسا کا رہا سہا اقتدار بھی ختم ہونے لگا، مگر کچھ زیادہ عرصہ نہ گذرنے

پایا تھا کہ مطلق العنان حکمرانوں کے مظالم کا ردِ عمل عوامی طبقوں کی ذہنی بیداری اور سیاسی شعور کی صورت میں نمودار ہوا، اور اب مغرب کے انقلاب پسندوں نے ایک جدید سیاسی جمہوری اور صنعتی انقلاب بپا کرنے کی ٹھان لی، بیشتر مغربی ممالک میں انقلابی تحریکیں اٹھیں، ہنگامے بپا ہوئے، اور عوامی طبقوں اور حکمرانوں میں شدید تصادم رونما ہوا، بالآخر عوامی طاقت کے آگے مطلق العنان حکمرانوں کو سرنگوں ہونا پڑا، اور انھوں نے پٹ کر مسند اقتدار عوام کے حوالے کر دی، یہ دور اہلِ مغرب کی نشاۃ ثانیہ کا تابناک اور انقلاب انگیز دور تصور کیا گیا ہے، جب کہ مغرب میں جمہوری اور پارلیمانی طرز کی حکومتیں قائم ہوئیں، اور قدیم مملکتی اور سیاسی تصورات کی جگہ نئے نئے سیاسی اور معاشی نظریوں (تھیوریز) نے جنم لیا، چنانچہ وطنی قومیت اور مملکت کا جدید تصور اسی عہد کی پیداوار ہے، مگر اس انقلاب نے اہلِ مغرب کو جو کچھ دیا، وہ اتنا ہی ہے کہ انھوں نے ملک و وطن کی بنیادوں پر جدید فلسفۂ اجتماع (سوشل فلاسفی) کی داغ بیل ڈالی، اور اس طرح ہمہ گیر رشتۂ اخوتِ انسانی کو تار تار کر کے رکھ دیا، چنانچہ اب وطن ہی ان کا دین و ایمان بن گیا، اور اُن کے جینے مرنے صلح و جنگ اور تمام اعمالِ زندگی کا یہی آخری مقصد پایا،

یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد　　زیر گردون رسم لادینی نہاد

یعنی جہاں تک مذہب و اخلاق کا تعلق ہے، اس میں میکیاولی کا تصور ہی کارفرما تھا، چنانچہ عہد جدید کے یورپ میں جو علما، و مفکرین پیدا ہوئے، ان میں سے بیشتر حضرات نے اس لادینی تصورِ مملکت کو سراہا، بلکہ اُن کے جدید نظریوں نے اس کو اور زیادہ تقویت دی، اور اصولِ انسانیت کا احترام پہلے سے بھی کم ہوتا گیا، چنانچہ جرمنی کا مایۂ ناز فلسفی ہیگل مملکت کا اتنا دلدادہ تھا، کہ اُس نے اسٹیٹ کو ایک مقدس اور معصوم سیاسی ادارہ قرار دیا، یعنی اس نے اس بات کو تسلیم کیا کہ ریاست ہر چیز سے بالاتر ہے، یہاں تک کہ مذہب پر بھی حاوی ہے، اور اخلاق کے لئے ماخذ و منبع ہے، گویا مملکت کسی چیز کی تابع نہیں، بلکہ دیگر تمام چیزیں مملکت کی تابع ہیں،

ہیگل کے تصورِ مملکت نے مذہب، اخلاق کی روحانی برتری پر چوٹ لگائی تھی، وہی کیا کم تھی کہ ڈارون کے نظریۂ کائنات نے اس کے جدِ نیم جان پر ایسی ضرب رسید کی کہ مغرب میں مذہب و خدا کا تصور محض عجوبۂ روزگار یا دگار بن کے رہ گیا، اور اس کے بعد اس جدید مملکتی تصور نے ہمہ گیر نوعیت اختیار کر لی، چنانچہ کارل مارکس اور انجلز نے جو دنیائے جدید کے خالق مانے جاتے ہیں، ہیگل اور ڈارون کے نظریات (تھیوریز) کی بنیادوں پر ہی اشتراکی فلسفۂ اجتماع کی عمارت کھڑی کی یعنی مارکس کا نظریۂ تاریخ دراصل ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کا غماز ہے، اور اس کا نظریۂ مادی جدلیت درحقیقت ہیگل کی جدلیت ہی کی مسخ شدہ صورت ہے لیکن تعجب ہے کہ جس شخص نے تمام مترددسروں کے دماغی کارناموں سے استفادہ کر کے ایک عجیب و غریب فلسفۂ زندگی مرتب کر ڈالا، آج اس کو دنیائے انسانیت کا خدا تصور کیا جا رہا ہے، اور یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ غریب تو خود دوسروں کے آستانۂ علم و دانش کا بھکاری ہے!

بہرحال فلسفۂ اشتراکیت کا ذہنی پس منظر بھی وہی ہے جس کی ابتداء سولہویں صدی میں ہوئی تھی لیکن اس نے اشتراکی سوسائٹی اور مملکت کی عظمت و تقدس کو اور بھی چار چاند لگا دیئے اور تصورِ مذہب کو اشتراکی مملکت سے ہمیشہ کے لئے جلاوطن کر دیا، چنانچہ کارل مارکس کے نزدیک مذہب و خدا کا تصور محض ایک فریب ہے، سرمایہ دارانہ ذہن کی اُپج ہے جس کو عوامی طبقوں کی دولت و عزت کا شکار کرنے کے لئے بطور تھپکنے کے استعمال کیا جاتا رہا ہے، اور اخلاق اس کے نزدیک کوئی مستقل بالذات حیثیت نہیں رکھتے، بلکہ ہر لحہ بدلنے والی چیز ہے خیر و شر اور صواب و خطا کا معیار اُن کے نزدیک یہ ہے کہ جو چیز اشتراکی ریاست و سوسائٹی کی فلاح و تعمیر پر منتج ہو، وہ خیر اور صواب ہے، اور جو اسکی تخریب و فساد پر منتج ہو وہ شر اور خطا ہے،

لینن کہتا ہے کہ ہماری سوسائٹی کسی ایسے نظامِ اخلاق کو نہیں مانتی جو معاشرہ سے باہر کسی فوق الفطرت طاقت کا بنایا ہوا ہو، اشتراکیت کے نزدیک ایسا نظامِ فکر و اخلاق سراسر فریب ہے،

نیز وہ کہتا ہے کہ قدیم اجتماعی نظام کے استیصال اور محنت کش طبقوں کی تنظیم کی راہ میں ہر چیز اخلاقاً درست ہے، ہم جب سرمایہ دار سے لڑیں گے، تو اس جنگ میں جھوٹ اور مکر و فریب کے ہتھیار استعمال کرنا ضروری ہیں،

غرض زمانۂ حال کا جدید تصور مملکت اور نظریۂ اجتماع جن فکری عناصر سے ترکیب پاتا ہے، ان کے سرسری تجزیہ سے آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اقوام حاضرہ آج جس راستہ پر گامزن ہیں، وہ اُن کو خلش و اضطراب اور ہلاکت و بربادی کے اُس اتھاہ سمندر کی پہنایوں کی طرف لئے جا رہا ہے، جہاں سے اُن کے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے،

خود ہی انصاف کیجئے کہ جہاں ہمہ گیر اصول انسانیت اور آفاق گیر اقدار حیات کو اوہام و خرافات تصور کیا جاتا ہو، جہاں احترام آدمیت کا معصوم جذبہ قطعی ناپید ہو، جہاں ملک و وطن کے بُت کو خوش کرنے کے لئے ہزاروں ناکردہ گناہ انسانوں کے خون ناحق سے ہولی کھیلی جا رہی ہو، جہاں دشت و زندگی کو ناقابل فخر کارنامہ، اور معصوم بچوں، ضعیفوں اور عورتوں تک کو انتہائی بے دردی سے ذبح کرنے کو عین ثواب تصور کیا جاتا ہو، کیا وہاں انسانیت کو امن و عافیت کا ایک لمحہ بھی میسّر آسکتا ہے ؟

اصل یہ ہے کہ عالم انسانی کی روز افزوں خلش اور زمانۂ حاضر کے درندہ صفت انسانوں کی دہشت و بہیمیت نے ہمارے اس یقین و ایمان کو محکم تر بنا دیا ہے کہ مستقل اور دوامی اقدار حیات اور ہمہ گیر اخوت انسانی کے گہرے اور پائدار احساس کے سوا انسانیت کی فلاح و نجات کی کوئی دوسری صورت ممکن ہی نہیں ہے،

اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا	جو لوگ ایمان لائے اور انھوں
اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ	نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ
لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ	نہیں کیا، اُن کے لئے ہی امن

مُهْتَدُوْنَ۔ کی زندگی ہے، اور وہی لوگ ہدایت

(الانعام) پانے والے ہیں،

ان ہمہ گیر اصولِ انسانیت کے سوا جو کچھ ہے، وہ ظن وتخمین اور ہوائے نفس کی تخلیق ہے، اور اس کا رحیات کی الجھنیں کم ہونے کے بجائے بڑھتی ہی چلی جائیں گی، ؎

ع :- راہبر ہو ظن وتخمین تو زبوں کارِ حیات

دارالمصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخرالدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ اُن پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں اُن کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ، فلسفہ وعلم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق اُن کے نظریات وخیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور وفکر کرنا چاہتے ہیں، اُن کے لئے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دے سکتی ہے،

ضخامت ۳۹۰ صفحے،

قیمت سے روپے،

(مرتبہ مولانا عبدالسلام ندوی)

"فیجر"

مولینا عبدالملک مبنائی محدّث

از

ڈاکٹر سیّد باقر علی صاحب ترمذی استاذ شعبۂ عربی اسمٰعیل کالج بمبئی

مولینا سیّد سلیمان صاحب ندوی نے عرصہ ہوا ہندوستان کے محدّثین کرام کے تذکرہ کا سلسلہ شروع کیا تھا، لیکن چند کڑیوں کے بعد یہ اہم سلسلہ کسی وجہ سے جاری نہ رکھا جا سکا، اس کے بعد معارف مین ہندوستان کے محدّثین پر چند اور مضامین شائع ہوئے، ذیل کی سطرین اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہین،

ہندوستان مین گجرات وہ خوش قسمت صوبہ ہے جہان علم حدیث کی اشاعت سب سے پہلے ہوئی، عام طور سے ہندوستان مین علم حدیث کی اشاعت کی ابتدا حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی کی طرف منسوب کی جاتی ہے، حضرت موصوف کی جلالت شان اور حدیث نبوی کی خدمات سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن تاریخی اعتبار سے ہندوستان مین یہ علم شریف پہلے پہل صوبۂ گجرات مین اشاعت پذیر ہوا، چنانچہ علامہ سخاوی کے دو شاگرد شیخ وجیہ الدین محمد بن محمد المالکی (متوفی ۹۲۹ھ) اور شیخ جمال الدین محمد بحرق (متوفی ۹۳۰ھ) شیخ الاسلام زین الدین زکریا انصاری کے دو شاگرد شیخ عبدالمعطی بن احسن باکثیر المکی (متوفی ۹۸۲ھ) اور شیخ شہاب الدین احمد العباسی المصری (متوفی ۹۹۲ھ) علامہ ابن حجر کے دو شاگرد شیخ محمد ابن عبداللہ الفاکہی المکی اور شیخ سعید شافعی اور دیگر کئی محدّثین کرام نے صوبۂ گجرات کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے سرفراز کیا، اور احمدآباد مین مدارس کھولے، اس کے علاوہ خود گجرات کے بے شمار علماء کو احادیث نبویہ کا بڑا ذوق تھا، حضرات صوفیہ نے اس کی تحصیل مین والہانہ انہماک کا ثبوت دیا، اور دربار کے اعلیٰ

عہدہ داروں نے اس علم شریف کے حصول کے لئے بوریانشینوں کا تلمذ اپنے لئے باعث نجات سمجھا، علم حدیث کی خدمت میں بعض خاندانوں نے نمایاں حصہ لیا، ان میں سے ایک بنبانیوں کا خاندان ہے، اس خاندان نے بہت سے علما پیدا کئے، جو آسمان علم کے درخشان ستارے ثابت ہوئے، اور افتا و قضا کے جلیل القدر مناصب پشتوں تک اُن کے خاندان میں رہے، اور اس خاندان کے باکمال بزرگوں نے نہ صرف ملکی انتظام میں نام پیدا کیا، بلکہ علوم و فنون کی سرپرستی، علما کی قدردانی، صلحا و اتقیا سے عقیدت و نیازمندی اور اپنے ذاتی علمی کمالات کا نقش تاریخ کے صفحات میں چھوڑا، بنبانیوں کی اصل کے متعلق حجات شاہی جلد چہارم (قلمی) میں اس طرح لکھا ہے:-

"بنبان ولایتی ست مابین خراسان و ملتان و این جماعت کہ بہ ملک گجرات بہ بنبانیان مشہور اند از آنجا آمدہ اند و ایشان از حضرت عبداللہ بن عباس اند"

یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس خاندان کے بزرگوں نے کس زمانہ سے گجرات میں سکونت اختیار کی لیکن اس کے علما میں شیخ صدرالدین کا زمانہ سب سے مقدم معلوم ہوتا ہے، شیخ صدرالدین نے کئی کتابیں تصنیف کیں جن کو انھوں نے شاہانِ گجرات کے نام سے معنون کیا، شیخ مذکور کو عربی ادب اور صرف و نحو سے خاص لگاؤ تھا،

قصیدہ البردہ، قصیدہ کعب ابن زہیر، قصیدہ لامیہ (قاضی عبدالمقتدر) وغیرہ پر انھوں نے حواشی لکھے ہیں، نحو کی مشہور کتاب الوافی کی شرح الکافی انہی کی ہے، ہندوستان میں غالباً اس کتاب کی سب سے پہلی شرح یہی ہے، شیخ نے قرآن مجید کی ایک تفسیر بھی لکھی جس کا نام تفسیر بحر المعانی رکھا وہ غالباً آٹھویں صدی کے آخر اور نویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں بقید حیات تھے،

شیخ منہاج الدین بنبانی غالباً شیخ صدرالدین کے بیٹے تھے، انھیں علم حدیث تصوف اور صرف و نحو سے بہت دلچسپی تھی، علم النحو میں اُن کے مرتبہ کا اس واقعہ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ

ی عالم شیخ بدرالدین دمامینی احمدآباد مین قیام پذیر تھے، اس وقت ان مین اور شیخ منہاج
مسلون کے متعلق بحث چھڑ گئی اور دمامینی کو اُن کے رد مین ایک کتاب الفتح الربانی
لبنانی لکھنی پڑی، اُن کی تصانیف کی تعداد ۸۰ سے متجاوز تھی، لیکن حدیث کی تالیفات
بخاری اور مسلم کی شرحون کے نام ہم تک پہنچے ہین،

فیض اللہ بن زین العابدین بنبانی کا ہمین شکر گذار ہونا چاہئے کہ انکی مجمع النوادر سے اکثر
ہین، شیخ فیض اللہ گجرات کے مشہور سلطان محمود بیگڑے (۸۶۳ھ تا ۹۱۷ھ) کے خزانچی تھے
ن مجید کی تفسیر دستور الحفاظ اسی سلطان کے نام سے معنون کی ہے،

کے علاوہ اُن کی تاریخ صدر جہان[1] اور مجمع النوادر[2] نہایت مفید تصانیف ہین، اتفاق سے
دردست دبید زمانہ کے ہاتھون برباد ہونے سے بچ گئے ہین،

ی خاندان کی ایک مایۂ ناز ہستی شیخ عبدالعزیز المعروف بہ عبدالملک بنبانی ہے، ان کا سلسلۂ نسب
ہ اللہ بن عباس سے ملتا ہے جس کی چند کڑیان حسب ذیل ہین،

خ عبدالملک بن شیخ محمود بن شیخ خضر بن شیخ نصیرالدین بن شیخ برہان الدین بن شیخ خضر بن شیخ
خ حسن بن شیخ الیاس،

خ عبدالملک زین البلاد احمدآباد مین پیدا ہوئے، اور وہین ۹۷۰ھ کے قریب قریب انتقال
ان کے اور بزرگون کی طرح شیخ عبدالملک بھی خانوادۂ سہروردیہ سے منسلک تھے، غالباً
انقاہ مین تعلیم پائی ہوگی، حدیث اپنے بڑے بھائی شیخ قطب الدین بنبانی سے پڑھی جن کو

ٹ کے لئے دیکھو روئداد کل ہند تاریخ کانفرنس اجلاس بمبئی گجرات کی چند تاریخی کتابون کی تعیین
تاب پر پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے ایک پر مغز مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جو لاہور کے اورینٹل کالج
ت اگست ۱۹۳۵ء مین شائع ہوا ہے،

مشہور مصری عالم شیخ شمس الدین سخاوی سے سند حاصل تھی، حدیث مین مولانا عبدالملک کے ممتاز شاگردون مین مولانا کمال محمد عباسی (مفتی احبن مالوہ) کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، شیخ عبدالملک نے تفسیر و حدیث مین کمال حاصل کیا، اور استاذ مذکور کے رتبۂ عالی پر فائز ہوئے، انھین صحیح بخاری ازبر تھی، ہمیشہ مسجد اور حجرے مین ورد و اوراد مین مشغول رہتے، توکل اور تجرید مین آپ کی مثال نہ تھی تمام علوم کا زبانی درس دیا کرتے تھے[1] افسوس ہے کہ مولانا جیسے باکمال محدث کے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہین، اُن کے ایک فرزند شیخ عبداللطیف (متوفی ۹۱۵ھ) نے مشارق الانوار کی شرح مبارق الازہار لکھی ہے، اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ بھروچ کے قاضی صاحب سید نورالدین احمد حسین کے ذاتی کتب خانہ مین موجود تھا[2] شیخ خلیل محمد عباسی شیخ عبداللطیف کے صاحبزادے ہین، والد سے علم حدیث حاصل کیا، احمد آباد کے بخاریون کے ایک مشہور عالم اور صوفی سید محمد مقبول عالم انھی سے روایت کرتے ہین، چنانچہ علامہ نورالدین (متوفی ۱۱۵۵ھ) نور القاری فی شرح البخاری مین فرماتے ہین :-

" وبه قال مولانا مقبول عالم حدثنی مولانا خلیل محمد العباسی البنانی حدثنی والدی عبداللطیف حدثنی والدی عبدالملک حدثنی محمد المدعو ببحار الله عن والدہ" الخ

ذیل مین ہم شیخ عبدالملک بنانی محدث گجراتی کی اسناد حدیث پیش کرتے ہین، یہ اسناد شیخ رشیدالدین چشتی کی کتاب مخبرالاولیاء سے لی گئی ہین، اس کتاب کا ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی

---

[1] ہم قاضی سید نورالدین صاحب کے تہ دل سے شکر گذار ہین، انھون نے ازراہ کرم مبارق الازہار اور نور القاری کے چند اقتباسات نقل کرکے ارسال فرمائے

[2] مختصر ترجمہ کے لئے دیکھو مرآت احمدی خاتمہ ص ۲، طبع بمبئی،

کے کتب خانہ مین موجود ہے چونکہ سلسلۂ اسناد مین زیادہ تر نام ہی ہین، اس لئے ہم عربی متن کے نقل کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہین،

صحیح بخاری | انه یروی من الشیخ محمّد المدعو بجار الله عن والد عز الدین بن عبد العزیز عن شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر عن محمد بن محمّد الهاشمی عن قاضی القضاة محب الدین محمّد بن محمّد بن محمّد الطبری عن الشیخ ابی الفتح المراغی عن شهاب الدین ابی العباس احمد بن ابی طالب بن ابی نعیم نعمه بن حسن بن علی بن بیان بن شحمة الحجازی الدمشقی الصالحی عن سراج الدین ابی عبد الله الحسین بن المبارك بن محمد بن یحیی الزبیدی عن ابی الوقت عبد الاول بن عیسی بن شعیب بن اسحاق بن ابراهیم الصفونی السنجری ثم البردی عن جمال الاسلام ابی الحسن عبد الرحمن بن محمّد بن المظفر بن محمن بن داؤد بن احمد بن معاذ بن اسهل بن الحکم الداؤدی عن ابی محمد عبد الله بن احمد بن حمویة بن احمد بن یوسف بن اعین الحموی السرخسی عن ابی عبد الله محمد بن یوسف بن مطر بن صالح بن بشر بن ابراهیم البخاری الغزنینی عن محمد بن اسمٰعیل البخاری رحمهم الله،

صحیح مسلم | انه یروی من محمّد المدعو بجار الله عن ابی العباس احمد بن ابی طالب الصالحی المذکور فی سند صحیح البخاری وانه یروی عن محمد بن ابی السعادة الحامی قال اخبرنا الحافظ ابو القاسم عبد الرحمن بن محمد بن اسحٰق بن مندة الاصفهانی عن الحافظ ابی بکر محمد بن عبد الله الجوزقی قال ابو حاتم المکی بن عبد الله التمیمی قال اخبرنا الامام ابو الحسین مسلم رحمه الله،

سنن ابی داؤد | انه یروی من محمد المدعو بجار الله قال اخبرنی والدی عز الدین عبد العزیز سماعًا قال اخبرنا ابو العباس بن ابی بکر الواسطی وابو عبد الله محمد بن احمد بن کامل الترمذی عن الخطیب ابی الفتح محمد بن محمد المنذری قال اخبرنا ابو الفضل عبد الرحمن بن یوسف بن یحیی الموصلی سماعًا قال اخبرنا ابو الفتح المفلح الدین بن احمد الدومی وابو النصر ابراهیم بن محمد الکرخی سماعًا عن المسند ابی طاهر محمد بن محمد بن عبد اللطیف قال انبأتنا ام عبد زینب ابنة احمد بن عبد الرحیم المقدسی عن ابی القاسم بن الحاسب قال حدثنی الحافظ ابو الطاهر احمد بن محمد السلفی اذنًا قال کتب ابو جعفر العبادانی من البصرة قال اخبرنی القاضی ابو عمر القاسم بن جعفر بن عبد الواحد الهاشمی قال اخبرنا ابو علی محمد بن احمد بن عمر اللؤلؤی، قال اخبرنا الامام ابو داؤد السجستانی رحمهم الله تعالی

سنن الترمذی | انه یروی من الشیخ محمد المدعو بجار الله عن والده عز الدین عبد العزیز قال اخبرنی شیخ الحنفیة امین الدین یحیی بن محمد القاهری قال اخبرتنا الاصیلة ام محمد سارة ابنة عمر الحسوی قال أنبأنا الصلاح عمر بن الحسین العراقی قال اخبرنا الفخر ابو الحسن علی بن احمد البخاری المقدسی قال اخبرنا ابو الفتح عبد الملک بن عبد الله الکرخی سماعًا قال أخبرنا ابو عامر محمود بن قاسم الازدی قال أخبرنا ابو العباس احمد بن محمد بن احمد بن محبوب المحبوبی قال اخبرنا الامام ابو عیسی محمد بن عیسی الترمذی رحمهم الله،

سنن نسائی | انه یروی من محمد المدعو بجار الله عن والده عز الدین عبد العزیز قال اخبرنا الحافظ تقی الدین محمد بن علوی المالکی اذنًا قال اخبرنا قاضی القضاة ابن زین الدین ابی بکر بن الحسین العراقی المدنی، قال اخبرنا المسند برهان الدین

ابراهیم بن محمد الدمشقی المؤذن سماعًا قال اخبرنا مسند الدنیا شهاب ابوالعباس احمد بن ابی طالب، قال أخبرنا ابو طالب عبداللطیف بن محمد قال اخبرنی ابوذر عبد طاهر بن محمد بن طاهر المقدسی سماعًا قال اخبرنا احمد بن عبدالرحمن سماعًا قال أخبرنا ابوالنصر احمد بن الحسین بن محمد الدینوری قال حدثنی ابو بکر احمد بن محمد بن السمیق السنی قال حدثنی ابوعبدالرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی،

سنن ابن ماجہ | انه یروی محمد المدعو بجارالله عن والد عزالدین عبدالعزیز قال أخبرنا الشیخان الحافظان تقی الدین محمد علوی المکی وقاضی القضاة شهاب الدین احمد بن علی بن حجر اذنًا قال البرهان ابراهیم بن صدیق الدمشقی سماعًا، قال اخبرنا رضی الدنیا ابوالعباس احمد بن ابی طالب الصالحی اذنًا قال اخبرنا ابو محمد عبداللطیف بن محمد بن علی قال اخبرنا ابو منصور محمد بن الحسین القزوینی سماعًا قال اخبرنا ابو طلحة القاسم بن الحنذر الخطیب قال اخبرنا ابوالحسن علی بن ابراهیم بن العطار قال اخبرنا الامام ابوعبدالله محمد بن یزید القزوینی المعروف بابن ماجه۔

موطا امام مالک | یرویه بن محمد المدعو بجارالله عن والد عزالدین عبدالعزیز عن شهاب الدین ابی الفضل احمد بن علی بن حجر قال اخبرنا العلامه برهان ابراهیم بن احمد بن الواحد قال أخبرنا المسند ابوعبدالله محمد بن جابر بن محمد بن القاسم الوادی آشی التونسی قال اخبرنا ابو محمد ..... عبدالله بن هارون القرطبی الطائی سماعًا قال اخبرنا القاضی ابوالقاسم

احمد بن زید بن عبد الرحمٰن بن تقی قال اخبرنا ابو عبید اللہ بن فرخ الفقیہ
مولیٰ محمد بن الطلاع قال اخبرنا ابو ولید یونس بن عبد اللہ بن مغیث
عن ابی عیسیٰ یحییٰ بن عبد اللہ عن ابیہ عبید اللہ بن یحییٰ عن ابیہ الامام
یحییٰ بن یحییٰ اللیثی عن الامام مالک،

ہماری بادشاہی

ہمارے چھوٹے بچون کے نصاب مین کوئی ایسی کتاب نہ تھی جو اُن کو تیرہ سو برس کی قومی تاریخ سے باخبر کرسکے، یہ کتاب اسی ضرورت کو سامنے رکھکر لکھی گئی ہے، اس کی زبان بچون کے لائق دلچسپ اور پسندیدہ ہے، یہ ان تمام بڑی بڑی سلطنتون کی مختصر اور آسان تاریخ ہے، جو گذشتہ صدیون مین مسلمانون نے دنیا کے مختلف حصون مین قائم کین قیمت :- عہ

ہندوستان کی کہانی

ہندوستان کی تاریخ کا یہ چھوٹا سا رسالہ نہایت آسان اور سہل زبان مین لکھا گیا ہے تاکہ ہمارے مکتبون اور ابتدائی مدرسون کے بچے اس کو آسانی سے پڑھ اور سمجھ سکین، ضرورت ہے کہ رسالہ چھوٹے بچون کے نصاب مین شامل کیا جائے تاکہ اُن کو معلوم ہو کہ وہ کون تھے، اور اب کیا ہین،

ضخامت ۶۰ صفحے قیمت :- عہ

(از مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی)

"منیجر"

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال صاحب ندوی

بسلسلہ ماہ مئی سنہ ۲۸ء

فارسٹر نے جس کتبہ میں اپنے زور تحریف سے حضرت ہودؑ کا نام پڑھکر اس میں نصرانیت کے جراثیم دکھانے کی کوشش کی ہے، اس کا چربہ دیکھئے۔

میری قرأت کے مطابق یہ ایک نظم[1] ہے جو حسب ذیل ہے،

سَمِیْقٌ . السَّسَ ... وذُ نَیْنِ ...

وَشَرَحَ ذَاکَلَهٗ یُکْمِلَا .

اَکَرُّ ذَوِیْ .. قَرَاذُ نَذِلْ

حَبِتَ بَحْرُخُهٗ سِیْلُ هِتَّاکَل

نَوَّ .. ذِیْتَ شَنْبِهٖ .. لَدُنْ مَا ... مَثَلْنَهٗ .. شُرْقُنَا .. حَبِّ مَا .. یَیْنِ ..

لِیَسْرَ مَا .. یَرْزَءُ .. مُکْرِ ذَمَا ...

قَهْتَا .. ذَرْشِیْنَاً .. یَلِلْ ذُو ..

لِیُمْنٰی .. یَصْدِءُ .. لِذُحْمَیٰ ..

یَدُ .. یَنَاَ .. کَزُرُنَا .. رَمْیَتَا ..

لِرَدُ نَا .. قَدْلَنَاَ .. شَرْلِیَا .. ذَنِی وَلْحَرْ .. شَشْ .. ذَحَرَ .. وَ .. حَکَتَا .

شَلَهْنَا .. سَلَقْنَاَ .. ذُیُقَتَهٗ ..

رَحَیْمَا .. رَکَفْنَاَ .. مِطَلَنْ نَاْ

سکا کَلَنَا .. زَکُرُدَا .. کَذَ .. دَا ..

مهرلوس یذ لون نصقا سطر:

وذُ نام زَنَدُ نُوُذِ رَنَا مُ ..

یتوکّث .. ذ ه . ولِنُشَّتِهٖ ..

وخلقه .. و مُسْلَلَتِهٖ ..

---

[1] اسے نظم کی صورت دیکر پڑھنے میں کاتب حروف اپنے محترم دوست مولوی اقبال احمد صاحب سہیل کے مشورون کا ممنون ہے،

ومنقل.. كِسَتْهِ صِبن.. وَذِهْ..
وَكُلَّ ذَكٍ

وذُنوش رضا حبشنا.. شِسِي
وشهٔ ذشن وَذرق تنوٗ ذكرُ ذِ وَحِمِيرُ ما كهرل،
وَملكٌ وَحِمِيرَما.. شُقّ..له.. وشح مرنو.. شَرَحَ ذو.. رخ..
وَنخل تَنُوذُ وشرذ.. يا..
سثا مرشتو وخرق تحر،

اس کو نظم کی صورت مین لکھنے کی غرض سے ہم نے سطر سطر کا اتباع نہین کیا، اصل کتبہ کی سطر جس لفظ سے شروع ہوتی ہے، اس پر نمبر لگا دیا گیا ہے، قرأت مین کوئی نقش محذوف نہین ہے، تشدید، تنوین اور تطویل حرکت کے علاوہ کوئی حرف زائد نہین ہے، فارسٹر اور روئیڈجر دونون کی قرأت کے برخلاف یہ قرأت حذف و اضافہ سے پاک ہے،

وزن و قافیہ | یہ نظم ۲۸ مصرعون کا مجموعہ ہے جن مین سے ۲۷ مصرعے تو فعولن فعولن فعولن فعو کے وزن پر ہین، اکیسوان مصرعہ فعولن فعو کے وزن پر ہے، یہ حیرتناک امر ہے، قوافی کا عجب انداز ہے،

مصرعہ نمبر ۱ و نمبر ۲
مصرعہ نمبر ۳ و نمبر ۴
مصرعہ نمبر ۷ و نمبر ۹
مصرعہ نمبر ۱۸ و نمبر ۱۹ و نمبر ۲۰
مصرعہ نمبر ۲۵ و نمبر ۲۶ ؛

ہم قافیہ ہین، باقی مصرعون مین قافیہ کی پابندی نہین کی گئی ہے،

زبان کتبہ | اس کتبہ کے اکثر الفاظ متداول عربی کی کتب لغت مین ملین گے، اس لئے زبان کتبہ

عربی سمجھنا چاہئے، عبارت کو متداول عربی کے قواعد پر ڈھال کے ہم نے پڑھا ہے، مگر چند مقامات پر عربی نحو کے خلاف جانا پڑا،

(۱) تین مصرعہ مین یمنا اور لذ حما کے الفاظ مین عربی قاعدہ سے یمنٍ اور لذ حمٍ ہونا چاہئے، عربی کی نحو سے تنوین کی غرض سے ہم نے ان دونون لفظون کے آخری الفون کو ی سے لکھا، عربی مین ایسے الفاظ کی بکثرت مثالین ہین،

(۲) گیارہوین مصرعہ مین شرلیا کا لفظ ہے، جسے قاعدہ سے شرلئے ہونا چاہئے لیکن ہمدانی نے اکلیل مین لکھا ہے کہ اہل حمیر خُذ بعیریک کی جگہ خذ بعیراک کہتے تھے،

(۳) مصرعہ دوم مین عربی قاعدہ سے اکملا نہین تو یکملان ہونا چاہئے، مگر ضرورت شعری یا زمانۂ کتبہ کے جواز نے اسے یکملا کر دیا،

لغات | کتبہ کے اکثر الفاظ لغت کی متداول کتابون مین ملتے ہین جن الفاظ کو عام ناظرین بآسانی تلاش کرسکتے ہین، اُن کو چھوڑ کر باقی الفاظ کی تشریح کی جاتی ہے،

مکرذما، ذحمی، ذحم، ذنی، یذنون اور شرذ مین ذال کو دال بنا دینے پر یہ الفاظ لغت مین مل جائین گے، وذہ کو ودہ پڑھکر استیدہ کا مرادف قرار دیا جاسکتا ہے، اسی طرح ذیل کے الفاظ کو بھی ذرا تغیر کے ساتھ ناظرین لغت مین پاسکتے ہین،

۱۔ حَیت = حوت (منڈلانا) سے فعل کے وزن پر

۲۔ ذیت شنہ = ذات سنتہ

۳۔ بصدء = یصادی (مقابلہ کرتا ہے)

۴۔ یَنَاءَ = ونی (عربی کی مثال وادی عبری مین مثال یائی ہوتا ہے اور ہمزہ آخر بکثرت ی سے بدل جاتا ہے)

(۵) نصقاسطر = نسقاسطر = قاف کے پہلے کی سین عموماً صاد سے بدل جاتی ہے تاج العروس مین ہے کہ ابن عباد نے کہا

"نسقان نکہ کے قریب دو ستارے ہین، ایک یمانی ہے، ایک شامی (ن س ق) نکہ چند دائرہ نما تارے ہین، سماک رامح کے پیچھے نبات النعش کے سامنے جن کو بچے نصعۃ الساکین کہتے ہین (ن ک ک)"

لفظ نسقا کی سطر کی طرف اضافت بتاتی ہے، سطر سے مراد ستارون کی وہ جھرمٹ مراد ہے جن مین نسقان واقع ہین،

(۶) ذکی = ذکی، ذہین، تیز فہم،

ذیل کے الفاظ کا ترجمہ عبرانی لغت کی مدد سے کیا گیا ہے

(۷) کلہ = تباہ کاری

(۸) کزر = سخت دلی

(۹) شلحنا = ہم نے نکال دیا،

(۱۰) نحل = فرمان روا ہوا،

(۱۱) کستہ = عرش

ذیل کے الفاظ نہ عربی لغت مین ملے، نہ عبرانی لغت مین، مگر اُن کے مطالب قرینہ سے معلوم ہوتے ہین

(۱۲) اگر = ذوی کا لفظ بتاتا ہے کہ یہ لفظ نباتات سے متعلق ہے، مواکرت کے معنی ہین مزارعت، اکر بمعنی زراعت،

(۱۳) ہتاکل = اکال وصول کیا، عربی مین اس چیز کو اکال کہتے تھے، جو امرا، اور حکام کو رعایا سے ملتا تھا، عربی افتعل عبرانی مین تفعل اور متفعل ہے،

۱۴۔ ذزہ = غالباً ایرانی فذ (قلعہ)

۱۵۔ لرونا = غالباً لرونیا (ہماری سنگ اندازی سے)

۱۶۔ شرلیا = سابق لفظ قذ نا بتاتا ہے کہ یہ قذالین کا مرادف ہے، پشت سر کے یمنی دیسی کو قذالین کہتے ہیں،

۱۷۔ مطلق = م = من
طلن = دیار } محض قیاساً

۱۸۔ سکاکل = دشمن محض قیاساً

۱۹۔ تیوکت = ؟؟؟

۲۰۔ شمسی = خادم بن گیا، (مصری "حرشمسو" کا ترجمہ کیا جاتا ہے، اتباع حور)

۲۱۔ ہرل = ؟؟؟

۲۲۔ سشام = غالباً مجرم

ترجمۂ نظم ان الفاظ کے علاوہ اور جتنے الفاظ ہیں، یا تو اسماء و القاب ہیں، یا ذرا سی توجہ پر ناظرین ان کو کتب لغت میں تلاش کر لیں گے، اس لئے اب ترجمہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے،

سمیتی نے بنیاد ڈالی اور ذوبین نے،

اور ذوشرح نے تباہ کاری کی حد کر دی

کھیتی مرجھا گئی اور گاؤن گاؤن بن گیا کینہ

منڈلانے والا گدھ سیل محصول لینے کو

ارادہ کیا اوس نے ایک بھولی بھالی کا پانی کے پاس، اس کی ناک اور کان کاٹ لئے ہماری آفتاب

دشمن نے، کیا... خوب ہے بین کا پانی،

یسار آفتین ڈھانے لگا کیا کر کے

قلعہ سینا کے فتات کو۔ یا للہ دو

یمن کی طرف سے مقابلہ کرنے لگا، مدافعت سے

ایک بازو عاجز ہو گیا، ہماری سنگ دلی بڑھ گئی

اپنی سنگ اندازی سے کمینہ کی پشتِ سر ہم نے زخمی کر دی، شاس اور حاکہ کے بافندہ نے

مدافعت کی،

ہم نے نکال دیا، اذیت دی، ذوبقہ

ریاح کو ہم نے لاتین مار کر اپنے دیار سے بھگا دیا

ہمارے دشمن ہماری کے تھیلے بن گئے ایسا دیکھ کر

بہادر سرہ فکہ کے دونوں ستاروں تک پہنچے

اور زندنوذ کے مغنی نے ترانہ گایا،

... شخص اور اپنی دُرّہ بازی

اور طور طریقہ اور شمشیر بازی

اور صین کی حکومت کے نکل جانے سے مغلوب ہو گیا،

اور عاجز ہو گیا تیز فہم

اور زندنوش نے حبش کو راضی کیا، وہ خدمت گار بن گئے،

اور صورت بگڑ گئی، بدحال کرنے والے کی اور نیزے مارے کرزد کے تنوذ نے اور حمیر... جیسا ہو گیا

اور بادشاہ اور حمیر کو اس کا دکھ ہوا

وشیح سخت اور ذوشرح کمزور ہو گیا۔

اور تنوخ حاکم ہوا، اور خدا نے پراگندہ کیا،

بدزبانی کے مجرم کو اور پاش پاش کر دیا، -

اماکن | اس نظم مین نام اماکن کے ہین، جن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

صین | عربی روایات مین کئی کہانیان ہین جن مین تبابعہ یمن کو صین پر حکمران بتایا تبابعہ مین سے ایک شمر الصباح تھا، جس کی بابت شاعر کہتا ہے کہ

من بعد ملک الصین اصبح ھالکا

اکرم بہ من ھالک محتاج

عام طور پر اس صین کو چین کا معرب سمجھا جاتا ہے، بعض کہانیان بھی اس کی تائید کر ایک صین وہ ہے جس کی بابت شمر دل بن شریک نے کہا،

حیث یقال للریاح اسفین	ہوا ؤن کو بھنے کا حکم ہوتا ہے، تو زور سے بھنے لگتی ہین، اور ہر سمت بہ لگتی ہین، یبرین اور حضر موت سے کر ریگ زار کی حد اور صین تک پہونچتی ہین،
ہوج یصبحن فلا ینبین،	
وکل وجہہ للسری یسرین	
بلغن اقصی الرمل من یبرین	
وحضر موت و بلغن الصین	

(جزیرۃ العرب ھمدانی صفحہ ۳۰۲)

ان اشعار کے صین کو بھی چین ہی سمجھا جاتا ہے لیکن شاعر صریحًا اس ہوا کا ذکر کرتا ہے اور حضر موت سے شمال کو روانہ ہوتی، اور ریگ زار عرب کی آخری حد اور صین تک پہنچ جا توراۃ کا مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ کوہ طور کے مشرق مین جو علاقہ ہے، توراۃ مین اس کا نام سین ہے، اور اس کے مغرب مین مصر سے ملا ہوا جو علاقہ ہے، اس کا نام دشت سین ہے، اسی سین

سے ایک قصاص شاعر ایک تبع کی زبان سے یون ذکر کرتا ہے کہ

وعلی بنی حام غدوت بطوکہ بالصین حتی بد ودا تبدیل

صین مین بنو حام پر مین نے حملہ کیا، اور اُن کو پراگندہ کر دیا، زبور مین ارض حام مصر کا نام ہے، اور توراۃ مین حام کو مصر و کنعان اور کوش و فوط کا مورث بتایا گیا ہے، اس کتبہ کے اندر صین کے نام سے اسی علاقہ بنو حام کا ذکر ہے جو طور و مصر کے درمیان ہے، اس کتبہ کے مطابق اس کے اندر مذکور واقعہ سے پہلے تک صین پر ملوک یمن کی حکومت تھی، مگر انہی دنون وہ وہان سے محروم اور بے دخل ہو گئے،

شیا | مراد سینا طور سے مشرق کا علاقہ

حاکہ | معجم البلدان مین ہے کہ حاکہ بلاد عذرہ کی ایک وادی کا نام ہے، بنو عذرہ کی شان مین نابغہ نے کہا،

عطاء اللہی ابناء عذرۃ انھم لھا میم یستلھونھا فی الحناجر

ھم منعوا وادی القری من عداۃ ھم بجمع شدید للعدا والمکابر

(یعنے)

"بنو عذرہ بڑے کھاؤ پیر ہین، انھون نے اپنے دشمن سے وادی القریٰ کی حفاظت کی تھی"

"بلاد عذرہ وادی القری مین تھے، اس لئے حاکہ بھی وادی القریٰ کے اندر واقع تھا"

شش | شش سے مراد ایک مقام شاس ہے"، ابن موسیٰ نے کہا کہ یہ مدینہ اور خیبر کے درمیان ایک راستہ کا نام ہے، حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم جب غزوۂ خیبر کو چلے، تو شاس کی راہ چھوڑ کر مرحب کی راہ سے چلے (معجم البلدان)

بین | مدینہ منورہ سے ایک برید کے فاصلہ پر صاحک اور صویک نام دو پہاڑون کے درمیان ایک وادی کا نام بین ہے، حضرت ابہان الاسلمی بہین کے باشندہ تھے، یہان بنو خزاعہ کی ایک شاخ بنو اسلم رہتی تھی

سیرت ابن ہشام میں دو بار اس کا ذکر آیا ہے، غزوۂ بدر کے سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تربان، ملل، عمیس الحمام اور مرمین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے اور غزوۂ بنو لحیان کے سفر میں غراب جبل مخیض، البتراء پھر مین ہوتے ہوئے صخیرات الیمام سے گذرے،

یمنی | مین کے مقام میں یسیل نام ایک سرکاری محصل کی توہین کی گئی، یسار نام ایک حاکم مہات کی فوج لے کر سینا سے انتقام کو چلا جس کا مقابلہ حاکہ اور شاس والوں نے کیا، مین کی طرف سے ذو بابیل نے مین پر چڑھائی کی، اس لئے سینا، حاکہ اور شاس کے ساتھ کتبہ میں مین کا ذکر بھی آیا ہے،

حبش | اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مین والے غالب رہے، یسار اور ذو بابیل کی فوجوں نے شکست کھائی، مجبوراً ذو نوش نے جو غالباً ان دنوں یمن کا بادشاہ ہوگا، اہل حبش کو خوشامد کر کے اپنی فوج میں داخل کیا، اس حیثیت سے کتبہ کے اندر حبش کا ذکر آیا ہے، (باقی)

دار المصنفین کی دوسری نئی کتاب

تاریخ اندلس

اندلس پر اردو میں بکثرت مضامین اور کتابیں لکھی گئیں، اور بکثرت عربی و انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا لیکن پھر بھی ایک محققانہ اور مستند کتاب کی ضرورت باقی تھی، اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جو درحقیقت دار المصنفین کے پیش نظر سلسلۂ تاریخ اسلام کی ایک اہم کڑی ہے، اس کی متعدد جلدیں ہیں، جو بتدریج شائع ہونگی، اس جلد میں شروع میں اندلس کے طبعی و تاریخی جغرافیہ اسکی قدیم تاریخ وہاں کے باشندوں اور مختلف حکومتوں کی تفصیل، پھر فاتح اندلس طارق بن زیاد (۹۲ھ/۷۱۱ء - ۹۳ھ/۷۱۲ء) سے لیکر عبد الرحمن اوسط ۲۰۶ھ/۸۲۲ء تک وہاں کی سیاسی تمدنی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے،

(مرتبہ سید ریاست علی صاحب ندوی)

"منیجر"

تلخیص و تبصرہ

ہندوستان کے مسلمان حکمرانون

کے

عہد کی ایک جھلک

ڈاکٹر راجندر پرشاد نے جو آج کل ہمارے جمہوریۂ ہند کے صدر ہین، ۱۹۴۶ء عیسوی مین ایک کتاب "India Divided" لکھی تھی، جو بہت مقبول ہوئی، اب تک اس کے تین اڈیشن نکل چکے ہین، اس کے ابتدائی حصہ مین ہندوستان کے مسلمان حکمرانون کی مذہبی، سیاسی اور علمی روادری پر بھی تبصرہ ہے جس کے خاص خاص حصے ہم ہدیۂ ناظرین کرتے ہین، آج جب کہ ایک خاص حلقہ مین یہ بتانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ ہندوستان مین مسلمانون کی حکومت بہت ہی جابرانہ اور متعصبانہ تھی، ذیل کی تحریر پڑھنے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کی باتین عدم واقفیت اور محض تعصب کا نتیجہ ہین،

ڈاکٹر راجندر پرشاد رقمطراز ہین :-

"عام طور پر ایسی بہت سی مثالین ملین گی کہ مسلمان بادشاہون نے مندرون اور مٹھون کیلئے جائدادین وقف کین، اور عبادت گذار اور صاحب علم و کمال پنڈتون کو جاگیرین دین، یہ بہت کچھ دکھایا جا چکا ہے کہ مسلمان بادشاہون نے ہندوؤن کے کتنے مندرون اور عبادت گاہون کو مسمار کیا، لیکن اگر کوئی محقق ان کثیر التعداد اوقاف اور جاگیرون کی فہرست تیار کردے، جو مسلمان حکمرانون

کی طرف سے ہندوؤں کی عبادت گاہوں کو دی گئی ہیں، تو یہ بڑا مفید کام ہوگا جنوبی ہند کی تاریخ کے طلبہ کو ایسی مثالیں بہت ملیں گی کہ عادل شاہی، قطب شاہی اور آصف شاہی بادشاہوں نے برہمنوں کے لئے بہت سی جاگیریں وقف کیں، بودھ گیا کے مہنت کی زمینداری کی سالانہ آمدنی لاکھوں روپیے ہے، یہ زمینداری دہلی کے مغل بادشاہ محمد شاہ کا عطیہ ہے، جسے اُس نے ایک شاہی فرمان کے ذریعہ سے مہنت لال گیر کو مستی پور تاراڈیہہ کا پورا علاقہ عطا کیا، مہاراجہ دربھنگہ کا علاقہ ہندوستان کی سب سے بڑی زمینداری ہے، یہ اکبر نے موجودہ مہاراجہ دربھنگہ کے مورثِ اعلیٰ کو دی تھی، جو زہد و فضل میں نمایاں حیثیت رکھتے تھے، شیر شاہ نے ہندو رعایا کی تعلیم کے لئے جاگیریں وقف کیں، ان جاگیروں کا انتظام خود ہندو ہی آزادانہ طریقہ پر کرتے تھے، شیر شاہ اپنی رواداری کی وجہ سے ہر فرقہ میں مقبول تھا، کشمیر کا حکمران سلطان زین العابدین امرناتھ اور شاردا دیوی کے مندروں میں گیا، تو وہاں کے زائرین کے آرام و آسایش کے لئے مکانات تعمیر کرائے، ۱۷۵۰ء میں ہردوار نجیب آباد کے پٹھانوں کے زیرنگیں تھا، نجیب آباد کے نواب نے ہردوار کے جانوروں کے لئے بڑے بڑے مکانات بنوائے، جو آج تک موجود اور ہندوؤں کے قبضہ میں ہیں،

عالمگیر کے عہد کا مورخ منشی سجان رائے خلاصۃ التواریخ میں لکھتا ہے کہ دیپالپور میں جو کالانور کے پاس واقع ہے شاہ شمس الدین دریائی کا مزار ہے، ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو اُن سے بڑی عقیدت تھی، لیکن ایک ہندو کی عقیدت اتنی زیادہ تھی کہ ان کی وفات کے بعد اسی ہندو کو مسلمانوں اور ہندوؤں نے مل کر اُن کے مزار کا متولی بنایا، چند سال کے بعد کچھ مسلمانوں نے شورش کرکے مذہبی بہانے سے ہندو کو تولیت سے محروم کر دینا چاہا، لیکن عالمگیری حکومت نے اس شورش کو کامیاب نہیں ہونے دیا، اور جب کہ یہ کتاب (یعنی خلاصۃ التواریخ) لکھی جا رہی ہے، عالمگیر کی حکومت کا تیسرا سال ہے لیکن اس مزار کی تولیت بدستور ہندوؤں ہی کے ہاتھ میں ہے"۔

حیدرآباد دکن میں ایک مشہور درگاہ کی تولیت کا سلسلہ ایک برہمن خاندان میں چلا آتا ہے، نظام

حیدرآباد نے اس درگاہ کے لئے ایک بڑی جاگیر وقف کی ہے بعض مسلمانوں نے ہندو متولی کو علیحدہ کرنا چاہا، مگر نظام نے نہیں ہونے دیا، حیدرآباد شہر کے اندر سیتارام کا ایک مندر ہے ایک اور مندر ماہور (عادل آباد) میں ہے ان دونوں مندروں کے لئے حکومت نظام کی طرف سے جائداد وقف ہے جس کی سالانہ آمدنی پچاس ساٹھ ہزار ہے، ناندیر میں گھنوں کے ایک گرودوارے کے لئے بھی نظام نے ایک جاگیر عطا کی ہے جسکی سالانہ آمدنی بیس ہزار ہے،

۱۱۶۷ھ میں احمد شاہ بہادر غازی نے ایک سند عطا کی تھی جس کا ترجمہ یہ ہے:-

ضلع اکبرآباد کے قصبہ اچنیرا کے زمینداروں اور کاشتکاروں کو معلوم ہو کہ شتیل داس بیراگی کو پنیارتھ کے طور پر شری ٹھاکرجی کے بھوگ اور نوید کے لئے سترہ بیگھے کھیت کی معافی دیجاتی ہے، تاکہ اُن کی آمدنی سے شری ٹھاکرجی کے اخراجات پورے ہوسکیں اور پوجا پاٹ ہوتا رہے، اچنیرا کے بازار کے چودھری کو معلوم ہو کہ وہ شری ٹھاکرجی کے لئے بیس بھر غلہ ادا کرے، بیراگی کو اس حق سے محروم نہ کیا جائے، تاریخ ۳ ربیع رمضان ۱۱۳۹ھ ف

ایک اور سند شہاب الدین خان کی ہے جو اُس نے چنچواد کے مشہور گنیش مندر کے اخراجات کے لئے عطا کی تھی اس سند کے لئے قول نامہ کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے وہ یہ ہے:-

"یہ قول نامہ چنچواد کے مندر یہ گوشائین کے لئے پرگنہ پونا کے بارہ میں ہے جس کے لئے خان حکمت نہاد خان نے اطلاع دے کر جاگیر کے ایک قول کی درخواست کی ہے، اس لئے یہ تحریر دیجاتی ہے کہ وہ اس گاؤں کے لوگوں کے ساتھ رہے، اور اسکی زمین کو زرخیز اور بہتر بنائے، اللہ تعالیٰ کے فضل سے اس کو کوئی ضرر یا دیب اٹھانی پڑے" اس قولیت نامہ کی تاریخ ۱۲ ذیقعدہ ۱۲۲۶ھ ہے،

الہ آباد میں اسی طرح کے دو فرامین ہیں، ایک مشہور مندر بیشور ناتھ کے پجاریوں کے نام ہے جسکو اورنگزیب نے کیا تھا

اورنگزیب نے لچھمیون کے لڑکے گردھر ساکن موضع بستی، ضلع بنارس جد و مشرا ساکن میش پور پرگنہ حویلی اور پنڈت بلبھدر مصرا کو بھی جاگیریں دیں، یہ سب کے سب مندرون کے پجاری تھے، اورنگزیب نے ملتان کے مندر تولا مائی کے لئے مشرا کلیان داس کو سو روپے کا وظیفہ عطا کیا، یہ مندر اب تک موجود ہے،

سلطان محمد مراد بخش نے ۱۰۵۲ھ مین حکم دیا کہ اوجین کے گدام سے مہاکل کے مندر کی روشنی کے لئے چار سیر گھی روزانہ دیا جائے،

بہت سے مسلمان حکمران علوم و فنون کے سرپرست رہے ہین جنھون نے صرف فارسی اور عربی زبان کو فروغ دیا، بلکہ سنسکرت زبان اور ہندوستان کے لٹریچر اور سائنس کی بھی سرپرستی کی، انھون نے ہندوستان مین علوم و فنون کو جو ترقی دی، اُن کو یہان مختصراً بھی لکھنا ممکن نہین شاہانہ سرپرستی مین سنسکرت کی متعدد کتابین فارسی اور عربی زبانون مین ترجمہ کی گئین، بہت سے مسلمان حکمرانون نے خود سنسکرت زبان کی تحصیل اور اُن مین سے بعض نے سنسکرت کی کتابون کو ترجمہ بھی اس غرض سے کیا کہ ہندوؤن کے علوم کے خزانے مسلمانون تک بھی پہنچ جائین، انھون نے دوسرون کو اس زبان کی تحصیل کی ترغیب دی، ہندو طلبہ کے تعلیمی نصاب مین سنسکرت زبان بھی ہوتی تھی، غرض سنسکرت زبان کی سرپرستی ہر ممکن طریقہ سے کی گئی، ڈاکٹر جیمز اچ کرہنس نے اسلامی ہند مین تعلیم کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

مسلمان بادشاہ اور شہزادے ہندو کلچر کا بھی دلچسپی سے مطالعہ کیا کرتے تھے، مسلمانون کی تعلیم مین ہندو ادب کا اختلاط اسی طرح ہو گیا تھا جس طرح مغل مصوری راجپوتون کی مصوری سے مل جل گئی تھی ہندو کے ادب العالیہ کا فارسی مین ترجمہ کیا گیا، اور رفتہ رفتہ فارسی کلچر سے ہندو کلچر متاثر ہوتا گیا،

پرتگالی مورخ فاریا سوزا لکھتا ہے کہ

"ہندو مسلمان ایک دوسرے سے مل جل کر رہتے، مسلمان بادشاہ ہندوؤن کو بڑے بڑے عہدون

پر ماموز کرتے اور ان کو اعلیٰ منصب عطا کرتے تھے"، اس کے یہ معنی ہین کہ ہندوؤن کے ساتھ مسلمانون کے مقابلہ مین کوئی تفریق نہین کی جاتی تھی، ہندو اپنے مذہبی فرائض اور مراسم کو ادا کرنے مین بالکل آزاد تھے اور مسلمان ہندوؤن کے مذہبی جذبات کا بڑا احترام کرتے تھے،

سر الفرڈ لائل ایشیاٹک اسٹڈیز مین رقمطراز ہین کہ مسلمان حکمران ہندوستان کو اپنے مذہب کے مطابق بنانے کے تخیل سے اتنے دور تھے کہ کبھی مسلمانون نے بھی اسکی کوشش نہین کی کہ ملکی نظم ونسق کے بڑے بڑے عہدے صرف مسلمانون ہی کے لئے مخصوص رہین،

اورنگزیب نے بہت سے لائق ہندوؤن کی ملازمت کے لئے شاہجہان کے پاس سفارش لکھی تھی، بجیپور کے دیوان کی جگہ خالی ہوئی، تو اورنگزیب نے ایک راجپوت عہدیدار رام کرن کی سفارش کی بعض اسباب کی بنا پر شاہ جہان نے اس سفارش کو قبول نہین کیا، تو اورنگزیب نے پھر شاہجہان کو لکھا کہ اس جگہ کے لئے کوئی اس سے بہتر آدمی مل نہین سکتا، اورنگزیب کی سفارشون کی اور مثالین بھی رقعات عالمگیری اور آداب عالمگیری مین مل سکتی ہین،

عام طور سے یہی سمجھا جاتا ہے کہ اورنگزیب نے ہندوؤن سے زبردستی اسلام قبول کرایا لیکن ہم یہان پر ایک عجیب غریب واقعہ کا ذکر کرتے ہین جس سے اورنگزیب کے رجحانات کا اندازہ ہوگا، شاہجہان نے دندھیرا کے راجہ اندرامن کو صندوق نگی کی بنا پر قید کر دیا جب اورنگزیب دکن کا صوبیدار مقرر ہوا تو اس نے راجہ کی رہائی کے لئے شاہجہان سے سفارش کی لیکن شاہجہان اندرامن سے بہت زیادہ برہم اور ناخوش تھا، اس لئے اورنگزیب کی سفارش قبول نہین کی اور اس کو لکھ بھیجا کہ اندرامن نے بارہا تکلیف پہنچائی ہے وہ صرف اس شرط پر رہا کیا جا سکتا ہے کہ اسلام قبول کرے، اس پر اورنگزیب نے سخت احتجاج کیا اور شاہجہان کو لکھا کہ اس شرط پر عمل نہین کیا جا سکتا، یہ بہت ہی غیر مدبرانہ اور کرتا اندیشانہ فعل ہوگا، اسکی رہائی خود اسی کے شرائط کے مطابق ہونی چاہئے اس سلسلہ مین اس نے شاہجہان کے وزیر اعظم کو ایک رقعہ لکھا جو آداب عالمگیری مین موجود ہے،

"ص ع"

ادبیات

فطرت اور مومن

از

جناب شہ زور کاشمیری

لحد کے خواب کا ہی سلسلہ اسکی گران خوابی
جو فطرت کے تقاضوں سے کری دانستہ تنابی

ہی فطرت ایک مجموعہ قوانین الٰہی کا
ازل سے جن کا پیرو ہی جہان خاکی و آبی

بصارت ہی تو فطرت کا صحیفہ پڑھ کبھی تو بھی
بصیرت کے لئے کافی ہی اک جگنو کی شب تابی

صلاحیت ہی ہر ذرہ مین صحراؤن پہ چھانے کی
ہراک قطری کی فطرت مین ہی طغیانی و سیلابی

دل ظلمت مین پوشیدہ ہین صدہا چاند اور سورج
نہان ہر خار کے دامن مین ہی جنت کی شادابی

کتاب فطرت رنگین کے اوراق پریشان ہین
دل رومی، دماغ طوسی و چشمان فارابی

ہی فطرت ایک دستور العمل مرد مجاہد کا،
ہی جس کا مقصد ہستی جہان بانی جہان تابی

ہی فطرت کی سی گیرائی نگاہ مرد مومن مین
ملی ہی اُس کے دل کو فطرۃً تقدیر سیمابی

ہی گر نغمات سے معمور اک ساز ازل فطرت
تو مومن کی نظر اُس کے لئے ہے ضرب مضرابی

ہی مومن ایک بحر بیکران رحمت یزدان
مسلمانی ہے صلح و امن کے تشنون کی سیرابی

بجز علم الیقین ممکن نہین ادراک فطرت کا
اُسی انوار کی ہو تیرہ دل مین بھی ضیا تابی

بجھانے دی یقین کو عقل کی افسردہ شمعیں سب طلوع مہر کا مژدہ ہی تارون کی تنک تابی

تری تخئیل پر ہو باز وراسرار فطرت کا
عطا تجھکو کرے خالق دل مومن کی بے تابی

غزل

از

جناب سید شاہ ولی الرحمن وکی ڈپٹی کلکٹر آرہ

عقل الجھ کے رہگئی وہم کے تار و پود مین حسن کی دیکھ لی جھلک عشق نے ہر وجود مین

کعبہ ہو یا کہ بتکدہ جھک گئی خود جبین شوق کس کو دماغ امتیاز بے خودی سجود مین

ڈھونڈھ چکا ہون جو بہ جو دشت بہ دشت کو بہ کو ایک بھی ہم نفس نہین کارگہ وجود مین

جن کے ہین دل جنون بدوش کان ہین جن کے حق نیوش پاتے ہین کیف سرمدی نغمہ چنگ و عود مین

کافر عشق کے لئے عین حرم ہے دیر بھی گو ہے در بتان پہ سر مگر ہو دل درود مین

کاکل عطر بیز کی دوش پہ چھا گئی گھٹا ڈوب گئی فضاے جان نکہت مشک و عود مین

جان ہو وقف جستجو دل ہو شہید آرزو امن و سکون نہ کر تلاش معرکہ وجود مین

کعبہ آرزو ہوا ہر نفس حیات عشق مل گیا نافۂ مراد کاکل مشک سود مین

مرگ بھی عین زیست ہے گر رہ سفر ہو گر حیات زیست بھی عین مرگ ہے منزل نیست و بود مین

عشق ہے حسن کا جواب حسن ہے عشق کا جواب حسن ازل کی ہے نمود عشق کی ہر نمود مین

مسلک عشق مین وکی یاس و امید ہے حرام
دل کو رہین غم نہ کر فکر زیان و سود مین

باب التقریظ والانتقاد

معین الارواح

یعنی

حضرت خواجہ معین الدین چشتی کی ایک نئی سوانح عمری

از

سید صباح الدین عبدالرحمن ایم اے علیگ رفیق دارالمصنفین

(۲)

اب ایک علحدہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تمام مذکرہ نویسوں کے لکھنے کے بموجب یہ تسلیم کرلیا جائے کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت ان کا سن شریف کیا تھا؟

معین الارواح کے فاضل مولف نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۰ھ قرار دیا ہے لیکن اس سنہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کچھ تامل اس لئے ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے حضرت خواجہ کے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا سال ولادت ۵۲۶ھ لکھا ہے، (خزینۃ الاصفیا ص ۲۵۶ جلد اول) گمان ہوتا ہے کہ مرشد و مرید میں سن و سال کا تفاوت کچھ اور زیادہ ہوگا، فاضل مؤلف لکھتے ہیں کہ اکثر مورخین نے حضرت خواجہ کا سال ولادت ۵۳۷ھ لکھا ہے، (ص ۵) اگر حضرت خواجہ عثمان ہارونی کی تاریخ ولادت ۵۲۶ھ صحیح تسلیم کرلی جائے، تو اُن کے مرید حضرت خواجہ کا سال ولادت

۵۳۷ھ تسلیم کرنے مین زیادہ تامل نہین ہوتا ہے اب اگر ہم حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ قرار دیتے ہین، تو ۵۶۱ھ مین ہندوستان آنیکے وقت اُن کی عمر اکتیس سال کی ہوتی ہے اور اگر ۵۳۷ھ کو صحیح سمجھتے ہین، تو ہندوستان مین اُن نے ورود مسعود کے وقت ان کی عمر چوبیس سال کی ہوتی ہے، قیاس کہتا ہے کہ اکتیس یا چوبیس سال کی اتنی کم عمری مین ہندوستان آکر مستقل سکونت اختیار نہ فرمائی ہو، خصوصًا جب یہ معلوم ہو کہ مرشد کی خدمت اور پھر سیاحت مین کافی مدت گذاری، ایک اور چیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ وہ اگر ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے، تو گویا اجمیر کے ہندو حکمران سے ۵۸۸ھ یعنی شہاب الدین غوری کے حملہ تک متصادم رہے، بعض مذکرہ نویسون نے لکھا ہے ۵۶۱ھ مین اجمیر آئے تو پرتھوی راج کو اجمیر مین اُن کا قیام گران گذرا، لیکن یہ صحیح نہین معلوم ہوتا کیونکہ تاریخون مین پرتھوی راج کی تخت نشینی کی تاریخ ۵۷۱ھ ہے[۱]، اور تھوڑی دیر کیلئے اگر تسلیم کر لیا جائے کہ حضرت خواجہ کے اجمیر مین آنے کے دس برس کے بعد پرتھوی راج گدی پر بیٹھا اور اپنی تخت نشینی کے بعد سے حضرت خواجہ کے قیام مین مزاحمت شروع کی، تو اس کی مطلق العنانی سے یہ توقع نہین ہو سکتی تھی کہ ۵۷۱ھ سے ۵۸۸ھ یعنی سترہ برس تک اُن کے تصادم کو اپنی راجدھانی مین برداشت کرتا رہا

---

[۱] عاجز راقم نے اپنی حقیر تالیف بزم صوفیہ مین تذکرہ نویسون پر بھروسہ کرکے یہ لکھدیا ہے کہ

"دہلی سے اجمیر گئے، جہان دسوین محرم ۵۶۱ھ مین نزول اجلال فرمایا، اور یہین آخر وقت تک قیام رہا۔ اس زمانہ مین اجمیر اور دہلی کا حکمران چوہان خاندان کا مشہور راجپوت راجہ پتھورا تھا"

اب مزید تحقیقات کے بعد یہ بیان نظر ثانی کا محتاج ہو گیا ہے، بزم صوفیہ مین ایک اور تسامح ہو گیا ہے، ص ۱۱۱، پر محمد یادگار کو اصفہان کا حاکم لکھدیا گیا ہے، اس سلسلہ مین بھی تذکرہ نویسون مین کچھ اختلاف ہے، خزینۃ الاصفیاء (جلد ۱ ص ۲۵۸) مین ہے کہ محمد یادگار ہمرات کا حاکم تھا، لیکن زیادہ تر تذکرہ نویسون نے اسکو سبزوار کا حاکم بتایا ہے اور یہ صحیح ہے،

اب یا تو ہم تسلیم کرلیں کہ حضرت خواجہ ۵۶۱ھ میں اجمیر آکر پھر لوٹ گئے، لیکن جب اس کے لئے کوئی قطعی شہادت نہیں ملتی ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تذکرہ نویسوں نے ۵۶۱ھ کی تاریخ غلط لکھی ہے، انھوں نے شہاب الدین غوری کے حملہ سے کچھ ہی پہلے یعنی ۵۸۷ھ میں اجمیر میں نزول اجلال فرمایا ہو، پرتھوی راج نے اُن کو تکلیف پہنچائی تو اُن کی دعاؤں سے شہاب الدین غوری ۵۸۸ھ میں حملہ آور ہوا، اس خیال کو تقویت اس سے بھی پہنچتی ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہونے کی تاریخ خود معین الارواح کے فاضل مؤلف نے ۵۸۳ھ بتائی ہے اور ابھی ذکر آچکا ہے کہ حضرت خواجہ قطب الدین اپنے مرشد کے ساتھ اجمیر آئے،

اب یہ مان لیا جائے کہ حضرت خواجہ اجمیر پہلی دفعہ ۵۸۷ھ میں آئے تو اُن کے ۵۳۷ھ کے سنہ پیدائش کے مطابق ان کی عمر اس وقت پچاس سال کی ہوتی ہے، لیکن تذکرہ نویس لکھتے ہیں، حضرت خواجہ کو جب اپنے مرشد حضرت خواجہ عثمان ہارونی سے خرقۂ خلافت ملا تو اس وقت ان کا سن شریف بارہ برس کا تھا، تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ ۵۸۷ھ میں اجمیر آکر پھر اپنے مرشد کے پاس گئے، لیکن ابھی بحث ہو چکی ہے کہ یہ ایک تذکرہ نویسی واقعہ ہے، اب اگر حضرت خواجہ کی ولادت باسعادت کی تاریخ ۵۳۰ھ میں مان لیں تو ۵۸۷ھ میں اجمیر آنے کے وقت اُن کی عمر ستاون برس کی ہوتی ہے، یعنی وہ اپنے مرشد سے خرقۂ خلافت لے کر اجمیر تشریف لائے،

لیکن یہ ساری بحث گنجلک ہوتی جارہی ہے، اور ہم کوئی قطعی رائے قائم کرنے سے قاصر ہیں، حضرت خواجہ کے حالات قلم بند کرنے میں تذکرہ نویسوں نے کچھ ایسی مبہم، غیر واضح، مختلف اور متضاد باتیں لکھی ہیں کہ اگر ان کا تجزیہ کیا جائے، تو ایک لامتناہی بحث چھڑ جاتی ہے، اور کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلتا ہے

ایک آدھ مثال اور ملاحظہ ہو، سلطان شمس الدین التمش کو کسی تذکرہ نویس نے حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین کا اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے

ہارونی کا مرید لکھا ہے، اور کسی نے حضرت خواجہ معین الدین اور کسی نے حضرت خواجہ بختیار کاکی کا مرید بتایا ہے حضرت خواجہ بختیار کاکی کے ملفوظات فوائد السالکین ہیں سلطان التمش کا ذکر بار بار آتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ سلطان کو حضرت بختیار کاکی سے ارادت تھی، چنانچہ ایک موقع پر حضرت بختیار کاکی فرماتے ہیں :-

"ایک رات وہ یعنی التمش میرے پاس آیا اور میرا پاؤں پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھکو کب تک تکلیف پہنچاتے رہوگے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اس نے کہا رب العزت مجھ کو مملکت تو دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی اور اس کا حساب دینا ہوگا، تو اس وقت بھی آپ مجھے چھوڑیں، وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اس کی بات قبول نہ کر لی۔ (فوائد السالکین ص ۲۹)

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سلطان التمش حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید تھا تو چشتیہ سلسلہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ گمان نہیں ہوتا کہ سلطان التمش کو اپنے مرشد کے مرید سے والہانہ عقیدت ہو گئی تھی، خزینۃ الاصفیا کے مؤلف نے واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ

"او را دنیا یعنی سلطان التمش رحم دل و عادل و سلطان کامل و مکمل از خلفائے نامدار و مریدان با وقار خواجہ قطب الدین بختیار است" (جلد اول ص ۲۷۶)

لیکن ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن زبیری صاحب نے حضرت خواجہ معین الدین کی ایک تصنیف کنجل اسرار کی سند پر سلطان التمش کو حضرت خواجہ عثمان ہارونی کا مرید بتایا ہے (ص ۶۰) مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا کنجل اسرار یا اور دوسری کتابیں جن کو فاضل مؤلف نے حضرت خواجہ کی طرف منسوب کیا ہے، اُن کی تصانیف تسلیم بھی کی جا سکتی ہیں ؟

خواجگان چشت کی تصانیف کے متعلق حضرت خواجہ نصیر الدین کا بیان خیر المجالس میں اس طرح ہے :-

"میرے حضرت پیر و مرشد جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز فرماتے تھے، مین نے کوئی کتاب تصنیف نہین کی، اس واسطے کہ خدمت شیخ الاسلام حضرت فرید الدین اور شیخ الاسلام حضرت مولینا قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور باقی خواجگان چشت وغیرہ مشائخ جو داخل ہمارے شجرہ مین ہین، کسی نے کوئی تصنیف نہین کی ہے، مین (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ فوائد الفواد مین ہے کہ ایک شخص نے جناب سلطان الاولیاء قدس سرہ العزیز کی خدمت مین عرض کی، مین نے ایک معتبر سے سُنا ہے وہ کہتا ہے کہ مین نے آپ کی تصنیف سے ایک کتاب دیکھی ہے، حضرت سلطان الاولیاء رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا اس نے غلطی کی، مین نے کوئی کتاب تصنیف نہیں کی ہے، اس واسطے کہ ہمارے خواجگان نے کوئی تصنیف نہین کی، یہ سن کر حضرت خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ بالخیر نے ارشاد کیا کہ واقعی ہمارے حضرت سلطان الاولیاء نے کوئی کتاب تصنیف نہین کی، پھر مین (یعنی مرتب خیر المجالس) نے عرض کی کہ یہ جو رسالے اس وقت مین دستیاب ہوئے ہین، ملفوظات حضرت شیخ قطب الدین رحمۃ اللہ علیہ اور ملفوظات حضرت شیخ عثمان برونی رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کے وقت مین ظاہر نہ ہوئے تھے، خواجہ ذکرہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھے، اگر ان حضرات کی تصنیف سے ہوتے، تو بڑے حضرت ذکر اُن کا فرماتے، اور دستیاب ہوتے"

(اردو ترجمہ سیر المجالس ص ۳۶-۳۵، ترجمہ کی عبارت ہو بہو نقل کر دی گئی ہے)

خیر المجالس کی مذکورۂ بالا روایت ہمارے فاضل مؤلف جناب محمد خادم حسن صاحب زبیری کی نظر سے گذری ہے لیکن ان کو اس بیان کے صحیح تسلیم کرنے مین تامل ہے، وہ لکھتے ہین:-

"ہر چند کہ ان ملفوظات سے مولانا حمید قلندر نے انکار کیا ہے، اور خیر المجالس (ملفوظات حضرت نصیر الدین چراغ دہلوی مرتبہ مولانا حمید قلندر) مین صاف لکھا ہے کہ یہ ملفوظات آنحضرت کے نہین ہین، کیونکہ اُن مین بہت سی ایسی باتین ہین، جو آنحضرت کے علم و ارشاد

کے مناسب نہیں ہیں، نیز ان حضرات کی کوئی تصنیف نہیں، مگر افضل الفوائد (جس میں حضرت سلطان المشائخ کے ملفوظات مرتبہ حضرت امیر خسرو) میں مرقوم ہے کہ خواجہ بزرگ اور حضرت سلطان المشائخ جو کچھ اپنے پیر و مرشد سے سنتے تھے، وہ لکھ لیتے تھے، ان دونوں روایات کے اختلاف میں اس طرح تطبیق ہو جاتی ہے کہ سلطان المشائخ کے زمانہ تک یہ رسالے بہ شکل رسالہ جات ظاہر نہیں ہوئے تھے، بلکہ تبرکاً شجرہ کے ساتھ تھے، اور جزو شجرہ سمجھے جاتے تھے، نہ کہ رسالہ جات، علاوہ ازیں کسی دوسرے شخص کو ان حضرات کے ملفوظات مرتب کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں معلوم ہوئی، غیر متعلق شخص اتنی محنت کر کے یہ رسالے کیوں مرتب کرتا، نیز حضرت امیر خسرو کے بیان کو کسی طرح غیر معتبر نہیں کہا جا سکتا، (صفحہ ۲۴)

عاجز راقم کے سامنے اس وقت افضل الفوائد نہیں، فاضل مؤلف اگر امیر خسرو کی وہ فارسی عبارت نقل کر دیتے جس میں انھوں نے ظاہر کیا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ اپنے مرشد کے ملفوظات لکھ لیتے تھے، تو بہتر ہوتا، حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ حضرت سلطان المشائخ کے جانشین تھے، اس لئے انکے قول کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، اس کے علاوہ حضرت امیر خسرو کی رائے تو صرف اپنے مرشد کے متعلق ہے، اُس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ حضرت سلطان المشائخ کے مرشد اور دوسرے خواجگان چشت نے کتابیں لکھیں اور اُن کی جو متعدد تصانیف بازاروں میں بکتی ہیں، وہ انہی کی ہیں،

فاضل مؤلف نے کنجل اسرار کے علاوہ حضرت خواجہ کی تصانیف میں حدیث المعارف اور رسالہ موجودیہ (شاید رسالہ وجودیہ مراد ہو) کا ذکر کیا ہے، یہ دونوں کتابیں کسی کی نظر سے نہیں گذریں، صرف اُن کے نام سے منسوب ہیں، علمی دنیا میں ایسی مثالیں سینکڑوں ملیں گی کہ ایک تصنیف مالی فوائد اور دنیاوی اغراض کی خاطر دوسرے کے نام سے منسوب کر دی گئی ہے، حضرت خواجہ کی عظیم المرتبت شخصیت سے فائدہ اٹھانے کی غرض سے مجاوروں نے کوئی تصنیف اُن کے نام سے منسوب کر دی ہو تو

کوئی تعجب انگیز بات نہیں،

فاضل مؤلف کا یہ بھی خیال ہے کہ دیوان معین جو عام طور سے بازاروں میں بکتا ہے، وہ حضرت خواجہ ہی کا دیوان ہے، اس سلسلہ میں وہ لکھتے ہیں کہ

"ہر چند کہ ایک گروہ دیوان معین کو معین الدین کاشفی کی تصنیف کہتا ہے آپ کا نتیجۂ فکر نہیں مانتا، مگر شوکتِ کلام زبان حال سے کہہ رہی ہے یہ معمولی عارف کا کلام نہیں، بلکہ اس میں جن اعلیٰ مقامات معرفت، نکات تصوف اور فنائے تامہ کا اظہار کیا گیا ہے وہ آپ ہی جیسے عالی مرتبت اہل اللہ فرما سکتے ہیں" (ص ۹۵)

آگے چل کر پھر رقمطراز ہیں :-

"ہماری رائے میں موجودہ دیوان آپ ہی کے جذباتِ صادقہ، فکر بلند اور اعلیٰ ترین سیر جبروتی و ملکوتی اور لاہوتی کا نتیجہ مبارکہ ہے، منکرین دیوان نے بلا کسی دلیل کے صرف آپ کا ہمنام ہونے کی وجہ سے اس دیوان کو معین الدین کاشفی کا دیوان بتایا ہے، مگر اس کی تائید میں کوئی قابلِ قبول ثبوت کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گذرا، اس لئے ہم اس دیوان کو غریب نواز کی نسبت سے محروم نہیں کر سکتے، (صفحہ ۹۵)

شاید فاضل مؤلف کی نظر سے پروفیسر محمود شیرانی مرحوم کا مقالہ "دیوان حضرت خواجہ معین الدین حسن سجزی چشتی اجمیری" جو رسالہ اردو جولائی ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا تھا نہیں گذرا، اگر یہ محققانہ اور مدلل مضمون اُن کی نظر سے گذرا ہوتا، تو وہ ہرگز یہ تحسر یہ نہ فرماتے کہ کوئی قابلِ قبول ثبوت میری نظر سے نہیں گذرا، ابھی چند سال پہلے پروفیسر عبدالغنی کی ایک انگریزی کتاب "مری مغل پرشین اِن ہندوستان" شائع ہوئی ہے، اس میں پروفیسر موصوف نے غالباً حضرت خواجہ معین الدین کی ذات سے غایت عقیدتمندی کے اظہار میں دیوان معین کو انہی کا دیوان سمجھکر اُن کو حافظ سے زیادہ بہتر اور

زیادہ شیرین کلام شاعر ثابت کیا تھا، پروفیسر موصوف کی اس کتاب پر پروفیسر شیرانی مرحوم نے رسالہ اردو کے شمارہ جنوری ۱۹۳۳ء میں بڑی سخت تنقید کرتے ہوئے لکھا تھا کہ تمام دنیا کے برخلاف نہ صرف خواجہ صاحب کو شاعر ہی ثابت کر دینا، بلکہ پورے جوش و خروش کے ساتھ ان کی شاعری کو حافظ سے بھی بڑھا دینا ع

آرزو خوبست اما این قدر ہا خوب نیست

پروفیسر عبدالغنی نے اس تنقید کا جواب دینے کی کوشش کی، اور اپنا جواب ایک رسالہ کی صورت میں شائع کیا، جس کے ٹائٹل پر انھوں نے بعض غلط فہمیوں کی بنیاد پر "ضمیمہ رسالہ معارف" لکھدیا ہے حالانکہ ان کا یہ لکھنا بالکل درست نہ تھا، اس رسالہ میں انھوں نے حضرت خواجہ کو بعض تذکرہ نویسوں کے حوالہ سے شاعر تو ثابت کر دیا لیکن اُن کے صاحبِ دیوان ہونے پر اصرار نہیں کیا ہے، اس رسالہ کا جواب الجواب اورینٹل کالج میگزین کے ۱۹۳۹ء و ۱۹۵۰ء کے مختلف شماروں میں پروفیسر ابراہیم ڈار، اسماعیل کالج بمبئی نے دیا، اور ابھی اگست ۱۹۵۰ء کے رسالہ اردو میں بھی ان کا ایک مقالہ "دیوان خواجہ معین الدین چشتیؒ" کے عنوان سے شائع ہوا ہے، پروفیسر محمود شیرانی مرحوم اور پروفیسر ابراہیم ڈار نے اپنی تحقیقات سے یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا معین الدین فراہی کاشفی نہیں، کی تصانیف معارج النبوۃ اور تفسیر سورۂ فاتحہ میں بہت سی ایسی غزلیں ہیں، جو دیوان معین میں پائی جاتی ہیں، اس لئے دیوان معین دراصل مولانا معین الدین فراہی کے کلام کا انتخاب ہے، معین الارواح کے فاضل مؤلف اگر ان تحقیقات سے باخبر ہوتے تو دیوان معین کو حضرت خواجہ کا دیوان تسلیم کرنے پر اصرار نہ کرتے، اور یہ اصرار اس لئے بھی بے جا ہے کہ حضرت خواجہ کا صاحبِ دیوان ہونا ان کا کوئی وصف یا کمال نہیں، اور نہ اُن کی شاعری اُن کے لئے وجہ امتیاز ہے،

معین الارواح کے حصۂ دوم میں سیرۃ مقدسہ کے عنوان سے حضرت خواجہ کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ ان کی تعلیمات کو بھی واضح طور پر پیش کیا گیا ہے، یہ تعلیمات حضرت خواجہ کے ملفوظات سے مرتب کی گئی ہیں، لیکن فاضل مؤلف نے جس تلاش و جستجو سے اپنی کتاب لکھی ہے، اسی محنت و کاوش

کے ساتھ یہ بھی دکھانے کی کوشش کرتے کہ ان ملفوظات میں سے کون صحیح اور کون اکاتی ہے تو یہ اُن کا بڑا علمی کارنامہ ہوتا، کیونکہ خواجگان چشت کے ملفوظات کے مجموعوں کو غور سے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ ہوجاتا ہے کہ بعض ملفوظات ان بزرگان دین کے ہرگز نہیں ہوسکتے، مثال کے طور پر حسب ذیل ملفوظ ملاحظہ ہو جس کو فاضل مؤلف نے اپنی کتاب کے صفحہ ۱۳۶ پر نقل کیا ہے،

"حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ معین الدین قدس سرہٗ کی خدمت اقدس میں حاضر تھا اور اہل صفہ بھی موجود تھے، اولیاء اللہ کا تذکرہ ہو رہا تھا، اس درمیان میں ایک شخص بیعت ہونے کے لئے حاضر خدمت ہوا، اور آپ کے قدموں پر سر رکھا، غریب نواز نے فرمایا بیٹھو، اس نے کہا میں مرید ہونے کے لئے حاضر ہوا ہوں آپ اس وقت اپنے حال میں تھے، فرمایا اس شرط پر مرید ہوسکتے ہو کہ ایک مرتبہ کہو لا الٰہ الا اللہ چشتی رسول اللہ چونکہ وہ راسخ العقیدۃ تھا، اُس نے فوراً اس طرح کہا غریب نواز نے اس کو مرید کرنے کیلئے ہاتھ بڑھایا، اور خلعت خاص سے سرفراز فرمایا،

یہ روایت حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مجموعہ ملفوظات فوائد السالکین سے لی گئی ہے، لیکن یہ روایت کبھی قابل قبول نہیں ہوسکتی، گو فاضل مؤلف نے اس کی مدافعت میں یہ تاویل کی ہے، کہ

"اگرچہ سرسری نظر سے دیکھنے میں مذکورۂ بالا الفاظ شرعاً قابل اعتراض معلوم ہوتے ہیں، مگر لغوی معنی کے پیش نظر ہرگز قابل اعتراض نہیں، نیز صاحبان حال نے اس قسم کے کلمات اکثر فرمائے ہیں، چنانچہ سید الطائفہ حضرت جنید البغدادی اور حضرت بایزید بسطامی وغیرہ کے حالات میں بھی ایسے واقعات موجود ہیں، بلکہ خود سرور عالم نے بھی طواف میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے سرگوشی کرنے کے موقعہ پر ارشاد فرمایا "میں نے اُن سے سرگوشی نہیں کی، بلکہ خدا نے کی" نیز ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہوتا ہے کہ "جس نے مجھے دیکھا اُس نے خدا کو دیکھا"

اس تاویل کی حیثیت عذر گناہ بدتر از گناہ سے زیادہ نہیں، اگر ہم مذکورہ بالا ملفوظات کو الحاقی سمجھ لیں، تو پھر کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی، اسی قسم کے ملفوظات کے متعلق سیر العارفین میں ہے

ایک شخص نے حضرت نصیر الدین محمود اودھی سے عرض کیا کہ میں نے خواجہ قطب بختی والدین قدس سرہٗ کے ملفوظات میں ایسا کچھ لکھا ہوا دیکھا ہے آپنے جواب میں فرمایا کہ بالکل غلط ہے، میں نے بچشم خود دیکھا ہے، حاشا للہ یہ کلام ان کا نہیں ہے، اکثر غلط غلا کلمات الحاقی ہیں جو مجاوروں نے بڑھا دئے ہیں کسی طرح قطب صاحب قدس سرہ کے حال و اعمال کے موافق نہیں ہیں، (جلد ۲ ص ۶۲)

اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حضرت خواجہ معین الدین کے بعض ملفوظات الحاقی ہیں، جو اُن کی عملی اور نظری تعلیمات کے بالکل منافی ہیں،

کتاب کے حصہ سوم میں حضرت خواجہ کی درگاہ اور اُن کے عُرس کے مراسم کی تفصیلات درج ہیں، حصہ چہارم میں حلقہ ارادت کے عنوان سے گذشتہ اور موجودہ عہد کے ان اکابر کا ذکر ہے جس کو حضرت خواجہ سے عقیدت رہی، حصہ پنجم میں حضرت خواجہ کی درگاہ شریف کے گذشتہ اور موجودہ درباریوں کا ذکر ہے حصہ ششم میں اجمیر کی مختصر تاریخ ہے، کتاب کے آخری تین حصے اجمیر شریف کے زائرین کے مطالعہ کے لئے مفید ہیں مجموعی حیثیت سے یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے کہ اس میں حضرت خواجہ سے متعلق زیادہ سے زیادہ لٹریچر اکٹھا کر دیا گیا ہے، اور آیندہ جب کوئی اہلِ قلم حضرت خواجہ کی سوانحعمری سلیقہ سے مرتب کرنے کی کوشش کرے گا تو یہ کتاب بلاشبہہ بہت مفید اور معاون ہوگی،

تصوفِ اسلام

اسلامی تصوف کا عطر، قدما صوفیہ کی تعلیمات کا لُبِّ لباب، اور اُن کی تصانیف پر تبصرہ،

قیمت :- عہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

یادِ ایام از نواب سر حافظ محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری بقطع بڑی ضخامت ۲۵۰ صفحے کاغذ، کتابت وطباعت، بہتر قیمت چار روپے، پتہ غالباً راحت منزل علی گڈھ سے ملے گی،

ہمارے صوبہ کے رؤسا مین خاندانی امارت و وجاہت ذاتی قابلیت وصلاحیت، تدبر و ہوشمندی، اخلاق وسیرت اور دینداری مین نواب سر محمد احمد سعید خان رئیس چھتاری کا ممتاز درجہ ہے، اُن کی صلاحیت وسلامت روی کی بدولت کونسل کی ممبری سے لے کر وزارت، (وممبری)، گورنری اور ریاست حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ تک کے اعزازان کو حاصل ہوئے، قومی اور سیاسی کامون مین بھی ان کا حصہ رہا ہے، جس سے ہر پڑھا لکھا شخص واقف ہے، زیرِ نظر کتاب سے اُن کی نئی تصنیفی صلاحیت کا علم ہوا، آپ بیتی جگ بیتی سے زیادہ دلچسپ اور سبق آموز ہوتی ہے، لیکن اردو مین خود نوشت سوانح عمریون کا بالکل رواج نہین ہے، اور سر سید رضا علی مرحوم کے اعمال نامہ کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر خود نوشت سوانح عمری موجود نہین ہے، یادِ ایام اردو مین دوسری کتاب ہے، اس کے دو چار یا دو حصے ہین، ایک صاحب سوانح کے نجی اور ذاتی حالات دوسرے اُن کی قومی وسیاسی زندگی، ذاتی حالات مین خاندان، بچپن، تعلیم و تربیت، انتظام ریاست اور حکام کے تعلقات وغیرہ کے حالات ہین، جو اگرچہ مختصر ہین لیکن دلچسپی سے خالی نہین، اور اُن سے اس دور کے رؤسا کی سوسائٹی اور اُن کے مذاق ومشاغل پر روشنی پڑتی ہے، کتاب کا اصل حصہ مصنف کی سیاسی وقومی زندگی کا ہے، اُن کی سیاسی زندگی چیمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ یعنی

۱۹۱۹ء سے شروع ہوتی ہے اور کانگریسی وزارتون کے قیام کے زمانہ ۱۹۳۷ء تک قائم رہتی ہے، اس درمیان مین گورنمنٹ کونسل کے ممبر، صوبے کے وزیر، ہوم ممبر اور گورنر رہے، اور وقتاً فوقتاً قومی معاملات مین بھی حصہ لیتے رہے، اسلیے حکومت اور ملکی سیاست دونون سے انکا ارتباط رہا، یہی زمانہ ہندوستانی سیاست کے طوفان کا تھا، ہمارے قومی، ملکی اور سیاسی مسائل اسی زمانہ مین پیدا ہوئے، ان کو اپریشن اور خلافت کی تحریکین شروع اور ختم ہوئین، گورنمنٹ کے ساتھ آئینی اور غیر آئینی معرکے ہوئے، سائمن کمیشن آیا، کانگریس اور لیگ کے اختلافات شروع ہوئے، ہندو مسلم مسائل نے شدت اختیار کی، زمیندارون اور کاشتکارون مین کشمکش پیدا ہوئی، غرض ایوان حکومت کے اندر اور باہر دونون جگہ بہت سے معاملات و مسائل چھڑے، مصنف کو چونکہ حکومت اور قومی سیاست دونون سے تعلق تھا، اس لیے ان کو ان تمام معاملات سے سابقہ رہا، اس لیے اس کتاب مین مصنف کے سوانح کے سلسلہ مین اس دور کی عموماً اور صوبہ متحدہ کی خصوصاً پندرہ سالہ سیاسی سرگذشت آگئی ہے، یہ سارے واقعات ہم مین سے اکثرون کی نگاہون کے سامنے گذرے ہین، اس لیے اس کتاب کے مطالعہ سے وہ دور نگاہون کے سامنے آجاتا ہے، اور پڑھنے والا ان کو لطف و دلچسپی سے پڑھتا ہے، اس تاریخی سرگذشت کے ضمن مین اس دور کے ارکان حکومت اور قومی رہنماؤن کے حالات اور مختلف النوع دلچسپ واقعات بھی معرض تحریر مین آگئے ہین، غرض کتاب گوناگون حالات اور دلچسپیون کا مجموعہ ہے، انداز تحریر دلکش اور شگفتہ ہے، کتاب بلکہ مصنف کا نمایان وصف جو اس کے صفحہ صفحہ سے نمایان ہے، انکی متانت و سنجیدگی، اعتدال و میانہ روی، اور تحریر کی شائستگی ہے، جس دور کے یہ حالات ہین وہ حکومت اور عوام کی کشمکش اور ہندو مسلم اختلاف کا دور تھا، اور بہت سے معاملات مین مصنف کی حیثیت فریق کی تھی، اس لیے اس کتاب مین جا بجا اختلافی مسائل بھی آئے ہین لیکن ان کا قلم کہین بھی اعتدال و متانت کے جادہ سے نہین ہٹا ہے، اور مصنف کی شگفتگی تحریر، اور لطائف کی آمیزش نے ان خشک واقعات مین خاصی ادبی چاشنی پیدا کردی ہے، اس کے مطالعہ سے پہلے یہ خیال مین بھی نہ تھا کہ مصنف کا ادبی مذاق اتنا ستھرا ہے، اور وہ ایسی اچھی کتاب لکھ سکتے ہین، یہ کتاب اپنی گوناگون دلچسپیون کے لحاظ سے نہایت قابل قدر اور تعلیم یافتہ طبقہ کے مطالعہ

کے لائق ہے۔

دیارِ عرب مین چند ماہ از مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۲۰۹ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت للہیہ، پتہ مکتبہ چراغ راہ، نمبر ۹ لوٹیا بلڈنگ رام باغ روڈ، کراچی۔

مصنف نے اسلامی جماعت کی تبلیغ واشاعت کے لیے گذشتہ سال عراق ونجد وحجاز کا سفر کیا تھا، اور اس سلسلہ مین ان ملکون کے تمام بڑے بڑے شہرون کی سیاحت کی، اور حج وزیارت سے بھی مشرف ہوئے، مذکورہ بالا کتاب اس سفر کی علمی سوغات ہے، یہ سفرنامہ عام سفرنامون سے کسی قدر مختلف ہے، مصنف کا ذوق خالص دینی اور علمی ہے، اور انھون نے ایک مذہبی مقصد کے لیے سفر کیا تھا، اس لیے سیر وتفریح کے بجائے خصوصیت کے ساتھ وہ ہر مقام کے علما، اور دینی حلقہ سے زیادہ ملے، ان سے مذہبی معاملات ومسائل پر تبادلہ خیال کیا، مذہبی اور علمی ادارون کو دیکھا، مذہبی نقطۂ نظر سے عقائد وخیالات واعمال کا جائزہ لیا، اسلیے اس سفرنامہ مین زیادہ تر ان ملکون کے علمی ومذہبی حالات ہین، اور مصنف نے بڑے دل لیکن بڑی سچائی اور جرأت کے ساتھ ان اسلامی ممالک کے مذہبی تساہل وتفرنج پر تنقید کی ہے، اور جلالۃ الملک ملک الحجاز کی شریعت پناہی کی حقیقت بھی پوری طرح واضح کی ہے، یہ اس سفرنامہ کا سب سے زیادہ قابل قدر پہلو ہے، اس سے ان ملکون کی مذہبی وعلمی حالات کی تفصیل معلوم ہوجاتی ہے، ضمناً ان مقامات کے دوسرے حالات اور سفر کے مشاہدات وتجربات بھی آگئے ہین، مصنف کا سنجیدہ علمی ومذہبی ذوق اور قلم کی پختگی پورے سفرنامہ مین نمایان ہے، البتہ ان کے قدرشناسون اور ہواخواہون مین انہی کے بقول ان کی "خشک باتیت" ہمیشہ کھٹکی ہے، جو اس سفرنامہ مین بھی موجود ہے، لیکن ان مین دین کا سچا جذبہ ہے، اس لیے ان کا دل باطنی کیفیتون سے خالی نہین ہے، اور اس کے اثرات اس سفرنامے مین بھی کہین کہین نظر آتے ہین، مثلاً مدینہ طیبہ کی حاضری کے سلسلہ مین لکھتے ہین "وہابیت کی خشکی کے باوجود دل بسیج رہا ہے" (ص ۳۰۵) اسی

سلسلہ مین آگے چل کر قصیدہ بردہ کے متعلق لکھتے ہین" بلاشبہ اس مین کہین کہین مقام نبوت سے تجاوز ہوگیا ہے لیکن اس کا ہر شعر درد و سوز مین ڈوبا ہے، راقم اپنی وہابیت کے باوجود اسے پڑھتا اور اور لطف اندوز ہوتا رہا" (ص ۱۳۴) مصنف مین دین کی سچی تڑپ ہے، اس لیے یقین ہے کہ انشاء اللہ آیندہ چلکر ان کی وہابیت کی خشکی مین محبت و رحمانیت کی تری بھی پیدا ہوجائے گی، سفرنامہ اپنے مفید علمی و مذہبی معلومات کے لحاظ سے اصحاب علم کے مطالعہ کے لائق ہے،

ملفوظات حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ | از جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی تقطیع اوسط ضخامت ۱۶۸ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت: عہ، پتہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ،

مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لمحہ تبلیغ دین کے لیے وقف تھا، انکے تمام افکار و تصورات اور اعمال و اقوال کا مرکز تبلیغ تھا، ان کی کوئی مجلس اور کوئی گفتگو اس مقصد سے خالی نہ ہوتی تھی، اور انکی زبان فیض ترجمان سے ہر وقت مسلمانون مین دینی روح کی تجدید، اور اس کے احکام کی تبلیغ اس کے علمی و عملی طریقون اور اس کے جملہ متعلقات کا چشمۂ فیض جاری رہتا تھا، مولانا منظور صاحب نعمانی مولانا مرحوم کی زندگی ہی مین ان کی دینی دعوت کے سرگرم مبلغ تھے، اور اس سلسلہ مین ان کو وقتاً فوقتاً مولانا کی خدمت مین حاضری اور قیام کا اتفاق ہوتا تھا، اور وہ مسلمانون کی دینی تجدید اور دعوت و تبلیغ کے متعلق مولاناؒ کے ملفوظات قلم بند کرتے جاتے تھے، اب ان کو انھون نے افادۂ عام کی غرض سے شائع کر دیا ہے، ان ملفوظات مین اسلامی تعلیمات، اور اسلامی زندگی کے حصول کی پوری روح آگئی ہے، اور وہ اپنے گوناگون مذہبی و روحانی فوائد کے اعتبار سے مسلمانون کے ہر طبقہ کے مطالعہ کے لائق ہین،

تردید حاضر و ناظر از مولانا عبدالرؤف خان صاحب رحمانی تقطیع بڑی ضخامت ۱۱۲ صفحے کاغذ

کتابت وطباعت معمولی، قیمت عہ پتہ: مدرسہ جھنڈے نگر، امدت گنج، ضلع بستی،

بریلوی جماعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو علی الاطلاق حاضر وناظر اور عالم الغیب مانتی ہے مولوی عتیق الرحمن صاحب بریلوی نے اسکے اثبات مین کوئی رسالہ خیر الانبیا لکھا تھا، مذکورہ بالا کتاب اس کی تردید مین لکھی گئی ہے، اس مین خیر الانبیا کے تمام دلائل کا رد کیا گیا ہے، یہ جھگڑا بہت پرانا ہے، اس پر دونون جانب سے ہزارون صفحات لکھے جا چکے ہین، اور اب اسکا کوئی پہلو تشنہ باقی نہین ہے، اور اس پر کوئی نیا اضافہ نہین کیا جاسکتا، اس لیے ان مسائل پر لکھنا محض اضاعت وقت ہے، اسکے علاوہ اب زمانہ کا مذاق بدل چکا ہے نئے نئے سیاسی ومعاشی کلامی مسائل درپیش ہین، ہر طرف الحاد ودہریت کا طوفان بپا ہے، کفر واسلام کا معرکہ چھڑا ہوا ہے، نام کے مسلمانون کا ایک طبقہ سرے سے اسلام ہی سے منحرف ہو رہا ہے، ایسی حالت مین اسکو چھوڑ کر پرانے دقیانوسی مسائل مین اپنی قوت اور وقت ضائع کرنا اسلام کی کوئی مفید خدمت نہین ہے، افسوس ہے کہ ہمارے علمار کا ایک طبقہ خواہ بریلوی ہون یا اہل حدیث وقت کے ضروری اور اہم مسائل کو چھوڑ کر انہی غیر ضروری مسائل مین الجھا ہوا ہے جنکی جانب اس زمانہ مین کسی کو توجہ کرنے کی بھی فرصت نہین ہے، اس وقت ضرورت اسکی ہے کہ انکو چھوڑ کر سارا زور کفر والحاد کے مقابلہ مین اسلام کی نصرت وحمایت مین صرف کیا جائے، تاہم مصنف کی نیت نیک اور انکا مقصد صحیح ہے، اسلیے انکا دینی جذبہ قابل قدر ہے، اور اس کا اجر انشاء اللہ ان کو ملے گا،

آسان قرآنی کورس کے بیس سبق | از جناب مولوی عبد السبحان صاحب عظیمی ربانی منتی فاضل تقطیع بڑی ضخامت ۴۸ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۹ر پتہ: بزم قرآن مسجد سعیدیہ کوچہ معروف اسپاری کنٹھ، ہونٹس روڈ، مدراس۔

خاص قرآن مجید کی تعلیم اور اس کا ترجمہ سمجھنے کیلیے اردو مین عربی قواعد کے متعدد قرآنی نصاب مرتب کیے گئے ہین، ان مین سب سے زیادہ مشہور ومفید ادارہ تعلیمات اسلامی لکھنؤ کا نصاب ہے، مصنف نے بھی اسی مقصد کے لیے یہ نیا رسالہ لکھا ہے، اس مین ادارہ تعلیمات اسلامی کی کتابون سے بھی انھون نے فائدہ اٹھایا ہے اور اپنے تجربے سے نئے اضافے بھی کیے ہین، اس رسالہ مین بیس سبق ہین، اور قرآن مجید کے ترجمہ کی مشق کے لیے مفید ہین

" م "

جلد ۶۶ ماہ محرم الحرام ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ نومبر ۱۹۵۰ء عدد ۵

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۲۲، ۳۲۴

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت	مولانا عبد السلام ندوی	۳۲۵، ۳۲۶
مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۳۲۷-۳۶۰
خدمتِ حدیث میں خواتین کا حصہ	حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی	۳۶۱-۳۷۵
	رفیق دار المصنفین	
تاریخ میں کا ایک ورق،	مولانا ابو الجلال ندوی	۳۷۶، ۳۸۸

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب	شاہ معین الدین احمد ندوی	۳۸۹، ۳۹۹
مطبوعاتِ جدیدہ	"م"	۴۰۰

خلفاے راشدین جلد اول

اس میں خلفاے راشدینؓ کے ذاتی حالات و فضائل مذہبی اور سیاسی کارنامون اور فتوحات کا مفصل بیان ہے، قیمت ۱- ۸ر

مینجر

شذرات

ہندوستان کے فرقہ پرستون کی تنگ دلی اور تنگ نظری اب اس درجہ کو پہنچ گئی ہے کہ وہ ہر اُس چیز کے دشمن بن گئے ہین جس کو مسلمانون کے ساتھ کسی قسم کی نسبت ہو، وہ اُن کی کسی یادگار کو دیکھنا گوارا نہین کرتے اور ہندوستان مین اُن کی ہزار سالہ تاریخ کا ایک ایک نشان مٹا دینا چاہتے ہین، جو ایک متمدن قوم کی شان سے فروتر ہے، اُس کا فرض تو یہ ہونا چاہئے کہ وہ علم وفن کی ہر متاع اور تہذیب وتمدن کے ہر نقش کو خواہ اس کا تعلق کسی فرقہ یا قوم سے ہو باقی رکھکر اپنی تعمیر وترقی مین اُس سے مدد لے، اور جدید ہندوستان اور ہندو مسلمانون کی مشترکہ قومیت کی تعمیر کے لئے تو یہ اور بھی زیادہ ضروری ہے،

اس بارہ مین ہم کو یورپ کی قومون سے سبق حاصل کرنا چاہئے، عیسائی دنیا مسلمانون کی پرانی حریف ہے، ان دونون مین بڑے سخت مذہبی اختلافات اور سیاسی معرکے برپا رہ چکے ہین، مسلمانون نے اُن کے مذہبی مرکز بیت المقدس پر جو مسلمانون کا بھی مقدس شہر اور اُن کا قبلہ رہ چکا تھا، حضرت عمرؓ ہی کے زمانہ مین قبضہ کرلیا تھا، پھر ایک صدی کے اندر اُن کے سارے مشرقی مقبوضات چھین لئے، اور خود یورپ کے ملکون مین آسپین، سسلی، یونان، قسطنطنیہ، بلقانی ریاستون، بحر روم کے بڑے بڑے جزیرون، اور فرانس، پرتگال اور اٹلی کے بعض حصون پر قبضہ کرلیا، اور صدیون یہان کے حکمران رہے، دونون مین مدتون جنگ صلیبی کا خونریز سلسلہ جاری رہا، جس مین سارا یورپ مسلمانون کے خلاف صف آرا تھا، غرض مذہبی وسیاسی دونون حیثیتون سے مخالفت اور دشمنی کا کوئی وقیقہ باقی نہین رہا،

لیکن مسلمانون نے اپنے دورِ حکومت مین اپنے تمام مقبوضہ ملکون کو تہذیب وتمدن کے زیور سے آراستہ اور

علم وفن کی روشنی سے منور کیا تو یورپین قومین اپنے دورِ جہالت تک تو اُن کی دشمنی پر قائم رہین لیکن علم کی روشنی پھیلنے کے بعد جب اُن کی آنکھون سے تعصب کا پردہ ہٹا اور اُن کو مشرقی دنیا اور خود اپنے ملکون مین مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامے نظر آئے تو انھون نے اُس کا پورا اعتراف اور احساس شناسی کا حق ادا کیا گو استعماری اغراض کی بنا پر ان کا ایک طبقہ مسلمانون کے خلاف زہر بھی اگلتا رہا لیکن اُس کے مقابلہ مین مسلمانون کے مداحون اور حامیون کی جماعت ہر دور مین زیادہ رہی اور یورپ کے ہر ملک کے علما و محققین نے مسلمانون کے علمی تمدنی اور اخلاقی کارنامون پر سیکڑون کتابین لکھین، چنانچہ آج یورپ کی کوئی علمی اور بڑی زبان اس قسم کی تصانیف سے خالی نہین ہے اس کے ساتھ انھون نے اسلامی علوم وفنون کو زندہ کیا اور عربی وفارسی کی ہر فن کی سیکڑون نادر ونایاب کتابون کو تلاش کرکے بڑی محنت و قابلیت سے تصحیح وتحشیہ کے ساتھ شائع کیا، اور اپنی اپنی زبانون مین بہت سی اہم کتابون کے ترجمے کئے اور آج مسلمانون کے قدیم علمی ذخیرہ کا بڑا حصہ انھی کے بدولت زندہ ہے اس کے علاوہ طب، طبعیات، نباتات، حساب، ہندسہ، ہیئت وجغرافیہ وغیرہ کی مسلمان مصنفین کی کتابین اور ان کے لاتینی ترجمے کئی صدی تک یورپ کی یونیورسٹیون کے نصاب مین داخل رہے، یورپ کے قرونِ مظلمہ مین ان کے ہاتھون مسلمانون کے جو آثار مٹ چکے تھے وہ مٹ چکے تھے لیکن جو باقی رہ گئے تھے، اُن کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جس کا مشاہدہ آج بھی اسپین مین کیا جاسکتا ہے غرض یورپین قومون نے علم وروشنی کے دور مین نہ صرف مذہبی وسیاسی اختلاف کی بنا پر مسلمانون کے آثار کو مٹایا نہین بلکہ اُن کو زندہ رکھکر اُن سے فائدہ اٹھایا، ورنہ وہ آج تک جہالت کی تاریکی مین بھٹکتی رہتین، یا کم از کم ترقی کی منزلین اتنی جلد طے نہ کرتین،

اس کے مقابلہ مین ہندو مسلمانون مین ہمیشہ اتحاد ویگانگت کا تعلق رہا، گو مسلمان ہندوستان کے حاکم تھے لیکن وہ اجنبی حکمرانون کی طرح نہین رہے، بلکہ انھون نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا، اور یہین شادی بیاہ کرکے رہ بس گئے، یہان کی بہتیری رسمین تک اختیار کرلین، اور مسلمانون اور یورپین قومون کے مقابلہ مین ہندو مسلمان مختلف حیثیتون سے ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، دونون مشرقی ہین، ہندوستانی مسلمانون کی بڑی تعداد نسلاً بھی ایک ہے، انھین

بہت سے تہذیبی اور کلچرل پہلو مشترک ہین، ہندوستان کی ترقی مین دونون کا حصہ ہے چنانچہ اسلامی ہند کے بہت سے علمی و تمدنی کارنامے دونون کے مشترکہ ہین لیکن اس کے باوجود محض اس جرم مین کہ وہ اسلامی دور کی یادگار ہین، فرقہ پرست انکو برداشت نہین کر سکتے، اور ان کا نام و نشان مٹا کر ہندوستان کی تاریخ سے اسلامی عہد کا باب ہی خارج کر دینا چاہتے ہین جو ایک مہذب اور تعلیم یافتہ قوم کی شان سے بعید ہے، ان یادگارون کو نہ صرف زندہ رکھنا چاہئے بلکہ ان کے جو نقش و نشان بے ہو گئے ہون انکو اجاگر کرنا چاہئے کہ درحقیقت وہ دونون کے مشترک کارنامے دونون کے لئے باعث فخر اور ہندوستان کی تمدنی عظمت کا نشان ہین، ع:- یہ ٹوٹے آئینے ہین زیب و زینت ان کی محفل کے

اس لئے ان کا جو نقش بھی مٹے گا اس سے تنہا اسلامی عہد کا نہین بلکہ ہندوستان کی عظمت کا ایک نشان مٹ جائے گا،

گرچہ مثل غنچہ دلگیریم ما گلستان میرد اگر میریم ما

ان حالات مین یہ سن کر حیرت کے ساتھ مسرت ہوئی کہ نولکشور پریس نے جس نے اسلامی علوم و فنون اور عربی فارسی اور اردو زبان کی بڑی گرانقدر خدمت انجام دی ہے اپنی پرانی روایات و خصوصیات کو قائم رکھنے کا فیصلہ کیا ہے، اور اس مطبع سے حسب دستور تینون زبانون کی کتابون کی طبع و اشاعت کا سلسلہ جاری رہے گا، فرقہ پرستی کے اس دور مین یہ فیصلہ قابل ستایش اور یہ نمونہ قابل تقلید ہے، درحقیقت علوم و فنون کی خدمت کو مذہب و فرقہ کی قید سے بلند رکھنا چاہئے ورنہ سائی ترقیان مسدود ہو جائین گی اگر مطبع کے کارکن اودھ اخبار کو بھی دوبارہ جاری کر دیتے تو ایک پرانی یادگار زندہ ہو جاتی،

مسلمانون مین زبانی تو اردو زبان کی محبت کا بڑا دعویٰ ہے مگر ہندوستان مین اسکے زوال کا بڑا ماتم ہے لیکن اسکی جانب سے اُن کی غفلت و بے توجہی کا حال یہ ہے کہ وہ اردو کے اہم اور ضروری اخبارون اور رسالون کو بھی زندہ نہین رکھ سکتے، یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ صدق جیسا اہم اور مفید اخبار جس کی قیمت بھی بہت کم ہے، مالی دقتون کی بنا پر چند دنون سے بند ہو گیا تھا، اس کے فاضل اڈیٹر مولانا عبدالماجد صاحب مدظلہ نے دوبارہ اس کو جاری کرنے کا ارادہ کیا ہے، اور آیندہ مہینہ سے وہ نکلنے لگے گا، اگر مسلمانون مین کچھ بھی احساس باقی ہے تو اُن کو صدق کا خریدار بن کر اس کی زندگی کا سامان فراہم کرنا چاہئے،

مقالات

معجزۂ قرآنی کی نوعیت

از

مولانا عبدالسلام ندوی

(۲)

گذشتہ نمبر مین معجزۂ قرآنی کی جو خصوصیات بیان کی گئین اُن سے ثابت ہوگیا کہ وہ کوئی دنیوی احسان یا مادی طاقت نہین ہی، بلکہ خالص روحانی طاقت ہے، جو جن وانس دونون کو نیک کامون کے کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اب اس نمبر مین یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ روحانی طاقت کوئی وقتی چیز نہین تھی، بلکہ ایک ابدی دولت ہی جو مسلمانون کے دینی خزانے مین ہمیشہ محفوظ رہیگی اور ان پر قیامت تک اپنا اثر ڈالتی رہیگی کیونکہ

معجزات کی دو قسمین ہین حسی اور عقلی، حسی معجزات کا اثر محدود ہوتا ہے، کیونکہ وہ آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جو لوگ اُن کو دیکھتے ہین، صرف انہی پر ان کا اثر پڑتا ہے، اور جب انکا زمانہ ختم ہوجاتا ہے، تو یہ معجزات بھی ختم ہوجاتے ہین، اور ان کا اثر بھی زائل ہوجاتا ہے لیکن عقلی معجزات کی حالت اُن سے مختلف ہوتی ہے، وہ دل کی آنکھون سے دیکھے جاتے ہین، اس لئے جب تک دنیا مین صاحب عقل وصاحب بصیرت لوگ موجود ہین، اُن کا معجزانہ اثر باقی رہتا ہی اور وہ ہر زمانہ مین پیغمبر کی صداقت

کی شہادت دیتے ہیں، انبیاء بنی اسرائیل کے اکثر معجزے حسی ہوتے تھے جن کا اثر اُن کے زمانہ تک محدود تھا، اور اب ان معجزات کا نہ وجود ہے، اور نہ اُن کا اثر باقی ہے، اب عصائے موسیٰ، ید بیضا، داؤد، دم عیسیٰ اور ناقۂ صالح کا نہ وجود ہے، اور نہ ان کے دیکھنے والے موجود ہیں، اس کے علاوہ اس قسم کے معجزے ان انبیاء کے لئے موزون ہوتے ہیں جن کی شریعت خود دائمی اور ابدی نہیں ہوتی، بلکہ اس کا تعلق ایک محدود زمانے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے جو پیغمبر اس قسم کی محدود الوقت شریعت کو لے کر آتے ہیں، اُن کو اسی قسم کے محدود الوقت معجزے بھی عطا کئے جاتے ہیں،

لیکن اسلام ایک ابدی مذہب تھا، اس لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن مجید کی صورت میں ایک عقلی معجزہ عطا کیا گیا، جو اب تک موجود ہے اور ہر صاحب عقل و بصیرت کو اسلام کی دعوت دیتا ہے، یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من	ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے جن
الآیات ما مثلہ آمن علیہ	پر لوگ ایمان لائے، لیکن مجھ کو جو
البشر وانما کان الذی اوتیتہ	معجزہ دیا گیا وہ وحی ہے، اس لئے
وحیا اوحاہ اللہ الی فارجو ان اکون	مجھے توقع ہے کہ قیامت کے دن
اکثرھم تابعا یوم القیامۃ،	میرے پیرو اور پیغمبروں سے زیادہ
(صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن	ہوں گے،
باب کیف نزل الوحی واول ما نزل)	

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ اور انبیاء کے معجزے ان کے زمانہ کے ساتھ ختم ہو گئے، اور ان کو انہی لوگوں نے دیکھا جو اس وقت موجود تھے، لیکن قرآن مجید کا معجزہ قیامت تک موجود رہے گا، اور اسلوب بیان، بلاغت، اور غیبی خبروں کے دینے کی وجہ سے اس کی

معجزانہ حیثیت قائم رہے گی، اس لئے کوئی زمانہ ایسا نہیں آئے گا جس میں کوئی واقعہ جس کے ہونے کی خبر قرآن مجید نے دی ہے ظاہر نہ ہو، اور وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے نبوت کی صحت کی دلیل نہ ہو، اس حدیث کے ایک معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ گذشتہ پیغمبروں کے معجزات حسی ہوتے تھے، جو آنکھوں سے دیکھے جاتے تھے، جیسے حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا لیکن قرآن مجید کا معجزہ چشم بصیرت سے نظر آتا ہے، اس لئے آپکے پیرو اور پیغمبروں سے زیادہ ہوں گے، کیونکہ جو معجزہ آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ دیکھنے والوں کے فنا ہونے کے ساتھ ہی فنا ہو جاتا ہے، اور جو معجزہ عقل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے، وہ باقی رہتا ہے، اور کے بادیگرے اس کو لوگ ہمیشہ دیکھتے رہتے ہیں،

یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید ہمیشہ غور و فکر کی دعوت دیتا ہے،

افلا یتدبرون القرآن،	تو کیا پھر لوگ قرآن میں غور نہیں
(نساء - ۱۱)	کرتے،

اور یہی وجہ ہے کہ دور نبوت میں جو لوگ صاحب فہم و بصیرت تھے، قرآن مجید کا اثر ان پر سب سے زیادہ پڑتا تھا، اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم نے جب سورہ طور کی یہ آیتیں ام خلقوا من غیر شیء الخ سنیں تو ان کا دل اڑنے لگا، لیکن یہ اثر صرف ان کے فہم و بصیرت کا نتیجہ تھا، چنانچہ حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں،

قال الخطابی کانه	خطابی کہتے ہیں کہ چونکہ وہ اس آیت
انزعج عند سماع هذه	کے معنی اور مفہوم کو سمجھ گئے، اس لئے
الآیة لفهم معناها و	اس کو سن کر بیساختہ متاثر ہو گئے،
معرفته بما تضمنته فظهر الحجة	غرض انھوں نے اس دلیل کو سمجھ لیا

فاستدرکھا بلطیف طبعہ اور اپنی طبیعت کی لطافت کی وجہ سے
اس کو پا گئے،

حضرت انیسؓ خود شاعر تھے، وہ مکہ مین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملے اور واپس جاکر اپنے بھائی حضرت ابوذر غفاریؓ کو اس کی اطلاع دی، تو انھون نے پوچھا کہ لوگ آپ کے بارے مین کیا کہتے ہین"؟ انھون نے جواب دیا کہ لوگ آپ کو شاعر، کاہن اور جادوگر کہتے ہین" ؟ لیکن مین نے کاہنون کی باتین سُنی ہین لیکن محمد جو کچھ کہتے ہین وہ کاہنون کی بولی نہین، مین نے اُن کی باتون کو اوزان و اصناف شعر کے مقابلہ مین رکھا تو وہ شعر بھی نہین، خدا کی قسم آپ سچے اور لوگ جھوٹے ہین[1]

اس قسم کے اور بھی متعدد واقعات احادیث و سیر کی کتابون مین مذکور ہین جن کو ہم بخوف طوالت قلم انداز کرتے ہین،

اس تفصیل سے معلوم ہوا ہوگا کہ قرآن مجید کو گذشتہ انبیاء کے مادی معجزات پر ہر حیثیت سے تفوق اور فضیلت حاصل ہے، لیکن اس موقع پر سب سے زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ قرآن مجید کے مقابلہ مین تورات و انجیل کا کیا درجہ ہے ؟ ہمارے علماء نے چونکہ قرآن مجید کو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ مانا ہے اور تورات و انجیل مین یہ فصاحت و بلاغت موجود نہین ہے، اس لئے وہ ان دونون کتابون کو معجزہ تسلیم نہین کرتے، چنانچہ تہیلہ بوسکو رسالمی مین جہان اعجاز قرآنی پر بحث کی ہے، لکھا ہے کہ بعض لوگ کہتے ہین کہ قرآن مجید صرف اپنے الفاظ کی وجہ سے معجزہ ہے، اور بعض لوگ اس کو معنی کی بنا پر معجزہ کہتے ہین لیکن صحیح ترین قول یہ ہے کہ وہ لفظ و معنی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، کیونکہ اگر ہم اسکو صرف معنی کی وجہ سے معجزہ تسلیم کرین تو اس سے گذشتہ انبیاء کی کتابون کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا اور یہ صحیح نہین ہے، اور اگر صرف لفظ کی وجہ سے معجزہ تسلیم کرین تو ایسی حالت مین اگر الفاظ معنی سے

---

[1] صحیح مسلم کتاب الفضائل باب اسلام ابی ذرؓ

خالی ہون، تو وہ ایک لغو کلام ٹھہرے گا اور یہ محال ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ قرآن مجید لفظ اور معنی دونون حیثیتون سے معجزہ ہے، آگے چل کر ایک خاص عنوان یہ قائم کیا ہے کہ گذشتہ کتابین معجزہ تھین یا نہین ؟ اور اس عنوان کے تحت مین لکھا ہے کہ گذشتہ کتابین اس معنی مین معجزہ تھین کہ وہ خدا کا کلام ہین، اور قرآن مجید بھی خدا کا کلام ہے، تو جب اس حیثیت سے قرآن مجید معجزہ ہے، تو اور کتابین اور صحیفے بھی لازمی طور پر معجزہ قرار پائین گے، لیکن صحیح یہ ہے کہ تمام گذشتہ کتابین اور صحیفے بھی اگرچہ خدا ہی کا کلام تھے لیکن وہ معجزہ نہین تھے، کیونکہ خود خداوند تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ لوگ ان کتابون اور صحیفون مین تحریف کیا کرتے تھے لیکن اگر وہ معجزہ ہوتین، تو اُن مین تحریف نہین کی جا سکتی تھی، اور تمام کتابین خدا کا کلام تو ضرور ہین لیکن یہ ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانہ مین اور ایک شخص کے لئے تو معجزہ ہو لیکن دوسرے زمانہ اور دوسرے شخص کے لئے معجزہ نہ ہو، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا ان کے ہاتھ اور اُن کے زمانہ مین تو معجزہ تھا لیکن اُن کے زمانہ کے بعد معجزہ نہین رہا، یہی حالت اُن کی کتابون کی بھی ہے[1]،

قاضی ابو بکر باقلانی اعجاز القرآن مین لکھتے ہین، اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے علاوہ کیا خداوند تعالیٰ کا دوسرا کلام مثلاً توراۃ انجیل اور صحیفے بھی تمھارے نزدیک معجزے ہین ؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ ان مین جو غیبی خبرین ہین، ان کے لحاظ سے وہ بھی قرآن مجید کی طرح معجزے ہین لیکن نظم و تالیف کے لحاظ سے ان مین کوئی کتاب معجزہ نہین، کیونکہ خداوند تعالیٰ نے ان مین کسی کتاب کے وہ اوصاف نہین بیان کئے، جو قرآن مجید کے بیان کئے ہین، نیز یہ کہ اُن کے متعلق تحدی نہین کی گئی ہے جیسا کہ قرآن مجید کے متعلق کی گئی ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ان کتابون کی زبان مین فصاحت کے ایسے وجوہ نہین پائے جاتے، جن کی وجہ سے کلام مین مقابلۃً ایسے محاسن پیدا ہو جائین، جو حدِ اعجاز

---

[1] تمہید ابو شکور سالمی ص۷۵، ۷۶،

تک پہنچ جائین، ان زبانون مین جو کلام موجود ہے، وہ تقریباً یکسان ہے، ہمارے اصحاب تمام زبانون کی یہی خصوصیت بیان کرتے ہین، اور کہتے ہین کہ ان مین باہم وہ فرق و امتیاز نہین پیدا ہو سکتا جو عجیب و غریب طریقہ پر ایک کو دوسرے پر ترجیح دیدے، اس کو یون بیان کیا جا سکتا ہے کہ جہان تک ہم کو ان زبانون کا علم ہے ان مین ایک چیز کے اس قدر متعدد نام نہین پائے جاتے جس قدر عربی زبان مین پائے جاتے ہین (یعنی ان مین مترادف الفاظ موجود نہین) اس طرح ان مین ایک لفظ بہت سے معانی پر دلالت نہین کرتا، جس طرح عربی زبان مین ایک ہی لفظ بہت سے معانی پر دلالت کرتا ہے (یعنی ان زبانون مین مشترک الفاظ موجود نہین) استعارات، اشارات اور استعمالات کے نادر طریقے بھی ان زبانون مین نہین پائے جاتے،

اس کی دلیل یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ نے قرآن مجید کا یہ وصف بیان کیا ہے کہ وہ عربی مبین کی زبان مین ہے، اس کی یہ خصوصیت بہت سے مقامات مین بیان کی ہے، اور یہ ظاہر کیا ہے کہ قرآن مجید کا درجہ اس سے بلند ہے کہ اس کو عجمی زبان مین نازل کیا جائے، اس لئے اگر اہل عجم کی زبان مین اسی قسم کی فصاحت پیدا ہو سکتی، تو خداوند تعالیٰ قرآن مجید کو اس سے بالاتر نہ سمجھتا اگرچہ عربی زبان مین قرآن مجید کے نازل کرنے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ اہل عرب اس کو خود سمجھ سکین، اور اس کی تفسیر مین دوسرون کے محتاج نہ ہون، تاہم ہم نے جو فائدہ بیان کیا ہے وہ بھی ممکن ہے،

بہت سے مسلمان جو عربی زبان کے ساتھ ان زبانون کے بھی ماہر ہین، اُن کے نزدیک ان زبانون مین وہ فرق و امتیاز اور وہ فصاحت نہین پائی جاتی جو عربی زبان مین پائی جاتی ہے، اس کے علاوہ وہ نہ تو خود توراۃ و انجیل کے ماننے والے اور نہ خود مسلمان ان کتابون کے معجز ہونے کا دعویٰ کرتے، اس سے معلوم ہوا کہ اعجاز قرآن مجید کے ساتھ مخصوص ہے[1]،

---

[1] اعجاز القرآن پر حاشیہ اتقان جلد اول صفحہ ۴۸، ۴۹،

یہی وجہ ہے کہ گذشتہ قوموں کے جو واقعات قرآن مجید میں مذکور ہیں، وہ بالمعنی بیان کئے گئے ہیں یعنی خداوند تعالیٰ نے اُن کے معانی کو عربی زبان میں بیان کر دیا ہے، کیونکہ کوئی زبانوں میں یہ فصاحت نہیں پیدا ہو سکتی تھی[1]

لیکن خداوند تعالیٰ نے فصاحت و بلاغت کو کہیں قرآن مجید کا وصف نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس کے یہ اوصاف بتائے ہیں،

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ،	وہ رہنمائی کر رہا ہے اور خوشخبری سنا رہا
(بقرہ ۱۲-)	ہے، ایمان والوں کو،
يَا اَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ	اے لوگو! یقیناً تمہارے پاس تمہارے
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكُمْ نُوْرًا	پروردگار کی طرف سے ایک دلیل آچکی
مُّبِيْنًا،	ہے، اور ہم نے تمہارے پاس ایک صاف
(نساء ۲۴-)	نور بھیجا ہے،
قَدْ جَاءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ	سو اب تمہارے پاس تمہارے رب کے
هُدًى وَّرَحْمَةٌ،	پاس سے ایک کتاب واضح اور رہنمائی
(الانعام ۳۰-)	کا ذریعہ اور رحمت آچکی ہے،

اور قرآن مجید میں بعینہٖ یہی اور اسی قسم کے دوسرے اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی بیان کئے گئے ہیں، مثلاً:-

وَاَنْزَلَ التَّوْرَاةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ	اور اسی طرح بھیجا تھا توریت و انجیل کو
هُدًى لِّلنَّاسِ (آل عمران ۱-)	اسکے قبل کے لوگوں کی ہدایت کے واسطے

---

[1] اتقان جلد ۲ صفحہ ۱۳۵،

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و	ہم نے توراۃ نازل فرمائی تھی جس میں ہدایت
نور۔ (مائدہ ۴۴)	تھی اور وضوح تھا،
وقفینا علی آثارھم بعیسی ابن	اور ہم نے اُن کے پیچھے عیسیٰ بن مریم کو اس
مریم مصدقا لما بین یدیہ	حالت میں بھیجا کہ وہ اپنے سے قبل کی کتاب
من التوراۃ وآتینہ الانجیل	یعنی توراۃ کی تصدیق فرماتے تھے، اور
فیہ ھدی ونور ومصدقا	ہم نے اُن کو انجیل دی تھی جس میں ہدایت
لما بین یدیہ من التوریۃ	تھی اور وضوح تھا، اور وہ اپنے سے قبل
وھدی وموعظۃ للمتقین	کی کتاب یعنی توریت کی تصدیق کرتی تھی
	اور وہ سراسر ہدایت اور نصیحت تھی خدا
(مائدہ ۴۷)	سے ڈرنے والوں کے لئے،
قل من انزل الکتب الذی	آپ کہئے کہ وہ کتاب کس نے نازل کی ہے جس کو موسیٰ
جاء بہ موسی نورا وھدی	لائے تھے جس کی کیفیت یہ ہے کہ وہ نور ہے
(الانعام ۱۱)	اور لوگوں کے لئے ہدایت ہے،
ثم آتینا موسی الکتب تماما	پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی تھی جس سے
علی الذی احسن وتفصیلا لکل	اچھی طرح عمل کرنے والوں پر نعمت پوری
شیئ وھدی ورحمۃ،	ہو، اور سب احکام کی تفصیل ہو جائے، اور
(الانعام ۲۰)	رہنمائی ہو اور رحمت ہو،
ومن قبلہ کتب موسی اماما و	اور ایک اس سے پہلے (یعنی) موسیٰ علیہ السلام
ورحمۃ (ھود ۲)	کی کتاب ہے، جو کہ (احکام بتلانے کے اعتبار سے)

وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْكِتَابَ مِنْ	اور ہم نے موسیٰ کو اگلی اُمتوں کے ہلاک کئے
بَعْدِ مَا أَهْلَكْنَا الْقُرُونَ الْأُولَىٰ	پیچھے کتاب دی تھی، جو لوگوں کے لئے دانشمندی
بَصَائِرَ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَرَحْمَةً	کا سبب اور ہدایت اور رحمت تھا تاکہ وہ نصیحت
لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ، (قصص - ۵)	حاصل کریں،
وَلَقَدْ آتَيْنَا مُوسَى الْهُدَىٰ وَ	اور ہم موسیٰ کو ہدایت نامہ دیچکے ہیں، اور
أَوْرَثْنَا بَنِي إِسْرَائِيلَ الْكِتَابَ	ہم نے وہ کتاب بنو اسرائیل کو پہنچائی تھی کہ
هُدًى وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ،	وہ ہدایت اور نصیحت تھی اہل عقل کے لئے

غرض قرآن مجید کے جس قدر اوصاف قرآن مجید میں مذکور ہیں، بعینہٖ وہی اوصاف توراۃ و انجیل کے بھی مذکور ہیں، اس لئے اگر ان اوصاف کی بنا پر جیسا کہ آگے تفصیل کے ساتھ آئے گا، قرآن مجید کو معجزہ تسلیم کیا جائے تو توراۃ و انجیل کو بھی معجزہ تسلیم کرنا پڑے گا، اور بعض محققین نے اس حیثیت سے ان کو معجزہ تسلیم بھی کیا ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ اگر یہ فرض کیا جائے کہ توراۃ یا انجیل یا زبور اس لئے معجزہ ہیں کہ اُن میں علوم غیبی خبریں اور امر و نہی وغیرہ موجود ہیں، تو اس سے اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ یہ اُن پیغمبروں کی نبوت کی اور اس پیغمبر کی نبوت کی جس کی نبوت کی انھوں نے خبر دی ہے، دلیل ہے، لیکن جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ کتابیں معجزہ نہیں ہیں، اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ وہ قرآن کی طرح لفظ و نظم کی وجہ سے معجزہ نہیں ہیں، تو یہ ممکن ہے اور اس کا تعلق عبرانی زبان کے جاننے والوں سے ہے، لیکن معانی یعنی غیبی خبروں اور امر و نہی کی وجہ سے توراۃ کے معجزہ ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، اور انبیاء کی کتابوں کے معجزہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی آپ کی بعثت سے بہت پہلے خبر دیگئی ہے اور بغیر خداوند تعالیٰ کی اطلاع دینے کے اس کا علم نہیں ہو سکتا[1]۔

---

[1] کتاب النبوات ص ۱۱۳،

ایک دوسرے موقع پر لکھتے ہیں کہ

"قرآن مجید کے معانی میں اُس کے الفاظ سے زیادہ اعجاز ہے، اور توراۃ و انجیل میں جو معانی ہیں، اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ وہ قرآن مجید کے مثل ہیں، تو اُس سے مقصد میں کوئی خلل واقع نہیں ہوتا، کیونکہ وہ بھی خداوند تعالیٰ کی کتاب ہیں، اور اگر ایک پیغمبر دوسرے پیغمبر کے معجزہ کے مثل کوئی معجزہ لائے تو یہ ناممکن نہیں ہے[1]"

توراۃ و انجیل کے ساتھ قرآن مجید کی طرح بے شبہہ تحدی نہیں کی گئی، لیکن معجزات کے لئے تحدی کوئی ضروری چیز نہیں ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ "دلائل نبوت کے لئے یہ شرط ضروری نہیں ہے کہ وہ دعوی نبوت کے ساتھ ساتھ ہوں، اُن کو بطور حجت کے پیش کیا جائے، ان کے مثل لانے کی تحدی کیجائے، اور اس پر مخالفین کو آمادہ کیا جائے، اس قسم کی باتیں بعض معجزات کے ساتھ تو ضرور پیش آتی ہیں لیکن یہ ضروری نہیں کہ جن معجزات کے ساتھ یہ باتیں پیش نہ آئیں، وہ معجزہ ہی نہ ہوں، بلکہ اس سے انبیاء کے اکثر معجزات باطل ہو جائیں گے، کیونکہ اُن میں یہ شرط موجود نہیں ہے، اور یہ ایک ایسی شرط ہے جس کی کوئی دلیل نہیں ہے، کیونکہ دلیل کے معنی یہ ہیں کہ اس کے ساتھ مدلول علیہ کا وجود لازمی طور پر پایا جائے، اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب کوئی مساوی یا راجح دلیل اُس کی معارض نہ ہو، لیکن اگر کوئی دلیل ایسی موجود ہے، جس کی معارض کوئی مساوی اور راجح دلیل نہیں ہے، تو اس کو دلیل ماننا پڑے گا، چاہے مستدل یہ کہے کہ اُس کے مثل پیش کرو "تم لوگ اُس کے مثل پیش کرنے کی قدرت نہیں رکھتے" یا نہ کہے "کیونکہ جب وہ دلیل فی نفسہ ایسی ہے جس کے مثل لانے پر لوگ قادر نہیں ہیں، تو مستدل کا یہ کہنا، اور نہ کہنا برابر ہے، نہ اس کے کہنے سے وہ دلیل بن سکتی، اور نہ اُس کے نہ کہنے سے اس کی دلالت باطل ہوتی، دلیل بہرحال دلیل ہے، خواہ

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۲ ص ۰۰

مستدل اس کے ساتھ استدلال کرے، یا نہ کرے، جو لوگ یہ کہتے ہین کہ نبوت کی دلیل اس وقت تک دلیل نہین ہوسکتی، جب تک دعوی نبوت کے ساتھ پیغمبر اس کے ساتھ استدلال نہ کرے یعنی جو لوگ دعوی نبوت، پیغمبر کے استدلال اور معارضہ کے مطالبہ سب کو دلیل کا جزو قرار دیتے ہین، وہ سخت غلطی پر ہین، بلکہ ان باتون سے سکوت اختیار کرنا بہتر ہے، اور ان باتون سے دلیل مین کوئی قوت نہین پیدا ہوتی خداوند تعالی نے

فلیاتوا بحدیث مثلہ، تو وہ لوگ بھی اس کے مثل ایسی ہی ایک بات بھی لائین،

اس وقت کہا جب کفار نے یہ دعوی کیا کہ قرآن مجید ایک بنائی ہوئی کتاب ہے، لیکن اس قول کو دلیل کی شرط قرار نہین دیا، بلکہ جب وہ اُس کے معارضہ سے عاجز ہوگئے، تو اُس سے یہ دلیل مکمل ہوگئی،[1]

دوسری جگہ لکھتے ہین کہ

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام معجزات کے ساتھ تحدی نہین کی گئی، آپ نے قرآن مجید کے ساتھ بھی ابتداءً تحدی نہین کی، بلکہ اس وقت تحدی کی جب کفار نے کہا کہ یہ ایک جعلی کتاب ہے"[2]

اس بنا پر اگر توراۃ و انجیل کے ساتھ تحدی نہین کیگئی تو اس سے اُن کے معجزہ ہونے مین کوئی خلل واقع نہین ہوتا، لیکن اگر تحدی ضروری سمجھی جائے، تو گو حضرت موسی علیہ السلام نے توراۃ کے ساتھ تحدی نہین کی تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن مجید کے ساتھ توراۃ کو بھی تحدی مین شامل کرلیا ہے،

---

[1] کتاب النبوت ص ۱۴۲ [2] ایضاً ص ۱۹۶،

قُلْ فَأْتُوا بِكِتٰبٍ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ — آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ

هُوَ اَهْدٰى مِنْهُمَا (قصص - ۵) — جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ و انجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ و انجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں لیکن قرآن مجید لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ و انجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ و انجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں ہستاروں کی مقدار اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[۱]"

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزگ اصحاب صورت را بہ بود ارباب معنی را

---

[۱] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۱، صفحہ ۔

مسلمانون کی حکومت مین غیر مسلم اقوام

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(اسلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۱۹۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم مین مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانون کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک مین دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہین" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہین کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت مین بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر مین وہ مدتون گھومتے رہے ہین، یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہین یہ وہ زمانہ ہے جس مین سارے علوم و فنون جو غیر قومون سے منتقل ہو کر مسلمانون مین رائج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقاء کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ مین بڑی بڑی نامور ہستیان چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھین، اس لیے نہین کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی مین اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف مین بھیجدی تھی، کاغذ کی گنجائش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۱۹۵۰ء مین شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر فوری تاثر پر پڑنا تھا، ہم جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر مین روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک مین ضائع ہو گیا دل بیٹھ گیا، معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ خدا کا کام کچھ نہین کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

قُلْ فَأْتُوا بِكِتَابٍ مِنْ عِنْدِ اللهِ — آپ کہدیجئے کہ اچھا تو تم کوئی اور کتاب اللہ کے پاس سے لاؤ

هُوَ أَهْدَىٰ مِنْهُمَا (قصص - ۵) — جو ہدایت کرنے میں ان دونوں (توراۃ و قرآن) سے بہتر ہو

بہرحال قرآن مجید کی طرح توراۃ و انجیل بھی معجزہ ہیں، البتہ باوجود اس اشتراک کے اسلام کی تکمیلی شان یہاں بھی موجود ہے، توراۃ و انجیل صرف معنی کے اعتبار سے معجزہ ہیں لیکن قرآن مجید لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ ہے، بلکہ معنوی حیثیت سے بھی اس کو توراۃ و انجیل پر تفوق حاصل ہے، چنانچہ علامہ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ

"توراۃ و انجیل میں جو معنی ہیں، وہ حقیقت، کیفیت اور کمیت کسی حیثیت سے بھی قرآن مجید کے معانی کے مثل نہیں ہیں، بلکہ جس شخص نے قرآن مجید اور ان کتابوں میں غور کیا ہے اس کو دونوں میں فرق نظر آئے گا، اور اہل علم و معرفت میں جس کو یہ باتیں معلوم ہو جائیں گی، اس پر اس حیثیت سے اس کا اعجاز ظاہر ہو جائے گا، لیکن جس شخص کو یہ باتیں معلوم نہ ہو سکیں، اس کے لئے صرف ظاہری باتیں کافی ہیں، مثلاً یہ کہ باوجود تحدی کے تمام دنیا اس کا جواب لانے سے عاجز تھی، کیونکہ یہ بات ہر شخص پر ظاہر ہے نبوت کے دلائل بھی ربوبیت کے دلائل کی طرح بعض تو بالکل ظاہر ہوتے ہیں، مثلاً حیوانات، نباتات اور بادل وغیرہ کی پیدائش کی یہ چیزیں ہر شخص کو علانیہ نظر آتی ہیں، اور بعض اہل علم کے ساتھ مخصوص ہوتی ہیں، مثلاً علم تشریح کی باریک باتیں، ستاروں کی مقدار اور ان کی حرکات وغیرہ کہ اس سے صرف اہل علم واقف ہو سکتے ہیں[1]۔

غرض قرآن مجید عالم و جاہل دونوں کے لئے یکساں طور پر معجزہ ہے، صرف

بزنگ اصحاب صورت را بہ بوار باب معنی را

---

[1] الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح جلد ۱، صفحہ ۔

مسلمانوں کی حکومت میں غیر مسلم اقوام[1]

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

(سلسلہ کے لیے ملاحظہ ہو معارف جون ۱۹۵۰ء)

اپنی مشہور عام متداول کتاب احیاء العلوم میں مفید و مضر علوم کی تفصیل کرتے ہوئے حجۃ الاسلام امام غزالی نے جو یہ اطلاع دی ہے کہ

"مسلمانوں کا کوئی شہر ہو یا آبادی، ہر ایک میں دیکھا جا رہا ہے کہ طبابت کا کام غیر مسلم اقوام کے افراد انجام دے رہے ہیں" (احیاء العلوم، ج ۱ ص ۱۱۱)

ہے تو یہ ایک اجمالی شہادت، لیکن ہم جب یہ سوچتے ہیں کہ غزالی کی عمر کا بڑا حصہ سیر و سیاحت میں بسر ہوا، خراسان و ایران تو ان کا وطن ہی تھا، اس کے سوا عراق و شام و مصر میں وہ مدتوں گھومتے رہے ہیں، تو یہی سمجھا جا سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا اطلاع غالباً ان کے ذاتی مشاہدات ہی پر مبنی ہے، امام غزالی چھٹی صدی ہجری کے امام ہیں یہ وہ زمانہ ہے جس میں سارے علوم و فنون جو غیر قوموں سے منتقل ہو کر مسلمانوں میں رواج پذیر ہوئے تھے اپنے عروج و ارتقا کے آخری نقطہ تک پہنچ چکے تھے، طب ہی کے سلسلہ میں بڑی بڑی نامور ہستیاں چھٹی صدی ہجری سے پہلے پیدا ہو چکی تھیں، اس لیے نہیں کہا جا سکتا کہ ناواقفیت کی وجہ سے

[1] بعض فوری موثرات کے تحت خاکسار نے اپریل ۱۹۵۰ء ہی میں اس مضمون کی ایک قسط لکھکر دفتر معارف میں بھیجدی تھی، لیکن گنجایش نہ نکلنے کی وجہ سے اپریل کا بھیجا ہوا یہ مضمون شاید جون ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا، اس طویل وقفہ کا اثر "فوری تاثر" پر پڑنا تھا جب پہلی قسط شائع ہو گئی، تو دوسری قسط لکھکر دفتر میں روانہ کی، مگر معلوم ہوا کہ مضمون ڈاک میں ضائع ہو گیا، دل بیٹھ گیا، معارف کے فاضل شریک مدیر مولانا شاہ معین الدین کے اصرار پر لکھے ہوئے مضمون کو دوبارہ قلم بند کرنے پر آمادہ ہوا تھا تو یہ خدا جانے کام کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ پہلے کیا لکھا تھا اور اب کیا لکھا گیا واللہ ولی التوفیق۔

مسلمان غیر مسلم اقوام کی طبی امداد کے محتاج اور دست نگر تھے، گویا یہ صورت حال اضطراری یا مجبوری کی رہین منت تھی، یقیناً یہ دعویٰ غلط ہوگا،

باقی یہ وسوسہ کہ مسلمانون کے دینی احساسات مین رفتہ رفتہ اضمحلال اور سستی کی جو کیفیت پیدا ہوتی چلی جارہی تھی، سو اس کا نتیجہ بھی اس کو قرار دینا مشکل ہے

آخر مین پوچھتا ہون کہ غزالی نامی چھٹی صدی ہجری کے آدمی ہین لیکن ہمین تو دیکھنا ہون کہ غزالی کو سینکڑون سال پہلے یعنی اسلام کی دوسری صدی کے اخیر مین پیدا ہونے والے امام حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف بھی کتابون مین یہ شہادت منسوب کی گئی ہے یعنی علم طب جسے امام شافعی علم کے تین حصون مین ایک مستقل حصہ قرار دیتے تھے، اسی علم طب کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے،

ثلث العلم وکلوہ الی الیھود و — علم کے تہائی حصہ کو مسلمانون نے یہود و

النصاریٰ (توالی التاسیس لابن حجر ص۶۶) — نصاریٰ کے سپرد کر رکھا ہے،

مان لیا جائے کہ چھٹی صدی ہجری تک پہنچتے ہوئے مسلمانون مین اپنے دین کے متعلق وہ جوش و خروش باقی نہ رہا ہو جو ان مین پہلے پایا جاتا تھا، لیکن دوسری صدی ہجری مین بھی اگر اس سے وہ خالی ہی تھے تو اسکا مطلب یہی ہوگا کہ جن دینی گرم جوشیون کو ان کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ نرے ایک افسانے کے سوا اور کچھ نہین ہے، مالکم کیف تحکمون،

ف بظاہر اس کا مطلب اس زمانہ کے مذاق کے مطابق جس مین امام شافعی تھے یہی معلوم ہوتا ہے کہ علم الادیان، علم الابدان، علم اللسان یعنی ادبیات ان ہی تین علومِ کو اہمیت دیجاتی تھی، خود امام شافعی نے علم کی ان تینون قسمون مین کمال پیدا کیا تھا، علم الادیان اور علم اللسان مین ان کا جو پایہ تھا اس سے تو دنیا واقف ہے لیکن طب کے ساتھ امام کے تعلق کی گو یا عام شہرت نہین ہے، مگر لکھا ہے کہ اس علم مین بھی ان کی غیر معمولی دستگاہ کا یہ عالم تھا کہ مصر جب پہنچے تو بقراط کی کتابون مصر کے بعض اطبا نے ان سے پڑھنے کی خواہش کی، (دیکھو توالی التاسیس ص۶۶)

اور سچی بات تو یہ ہے کہ مسلمانون کے جس دین کی طرف تنگ نظرون، کوتاہ فکرون کو منسوب کرنے[1] آج منسوب کر رہے ہین، کاش واقعات کا صحیح علم ان کو ہوتا، تو بعکس اس کے شاید وہ اس یقین پر مجبور ہوتے کہ غیر قومون کے ساتھ ساری فراخ چشمیان اور رواداریان جن کا ذکر مسلمانون کی تاریخ مین کیا جاتا ہے، ان کی ضمانت خود مسلمانون کے دین اور دین کے عطا کرنے والے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیع طرز عمل مین پوشیدہ ہے،

اس قسم کے چھوٹے موٹے، ناقابل توجہ واقعات مثلاً جب مشہور ایرانی بزرگ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مین حاضر ہوئے، اور ایرانی نژاد ہونے کیوجہ سے عربی زبان مین جیسی کہ چاہیے گفتگو نہین کر سکتے تھے، تو تاریخ خمیس وغیرہ مین لکھا ہے کہ

طلب النبی صلی اللہ علیہ وسلم	تلاش کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک
ترجمانا وکان فی المدینۃ یھودی	ترجمان کو، مدینہ مین ایک یہودی تھا، جو عربی
عارفا بالعربی والفارسی (ص ۲۵۲ ج ۱ خمیس)	اور فارسی زبان سے واقف تھا،

غرض اسی یہودی کو بلایا گیا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترجمانی کا کام اسی یہودی سے لیا،[2]

---

[1] غیر قومون کے ساتھ میل جول کے ان ہی نمونون کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام جب عرب سے باہر نکلے تو اس علاقے کی زبانون کو بھی انھون نے سیکھا، اور ان کے مفید رسم و رواج کو اختیار کیا، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جو صحابہ مین امام المحدثین سمجھے جاتے ہین، خطیب نے تاریخ بغداد مین مشہور محدث ابراہیم حربی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ کان ابوھریرۃ یکلم صبیانہ واھلہ بالنبطیہ (ص ۲۰۰ ج ۵) یعنی ابو ہریرۃ اپنے بچون اور اپنے گھر کے لوگون سے نبطی زبان مین گفتگو کرتے تھے، عراق کے سواد دیہاتی علاقہ مین جو زبان بولی جاتی تھی اور فارسی و عربی کی کچھ ملی جلی شکل تھی، اس زبان کا نام نبطی تھا، اس سلسلہ مین صحابہ کے متعلق دلچسپ معلومات کتابون مین ملتے ہین. بلکہ تاریخ خمیس کی مندرجۂ بالا روایت مین ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبریلؑ نے فارسی زبان سکھائی ۱۲

اور بھی اسی نوعیت کے غیر اہم واقعات کے سوا کون نہین جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سفر مبارک کا سب سے بڑا واقعہ جس نے سچ پوچھیے تو عرب یا مشرق ہی نہین بلکہ اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانیت کی تاریخ کا رخ پلٹ دیا یعنی سفر ہجرت مین بھی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بالکل پروا نہ کی کہ اس اہم ترین دینی اقدام مین راستہ دکھانے کے لیے ایک غیر مسلم آدمی کی امداد کیوں حاصل کی جائے؟ بخاری و غیرہ حدیث کی کتابون مین ہے کہ

استاجر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ نے
وابوبکر رجلا من بنی الدیل ھادیا	قبیلہ بنی الدیل کے ایک شخص کو ملازم رکھا کہ (مدینہ کا)
خریتا وھو علی دین قریش	راستہ بتائے گا، اور یہ شخص قریش کے دین پر تھا (یعنی
(بخاری ج ۱ ص ۳۰۱)	مسلمان نہ تھا۔

اور بقول امام بخاری غیر مسلم آدمی کے خدمات سے استفادہ کا یہ واقعہ کوئی استثنائی یا انفرادی واقعہ نہین ہے، بلکہ وہی لکھتے ہین

عامل النبی صلی اللہ علیہ وسلم	خیبر کے یہودیون سے (بٹائی) کا معاملہ رسول اللہ
یھود خیبر	صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

ظاہر ہے کہ خیبر کے جن یہودیون سے معاملہ کیا گیا تھا، ان کی تعداد ایک دو مین محدود نہ تھی، دراصل یہ اور اسی کی قوم کے بنو نضیر کو پیش نظر رکھکر جیسا کہ شارح بخاری ابن بطال کے حوالہ سے نقل کیا جاتا ہے کہ

الفقہاء یجیزون استیجارھم	علماء اسلام نے غیر مسلم لوگون کے خدمات سے معاوضہ
عند الضرورۃ وغیرھا	دے کر کام لینے کی عام اجازت دی ہے، خواہ
(حاشیہ بخاری)	ضرورت ہو یا نہ ہو،

ضرورت ہو یا نہ ہو، اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کام کے انجام دینے کے لیے مسلمان آدمی مل رہا ہو یا نہ مل رہا ہو، ہر حال میں مسلمانوں کو اجازت ہے کہ غیر مسلم اقوام کے افراد سے اس قسم کا معاملہ کر سکتے ہیں، اور یہ تو خیر عام معاملات کے قصے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ غیر مسلم طبیبوں سے طبی امداد حاصل کرنے کا براہ راست نمونہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں موجود تھا،

میرا مطلب یہ ہے کہ عرب کا مشہور طبیب جس کا نام حارث بن کلدہ تھا، طائف کا رہنے والا تھا، ظہور اسلام سے پہلے اپنے وطن طائف سے دو یمن پہنچا، جہاں اس زمانہ میں ایرانیوں کی حکومت قائم تھی، لکھا ہے کہ کچھ دستگاہ علم طب میں حارث نے یمن ہی میں حاصل کی، اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایرانیوں سے ملنے جلنے کی وجہ سے اس کو خود ایرانی علاقہ کی مشہور طبی درسگاہ جندی سابور میں باضابطہ علاج و معالجہ میں مہارت پیدا کرنے کا موقع مل گیا، طبی معلومات اور کمالات کے ساتھ وطن واپس ہوا، اور عرب ہی میں عوام و خواص کے علاج و معالجہ کا مرکز و مرجع بن گیا،

عمر اس نے کافی طویل پائی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں موجود تھا لیکن جیسا کہ ابن ابی حاتم کے حوالہ سے حافظ ابن حجر نے اصابہ میں نقل کیا ہے:

لا یصح اسلامہ (ص ۲۰۷ ج ۱) حارث کا مسلمان ہونا درست نہیں ہے،

جس کا مطلب یہی ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں اس نے اسلام قبول نہیں کیا، اور جیسا کہ طبقات الاطباء میں لکھا ہے:

حارث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بھی تھا، اور آئندہ ابوبکر و عمر و عثمان و علی و معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے زمانہ تک زندہ رہا (ص ۱۱۰ ج ۱)

اس نے چاروں راشدین خلفاء اور امیر معاویہ کی حکومت کا زمانہ بھی پایا، مگر آزادی کے ساتھ باوجود غیر مسلم ہونے کے عرب کی مقدس سرزمین اور اس کے شہر طائف میں بلکہ ایام حج میں مکہ معظمہ پہنچکر علاج و

معالجہ کا کام اس نے جاری رکھا، اور کیون جاری نہ رکھتا، معمولی تاریخی کتابون مین نہین بلکہ حدیث کی مستند کتابون مین ہم پڑھتے ہین کہ فاتح ایران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو فتح مکہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکہ آئے، اتفاقاً بیمار ہوگئے، تو ایک طرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود سعد کو مشورہ دیا،

ایت الحارث بن کلدۃ اخا ثقیف — ثقیف قبیلہ والے حارث بن کلدہ کیطرف

فانہ یتطبب (ابوداؤد) — رجوع کرو کیونکہ وہ معالج ہے،

اور دوسری طرف جیسا کہ حافظ ابن حجر نے ابن مندہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ خود حارث بن کلدہ کو بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ

عالج سعدا مابہ (اصابہ ج ۱ ص ۳۰۱) — سعد جس مرض مین مبتلا ہین تم اسکا علاج کرو،

کیا اس کے بعد یہ دریافت کرنے کی چیز رہ جاتی ہے کہ غیر مسلم اطباء سے علاج و معالجہ کا جو تعلق مسلمانون نے آئندہ مسلسل قائم رکھا، ان مین خود ان کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اس طرز عمل کو دخل نہ تھا، جو حارث کے ساتھ قائم کرکے صحابہؓ کو آپنے دکھایا تھا،

ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اگر چاہتے تو مسلمانون کے مقدس ترین شہر مکہ سے اس غیر مسلم طبیب کو نکل جانے کا حکم بآسانی دے سکتے تھے، خصوصاً جب مکہ معظمہ اس کا وطن بھی نہ تھا، بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مطب کرنے کے لیے وقتاً فوقتاً عرب کے اس مرکزی شہر مین بھی وہ آتا جاتا رہتا تھا، لیکن بجائے اس کے اپنے عزیز صحابی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم دینا کہ حارث سے علاج کراؤ، اور حارث سے فرمانا کہ تم میرے صحابی کا علاج کرو، کیا اس کے بعد اب بھی شک کی گنجایش اس مسئلہ مین باقی رہتی ہے کہ آئندہ غیر مسلم اطباء کے ساتھ مسلمانون کے جو تعلقات قائم ہوئے ان کا منشا، خود مسلمانون کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا براہ راست طرز عمل اور آپ کا عملی نمونہ تھا،

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرز عمل کی بنیاد پر اسی عارث کو جو مواقع خلافت راشدہ اور حضرت امیر معاویہؓ کے عہد حکومت میں حاصل ہوئے، کتابوں میں لکھا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حادث سے بسا اوقات طبی مسائل میں گفتگو بھی فرماتے، اور یہی طریقہ امیر معاویہؓ کا بھی تھا، سوچا جا سکتا ہے کہ قدرۃً ان واقعات کا مسلمانوں پر کیا اثر مرتب ہو سکتا تھا،

سچی بات تو یہ ہے کہ عرب سے باہر نکلنے کے بعد مصر و شام، عراق و ایران وغیرہ ممالک میں مسلمان جب پہنچے، اور ان کے سامنے پیغمبر کے براہ راست صحبت یافتوں کی طرف سے ایسے نمونے پیش ہوتے رہے کہ مثلاً کہتے ہیں کہ عمرو بن عاصؓ صحابی جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف سے مصر کے والی مقرر ہوئے تو مصر پہنچکر عمرو بن عاص کو خبر ملی کہ مشہور عیسائی طبیب جس کا اصلی نام اتوشیوس یا اتاسطیوس تھا، لیکن مسلمانوں میں یحییٰ نحوی کے نام سے مشہور رہا، علاوہ طب و فلسفہ و ادب کے دین مسیحی میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، قسطنطنیہ کے عیسائی دربار میں بڑا رسوخ اسے حاصل تھا، اور زمانہ تک اس مسیحی پایہ تخت میں رہا تھا، قیصر کے دربار سے جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے، اس کو فیلوپونوس کا علمی و دینی خطاب بھی ملا تھا، لکھا ہے کہ رومی زبان میں فیلوپونوس مجتہد کو کہتے ہیں، خلکدونیہ نامی مقام میں صلیبی دین کے اہم مسائل پر بحث و مباحثہ کے لیے علماے دین مسیحی کی جو مجلسیں ہوتی رہیں، تو بیان کیا جاتا ہے کہ چوتھی مجلس جس میں (۶۳۴) اسقف یعنی پادریوں نے نمایندگی کی تھی، اس مجلس کا ایک ممتاز رکن اتوشیوس بھی تھا،

مگر باوجود ان تمام باتوں کے حضرت عمرو بن عاصؓ کے کان تک اس کے علم و فضل کی شہرت جب پہنچی تو جیسا کہ ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اس کو حضرت عمرو بن عاصؓ نے بلایا،

واکسمه وسری له موضعا اور اس کی عزت کی اور خاص حیثیت اسکی

لہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا میں پہلے نام کو اور تاریخ الحکما میں قفطی نے دوسرے نام کا ذکر کیا ہے، غیر عربی ناموں کے متعلق عربوں میں اس قسم کا اختلاف پیدا ہو جانا محل تعجب نہیں ہو سکتا، مسلمانوں کے نام کو یورپ والے کن کن شکلوں میں بگاڑ رہے ہیں اسی پر قیاس کر لیجئے۔

(ص ۱۰۴) ان کی نظر مین قائم ہوگئی،

قفطی نے اسی واقعہ کا ذکر کرکے لکھا ہے کہ

فلازمہ وکان لا یکاد یفارقہ — اور اسکو عمرو بن عاص نے اپنے ساتھ رکھ لیا اور مشکل ہی سے وہ اس سے الگ ہونا چاہتے تھے،

(ص ۲۳۲)

پھر دونون کے تعلقات کی تفصیل کی ہے،

اور عمرو بن عاصؓ تو پھر بھی ایک ملک کے والی اور گورنر تھے، امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ تو وقت کے سب سے بڑے حکمران اور ان کے زمانہ مین مسلمانون کے سیاسی اقتدار کے وہی مرکز وحید تھے اور اسی کے ساتھ صحابیت کا شرف بھی، لکھتے تھے، ہم دیکھتے ہین کہ حکومت کے دوسرے صیغون اور محکمون کے سوا ان کے دربار مین بھی طبی سررشتہ کا تعلق عیسائیون یعنی غیر مسلم اطبا کے ہاتھون مین ہے، جن مین ابن آثال اور دوسرے عیسائی طبیب جس کا اصلی نام معلوم نہین، مگر مسلمانون مین ابو الحکم کے نام سے مشہور ہے، ان دونون کے تذکرون اور ان کے قصون سے کتابین معمور ہین، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابن آثال تو علاج و معالجہ مین مشہور تھا، اور ابو الحکم دوا سازی مین امتیاز رکھتا تھا، طبقات الاطبا مین ابن آثال کے متعلق لکھا ہے کہ

جب حضرت امیر معاویہؓ نے اپنی حکومت کا اعلان دمشق مین کیا تو ابن آثال کو اپنا معالج خاص مقرر کیا، اس کے ساتھ وہ بہت سلوک کرتے تھے، اور اس کے بہت معتقد تھے، صبح و شام اس سے گفتگو کرتے" (ص ۱۱۶ ج ۱)

اسی طرح ابو الحکم کے متعلق یہ لکھکر کہ کان طبیبا نصرانیا یعنی وہ ایک عیسائی طبیب تھا لکھا ہے کہ طبی امداد امیر معاویہؓ اس سے بھی حاصل کرتے تھے، اور دواؤن کی ترکیب مین اس پر بھروسہ کرتے تھے (ص)

جب گورنرون اور گورنرون سے بھی آگے بڑھکر خود وقت کے حکمران کے دربارون مین غیر مسلم اطبا کی اسلام

کے عہد آغاز یعنی عہد صحابہ ہی مین یہ آؤ بھگت ہو رہی تھی تو عام مسلمانون مین ان غیر مسلم طبیبون کی مقبولیت کی کوئی حد ہو سکتی تھی،

دوسری صدی کے امام، امام شافعی سے لیکر عہد غزالی تک تقریباً پانچ ساڑھے پانچ صدیون کی اجمالی شہادت آپ کے سامنے جو گذری کہ مسلمانون کے عام علاقے غیر مسلم طبیبون سے بھرے ہوئے تھے، کیا مذکورۂ بالا معلومات کے بعد بھی کوئی یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ دین سے بُعد یا طول امد کی قدرتی افسردگی کا یہ نتیجہ تھا،

مین تو کہتا ہون کہ تاریخون مین یہ واقعہ جو نقل کیا جاتا ہے کہ امیر معاویہؓ کے دربار کا ایک عیسائی طبیب یا دوا ساز ابو الحکم ان کے حکم سے یزید کے ساتھ حج کے موسم مین مکہ معظمہ آیا، اور ساتھ ساتھ رہا، یا عباسیون کے زمانہ مین اسی ابو الحکم کو جس نے کافی عمر پائی تھی، کہ کے عباسی گورنر عبد الصمد بن علی نے اپنے علاج کیلیے بلوایا[1]، اور مسلمانون کی طرف سے کوئی اعتراض اس پر نہین ہوا، تو اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین حارث بن کلدہ مکہ معظمہ مین مسلمانون کے علاج و معالجہ کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے انجام دے چکا تھا،

اور اس سے بھی زیادہ دلچسپ پہلی صدی ہجری کا وہ واقعہ ہے جس کا ذکر ابن سعد نے اپنے طبقات مین کیا ہے، یعنی شام کے ایک عیسائی طبیب جس کا نام عبد الرحمن تھا، لکھا ہے کہ کسی وجہ سے شام چھوڑ کر وہ مکہ معظمہ پہنچا اور وہین اس نے مطب قائم کیا، طبقات کے الفاظ یہ ہین کہ

کان عبد الرحمن ابو داؤد نصرانیا	عبد الرحمن جس کی کنیت ابو داؤد تھی ایک عیسائی تھا،
وکان رجلا من اهل الشام وکان	شام کا باشندہ تھا اور طبابت کرتا تھا، پھر مکہ
یتطبب فقدم مکة فنزلها (ج ۵ ص ۳۶۲)	آیا، اور وہین رہ پڑا،

قابل توجہ اور خاص طور پر جو چیز عبد الرحمن الطبیب النصرانی کے تذکرہ مین اہمیت رکھتی ہے وہ یہ ہے

---

[1] دیکھیے طبقات الاطباء ج ۱ ص ۱۱۹

کہ مکہ معظمہ مین اپنا مطب اس عیسائی طبیب نے کہان قائم کیا تھا، ابن سعد کا بیان ہے کہ

عبد الرحمن یجلس فی اصل منارۃ	کوہ صفا کی طرف مسجد حرام یعنی کعبہ کا جو مینارہ
المسجد الحرام من قبل الصفا (۱)	تھا عبد الرحمن اسی مینارہ کے نیچے بیٹھا کرتا تھا،

جیسا کہ مین نے عرض کیا یہ واقعہ پہلی صدی ہجری کا ہے، ذرا اندازہ کیجئے مسلمانون کی دینی فراخ دلی کا کہ ایک غیر مسلم طبیب ان کے اس شہر مین آکر قیام کرتا ہے، جہان ان کی نمازون کا قبلہ اور بیت اللہ ہے جس کا وہ حج کرتے ہین، اور اسی بیت اللہ کی مسجد کے مینارے کے پایہ کے پاس مطب کھولتا ہے، لیکن کسی کو اس پر اعتراض تو کیا ہوتا ہے، بلکہ لکھا ہے کہ شرفائے قریش مین آل جبیر کا جو ممتاز خاندان تھا، اسی خاندان کی سرپرستی اس عیسائی طبیب کو حاصل تھی، ابن سعد ہی مین ہے

وولی آل جبیر بن مطعم بن	موالات کا تعلق جبیر بن مطعم بن عدی کے
عدی	خاندان والون سے عبد الرحمن نے قائم کیا تھا،

آج دنیا مین ایسے کتنے ممالک اور علاقے ہین، جہان اس لیے کہ مسلمانون کی آبادی اتفاقاً اقلیت کے داغ سے داغدار ہوگئی ہے، اکثریت والون نے ان کی زندگی کو دوبھر بنا رکھا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اپنے عہد اقتدار مین غیر قومون کے ساتھ موجودہ مسلمانون کے باپ دادون نے جو سلوک کیا تھا، یہ اسی کا انتقام ہے۔

اس بے بنیاد دعوے کے مقابلہ مین تاریخ کی شہادت مین کیا ہین؟ یا جرم کی سزا ان لوگون کو دینی جنھون نے خود کوئی جرم نہین کیا ہے، مگر یہ الزام لگا کر کہ تم نے نہ سہی تمھارے باپ دادون نے تو جرم کا ارتکاب کیا تھا، قانوناً وعقلاً کس حد تک غیر مجرمون سے بدلہ لینا درست ہوسکتا ہے، ان امور سے قطع نظر کرتے ہوئے مین صرف اسی ایک جزئی واقعہ کو پیش کرتا ہون، اور پوچھتا ہون کہ مسلمانون کے ان ہی باپ دادون کو مجرم ٹھہرایا جاتا ہے، جو اپنے مقدس ترین شہر مین بھی اپنی سب سے

بڑی مرکزی مسجد کے زیر سایہ غیر مسلم آدمی کو پناہ دینے سے بھی دل مین تنگی نہین محسوس کرتے تھے،

حقیقت تو یہ ہے کہ مسلمانون کے گذشتہ آبا و اجداد جن تنگ نظری اور قومی و ملی عصبیت کے مریض طبائع کی طرف سے طرح طرح کے الزام تراشے جاتے ہین، کاش! اپنی کوتاہ بینی کے عوارض سے پاک ہوکر مسلمانون کی تاریخ کا مطالعہ کرتے، تو ان کو شاید یہ ماننے پر مجبور ہونا پڑے گا، کہ جن گذرے ہوئے بزرگون کو طعن و تشنیع کا آج نشانہ بنایا جارہا ہے، ان کے سینے اتنے کشادہ اور نگاہین اتنی وسیع تھین، اور اسی بنا پر ایسی باتین وہ کرگذرتے تھے، کہ جن کو کرنا تو کرنا شاید عہد جدید کے مسلمان اس کے سننے کی تاب بھی نہین لاسکتے،

دور کیون جایئے، اسی طب وطبابت کے قصہ مین ابن ابی اصیبعہ نے مشہور غیر مسلم عیسائی طبیب جبیرین بختیشوع کے تذکرے مین یہ قصہ جو نقل کیا ہے کہ ایک دن ہارون عباسی خلیفہ دربار مین بیٹھا ہوا تھا، جبرئیل بھی حاضر تھا، ہارون نے جبرئیل کی طرف خطاب کرکے کہا کہ

"تم جانتے ہو میرے دل مین تمھاری کتنی جگہ ہے"

پھر خود ہی ہارون نے مسلمانون سے بھرے ہوئے دربار مین کہنا شروع کیا کہ

"خدا کی قسم موقف (یعنی میدان عرفات جہان کے قیام کے بغیر حاجی کا حج پورا نہین ہوتا اسی موقف مین) ہے، جبرئیل مین نے تیرے لیے دعائین کین، اور بہت زیادہ دعائین کین" (طبقات الاطبار ج ۱ ص ۱۲۰)

موقف یعنی عرفات کے میدان کی دینی اہمیت مسلمانون مین جتنی ہے، جو اس سے ناواقف ہین، وہ شاید صحیح طور پر اندازہ نہین کرسکتے کہ ہارون اس وقت کیا کہہ رہا تھا، اور غیر قومون کے ساتھ مسلمانون کی رواداری کی کتنی غیر معمولی مثال پیش کررہا تھا، جذبۂ احسان شناسی کی یہ ایک تاریخی نظیر ہے، جسے عمل کرکے ہارون نے دکھایا، مسلمانون پر جنھون نے احسان کیا ان کو وہ کہین نہین

بھولتے، حرم میں جگہ دیتے ہیں، حرم کی مسجد کے نیچے اسے خود بٹھاتے ہیں، اور حد یہ ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ جس کے لیے دعائیں کر رہا ہوں وہ مسلمان نہیں ہے، وہ اس خاص مقام پر دعا کرتے ہیں، جس کے متعلق کم از کم ان کا یہ دینی اذعان، اور ایمانی ایقان ہے کہ وہاں کی دعا نا مقبول نہیں ہوتی، دربار سے بعضوں نے ہارون سے پوچھا بھی، جواب میں اس نے کہا تھا کہ

"میں مسلمانوں کے حقوق کا محافظ ہوں اور جبرئیل میری جسمانی صحت کا محافظ ہے، اس لیے دراصل جبرئیل کا وجود مسلمانوں کا محافظ ہے"

راوی کا بیان ہے کہ ہارون کے اس جواب کو سن کر دربار والوں نے کہا

صدقت یا امیر المومنین (رر) آپ نے سچ فرمایا اے مسلمانوں کے امیر

میں نہیں جانتا کہ اس صدقت (سچ کہا آپ نے) کی تصدیق پر اس زمانے کے مسلمان آمادہ بھی ہوں گے یا نہیں؟ مگر اتنی بات کے لیے تو کسی تلاش و جستجو کی بھی ضرورت نہیں، آپ کے سامنے زمین کے اسی گوشہ پر حبشہ (ابی سینیا) کی عیسائی حکومت تیرہ سو سال سے قائم ہے، اپنے جغرافی محل وقوع کے لحاظ سے کوئی نہیں جانتا کہ اگر چاہا جاتا تو اپنے محروسہ مقبوضہ علاقہ میں بآسانی اس علاقے کو بھی شریک کر لے سکتے تھے، مگر اسی جذبۂ اتحاد و تشکر کا یہ نتیجہ ہے کہ کشور کشائیوں کے سلسلے میں مسلمان دنیا کے دور دراز علاقوں میں گھستے چلے گئے، لیکن حبشہ والوں نے بڑے نازک وقت پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابیوں کی مختصر تعداد کو چونکہ پناہ دی تھی، اس لیے نگاہ غلط انداز بھی ان کی حبشیوں کی اس سرزمین پر نہیں پڑی، حالانکہ جس وقت حبشہ والوں نے ان صحابیوں کو پناہ دی تھی اس وقت بھی ان کی اکثریت دین مسیحی ہی پر قائم ہے،

کچھ بھی ہو، میرا ناچیز خیال یہی ہے کہ مسلمان حکمرانوں اور عام مسلمانوں نے بغیر کسی تنگ دلی کے غیر مسلم اطباء کے خدمات سے استفادہ کے سلسلہ کو آئندہ جو جاری رکھا، اس کی حوصلہ افزائی عہد نبوت

وخلافت راشدہ کے روایات ہی سے ہو رہی تھی،

اور شاید یہی وجہ ہے کہ سیدنا عمر بن عبدالعزیز الخلیفہ نے بھی اپنے زمانہ میں اطبا کے ساتھ مروانی حکمرانوں کے جو تعلقات تھے، ان میں صرف یہی نہیں کہ کسی قسم کی ترمیم و اصلاح نہ فرمائی، بلکہ کتابوں میں لکھا ہے کہ اہرن بن اعین القس کی کتاب کناشہ (یا قرابادین) کا ترجمہ سریانی زبان سے بنی امیہ کے عہد کے یہودی طبیب ماسرجویہ نے عربی زبان میں کیا تھا، اور علاوہ شرح کے مزید دو مقالوں کا بھی اضافہ اس کتاب میں اس کی طرف سے عمل میں آیا تھا، بیان کیا جاتا ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے چالیس دن تک اس کتاب کو اپنی عبادت گاہ کے کمرہ میں رکھا، اور اس کے بعد حکم دیا کہ عام مسلمانوں میں یہ کتاب پھیلا دی جائے، (طبقات الاطبا، ص ۱۹۳ ج ۱)

زیادہ سے زیادہ اس سلسلہ میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کی بس، اصلاحی خدمت کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ عام طور پر اس زمانے میں یہودی اور عیسائی اطبا تریاق کے نام سے جو چیز تیار کرتے تھے، اس میں سانپ بھی نسخہ کا ایک جز تھا، ابن سعد نے طبقات میں ابن لہیعہ محدث کے حوالہ سے یہ روایت نقل کی ہے کہ عمر بن عبدالعزیز نے صوبہ کے عامل کو لکھا تھا کہ تریاق میں بجائے مردہ سانپ کے نہ ڈالا جائے،

الاحیۃ ذکیۃ (ص ۲۸۵ - ج ۵) مگر ذبح کیا ہوا سانپ،

حالانکہ سانپ خواہ میتہ (مردہ) ہو، یا ذکیہ (ذبح کیا ہوا) ہر حال میں حرام ہے، مگر طبی ضرورت سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کا خیال بھی وہی تھا، جو بہت سے دوسرے ائمہ اسلام کا ہے کہ دوائی حرام چیزوں کا استعمال بھی جائز ہوتا ہے[1]، میں خود طبیب نہیں ہوں، مجھے معلوم نہیں ہے کہ تریاق میں

---

[1] حرام چیزوں سے دوائی استفادہ یا ان کا کھانا جائز ہے یا نہیں، امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا فتوی اس باب میں یہ نقل کیا جاتا ہے کہ جب تک اطبا صحت کو اسی دوا کے استعمال کے ساتھ محدود نہ کر دیں، اس وقت تک ان کا استعمال

سانپ کو لوگ کس طرح شریک کرتے تھے، آج کل کے اطباء کا اس کے متعلق کیا خیال ہے، عہد جدید کی ڈاکٹری دواؤں میں مسلمانوں کے لیے عام ابتلا کی جو صورت پیش آگئی ہے، ارباب علم و فتویٰ چاہیں تو حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے اس "اثر" سے سہولت کی راہ پا سکتے ہیں،

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی، میں کہنا یہ چاہتا تھا کہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنی امیہ کے ہاتھوں میں سیاسی اقتدار آیا، تو ایک طرف جیسا کہ عام طور پر لوگ جانتے ہیں، قدیم عربی حمیت کے بجھے ہوئے شعلے ان کے زمانہ میں بھڑک اٹھے تھے، جس اسلامی نظام میں ایران کا نومسلم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کا رکن بن جاتا تھا، خالص قریشی نژاد خلیفہ عمر فاروقؓ اپنی صاحبزادی کو اس کے عقد ازدواج میں دینے کے لئے آمادہ ہو جاتے ہیں[۱]،

حبشی بلالؓ ان ہی عمر فاروقؓ کا سید نا بن جاتا ہے، اسی اسلامی نظام میں بنی امیہ کے فرمانرواؤں نے عربی و عجمی موالی و غیر موالی کے سوال کو اٹھایا، اور جہاں تک ان کے امکان میں تھا، اس کلمہ منتنہ[۲] (بدبودار) سے نفع اٹھانے میں کمی نہ کی،

(بقیہ حاشیہ ص ۳۴۹) جائز نہ ہوگا، یعنی اس حرام کا بدل حلال دوا اگر مل سکتی ہے، تو اس وقت تک حرام دوا کو استعمال نہ کرنا چاہیے، لیکن دوسرے ائمہ کا فتویٰ ہے کہ بدل نہ ملے، دوا حرام چیزوں کا استعمال حرام ہی نہیں تفصیل کے لئے فقہ کے مطولات کا مطالعہ کیا جائے عجیب بات یہ ہے کہ امام شافعی کا نام بھی ثانی الذکر طبقہ میں لیا جاتا ہے یعنی دوا حرام چیزوں کا استعمال جائز ہو جاتا ہے، مگر الدمیری نے حیات الحیوان میں نقل کیا ہے کہ جس تریاق میں سانپ ڈالا گیا ہو امام شافعی اس کے کھانے کی اجازت اس وقت تک نہیں دیتے تھے، جب تک کہ اضطرار کی حالت نہ پیدا ہو جائے، جس میں قرآن نے مردار کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے (ج ۱ ص ۲۴۵ حیات الحیوان دمیری، ۱۲)

[۱] میرا اشارہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف ہے، ۱۲۔

[۲] عہد نبوت و رسالت میں نسلی و وطنی سوالات کوئی اگر اٹھاتا تو آواز بلند ہوتی تھی، دعوہا فانہا کلمۃ منتنۃ (اسکو چھوڑو بھی بدبو بات ہے)

گرباوجود اس کے ہم اطبا کے لباس میں ان ہی اموی فرمانرواؤں کی شاہی خواب گاہوں میں یہودی اور عیسائی طبیبوں کو پاتے ہیں، ابن ابی اصیبعہ نے نقل کیا ہے کہ بیمار مروانی حکمران عبدالملک جب مرض الموت میں مبتلا ہوا، تو وہی عیسائی طبیب جس کی کنیت مسلمانوں نے ابوالحکم رکھدی تھی، پہلے بھی اس کا ذکر آچکا ہے کہ یزید کے ساتھ بطور اتالیق کے موسم حج میں امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کو حجاز بھیجا تھا، اسی ابوالحکم کا بیان ہے کہ عبدالملک نے اس کو اپنے زمانہ میں بلالیا، اسکی روایت کے الفاظ ہیں :-

فانی مجالس وعندہ بناتہ — میں عبدالملک کے بستر علالت کے پاس بیٹھا ہوا تھا، اور عبدالملک کی لڑکیاں بھی وہاں

(ج ۱ ص ۱۱۶)

واللہ اعلم درمیان میں کوئی پردہ تھا، یا برنج اودھکر باپ کے پاس عبدالملک کی یہ شہزادیاں آتی تھیں میری غرض یہ ہے کہ قرب اور نزدیکی کا جو مقام غیر مسلم طبیبوں کو مروانی حکومت میں دیا گیا تھا، کیا اس کے بعد بھی کوئی مرتبہ سوچا جاسکتا ہے؟

---

۵۱ آگے جو قصہ ابوالحکم نے بیان کیا ہے وہ بڑا دردناک ہے، لکھا ہے کہ اسی عرصہ میں عبدالملک کو ولی عہد ولید بھی اسی کمرے میں داخل ہوا، اور باپ سے حال پوچھنے لگا، مگر جس انداز سے مزاج پرسی کر رہا تھا، عبدالملک نے تاڑلیا، یعنی اپنی بادشاہی کا خواب اس کے مرنے کے بعد دیکھ رہا ہے، عبدالملک کی زبان پر بے ساختہ یہ شعر جاری ہوا جس کا ترجمہ یہ ہے کہ

"ایک شخص میرا حال دریافت کر رہا ہے، اور چاہ رہا ہے کہ میں مرجاؤں، دوسری طرف کچھ عورتیں (لڑکیاں) مزاج پرسی کر رہی ہیں، اور اُن کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں)

۵۲ صرف قیاس سے میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں، طبقات الاطبا ہی میں ابوسہل نوبخت ایرانی طبیب کے ذکر میں لکھا ہے کہ خلیفہ منصور کے پاس پہلی دفعہ جب ابوسہل پیش ہوا، تو نام پوچھنے پر اُس نے اپنا اصل ایرانی نام بتاتے ہوئے کہا کہ میرا نام "خرشاہ" ذاہ طہماذاہ ماذر یاد خسرو ابھشاذ" ہے اس طویل لمبے نام کو سنکر منصور مسکرایا پھر کہا کہ تمھارے باپ نے تو عجب تماشا کیا ہوگا وہی صورت ہوگی تمام الفاظ میں "طہماذاہ" کے لفظ کو میں چن لیتا ہوں اسی نام سے تم کو موسوم کیا جائیگا اور جس بنا پر [illegible] کنیت "ابوسہل"

حیرت ہوتی ہے کہ عربیت کے سب سے بڑے علمبردار اموی حکومت کے تاج کا جوہر تابدار اور مسلمانوں کا سب سے بڑا ظالم فتار حجاج بن یوسف ثقفی جیسے آدمی کو بھی طبی کاروبار میں ہم کافی وسیع النظر پاتے ہیں، جو اس کی جو کچھ بھی ہو، مان بھی لیا جائے کہ پرخوری کی عادت بد سے مجبور ہو کر وہ طبیبوں کا دست نگر ہو گیا تھا لیکن جس نے سارے ایرانی ممالک کے فارسی دفاتر کو عربی زبان میں بہ یک اشارہ چشم بدل دیا تھا، اس کے لئے کیا دشوار تھا کہ عربی النسل اطبار کو اپنے اردگرد جمع کر لیتا، خصوصاً بنی ثقیف جس سے حجاج کا خاندانی تعلق تھا، اسی قبیلہ میں پشتہا پشت سے عربی طبیبوں کا ایک سلسلہ اسلام سے پہلے بھی پایا جاتا تھا، اور بعد کو بھی اس خاندان کے اطبار کا ذکر لوگوں نے کیا ہے یعنی وہی حارث بن کلدہ جو عہد نبوت میں حجاز کا سب سے بڑا طبیب شمار ہوتا تھا، اور اس کو بھی جانے دیجئے، حجاج کے لئے کیا دشوار تھا کہ اپنے علاقہ جندیسابور کی طبی درس گاہ میں عرب نوجوانوں کو بھیج کر اپنے لئے عربی النسل اطبار کا اسٹاف مہیا کر لیتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ حجاج کے دربار کا بھی سب سے زیادہ سرپرآوردہ اور اس کا محبوب ترین چہیتا طبیب بھی عیسائی ہی تھا، نام اس کا لوگ تیاذوق بتاتے ہیں، لفظ کی صورت بتاتی ہے کہ کسی غیر معمولی عربی لفظ کی یہ عربی شکل ہے، واللہ اعلم بالصواب، ابن ابی اصیبعہ جس کی نظر سے ابراہیم بن القاسم الکاتب کی کتاب اخبار الحجاج گذر چکی تھی جس میں کافی بسط و تفصیل کے ساتھ حجاج کے حالات درج کئے گئے ہیں، اسی کتاب کے حوالہ سے بھی اور دوسری کتابوں سے بھی اخذ کر کے تیاذوق کے بڑے دلچسپ قصے اپنی کتاب میں نقل کئے ہیں، اسی میں لکھا ہے کہ

کان یعتمد علیہ وثیق بما وآتہ	حجاج تیاذوق پر بھروسہ کرتا تھا، اور
وکان لہ منہ الجامکیۃ	اس کے علاج پر اعتماد کرتا تھا حجاج

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۳۵۱) رکھ لو، ابوسہل نے دوسری صورت کو سہل قرار دیا، اور بعد کو "ابوسہل" کے نام سے مشہور ہوا جس سے معلوم ہوا کہ عربی کنیت ان عیسائی یا یہودی طبیبوں کی مسلمانوں کی طرف سے رکھی جاتی تھی، ۱۲

الوافر کا، والافتقاد الکثیر کے پاس سے غیر معمولی تحفہ بھی تیاذوق کو ملتی تھی، اور یون بھی اس کی بہت زیادہ خبر گیری کرتا تھا،

(ص ۱۲۱ ج ۱)

یہ بھی لکھا ہو کہ جب تیاذوق مرض موت مین مبتلا ہوا تو حجاج عیادت کے لئے براہ راست اس کے گھر گیا خود کہتا تھا کہ

لما حضرتہ الوفاۃ دخلت علیہ جب تیاذوق مرض الموت مین مبتلا ہوا تو

اعودہ، (ص ۱۲۳) مین اس کے گھر گیا عیادت کرنے کے لئے،

آج ان الفاظ کے وزن کو ہم محسوس نہین کر سکتے تھے لیکن حجاج جو امری حکومت کے سارے ایشیائی علاقہ کا مطلق العنان والی و حاکم تھا، اور نخوت و کبر مین اس کا جو حال تھا، ان امور سے جو واقف ہین، وہ سمجھ سکتے ہین کہ یہ کتنا غیر معمولی واقعہ تھا، ممکن ہے کہ اس مین تیاذوق کی غیر معمولی خدمت کو بھی دخل ہو، حجاج اپنے لڑکے محمد سے بیان کیا کرتا تھا کہ

"بقاے صحت کے متعلق تیاذوق کے طبی مشورون کو مین نے اپنے تجربہ مین بالکل درست پایا، اور ہمیشہ ان پر عمل کرنے سے مجھے نفع پہنچا"[1]

یا تیاذوق کی غیر معمولی حاضر جوابیون سے حجاج کے دل مین غیر معمولی اثر اس کا جو قائم کر دیا تھا، اس کا نتیجہ ہو، حجاج اپنے بے پناہ مظالم کی وجہ سے اپنے آپ کو ہمیشہ مشکلات مین گھرا پاتا تھا، تیاذوق جب آجاتا، تو اس کی گفتگو سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا غم غلط ہو جاتا تھا، اس سلسلہ مین لوگون نے تیاذوق کے متعدد لطیفون کا ذکر کیا ہے جن مین اُس کے ذہنی انتقال کی بڑی اچھی مثال یہ ہے کہ حجاج کے سر

---

[1] اگر یہ واقعہ ہو جیسا کہ ابن عساکر نے تاریخ دمشق مین نقل کیا ہے کہ بعضون نے حجاج کو دسترخوان پر کھاتے ہوے پایا جتنے لقمے اٹھاتا تھا انھین وہ گن رہے تھے، بیان کرتے تھے کہ مسلم ایک روٹی مین ایک کف دست

مین مرد تھا، تیاذوق بُلایا گیا، اُس نے حکم دیا کہ امیر کے پاؤن پر گرم پانی ڈالا جاے اور تیل کی مالش کی جاے، ایک خواجہ سرا جو عموماً حاضر ہوتے تھے، حجاج کے سامنے کھڑا تھا، بے ساختہ بول اٹھا کہ درد تو امیر کے سر مین ہے اور یہ عجیب طبیب ہے مشورہ دے رہا ہے کہ امیر کا پاؤن دھویا جاے، تیاذوق نے کہا کہ میرے دعوی کی دلیل تو تیرے چہرے پر ہے، خواجہ سرا نے کہا کہ وہ کیا، بولا کہ جو چیز تمھارے اندر سے نکالی گئی، وہ کان تھی اور ڈاڑھی تمھارے چہرے سے غائب ہوگئی، خواجہ سرا شرمندہ ہوگیا،

بہرحال عبدالملک اور حجاج جو غربت کی زندگی سے امارت و دولت تک پہونچے تھے، بداوت کیے یا دہقانیت سے زیادہ دور نہین ہوئے تھے، جب اُن کے درباروں مین غیر مسلم اطبا کو عزت و جاہ کی ان بلندیون پر ہم پا رہے ہین، تو اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آیندہ ان مروانی حکمرانون کے تعلقات کی نوعیت ان طبیبون کے ساتھ ترقی کے کس نقطہ تک پہونچ گئی، ہوگی، جنھون نے شاہی خانوادہ مین پرورش پائی تھی اور پیدا ہونے کے ساتھ ناز و نعمت کی زندگی کے عادی تھے، ان ہی حکمرانون مین جب اس قسم کے لوگ پیدا ہو چکے تھے، جو فخر کرتے تھے کہ مین کسری کا بیٹا ہون، اور مروان میرا باپ ہے، میرا نانا قیصر بھی ہے اور

(بقیہ حاشیہ ص ۳۵۳) کھن بھرتا اور نگلتا جاتا تھا، اس طرح (۸۴) لقمے مین نے اس کے گنے غالباً تیاذوق کی دوا بن سنا اس کے معدے مین ہضم کی یہ غیر معمولی قوت پیدا کر دی تھی، (دیکھو ابن عساکر ج ۵ ص ۲۰، طبقات الاطبا مین ایک لطیفہ یہ نقل کیا ہے کہ تیاذوق سے حجاج نے کچھ ضعف معدہ کی شکایت کی، اس نے مشورہ دیا کہ بچے ہوے پستے سامنے رکھ لیجئے، اور ایک ایک دانہ توڑ توڑ کر بطور نقل کے استعمال کیجئے، حجاج نے درباریون سے کہا کہ بچے ہوے پستون کے استعمال کا مشورہ آج تیاذوق نے مجھے دیا ہے، کہتے ہین کہ مختلف درباریون کے گھر سے بچے ہوے پستون کے خوان کے خوان نازل ہونے لگے، حجاج نے بھی مٹھیون مین بھر بھر کر پھانکنا شروع کیا، اور اتنا کھا گیا کہ بدہضمی ہوگئی، تیاذوق بلایا گیا، حجاج نے کہا کہ یہ کیا ہوا؟ بولا کہ اے امیر! مین نے تو عرض کیا تھا کہ دانہ دانہ کرکے اسے چگئے گا، آپنے تو پھانکنا شروع کیا، حجاج شرمندہ ہوگیا، پھر علاج معالجہ سے طبیعت درست ہوگئی

خاقان بھی[1]،

سوچا جاسکتا ہے کہ اپنی ہمرشتہ قوموں کے افراد کے ساتھ حسن سلوک میں اگر اسے خالص عربی نژاد بزرگوں سے وہ آگے بڑھ گئے ہوں، تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے،

افسوس ہے کہ مروانیوں کے اسّی سال کے دورِ حکومت میں دربار سے جن جن اطبا کا تعلق رہا، لوگوں نے تفصیلی تذکرہ اپنی کتابوں میں نہیں کیا ہے مگر تیاذوق ہی کے متعلق ہم ان ہی میں پاتے ہیں کہ اس کا بیٹا بھی طبیب تھا، ابن ابی اصیبعہ نے لکھا ہے کہ اسی بیٹے کے لئے تیاذوق نے "کناش کبیر" بھی لکھی تھی، اور کتاب الادویہ بھی جس میں بیان کیا ہے کہ

کیفیۃ دقھا و ایقاعھا و اذابتھا	دواؤں کے کوٹنے اور اُن کے ڈالنے
وشی من تفسیر الادویۃ،	گھلانے وغیرہ کے طریقے بھی بیان کئے
	گئے تھے، اور بعض دواؤں کے نام کی
(صفحہ ۱۳۳)	بھی تشریح کی تھی،

نیز یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اپنے بعد تیاذوق نے شاگردوں کی بھی معقول تعداد چھوڑی تھی جن میں ایک یہودی طبیب فرات بن شحاثا کے متعلق طبقات الاطبا میں لکھا ہے کہ

کان تیاذوق المتطبب یقدمہ	تیاذوق طبیب اس کو (یعنی فرات بن
علی جمیع تلامذتہ،	شحاثا) کو اپنے تمام دوسرے شاگردوں

---

[1] عام تاریخوں میں یزید بن الولید مروانی فرمانروا کی طرف عربی کا یہ شعر منسوب کیا گیا ہے، وہ کہا کرتا تھا،

انا ابن کسری و ابی مروان وقیصر جدی وجدی خاقان

مسعودی ص ۳، پر کامل اسی کا ترجمہ درج کیا گیا ہے، کہتے ہیں کہ یزید بن الولید کی ماں جس کا نام سارہ بنت فیروز تھا، کہتے ہیں کہ اس میں واقعی ایران کے کسری روم کے قیصر ترکوں کے خاقان کا خون شریک تھا، ۱۲

(جلد ۱ صفحہ ۱۶۱) پر ترجیح دیتا تھا،

اسی فرات بن شحاثا یہودی کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ

خدم الحجاج بن یوسف و هو حدث — اُس نے حجاج بن یوسف کی بھی اس زمانہ مین خدمت کی تھی، جب یہ یہودی طبیب جوان تھا،

(ج ۱ صفحہ ۱۶۱)

فرات نے کافی عمر پائی، مروانیون کا دور جب ختم ہوگیا، اور ان کے جانشین عباسی ہوئے تو ان کے دربار مین فرات داخل ہوگیا، کوفہ کے عباسی گورنر عیسیٰ بن موسیٰ نے اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا تھا، جیسا کہ بیان کیا گیا ہے، عیسیٰ کا وہ صرف طبیب ہی نہین تھا، بلکہ سیاسی مشیر بھی، بعض سیاسی مشورے فرات نے جو اس کو دیے تھے، فرات کی وفات کے بعد جب واقعات اسی کی سیاسی بصیرت کے مطابق پیش آتے، تو عیسیٰ کہا کرتا تھا کہ

فرات! تو کتنا صائب الرائے آدمی تھا، جو بات بھی تو کہتا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقوع سے پہلے گویا بے نقاب ہوکر تیرے سامنے آجاتی تھی، جو واقعات آج میرے سامنے پیش آرہے ہین، تو ان کو گویا دیکھ رہا تھا، (صفحہ ۱۶۳)

ابن ابی اصیبعہ نے فرات کے بعض سیاسی مشورون کا تذکرہ بھی کیا ہے جو پڑھنے کے قابل ہین افسوس ہے کہ اُن کی تفصیل کا یہان موقع نہین ہے، اُن کے پڑھنے سے ایک طرف جہان اس کا پتہ چلتا ہے کہ غیر مسلم اقوام کے ان طبیبون پر کتنا غیر معمولی اعتماد مسلمانون کے سلاطین و امرا کرتے تھے، تو دوسری طرف اس کا بھی انکار نہین کیا جا سکتا ہے کہ اپنے قدرشناسون کے ساتھ ان کے تعلقات بھی کتنے مخلصانہ اور سچی ہمدردی خواہیون پر مبنی تھے،

جیسا کہ مین نے عرض کیا، مردانی حکمرانون کے دربار کے ان طبیبون کا تفصیلی تذکرہ کتابون مین

نہین پایا جاتا، لیکن جب عباسیون نے اپنے ہاتھ مین مسلمانون کی حکومت کی باگ لی، اس وقت جو تماشا اس سلسلہ مین پیش آیا، وہ دیکھنے کے قابل ہے،

عباسیون نے جیسا کہ جاننے والے جانتے ہین زیادہ تر کامیابی غیر عربی عناصر کی امداد و معاونت سے حاصل کی تھی، قدرۃً ان کا دربار عجمیون سے بھر گیا، عموماً مالی کاروبار کا عباسیون کے زمانہ مین یہودی جھبذون یا موجودہ اصطلاح مین یہودی بنک کارون سے تعلق تھا،

عباسیون کی تاریخ کا یہ ایک بڑا اہم باب ہے، میرے سامنے اس وقت صرف اطبا اور معالجین کا قصہ ہے، آیئے پہلے اس کو سن لیجئے، پھر اگر توفیق رفیق ہوئی تو عہد عباسی کے جہابذہ کی داستان بھی سنائی جائیگی اگر اجل سمجھ نے فرصت نہ دی تو مین دوسرے ارباب علم و قلم سے درخواست کرتا ہون کہ آیندہ اس مضمون کی تکمیل فرما دین گے،

سچ پوچھئے تو غیر مسلم اطبا کے عروج و اقبال کا حقیقی زمانہ عباسیون ہی کا عہد ہے، ان کے دربار مین یہودی، عیسائی، مجوسی، صابی اطبا کے سوا نیا عنصر ہندوستانی طبیبون کا بھی داخل ہو گیا تھا، کہتے ہین کہ عباسیون کا دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور ضعف معدہ مین مبتلا تھا اچھا نہ ہوتا تھا، ایک ہندوستانی طبیب نے پھنکی بنا کر دی جس سے صحت حاصل ہوئی، اور اس کے دل مین ہندی طریقۂ علاج کا وزن پیدا ہوا، نیز خالد برمکی کو ہند اور ہندی علوم سے جو تعلق تھا، اس کو بھی عباسیون کے دربار مین "ہندی طب" بلکہ دوسرے ہندی علوم و فنون کی روشناسی مین بہت دخل ہے، اب خواہ اسباب کچھ بھی ہون ہندوستانی اطبا کی کافی تعداد مختلف زمانہ مین بغداد پہنچی ہے، ہندی طب کی بے شمار کتابون کا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، اردو زبان مین کافی مواد اس مسئلہ مین جمع ہو چکا ہے، ابن ابی اصیبعہ نے ہندی اطبا اور ہندی طب کی جو کتابین عربی مین ترجمہ ہوئین ان کی فہرست درج کی ہے، جس مین دلچسپ بات یہ ہے، کہ منجملہ اور

کتابوں کے ایک کتب خانہ ہندوستان سے بغداد پہنچی جس کا نام علاجات النساء تھا۔ یا اسی عنوان پر یہ کتاب لکھی گئی تھی، بہرحال دلچسپ بات یہ ہے کہ ابن ابی اصیبعہ کا بیان ہے کہ

کتاب رومی الھندیہ فی علاجات	روسی ہندی خاتون کی کتاب عورتوں
النساء، (ج ۲ صفحہ ۳۲)	کے علاج کے متعلق ہے،

ہمیں نہیں جانتا کہ اس ہندوستانی مصنفہ کی اس خدمت کا جو اپنے جنس کی اس نے انجام دی تھی دوسروں نے بھی تذکرہ کیا ہے یا نہیں، اور اس زمانے میں اُس کے متعلق لوگوں کی تحقیق کیا ہے، کچھ بھی ہو طب جیسے اہم فن پر ہندوستان کی کسی خاتون نے کتاب لکھی ہے، اس کا پتہ تو اس تاریخی شہادت سے چلتا ہے، کاش اس فن سے تعلق رکھنے والوں کی توجہ اس کتاب کی طرف مبذول ہو، ہمارے مسلمانوں کی طب کی تاریخ پر کام کرنے والوں کے حوالہ کرکے میں اپنے موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں،

سب سے پہلے تو اس سلسلہ میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ دربار خلافت کے ساتھ تعلق رکھنے والے اطبا کی تعداد کیا ہوگی، جب ہم دیکھتے ہیں کہ عباسی عہد کے امرا بھی اپنے ہاں طبیبوں کی ٹولیوں کو ملازم رکھتے تھے طبقات الاطبا میں مشہور عباسی امیر ابو دلف کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے،

کان مجلس ابی دلف مجمعًا	ابو دلف کی مجلس میں طبیبوں کا مجمع
للمتطببین،	رہتا تھا،

طبیبوں کے اس مجمع میں جو لوگ شریک تھے، اُن میں بعضوں کا نام بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

کان معہ من المرتزقۃ جماعۃ	امیر ابو دلف کیساتھ تنخواہ یاب طبا کا ایک
منھم یوسف بن صلیبا وسلیمان	گروہ تھا جن میں یوسف بن صلیبا سلیمان بن
بن داؤد بن بابان ویوسف القصیر	داؤد بن بابان یوسف القصیر (کوتاہ قد) اور
ویونس بن حنون، (ج ۱ ص ۱۶۸)	یونس بن حنون بھی تھے،

نام ونسب سے ہی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان نہین تھے، اسی کے بعد بیان کیا ہے، کہ مرتزقہ کے سوا

وربما اجتمعوا فی مجلسہ منھم	بسا اوقات (غیر تنخواہ دار اطبا کے)
عشرون رجلاً	بیس بیس آدمی اس کی مجلس مین جمع
	ہو جاتے تھے،

فہرس ہے کہ لوگون نے مفصل فہرست ان طبیبون کی نہین دی ہے، جو مختلف عباسی خلفا کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، لیکن اتفاقی طور پر دوسرے واقعات کے تذکرے کے ذیل مین ایسی چیزین مل جاتی ہین، مثلاً ابن ابی اصیبعہ نے مشہور عیسائی طبیب حنین بن اسحاق کے اس رسالہ کو نقل کیا ہے، جس مین اُس نے اپنی اور بختیشوع طبیب کی باہمی کش مکش اور سازش کی داستان بیان کی ہے، اسی رسالہ مین حنین نے خلیفہ متوکل کے زمانہ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ ہمارے مخالف اطبا جو ہمارے ہم مذہب یعنی عیسائی ہین، اور خلفا کی خدمت کا شرف سب کو حاصل ہے، ان کی تعداد،

ستۃ وخمسون رجلاً کلھم	چھپن ہے، اور سب ہمارے ہم
من اھل المذھب، (ص۱۹۳)	مذہب ہین،

ظاہر ہے کہ دربار خلافت کے یہ چھپن طبیب اسی درجہ کے لوگ ہون گے، جو حنین سے ٹکر لینے کی صلاحیت رکھتے تھے، نہین کہا جا سکتا کہ اُن کے مددگارون، دواسازون وغیرہ کی تعداد کیا ہو گی،

یہ اور اسی قسم کی دوسری شہادتون کی بنا پر میرا خیال ہے کہ طب اور علاج ومعالجہ کی راہ سے عباسی دور مین غیر مسلم اقوام سے تعلق رکھنے والون نے اقتدار واثر حاصل کیا تھا، ان کی تعداد معمولی نہ ہو گی، ذرا ممالک محروسہ عباسیہ کی وسعت وفراخی کا تصور کیجئے، اور سوچئے کہ اس وسیع علاقے کے باشندون

کی طبی ضرورتوں کی تکمیل کے لیے کتنے آدمیوں کی ضرورت تھی، چونکہ اس پیشہ کو مسلمانوں نے غیر مسلم اقوام ہی کے سپرد کر رکھا تھا، اس لیے اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے کہ اگر عباسیوں کے زمانہ میں طبابت کی راہ سے معاش حاصل کرنے والوں کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہو، یہ خیال بھی صحیح نہ ہوگا کہ اپنی قومی اور دینی خصوصیتوں کو ترک کر کے یا ان سے لاپروائی اختیار کر کے مسلمانوں کے دلوں میں ان لوگوں نے جگہ پیدا کی تھی،
(باقی)

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضا تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس میں ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق ان کے نظریات و خیالات کی تشریح کی گئی ہے، جو لوگ قرآن مجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہیں، ان کے لیے یہ کتاب مشعلِ ہدایت کا کام دے سکتی ہے، (مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت :- ۲ روپے،

رقعات عالمگیر

اورنگ زیب عالمگیر کے خطوط و رقعات جو زمانۂ شہزادگی سے برادرانہ جنگ تک اعزہ کے نام لکھے گئے ہیں، اس جلد میں جمع کیے گئے ہیں، اور ان سے علم ادب، سیاست اور تاریخ کے بیسیوں حقایق کا انکشاف ہوتا ہے، قیمت للعہ (جامع پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی)

"منیجر"

خدمتِ حدیث میں خواتین کا حصہ

از

حافظ مولوی مجیب اللہ صاحب ندوی

اسلام سے پہلے زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح علم و فن کے شعبہ میں بھی خواتین کے کارنامون کا بہت کم سُراغ ملتا ہے، خاص طور سے عرب میں تو اس صنف کی حالت اور زار و زبون تھی، پورے ملک میں مشکل سے دو چار عورتیں پڑھی لکھی مل سکتی تھیں لیکن یہ اسلام کی علم پروری کا فیض تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں مردوں کی طرح عورتوں میں بھی اُس نے ایسا انقلاب پیدا کر دیا کہ ان کی دنیا بدل گئی، اور زندگی کے مختلف شعبوں کے ساتھ علم و فن میں بھی انھوں نے اپنا ایک مقام پیدا کر لیا، اور اسلام کا یہ چشمۂ فیض عرب ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ ساری دنیا اس سے سیراب ہوئی،

لیکن سوء اتفاق سے عام طور پر یہ خیال قائم کر لیا گیا ہے کہ گذشتہ زمانہ میں پردہ کی وجہ سے مسلم خواتین زندگی کے کسی شعبہ اور خاص طور سے علم و فن میں کوئی خاص حصہ نہیں لے سکیں، اور نہ انھوں نے کوئی قابلِ ذکر یادگار چھوڑی، اور اس زمانہ میں بھی اُن کی دنیا گھر کی چار دیواری تک محدود ہے، پھر اسی وہمی خیال کے ماتحت یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پردہ میں رہ کر مسلم خواتین کی ترقی ممکن نہیں ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کو اس قید سے آزاد کر کے میدانِ عمل میں آنے کی اجازت دیجائے، کہ وہ بھی مردوں کے دوش بدوش زندگی کی جد و جہد میں حصہ لے سکیں، اس وقت اس پر بحث کرنا مقصود نہیں ہے کہ ایک صالح معاشرہ کی تعمیر اور مسلم خواتین کی واقعی ترقی پردہ میں رہ کر ہو سکتی ہے، یا اس قید سے آزاد ہو کر، لیکن تاریخ سے مذکورۂ بالا خیال کی تائید نہیں ہوتی

بلکہ اس کے برعکس یہ پتہ چلتا ہے کہ ابتدائے اسلام سے اس وقت تک سیکڑوں ہزاروں پردہ نشین مسلم خواتین نے حدودِ شریعت میں رہتے ہوئے گوشۂ علم و فن سے لیکر میدانِ جہاد تک ہر شعبۂ زندگی میں حصہ لیا، اور اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں، جیسا کہ حق ادا کیا، اس مضمون میں صرف اُن کی علمی کوششوں کے ایک گوشہ یعنی علمِ حدیث کے سلسلہ میں ان کی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے،

خواتین نے علمِ حدیث کی جو خدمات انجام دی ہیں، اُن کی سب سے پہلی نمایندگی صحابیات پر تاہیں، کرتی ہیں، اس لئے سب سے پہلے انہی کے کارناموں کا اجمالی نقشہ پیش کیا جاتا ہے،

صحابہ کی طرح صحابیات بھی اپنے ذہن و دماغ کے لحاظ سے ایک درجہ اور مرتبہ کی نہیں تھیں، اور سب کو یکساں طور سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی تھی، اس لئے اُن کی خدمات بھی اسی اعتبار سے کم و بیش ہوں گی، کیونکہ حدیث کی خدمت کے لئے سب سے زیادہ ضرورت صحبت اور فہم و فراست ہوگی تھی، صحابیات میں ازواجِ مطہرات کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہر لحاظ سے زیادہ خصوصیت حاصل تھی، اس لیے اس سلسلہ میں ان کی خدمات سب سے زیادہ ہیں، اُن میں بھی حضرت عائشہؓ اور حضرت اُم سلمہؓ کے کارنامے سب سے زیادہ ہیں،

حضرت عائشہؓ کثرتِ رواۃ صحابہ (یعنی وہ صحابہ جن کی روایات .... کثرت سے موجود ہیں) میں ہیں، ان کی روایات کی تعداد (۲۲۱۰) ہے جن میں ۲۸۶ حدیثیں بخاری و مسلم میں موجود ہیں، روایات کی کثرت کے لحاظ سے صحابہ میں ان کا چھٹا نمبر ہے،

روایات کی کثرت کے ساتھ احادیث سے استدلال اور استنباطِ مسائل، اُن کے علل و اسباب کی تلاش و تحقیق میں بھی اُن کو خاص امتیاز حاصل تھا اور انکی اس صفت میں بہت کم صحابہ اُن کے شریک تھے، کتبِ حدیث میں کثرت سے اس کی مثالیں موجود ہیں، اگر ایسا ہوتا ہے کہ ایک روایت متعدد صحابہ سے مروی ہوتی ہے، اور حضرت عائشہؓ بھی وہی روایت کرتی ہیں، لیکن وہ اپنی روایت میں اس کی علت و حکمت کا بھی تذکرہ کر دیتی ہیں

جس سے اس کی افادیت بہت بڑھ جاتی ہے، بلکہ بسا اوقات وہ عمل کے لئے زیادتی شوق کا سبب بنجاتی ہے، مثلاً غسل جمعہ کے سلسلہ میں حضرت ابوسعید خدریؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ اس دن غسل کرنا چاہئے، اول الذکر دو صحابی صرف اتنا بیان کرتے ہیں کہ جمعہ کا غسل ضروری ہے، مگر حضرت عائشہؓ نے اپنی روایت میں اسکی علت و حکمت بھی بیان کردی ہے، فرماتی ہیں،

کان الناس ینتابون من منازلھم	لوگ اپنے اپنے گھروں اور مدینہ کے باہر
والعوالی فیاتون فی الغبار تصیبھم	کی آبادیوں سے (نماز کے لئے) آتے تھے، اُن
الغبار والعرق فیخرج منھم العرق	گرد و غبار اور پسینہ میں شرابور ہوتے تھے
فاتی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسان	ایک دفعہ ایک صاحب آپ کے پاس آئے
منھم وھو عندی فقال النبی صلی اللہ	وہ میرے قریب ہی بیٹھے تھے، آپ نے ان
علیہ وسلم لو انکم تطھرتم لیومکم ھذا	سے فرمایا کہ اگر تم آج کے دن غسل کرلیتے
(بخاری کتاب الجمعہ)	تو کیا بہتر ہوتا،

ایک سال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ قربانی کا گوشت تین دن سے زیادہ نہ کھایا جائے، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت ابوسعید خدریؓ نے اسے دائمی حکم سمجھا، حضرت عائشہؓ کو علم ہوا تو آپ نے فرمایا، کہ یہ حکم نہ واجب اور دائمی نہیں، بلکہ مستحب ہے، اس حکم سے آپ کا مطلب یہ تھا کہ قربانی کا گوشت لوگ جمع نہ کریں، بلکہ دوسروں کو کھلا پلا دیا کریں[1]،

بعض مرتبہ راوی کو پوری حدیث محفوظ نہیں ہوتی تھی، صرف حدیث کا ایک ٹکڑا یاد رہ جاتا تھا، یا روایت کے مغز سخن تک نہ پہنچنے کی وجہ سے جب وہ حدیث روایت کی جاتی تھی تو روایت کا پورا مفہوم سامنے نہیں آتا تھا، بلکہ بسا اوقات معنی بھی بدل جاتے تھے، حضرت عائشہؓ جب بھی ایسی حدیث سنتی تھیں، تو اُن کی تصحیح

---

[1] سیرت عائشہ صـ۱۸۲،

تردید کر دیتی تھیں، اس سلسلہ میں انھوں نے اکابر صحابہ تک سے اختلاف یا ان کی روایات پر استدراک کیا ہے، تقریباً ایسی چالیس احادیث ہیں جن میں انھوں نے صحابہ پر استدراک کیا ہے، امام سیوطی نے ان روایات کو ایک جگہ جمع کر دیا ہے، اس رسالہ کا نام عین الاصابہ ہے، اس کے دیکھنے سے احادیث میں ان کی دقت نظر اور نکتہ سنجی کا اندازہ ہوتا ہے، توضیح کے لیے دو ایک مسئلے پیش کیے جاتے ہیں، ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت عائشہؓ سے بیان کیا کہ حضرت ابوہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ تین چیزوں میں بدشگونی ہے، عورت میں، سواری میں اور گھر میں، حضرت عائشہؓ نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ ابوہریرہ نے پوری حدیث نہیں سنی، پوری حدیث یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے وہ کہتے ہیں کہ بدشگونی تین چیزوں میں ہے، عورت میں، گھوڑے میں اور گھر میں، ابوہریرہ نے حدیث کا آخری ٹکڑا تو سنا اور پہلا نہیں سنا[1]

بعض صحابہ سے روایت ہے کہ "مردہ پر اس کے گھر والوں کے رونے سے عذاب ہوتا ہے" حضرت عائشہؓ نے جب یہ روایت سنی تو فرمایا کہ آنحضرت صلعم نے کبھی یہ نہیں فرمایا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ ایک دن ایک یہود کے جنازہ پر سے گذرے، اس کے گھر والے اس کا ماتم کر رہے تھے، آپ نے فرمایا یہ رو رہے ہیں اور اس پر عذاب ہو رہا ہے" یعنی مقصود یہ ہے کہ یہ تو رو رہے ہیں، اور مردہ اپنے اعمال کی سزا میں مبتلا ہے، پھر فرمایا کہ ہر شخص اپنے فعل کا جواب دہ ہے، اور استدلال میں یہ آیت تلاوت کی،

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى — اور کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائیگا

عین الاصابہ میں اس کی اور بہت سی مثالیں ہیں، حضرت عائشہؓ سے جن بزرگوں نے حدیث میں استفادہ کیا ہے، ان میں بہت سے صحابہ اور کبار تابعین ہیں مثلاً عبداللہ بن زبیر، سعید بن المسیب، عبداللہ ابن عامر، مروق بن اجدع، عکرمہ، علقمہ، صفیہ بنت عبید، عطا بن یسار، یہ چند نام لکھ دیے گئے ہیں، ورنہ ان

---

[1] عین الاصابہ

روایت کرنے والوں کی تعداد سو سے تجاوز ہے،

ازواج مطہرات میں حضرت عائشہؓ کے بعد ام سلمہؓ ممتاز نظر آتی ہیں، محمد بن لبید کا قول ہے،

کان ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم	ازواج مطہرات کو کثرت سے احادیث یاد تھیں،
یحفظن من حدیث النبی صلی اللہ علیہ	لیکن حضرت عائشہؓ اور ام سلمہؓ سب سے زیادہ
وسلم کثیراً ولا مثلا لعائشۃ وام سلمۃ[1]	ممتاز تھیں،

انھیں حدیث سننے کا بیحد شوق تھا، ایک مرتبہ گھر میں بال گندھوا رہی تھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے زبان مبارک سے جوں ہی ایھا الناس (اے لوگو) نکلا، آپنے مشاطہ سے کہا کہ بال باندھ دو، اس نے کہا جلدی کیا ہے، ابھی تو آپنے ایھا الناس ہی کہا ہے، بولیں کیا خوب ہم آدمیوں میں نہیں ہیں؟ اس کے بعد خود بال باندھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں، اور پورا خطبہ سنا[2]،

حضرت عائشہؓ حدیث میں گو خود بلند درجہ رکھتی تھیں لیکن بعض مرتبہ انھیں بھی ام سلمہ کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا، حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ عصر کے بعد دو رکعت نفل پڑھتے تھے، بعض لوگوں نے اعتراض کیا، تو انھوں نے حضرت عائشہؓ کے واسطہ سے حدیث بیان کی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پڑھتے تھے، حضرت عائشہؓ کے پاس تصدیق کے لیے آدمی بھیجا گیا، تو انھوں نے فرمایا کہ مجھے یہ حدیث ام سلمہؓ سے پہنچی ہے، حضرت ام سلمہؓ کے پاس آدمی گیا، اور قول نقل کیا، تو فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ عائشہ کی مغفرت کرے، انھوں نے بات نہیں سمجھی، کیا میں نے ان سے یہ نہیں کہا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے[3]"،

حضرت ام سلمہؓ کی مرویات کی تعداد (۳۷۸) ہے، ان کے فتاوے بھی کثرت سے ہیں، علامہ ابن قیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اگر ان کے فتاوے جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا سا رسالہ تیار ہو سکتا ہے (ص ۱۳)

ان کا شمار محدثین کے تیسرے طبقہ میں ہے، حضرت ام سلمہؓ کے تلامذۂ حدیث میں بے شمار تابعین اور بعض

---

[1] طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۱۲۶ [2] مسند ج ۶ ص ۳۰۲ [3] بخاری ج ۲ ص ۶۲۷

صحابہ شامل ہیں، چند مشاہیر کے نام یہ ہیں :-

اسامہ بن زید، سلیمان بن یسار، سعید بن مسیب، عبداللہ بن رافع، نافع مولیٰ ابن عمر، عروہ بن زبیر، عکرمہ، ابوسلمہ، ابوعثمان النہدی، ہند بنت الحارث، خیرۃ والدۂ حسن بصری، زینب آپ کی صاحبزادی وغیرہ

حضرت عائشہؓ اور حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات نے بھی حدیث کی روایت اور اشاعت میں حصہ لیا، حضرت حفصہؓ سے مسند میں (۶۰) حدیثیں مروی ہیں، حدیث میں ان سے بڑے بڑے جلیل القدر صحابہ روایت کرتے ہیں، حضرت ام حبیبہؓ سے ۶۵ حدیثیں مروی ہیں اور انکے تلامذۂ حدیث بھی کچھ کم نہیں ہیں مثلاً عروہ بن زبیر، زینب بنت ام سلمہ، ابوصالح السمان وغیرہ، حضرت میمونہؓ سے (۷۶) حدیثیں منقول ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ، عبدالرحمٰن بن سائب، یزید بن اصم، عطاء ابن یسار وغیرہ ہیں، آنحضرت صلعم کی صاحبزادیوں میں حضرت فاطمہؓ سے بھی متعدد روایتیں مروی ہیں،

عام صحابیات میں شاید ہی کوئی صحابیہ ایسی ہونگی جن سے کوئی نہ کوئی روایت موجودہ مجموعہ میں متعدد روایتیں موجود ہیں، ان کے نام مع تعداد حدیث یہ ہیں،

حضرت ام الفضلؓ ان سے (۳۰) حدیثیں مروی ہیں، حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت انس بن مالکؓ وغیرہ ان سے روایت کرتے ہیں، حضرت ام رومانؓ اور ام سلیمؓ سے بھی چند حدیثیں مروی ہیں، ام سلیمؓ سے بڑے بڑے صحابہ مسائل دریافت کرتے تھے، ایک بار کسی مسئلہ میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ میں اختلاف ہوا، تو دونوں بزرگوں نے ان ہی کو حکم مانا[1]، ان دونوں بزرگوں کے علاوہ متعدد صحابہ و تابعین نے ان سے روایت کی ہے، حضرت ام عمارہؓ اور حضرت ام عطیہؓ سے بھی متعدد روایتیں منقول ہیں، حضرت ام عطیہؓ سے متعدد صحابہ و تابعین مثلاً حضرت انسؓ، محمد بن سیرین، حفصہ بنت سیرین وغیرہ نے روایت کی ہے، صحابہ و تابعین ان سے میت کے نہلانے کا طریقہ سیکھتے تھے[2]، حضرت ربیع بنت مسعودؓ

---

[1] مسند ج ۶ ص ۳۰۴ [2] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۵۵

سے (۱۰) حدیثیں صرف مسند میں مروی ہیں، علمی اعتبار سے ان کا پایہ بہت بلند ہے، حضرت عبداللہ بن عباس اور امام زین العابدین ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان بزرگوں کے علاوہ عائشہ بنت انس سلیمان ابن یسار، ابوسلمہ، نافع مولی ابن عمر، وغیرہ ان کے رواۃ میں ہیں، حضرت ام ہانیؓ گو قدیم الاسلام نہیں تھیں، لیکن ان کی روایت سے (۴۶) حدیثیں مسند میں موجود ہیں، ان کے رواۃ کی تعداد بیس کے قریب ہے ان میں عبداللہ بن عباس کے علاوہ متعدد کبار تابعین مثلاً امام شعبی، عروہ بن زبیر، مجاہد، ابن ابی لیلی، عطاء بن یسار، کریب، محمد بن علقمہ وغیرہ ہیں،

خانوادۂ صدیقی میں حضرت اسماءؓ بنت عمیس حضرت صدیقؓ کی زوجہ مکرمہ، اور حضرت اسماءؓ آپ کی صاحبزادی رواۃ حدیث میں ممتاز تھیں، بلکہ عام صحابیات میں کثرت روایت کے اعتبار سے ان کو سب پر فوقیت حاصل ہے، اسماء بنت عمیس سے (۶۰) حدیثیں اور حضرت اسماء بنت ابی بکر سے (۵۶) حدیثیں مروی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں کی تعداد بہت کافی ہے، جن میں حضرت عمرؓ، حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت عبداللہ بن زبیرؓ جیسے صحابہ اور سعید بن المسیب، عروہ بن زبیر، فاطمہ بنت علی، ام عون، عبداللہ بن کیسان، صفیہ بنت شیبہ جیسے تابعین اور تابعات شامل ہیں، ان کے علاوہ فاطمہ بنت قیس، شفاء بنت عبداللہ، زینب بنت ابی معاویہ، اسماء بنت یزید، زینب بنت ابی سلمہ[۱] و بسیرہ بنت الحارث وغیرہ بھی اس سلسلۃ الذہب میں شامل ہیں،

مسانید صحابیات | صحابیات کی کثرت روایت اور ان کی خدمت حدیث کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے امام احمد بن حنبل نے ایک سو تیس صحابیات کی مسانید جمع کی ہیں، جن کی مجموعی ضخامت ۴۴۴ صفحات ہیں، ان میں کئی ہزار حدیثیں ہیں، حافظ ابن عبدالبر نے استیعاب میں ۳۹۰ صحابیات کا تذکرہ لکھا ہے، اسی طرح اسد الغابہ اور اصابہ میں ۵۰۰ سے زائد صحابیات کے تراجم موجود ہیں، اور مشکل ہی سے کوئی صحابیہ

---

[۱] اصابہ و مسند [۲] اسد الغابہ ج ۵ اور تہذیب ج ۱۲

ہوں گی جن سے کوئی روایت نہ موجود ہو، تہذیب میں ۳۴۳۲ عورتوں کا تذکرہ ہے، جن میں بیشتر صحابیات ہیں، اگر ان تمام صحابیات کی روایتیں جمع کی جائیں تو ان کی مسانید کے لیے کئی جلدیں درکار ہونگی کاش اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی توفیق دیتا کہ وہ ان کی مسانید کتب احادیث سے چھانٹ کر ایک جگہ جمع کر دیتا تو بڑا مبارک اور مفید کام انجام پاجاتا،

تابعات صحابیات کی صحبت میں جن خواتین نے پرورش پائی یا ان سے استفادہ کیا ان کو تابعات کہا جاتا ہے، صحابیات کی طرح تابعات نے بھی فن حدیث کی حفاظت و اشاعت اور اس کی روایت اور درس و تدریس میں کافی حصہ لیا، اور بعض نے تو اس فن میں اتنی مہارت بہم پہنچائی کہ بہت سے کبار تابعین نے ان سے اکتساب فیض کیا، چند مشہور تابعات کی خدمات کا تذکرہ کیا جاتا ہے،

حفصہ بنت سیرین، انھوں نے متعدد صحابہ اور تابعین سے روایت کی ہے جن میں انس بن مالک، ام عطیہؓ، ام الدرائح، خیرۃ ام الحسن البصری، ابو العالیہ، ربیع بن زیاد وغیرہ ہیں ان سے روایت کرنے والوں میں ابن عون، خالد الحذاء، قتادہ، ہشام بن حسان وغیرہ تابعین شامل ہیں، جرح و تعدیل کے امام یحیی بن معین نے ان کو ثقہ حجۃ قرار دیا ہے، ایاس بن معاویہ فرماتے ہیں کہ ما ادرکت احدا افضل من حفصۃ میں نے حفصہ سے زیادہ افضل والا کسی کو نہیں پایا، ان کے اس فضل کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ ابن ابی داؤد فرماتے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں انھوں نے قرآن و حدیث پڑھ لیا تھا[1]، امام بخاری اور ابو داؤد نے ان کا تذکرہ کیا ہے، ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے[2]، ۱۰۱ھ میں وفات پائی، امام ذہبی نے انھیں حفاظ حدیث کے دوسرے طبقہ میں شامل کیا ہے[3]،

حافظہ بنت عبد اللہ۔ انھوں نے حضرت عائشہؓ اور حضرت علیؓ اور ام عمرو سے اور ان سے ابو قلابہ، قتادہ، یزید الرشک، ابو عاصم حسن بصری کی والدہ وغیرہ نے روایت کی ہے، یحیی بن معین نے

---

[1] تہذیب التہذیب ج ۱۲ ص ۱۰۱ [2] ایضاً [3] تذکرہ الحفاظ ج ۱ ص ۹۰

ثقہ و حجت کہا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے، جن احادیث کا انھیں علم تھا ان پر سختی سے عمل بھی کرتی تھیں، ابو بشر بیان کرتے ہیں کہ ایک بار زینب کی خدمت میں حاضر ہوا، ان کے پیٹ میں درد تھا، انھوں نے مجھ سے درد کا حال بتایا، بعض لوگوں نے مشورہ دیا کہ کچے گھڑے میں رکھی ہوئی نبیذ ان کو استعمال کرائی جائے، اس میں نشہ آجاتا ہے، چنانچہ میں نے ایک پیالہ نبیذ لاکر ان کے سامنے پیش کیا، انھوں نے نبیذ دیکھکر مجھ سے مخاطب ہوکر فرمایا، اللہ کی پناہ! تم کو معلوم نہیں کہ حضرت عائشہؓ نے آنحضرت صلعم سے روایت کی ہے کہ آپ نے نبیذ جر سے منع فرمایا ہے، خیر تم نے جو کچھ میرے لیے کیا وہ کافی ہے، خدا کی شان کہ وہ پیالہ الٹ گیا، اور نبیذ زمین پر گر پڑی اور ان کو افاقہ بھی ہوگیا[1]

عائشہ بنت سعد بن ابی وقاص۔ مشہور صحابی حضرت سعدؓ کی صاحبزادی تھیں، چچا امہات المومنین کو دیکھا تھا، اپنے والد حضرت سعد اور ام درہؓ سے روایت کی ہے، ان سے روایت کرنے والوں میں ۸ تابعین ہیں، ام ذہبی نے ان کا شمار حفاظ حدیث میں کیا ہے، اور تابعین کے تیسرے طبقہ میں ان کو جگہ دی ہے[2] یہ تنہا خاتون ہیں جن سے امام مالک نے روایت کی ہے[3] ابن حبان نے ان کو ثقہ لکھا ہے، ۱۱۷ھ میں وفات پائی۔

صفیہ بنت عبید۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی اہلیہ تھیں، حضرت عائشہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت ام سلمہؓ، قاسم بن محمد وغیرہ سے روایت کرتی ہیں، ان سے متعدد تابعین مثلاً سالم بن عبداللہ، نافع عبداللہ بن صفوان وغیرہ نے روایت کی ہے، عجلی نے ان کو تابعیہ ثقہ لکھا ہے، ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[4]

عائشہ بنت طلحہ۔ حضرت ابوبکرؓ کی نواسی تھیں، اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں، ان سے جملہ تابعین نے روایت کی ہے، ابن معین اور ابن حبان نے ان کی توثیق کی ہے، عجلی نے تابعیہ

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۰۰ [2] ایضاً ج ۱ ص ۹ [3] ایضاً ج ۲ ص ۳۷۴ [4] ایضاً ص ۴۳۰

ثقہ لکھتے ہیں، ابوزرعہ فرماتے ہیں کہ ان کے فضل کی وجہ سے بہت سے لوگوں نے ان سے روایت کی ہے، اور اہل علم ان کا ادب کرتے تھے[1]

عمرۃ بنت عبدالرحمٰن۔ یہ حضرت عائشہؓ کی خاص تربیت یافتہ اور ان کی احادیث کی امین تھیں، ابن حبان کا قول ہے کہ کانت من اعلم الناس بحدیث عائشۃ (حضرت عائشہؓ کی احادیث کی سب سے بڑی جاننے والی تھیں) ابن المدینی فرماتے ہیں حضرت عائشہؓ کی حدیثوں میں سب سے زیادہ قابل اعتماد احادیث عمرۃ، قاسم اور عروہ کی ہیں، عروہ کے بھائی محمد بن عبدالرحمٰن فرماتے ہیں کہ مجھ سے عمر بن عبدالعزیز نے فرمایا کہ ما بقی احد اعلم بحدیث عائشۃ (اسوقت حضرت عائشہؓ کی احادیث کا ان سے بڑا جاننے والا کوئی موجود نہیں ہے) حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے ابن حزم سے خاص طور سے لکھا تھا کہ عمرۃ کی تمام احادیث ان کے لیے لکھ لیں، ابن سعد نے انکو "عالمۃ" لکھا ہے، امام ذہبی[2] ان کو تابعین کے تیسرے طبقہ میں شمار کیا ہے[3] اور ان کو فقیہۃ لکھا ہے، ابن معین نے انکی شان میں ثقۃ حجۃ اور عجلی نے ثابتۃ ثقۃ اور ابن المدینی نے احد الثقات العلماء[4] کے الفاظ استعمال کیے ہیں،

حضرت عائشہؓ کے علاوہ دوسرے صحابہ سے بھی انھوں نے روایتیں کی ہیں، ان سے روایت کرنے والوں میں ۱۳ سے زیادہ کبار تابعین ہیں، ۱۰۳ھ یا ۱۰۶ھ میں وفات پائی[5]

فاطمہ بنت المنذر حضرت زبیرؓ بن العوام کی پوتی مشہور تابعی ہشام بن عروہ کی بیوی تھیں، انھوں نے متعدد صحابیات و تابعات مثلاً حضرت اسماء، حضرت ام سلمہؓ ام المومنین اور عمرۃ بنت عبدالرحمٰن وغیرہ سے روایت کی ہے، اپنے علم و فضل کے باوجود ہشام بن عروہ نے ان سے روایت کی ہے، عجلی نے انکے بارے میں مدنیۃ تابعیۃ ثقۃ لکھا ہے، اور ابن حبان نے بھی توثیق کی ہے[6]

قمیر بنت عمرو مشہور محدث مسروق بن الاجدع کی بیوی ہیں، انھوں نے حضرت عائشہؓ اور اپنے شوہر مسروق سے روایت

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۱ [2] ایضاً [3] تذکرۃ الحفاظ ۱ ص ۹۴ [4] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۳۵

[5] ایضاً [6] ایضاً ص ۴۴۴

ان کو روایت کرنے والوں میں امام شعبی، محمد بن سیرین، مقدام بن شریح اور عبداللہ بن شبرمہ وغیرہ کبار تابعین ہیں، ابوداؤد اور نسائی میں ان کی روایات موجود ہیں عجلی نے تابعیہ ثقہ لکھا ہے[1]

ام الدرداء صغریٰ: حضرت ابودرداؓ کی بیوی تھیں، اور عمر میں ان سے بہت چھوٹی تھیں، یہ یتیم تھیں حضرت ابودرداؓ نے ان کی پرورش کی تھی، اور وہ چھوٹی ہی عمر سے ہر وقت حضرت ابودرداؓ کے ساتھ رہتی تھیں، اور ان کے ساتھ صحابہ کی مجلسوں میں شریک ہوتی تھیں، ان ہی کی تربیت کا فیض تھا کہ تابعین کے دوسرے طبقہ میں شمار کی جاتی ہیں، انھوں نے حضرت سلمان فارسیؓ، حضرت ابوہریرہؓ فضالہ بن عبید اور حضرت عائشہؓ وغیرہ کے علاوہ ام الدرداء الکبری صحابیہؓ سے کثرت سے روایت کرتی ہیں، حافظ ابن حجر نے لکھا ہے،

وھی تروی عنھا الحدیث الکثیر[2] یام الدرداء کبری سے بہت کثرت سے حدیثیں روایت کرتی ہیں

(تہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۶)

ان سے روایت کرنے والوں میں تقریباً بیس تابعین ہیں جن میں زید بن اسلم، مکحول الشامی، عروہ بن الزبیر التیمی اور عون بن عبداللہ وغیرہ ہیں،

خیرۃ حضرت حسن بصری کی والدہ ہیں، یہ حضرت ام سلمہؓ کی لونڈی تھیں، اور ان ہی سے استفادہ کیا بھی کیا تھا، حضرت عائشہؓ سے بھی روایت کرتی ہیں، ان سے ان کے دونوں صاحبزادے حسن اور سعید اور علی بن زید، حفصہ بنت سیرین وغیرہ روایت کرتے ہیں،

ان مذکورہ بالا تابعات کے علاوہ بے شمار تابعات ہیں، جنھوں نے اس فن کی ترقی واشاعت میں حصہ لیا ہے، چند نام بیان درج کیے جاتے ہیں،

جبلہ بنت مصفح، حجرہ بنت وداجہ، جمیلہ بنت واثلہ، ہبابہ بنت عجلان، حجیہ بنت میسرہ،

---

[1] تہذیب ج ۱۲ ص ۴۴۶ [2] ایضاً

حفصہ مخزومیہ، زینب بنت ابوسعید خدری، صفیہ بنت الحارث، صفیہ بنت شیبہ، ام الرباب حفصہ بنت عبدالرحمن بن ابی بکر، زرقہ، رملہ، فاطمہ بنت حسین، فاطمہ بنت علی، ام بلال، کریمہ بنت الحسحاس وغیرہ، یہ وہ تابعات ہیں جنھوں نے متعدد صحابہ سے روایتیں کی ہیں، اور ان سے صحاح میں روایات موجود ہیں، اور ائمہ جرح و تعدیل نے ان کی توثیق کی ہے،

ہم نے زیادہ تر ان تابعات کا تذکرہ کیا ہے جن کا تذکرہ تہذیب یا تذکرۃ الحفاظ میں ہے، ورنہ ان تابعات کی تعداد جنھوں نے روایت حدیث میں حصہ لیا، اس سے بہت زیادہ ہے، صرف ابن سعد نے ۹۳ تابعات کا تذکرہ کیا ہے، اصابہ میں تیسری اور چوتھی قسم میں جن خواتین کا تذکرہ ہے تقریباً ان سب کا شمار تابعات میں ہے، اور ان کی مجموعی تعداد دو سو سے زیادہ ہے،

تابعات کے بعد دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی بے شمار خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترقی و اشاعت میں حصہ لیا، لیکن افسوس ہے کہ ان صدیوں میں خواتین کے کارناموں کے سلسلہ میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ سب ناپید ہیں، مثلاً ابن مندہ متوفی ۳۹۵ھ، ابن عبدالبر متوفی ۴۶۳ھ، ابوموسیٰ اصفہانی متوفی ۵۸۱ھ کی کتابیں اور خصوصیت سے ابن اثیر جزری کی تاریخ النساء وغیرہ، تاہم جن کا تذکرہ متداول کتابوں میں ملتا ہے ان کا ذکر کیا جاتا ہے،

دوسری صدی کے آخر اور تیسری صدی میں بھی جن خواتین نے علم حدیث کی روایت اور اس کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا ان کے نام اور کارنامے حسب ذیل ہیں،

ام عمر۔ حسان بن زید تابعی کی صاحبزادی تھیں، انھوں نے اپنے والد اور اپنے شوہر یحییٰ بن سعید سے متعدد روایتیں کی ہیں، اور ان سے روایت کرنے والوں میں امام احمد بن حنبل، ابوابراہیم محمد بن الصباح، ابراہیم بن عبداللہ، علی بن مسلم وغیرہ ہیں، ان کے والد نے حضرت علیؓ کو دیکھا تھا، چنانچہ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے والد کی روایت سے حضرت علیؓ کے متعلق یہ نقل کیا ہے کہ ایک

آپ خطبہ دے رہے تھے، اور بلند آواز سے لوگوں کو مخاطب کرکے کہہ رہے تھے کہ لوگو! تم نے میرے اور عثمان بن عفان کے بارے میں عجیب عجیب باتیں مشہور کر رکھی ہیں لیکن ہمارا اور ان کا حال بالکل وہی ہے جو نقشہ قرآن نے اہلِ جنت کا کھینچا ہے، پھر یہ آیت پڑھی،

ونزعنا ما فی صدورھم من	اور ان کے دلوں میں جو کینہ تھا ہم دو
غلٍّ اخواناً علی سرر متقابلین[1]	سب دور کر دیں گے، اور سب بھائی بھائی کی طرح تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے،

امام جرح و تعدیل یحییٰ بن معین ام عمر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ دار معاذ میں میں نے ان سے سماع کیا ہے ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے مگر میرے بہت سے اصحاب ان سے روایت کرتے ہیں[2]،

زینب بنت سلیمان الہاشمیہ: یہ اس خانوادہ کی چشم و چراغ تھیں جس کے چشمۂ فیض سے ایک دنیا سیراب ہوئی یعنی ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس کی پرپوتی تھیں، ان کے والد سلیمان کا شمار حفاظ حدیث میں تھا، انہی کی تربیت کا اثر تھا کہ زینب کو علم حدیث سے لگاؤ پیدا ہوا، ان سے متعدد اتباع تابعین نے روایت کی ہے، مثلاً قاضی جعفر بن عبداللہ، عاصم بن علی، احمد بن خلیل وغیرہ خطیب ان کی روایت سے متعدد احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں،

من افاضل النساء (جلد ۱۴ ص ۴۳۲)	خواتین میں نہایت فاضلہ تھیں،

خلفاء تک ان کا احترام اور ان کی عظمت کرتے تھے چنانچہ مامون جس کا معمول تھا کہ پردہ نشین کے اوٹ سے گفتگو کرتا تھا لیکن جب زینب پہنچتی تھیں تو پردہ ہٹا دیا جاتا تھا[3]،

ان کے علاوہ اسی خانوادہ کی انہی کی ہم نام ایک دوسری زینب بھی تھیں جنہوں کوئی مرفوع حدیث تو مروی نہیں ہے لیکن اپنے والد کی سند سے عبداللہ بن عباس کے دو ایک اثر کی روایت کرتی ہیں،

---

[1] تاریخ بغداد جلد ۱۴ ص ۴۳۲۔ [2] ایضاً ج ۱۴ ص ۴۳۲۔ [3] ایضاً ص ۴۳۲،

عبدہ بنت خالد بن معدان حمص کی رہنے والی تھیں، خالد بن معدان مشہور تابعی ہیں، یہ انہی کی صاحبزادی ہیں، اپنے والد سے روایت کرتی ہیں، افسوس ہے کہ اُن کے حالات متداول کتابوں میں نہیں ملتے، تہذیب میں اُن کے والد کے تذکرہ کے سلسلہ میں یہ واقعہ درج ہے کہ امام اوزاعی والد ابن معدان کا بڑا ادب واحترام کرتے تھے، ان کی وفات کے بعد انھوں نے اپنے تلامذہ سے دریافت کیا کہ ان کی اولاد میں کوئی ہے؟ لوگوں نے عبدہ کا نام لیا، انھوں نے کہا کہ جاکر ان سے خالد کے حالات دریافت کرو، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا[1]

عبدہ بنت عبدالرحمن بغداد یہ، ان کا نسبی تعلق ابوقتادہ انصاری کے خانوادہ سے تھا، یہ حضرت ابوقتادہ کی پرپوتی ہیں، اپنے والد عبدالرحمن سے روایت کرتی ہیں، اُن سے روایت کرنے والوں میں محمد بن محمد سلیمان بن احمد غیرہ شامل ہیں، ابوالقاسم طبرانی نے اُن سے چند مرفوع احادیث نقل کی ہیں، اُن کے نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ یہ احادیث حضرت ابوقتادہؓ کی اولاد ہی سے مروی ہیں، اور میں نے ان احادیث کو عبدہ کے علاوہ کسی سے نہیں سنا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں:-

وکانت امرأۃ عاقلۃ فصیحۃ	یہ ایک عاقل، فصیح البیان اور حدیث کی
متدینۃ (بغداد ج ۱۳ ص ۴۴۰)	روایت میں متدین تھیں،

خدیجہ ام محمد۔ انھوں نے امام احمد بن حنبل سے سماع کیا تھا، اور ان سے روایت بھی کرتی ہیں، امام احمد کے علاوہ یزید بن ہارون، اسحاق بن یوسف اور ہاشم بن القاسم سے روایت کرتی ہیں، امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ اُن سے روایت کرتے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ

کانت تجی الی ابی تسمع	میرے والد (امام احمد) کے پاس سماع
	کے لئے آتی تھیں،

خطیب نے ام محمد کی سند سے ام درداء کا ایک اثر نقل کیا ہے جس کے ایک راوی عبداللہ ہیں، وہ اثر یہ ہے،

---

[1] تہذیب ج ۳ ص ۱۱۲،

حدثنا عبد اللہ بن احمد قال حدثتنی خدیجۃ ام محمد سنۃ ست وعشرین ومأتین قالت حدثنا سحاق الازرق حدثنا المسعودی عن عون بن عبد اللہ، قال کنا نجلس الی ام الدرداء فنذکر اللہ عندھا فقالوا لعلنا قد املللناک؟ قالت ترعمون انکم قد املتمونی فقد طلبت العبادۃ فی کل شیئ فما وجدت شیئا اشفی لصدری ولا امری ان اصیب بہ الذی اربد من مجالس الذکر، (تاریخ بغداد ج ۴ ص ۴۳۶)

۲۲۶ھ کے بعد تک زندہ ہین،

یہ ذوق صرف آزاد خواتین ہی تک محدود نہین تھا، بلکہ اس مین لونڈیان اور باندیان بھی شریک تھین امام محمد کے پاس متعدد لونڈیان رات کے وقت آکر تحصیل حدیث کرتی تھین، ابراہیم بن سعد ایک حافظ حدیث گذرے ہین، اُن سے ایک بار مسند ابو بکر کے متعلق سوال کیا گیا، تو انھون نے اپنی لونڈی سے فرمایا، کہ مسند ابو بکر کی ۲۳ ویں جلد نکال لاؤ، اس سے ان کے علم حدیث کی واقفیت اور ذوق کا اندازہ ہوتا ہے،

سمانہ بنت حمدان ۱۴ ویں صدی کے اخیر مین وضاح بن حسان ایک محدث گذرے ہین، جنھون نے حدیث مین ایک تحریری یادگار بھی چھوڑی ہے، سمانہ انہی کی نواسی ہین، وہ اپنے نانا سے روایت کرتی ہین، اُن سے روایت کرنے والون مین ابو بکر الشافعی اور ابو القاسم طبرانی ہین، خطیب نے اُن سے متعدد روایتین نقل کی ہین،[1]

اسی صدی کے آخر مین ایک خاتون فاطمہ بنت محمد بھی تھین، جنھون نے حدیث کی خدمت مین حصہ لیا، اُن کی زندگی نہایت ہی زاہدانہ تھی، وہ مصلے ہی پر سوتی تھین، ۳۱۲ھ مین وفات پائی،

(باقی)

---

[1] تاریخ بغداد ج ۱۴ ص ۴۴۱،

تاریخ یمن کا ایک ورق

از

مولانا ابو الجلال ندوی

(۲)

اقوام | یہ عجیب بات ہے کہ یہ کتبہ اگرچہ حضرموت میں ملا لیکن اس میں حضرموت کے اماکن میں سے ایک مقام کا بھی ذکر اس میں نہیں ہے یہ تحریر یقینی طور پر یمن کے باشندوں اور ان کے حلفاء اور اقرباء میں سے کسی ایک کی ہے اس میں جن قوموں کے نام ہیں، وہ یہ ہیں،

حمیر | حمیر ایک مشہور قبیلہ کا نام ہے، کتبہ کے ایام تحریر میں اسی قبیلہ کی حکومت تھی، کتبہ اس قوم کے مخالفین کا ہے

قبات | بنو اسرائیل کے ایک سبط کا نام لاوی ہے، اس سبط کی ایک شاخ کا نام قہات ہے، حضرت ہارونؑ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام اسی خاندان کے افراد تھے، اس کتبہ میں قہات کا ذکر سبا کے باشندوں، یسار کے معاونوں اور باشندگان یمن کے دشمنوں کی حیثیت سے آیا ہے

مہرہ | بنو قضاعہ کی ایک شاخ کا نام جو یمن میں رہتی تھی، اس قوم کو اس کتبہ کے اندر مذکور جنگ کے انجام سے بہت خوشی ہوئی تھی، خاکہ کی تشریح سے ظاہر ہے کہ وہاں کے باشندے بنو عذرہ تھے، یہ مہرہ کی طرح بنو قضاعہ کی ایک شاخ ہیں، مہرہ کو جنگ کے انجام کی جو خوشی ہوئی تھی، اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ وہ بنو عذرہ کے ہم خاندان تھے،

نوذ | نوذ نون و ذال کا مجموعہ ہے نوذ سے مراد وہی ارض نود ہے جس کا ذکر فرزندانِ آدم کے قرآنی

قصہ میں آیا ہے تورات کے مطابق بنو قین کا علاقہ ہے ارض نود کے مقام کی تعیین طویل بحث کی مقتضی ہے لیکن مختصراً اتنا کہنا کافی ہے کہ مدین کا علاقہ دراصل علاقہ بنو قین تھا، یہود مدینہ میں سے ایک گروہ بنو قینقاع تھا، یہ نام قاعۂ قین کا مقلوب ہے، اس لئے نود کو یمن اور شام اور حارک کے علاقہ سے تطبیق دینا بے جا نہ ہوگا، زند نود اسی علاقہ میں بسنے والی ایک قوم کا نام ہے، عدنان کے نسب نامہ میں ایک نام زند بن مری بن اعراق الثریٰ کا نام آتا ہے (تاج العروس) زند نود سے مراد اطراف یمن میں بسنے والے بنو عدنان ہیں جن کو اس کتبہ کے اندر مذکورہ جنگ کے انجام سے خوشی ہوئی،

کردا کردا کو سمجھنا چاہئے اس کتبہ کے بیان کے مطابق یمن والوں نے شاہی فوج کے رسیل کی ناک اور اس کے کان کاٹ لئے جس کے انتقام کے لئے سینا سے یسار اور یمن سے ذویالیل فوج لے کر بڑھے لیکن ان دونوں فوجوں نے شکست کھائی، تب شاہ یمن نے اہل حبش کو خوش کیا اور حبش والوں نے شاہ یمن کی نوکری کرلی لیکن کردا نے جن کے سردار کا نام نوذ تھا، نیز نوداشیح نے جنگ کی، اور اہل حبش کی امداد سے ذونوش اور ذوشرح کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، حکومت یمن پر نوذ نے قبضہ کرلیا،

کرد ایک عجمی قوم کا نام ہے جن کے کچھ افراد یمن میں بستے تھے، ان یمنی کردوں کی بابت نشوان نے لکھا ہے، کہ

یقال انھم من الازد. قال	کہتے ہیں کہ وہ بنو ازد میں سے ہیں شاعر
لعمرك ما کرد من ابناء فارس	نے کہا قسم ہے کرد فارس کے بیٹے نہیں
ولکنه کرد بن عمرو بن عامر	بلکہ عمرو بن عامر کی اولاد ہیں نیز کہا شاعر نے
وقال	
لعمرك ما کرد بن عمرو بن عامر	قسم ہے عمرو بن عامر کا بیٹا کرد عجمی نہیں تھا،
بعجم ولکن خالط العجم اعجم	البتہ اہل عجم کے ساتھ رہنے سہنے کی وجہ سے
	عجمی ہوگیا تھا،

نسبتهم الشعراء الی الیمن ثم شعراء ان کو یمن پھر ازد کی طرف منسوب
الی الازد، کرتے ہین،

یعنی کردھ تو نیز غیر عرب مگر بنو ازد مین شمار ہوتے تھے، دخیل ہونے کی حیثیت سے یہ انصار مدینہ کو نیز بنو خزاعہ کو جن کی ایک شاخ یمن مین بستی تھی، اپنا ہم نسب بتاتے ہونگے،

داشح | بنو داشح بن الحرث، یہ بنو ازد کی ایک شاخ تھے،

رجال کتبہ | اماکن واقوام کے بعد ایک نظر رجال کتبہ پر بھی ڈال لینا مناسب ہوگا، اس کے بعد کتبہ کا مضمون آئینہ ہو جائے گا،

سمیق | پہلا نام اس کتبہ مین سمیق کا ہے، اس کی بابت ہم صرف اتنا جانتے ہین کہ سموق درخت اور نبات کے طویل ہونے کو کہتے ہین، سمیق کا مفہوم طویل ہے، یہ شخص کون تھا اس کا عہد کیا تھا، اس کے متعلق ہم کچھ نہین کہہ سکتے،

ذونین | حصن غراب کے سہ سطری مختصر کتبہ کے نیچے اس شخص کا سماتی دستخط موجود ہے، معارف مئی ۱۹۵۰ء ہم بتا چکے ہین کہ یہ شخص ذوشرح کا چچا تھا، ذو کے معنی ہین صاحب اور نن ایک مصری لفظ ہے جس کا مطلب پانی دیتا ہے لفظی مفہوم اس لقب کا ہے "رئیس محکمۂ آب رسانی" اس لقب کے اور معانی بھی ہو سکتے ہین مثلاً ذونون (مچھلی والا) ذونون (صاحب السیف) ذونون (صاحب الدواۃ) لیکن کتبہ کے اندر چونکہ زراعت کے مرجھانے کی ذمہ داری سمیق، ذونین اور ذوشرح کی تباہ کاری پر عائد کی گئی ہے اس لئے اس لقب کا مناسب ترمفہوم رئیس محکمۂ آب رسانی ہی ہو سکتا ہے،

شرح ذو | یہ نام کتبہ مین دو بار آیا ہے، یہی عربی روایات کا ذوشرح ہے، سیف بن ذویزن سے امیہ بن ابی الصلت نے غمدان کی بابت کہا،

تصیر بناہ ابوک القیل ذوشرح

اس مصرع مین ذو شرح کو "قیل" کہا گیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ یہ بادشاہ یمن نہین تھا البتہ کسی تبع کے ماتحت امیرون مین سے ایک امیر تھا، عربی مین ذو شرح مشہور ہے، اس کتبہ مین ذو کا لفظ شرح سے موخر ہے تاج العروس مین ہے کہ

قال ابو عمرو الشارح الحافظ وھو	ابو عمرو نے کہا شارح حافظ کو کہتے ہین، اہل
فی کلام اھل الیمن حافظ الزرع	یمن کی بولی مین شارح وہ ہے جو کھیتون
من الطیور،	سے چڑیون کو اڑاتا ہے،

شَرَحَ کے معنی ہین اُس نے زراعت کی رکھوالی کی، "ذو شرح کے معنی ہین، محکمۂ زراعت کا رئیس اعلیٰ"، اس لقب کے بہتیرے افراد گذرے ہون گے، عربی روایات کے مطابق یہ ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا کا یا اس کے دادا کا لقب تھا، اس کتبہ کا سنہ تحریر پچھلے مضمون مین ۳۳۰ء بتایا جا چکا ہے، یہ سنہ ہم کو بتاتا ہے کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہمعصر ملکہ بلقیس کے باپ یا دادا سے اس ذو شرح کو تطبیق دینا چاہیے،

یسل | اس کتبہ کی اہم ترین شخصیت کا نام ہے تاج العروس مین ہے،

الیسل اھملہ الجوھری وصاحب	جوہری صاحب صحاح اور صاحب لسان
اللسان وقال الزبیر بن بکار ھو	نے یسل کا ذکر نہین کیا، مگر زبیر بن بکار
ید من قریش الظواھر قال و	کا کہنا ہے کہ یسل اور یسل قریش ظواہر کے
بالباء الموحدۃ الید الاخری	دو بازو تھے، نو عامر بن لوی کو یسل (ب سے)
اعنی بنی عامر بن لوی ھکذا	کہا جاتا تھا، اس کی خبر مجھے (زبیر کو)
حدثنی محمد بن الحسن کما فی العباب	محمد بن حسن نے دی جیسا کہ العباب مین ہے،
وقد تقدم ذکر الیسل فی موضعہ،	

الیسل لقب بنی عامر بن لوی هکذا یقولون وکانوا ثلاثة اخوة
والید الاخری الیسر بالشین
محت قاله الزبیر بن بکار عن
محمد بن الحسن بکذا وقع فی النسبة
ونقله الحافظ فی التبصیر ولکنه
عکس القضیة (ب س ل) فقال
الیسل بالتحتیة بنو عامر بن لوی
والیاقون بنو حدلة (ی س ل)

یسل بنو عامر بن لوی کا لقب ہے، ان کا یہی
دعوی ہے وہ دو بازو تھے، دوسرے بازو
کو یسل (ی ت) کہتے تھے، زبیر بن بکار نے
محمد بن الحسن سے اس کی روایت کی، العباب
میں یونسی وارد ہے، حافظ تبصیر میں یہ قول
نقل کرتے ہوئے بات الٹ دی ہے یسل
کو بنو عامر اور ان کے غیر کو یسل بنا دیا،

اس سے معلوم ہوا کہ بنو عامر بن لوی یا اُن کے ہم جد کسی خاندان قریش اور اس کے مورث کو یسل کہا جاتا تھا، اس کتبہ میں اسی قرشی کا ذکر ہے، جو یسل کہلاتا تھا،

یسار اس کتبہ میں یسل پر یہ الزام عائد کیا گیا ہے کہ اُس نے یمن کے مقام میں ایک پاکباز بھولی بھالی لڑکی کی آبرو لینی چاہی جس کی سزا اُسے یہ دی گئی کہ یمن کی عورتوں نے اس کی ناک اور کان کاٹ لئے اور اس پر برہم ہو کر یمن کی سمت سے ذو یالیل نے اور صین اور سبا سے ایک شخص یسر امنے یمن دونوں پر چڑھائی کر دی یسر ما کے نام میں جو مالگا ہوا ہے اس کی حقیقت براشما کے تذکرہ (معارف مئی ۱۹۵۰ء) میں بتائی جا چکی ہے، اصلی نام یسرہ گیا ہے یا سر اور یسار کا مخفف قرار دیا جا سکتا ہے ہم نے اسے یاسر کے بجائے یسار سے تطبیق دی جس کی وجہ یہ ہو کہ جن لوگوں نے یسل کی توہین کا انتقام لینے والوں سے جنگ کی، ان میں بنو ہمرہ اور باشندگان حاکہ بھی تھے جو کہ بنو قضاعہ میں سے تھے، بنو قضاعہ کا ایک گروہ اپنے کو قریش کا ہم خاندان یعنی بنو عدنان میں خیال کرتا تھا، ایک گروہ قضاعہ کو بنو حمیر میں گنتا تھا، دو حمیری بتانے والے بنو قضاعہ

پر ایک دوسرا قتنائی شاعر اعتراض کرتا ہے،

ازنیتم عجوزکم وکانت قدیما لایشم لها خمار

کیا اپنی مورثہ کو بدکار بتاتے ہو جس کی اوڑھنی سونگھی نہین جاتی تھی،

عجوز لودنا منها یمان للاقی مثل ما لاقی یسار

ایسی بڑھیا کہ اگر کوئی یمنی اس کے پاس جاتا تو اس کا انجام یسار کا سا ہوتا

اس سے ظاہر ہے کہ یہ کتبہ جو الزام یسیل پر لگاتا ہے اور اس کا جو مآل بتاتا ہے تقریبًا وہی الزام روایت یسیل کی بجائے اس کے معین دمددگار یسرما پر لگا کر اس کا وہی انجام بتاتی تھی جو کتبہ مین مذکور ہے

ذویالیل | جوہری نے لکھا ہے کہ یالیل ایک شخص کا نام ہے سید مرتضیٰ زبیدی صاحب تاج العروس کہتے ہین کہ یہ غلط ہے یالیل ایک بت کا نام تھا، جیسا کہ عبدیالیل کے نام سے ظاہر ہے، ذویالیل ایک مذہبی لقب معلوم ہوتا ہے، یالیل نام کے دیوتا کے مندر کا محافظ ذویالیل تھا،

یمن والون پر یسیل کی توہین کا بدلا لینے کے لئے دو شخصون نے چڑھائی کی ایک نے جنوب سے ایک نے شمال سے، جنوبی حملہ آور ذویالیل کا نام بتاتا ہے کہ یہ ایک بت پرست رئیس تھا، شمال کی فوج کا رئیس علی یسرما تھا، اور اسکی فوج مین قبائل یعنی یہود کا مذہبی گروہ شامل تھا، گویا یمن والون کے برخلاف موحدین اور مشرکین کے دو گروہ متحد ہو گئے، خود یمن والون کا مذہب ان دنون کیا تھا، اس کا اس کتبہ سے پتہ نہین چلتا،

ریاح | ذویالیل کے بعد ایک نام ریحا ملتا ہے حمیرا اور یسرما کے نامون کی طرح ما کے حذف کے بعد یہ نام ریح رہ جاتا ہے جو عربی کے متداول لہجہ مین بنو ریاح بن یربوع بن حنظلہ بن مالک بن زید منات ابن تمیم کے مورث یا اس کے ہم نام کسی شخص کا علم ہوا، ایک یربوعی شاعر کہتا ہے

ولکن لی علیاک تل یوم مجد وعالی مفخر صعب السلوک

یعربوع وغلب بن بنیہ لھم کانت ردافات الملوک

یعنی یربوع اور اس کے فرزندون کی بدولت جن کو ردافت ملوک کا شرف حاصل تھا مجھے تجھ پر بزرگی حاصل ہے اس کتبہ مین تبع یربوع ہی جیسی عظمت رکھنے والے ایک ریاح کا ذکر ہے،

الروف جلیس الملک عن یمینہ	روف بادشاہ کے ہمنشین راست کو کہتے
اذا شرب یشرب بعدہ قبل	تھے، بادشاہ جب شراب پیتا تو بادشاہ
الناس ویخلفہ علی الناس اذا	کے بعد اور سب سے پہلے روف پیتا، اور
غزا ویقعد موضع الملک حتی	بادشاہ جب غزو پر جاتا تو وہ اس
یتصرف واذا عادت کتیبۃ الملک	کی جگہ قائم مقامی کرتا یہان تک کہ بادشاہ
اخذ الروف المرباع،	واپس آجاتا تھا، بادشاہ کی فوج جب واپس
	آجاتی تو روف چوتھ وصول کرتا تھا،

روف کا جو کام تھا وہی اس کتبہ مین ریاح کا نظر آتا ہے جس کا لقب ہمزہ وتقیۃ، یہ لفظ دو لفظون سے مرکب ہے (۱) ذو بمعنی وہ شخص (۲) یقتہ بمعنی یقتۃ الملوک یعنی بادشاہون کی خدمت کرتا ہے،

اس کتبہ کے اندر مذکور ریاح کو کتبہ نویس کی قوم نے اس وقت نہایت ذلیل کرکے اپنے علاقہ سے نکال دیا، جب کہ حاکم شناس اور تبع یسار اور ذویالیل کی فوجون نے شکست کھائی اور ریاح کے اس انجام کو دیکھ کر قوم مہرہ اور زمرنود کو بے انتہا خوشی ہوئی تھی،

ذونوش سمیتق، ذوتبین، ذوشرح، ذویالیل، یسار اور تبع مین سے کوئی بھی یمن کا بادشاہ نظر نہین آتا، یہ سب کے سب بادشاہ کے ماتحت امراء نظر آتے ہین، کتبہ کے بیان کے مطابق جب تبع کے باشندون اور اُن کے معاونون نے بغاوت کردی تو اس وقت ایک ذوتقیۃ جس کا نام ریاح تھا حضرموت مین بادشاہ وقت کی نیابت یا بالفاظ قدیم روافت کے فرائض انجام دے رہا تھا، تبع یعنی مدینہ منورہ کے پاس جب

شاہی فوجون نے شکست کھائی، تو حضرموت والون نے بھی شاہ وقت کے رویف یا قدیم تر لفظون مین ذوریقتہ ریاح کے اپنے علاقہ سے نکال دیا، ذوریقتہ ریاح جس بادشاہ کا رویف تھا، غالبًا اسی کا ذکر ذونوش کے لقب سے آیا ہے یعنی ذونوش ذوشرح وغیرہ کا بھی بادشاہ ہوگا، جہان تک میرے علم کی رسائی ہے ذونوش لقب رکھنے والے کسی شاہ مین کا عربی لٹریچر مین ذکر نہین ملتا، البتہ بلقیس بنت ہاد بن (ذو) شرح بن شرحبیل بن ذوسحر کے خاندان مین ایک بادشاہ ذوبوس بن ذوسحر کا نشوان نے ذکر کیا ہے، مگر اس کا زمانہ اس کتبہ کے زمانہ سے بہت پیشتر گذرا ہے لیکن ہوسکتا ہے ذوبوس دراصل ذونوش ہی کی تصحیف ہو، اور اس کتبہ مین ذوبوس اول کے کسی جانشین کا ذکر ہو، بہرحال ریاح جس کا ذکر اس کتبہ مین ہے، ذونوش ہی کا ذوریقتہ یعنی رویف اور قائم مقام نظر آتا ہے ذونوش نے جب دیکھا کہ صبن کا راج جاتا رہا مین والون کی بغاوت نے حجاز کو بھی آزاد کرادیا، حضرموت والون نے ریاح کو لات مار کر اپنے علاقہ سے نکال دیا، تو

ذونوش رضا حبشتا شمسی

ذونوش نے اہل حبش کو راضی کیا اور وہ غلام ہوگیا

تنوذ | آخری نام اس کتبہ مین ایک شخص تنوذ کا ہے جو اس قوم کرو کا ایک فرد تھا، جو ازد کے خاندان بنو عمرو بن عامر مین دخیل ہوگئے تھے، اس سے زیادہ اس شخص کا حال معلوم نہین، اس کتبہ کے مطابق ذونوش نے حبشیون کی امداد حاصل کی تسپر بھی بغاوت فرو نہین ہوئی، بلکہ کرداور نبوشارح نے مقابلہ کیا جس مین کردون اور نبوشارح کو فتح حاصل ہوئی،

مضمون کتبہ | اماکن، اقوام، اور رجال سب کو پہچان لینے کے بعد اب ایک بار پھر کتبہ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ ۳۳۰ء کے ایام مین جب کہ شاہ مین حضرموت سے لے کر صبن یعنی سرحد مصر تک حکومت کرتا تھا، بادشاہ وقت کہین غائب تھا، اسکی جگہ ریاح اس کے فرائض انجام دیتا تھا، ہمیتی، ذومین اور

ذوشرح کی بدانتظامی کی بدولت زراعت مرجھا گئی تھی، ان دنون سیل نام ایک امیر جو کہ قریش ظواہر کی ایک شاخ کا مورث تھا، اکال دصول کرنیکے لئے مدینہ کے پاس ہین نام ایک وادی مین پہنچا، یہان اُس نے ایک عورت کی آبروریزی کرنی چاہی۔ عورتون نے اُس کی ناک اور کان کاٹ لئے، اس پر برہم ہوکر سیناسے یہودیون کی ایک فوج لیکر یسار نے اور یمن کی طرف سے ذویاسل نے یمن والون پر حملہ کردیا، لیکن باغیون کو کامیابی ہوئی، یمن کے علاقہ اور حجاز سے اہل یمن کی حکومت اٹھ گئی، حضرموت والون نے بھی ریاح کو اپنے دیار سے نکال دیا، ذونوش نے جو ان دنون شاہ یمن تھا، اہل حبش کو راضی کرکے ان کو نوکر رکھا تاکہ کھوئی ہوئی حکومت حاصل ہو، مگر نبوواشح، نبوہرہ، اور کردون نے اُن کا مقابلہ کیا، اور یہ کامیاب رہے، اور تنوذکرد حاکم یمن ہوا،

نقوش زیرین اس کتبہ کے نیچے دائین طرف دو نقوش ہین، ان کے نیچے دو اور نقوش ہین، جن کے بالمقابل بائین طرف چھ نقوش ہین، ان پر بھی غور کرلینا ضروری ہے، نقوش کی کشش اور گہرائی شاہد ہے کہ نقوش زیرین دو مختلف شخصون نے کندہ کئے، جو دہ سطری نقوش کے کندہ کار نہین تھے،

فارسٹر کی ادعا فارسٹر کے نزدیک دائین طرف کے نقوش لایعنی ہین، بائین طرف کے چھ نقوش کو طغراء قرار دے کر انھین گیارہ نقوش مین تحلیل کیا ہے، جو حسب ذیل ہے،

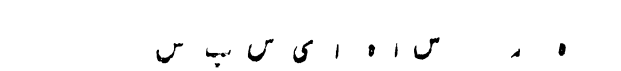

تشریح کتبہ کے محل (ج ۲ ص ۳۸۱) پر ان نقوش مین سے کسی کی آواز نہین بتائی ہے، لیکن (ج ۲ صفحہ ۴۰۲ و صفحہ ۴۰۳) سے ہم نے دس نقوش کی آوازین نقل کی ہین، ۴ کی آواز نہین معلوم، پادری صاحب کے ذہن مین کیا تھی، اس نقش کو ج ۲ ص ۳۸۱ کے حاشیہ پر حبشی نقش بتایا ہے، اور اس سے اس تحریر کے زمانہ پر استدلال

کیا ہے کہ اصل کتبہ سے عرصہ بعد کی ہے خود اپنی بتائی ہوئی آواز ان کے مطابق انھین پڑھنا چاہئے تھا،

ھر × ساہ ای سبں

لیکن ان نقوش کو انھون نے پڑھا ہے،

Hareth or Hare Ikah the Sabean

ع بروخت عقل زحیرت کہ این چہ بوالعجبی است

تصحیح قرات | حمدانی نے اکلیل مین سین کی ایک صورت لکھی ایسی بتائی ہے، دائین طرف کے نقش اول اور بائین طرف کا نقش دوم اسی کی بدلی ہوئی صورتین ہین، دائین طرف کا نقش دوم، اور بائین طرف کا نقش چہارم نشوانی ط؟ کی بدلی ہوئی صورت ہے، دائین طرف کے نقش سوم اور بائین طرف کے نقش پنجم کو فارسٹر کے علاوہ سب علماے مسند نے کان خیال کیا ہے،

دائین طرف کے چوتھے اور بائین طرف کے چھٹے نقش کو پادری صاحب نے ۳ اور ۴ مین تحلیل کیا ہے، درحقیقت یہ نقش ⋕ ایک بیخکی پر رکھے ہوئے تین چراغون کے فتیلہ سوز کی صورت ⁹⁹؟ ہے، جو روشنی کا مفہوم اور شین کی آواز دیتا ہے، بائین طرف کے پہلے اور تیسرے نقش کو ایک بار پادری صاحب نے ⧖ کی صورت مین اور دوسری بار ⧖؟ کی صورت مین حل کیا ہے، دراصل ⧖ ایک عاذور نقش زاید کے اضافہ کیساتھ ⧖ ہے جس کی آواز زاے ہوز کی سی ہے، میرے نزدیک تحریر کی صحیح قرات حسب ذیل ہے،

سُطَ کُشْ

ذُشْ ذُطْ لُوشْ

سوط کے معنی ہین کوڑا، اس سے سواط مشتق ہے، صاحب لسان نے لکھا ہے کہ "حدیث مین ہے کہ جہنم مین سب سے پہلے سواط داخل ہون گے، سواط سے مراد وہ سرہنگ ہین جو لوگون کو کوڑے مارتے ہین"،

کوش ایک قوم کا نام ہے جس کا ذکر بائبل مین کثرت سے آیا ہے، انگریزی بائبل مین اس نام کو عموماً

ایتھوپیا (حبش) سے بدل دیا گیا ہے، کیونکہ جن دنوں یونانی میں بائبل کا ترجمہ ہوا، صرف اہلِ حبش خود کو کوش کہتے تھے، اس تحریر میں کوش کو اہلِ حبش کا مرادف سمجھنا چاہئے،

پچھلے مضمون میں بتایا گیا ہے کہ یہ تحریر ۳۳۰ء کی ہے، ۳۲۵ء سے ۳۷۰ء تک یمن اور حضرموت پر اہلِ حبش نے حکومت کی، اہلِ حبش کو ذونوش نے اپنی امداد کے لئے نوکر رکھا تھا، مگر بعد میں وہ خود حاکم بن بیٹھے، ۳۳۰ء اور ۳۷۵ء کے درمیان کسی نے وہ سطری کتبہ کے اس مصرعہ کی بنا پر کہ

ذونوش رضا حبشا شسی

ذونوش نے اہلِ حبش کو راضی کیا انھوں نے نوکری کر لی۔

دائیں طرف کا دو لفظی فقرہ کھ کر بتایا کہ

کوش نے بائیں کو ہکوڑے مارے،

زوش عربی میں ذلیل غلام کا مرادف تھا، زیاط کے معنی ہیں شور مچانا جھگڑا کرنا، بائیں طرف کے تین لفظا دہ سطری کتبہ لکھنے والی قوم کے کسی فرد نے اہلِ حبش کی توہین کے لئے بعد میں کندہ کئے اس کا مطلب یہ ہے،

کوش ایک جھگڑالو ذلیل غلام ہے

ایک قدیم کتبہ اس کتبہ کی تشریح پر اب مزید لکھنے کی ضرورت نہیں رہی لیکن اس سے ایک قدیم روایت کتبہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے، جی چاہتا ہے کہ اس کا بھی اسی جگہ ذکر کر دیا جائے،

یثجان اور کلیس میں ہے کہ منجانب حضرت علیہ السلام کے پاس سے عمرو ذوالاذعار کے زمانہ میں ایک لوح برآمد ہوئی تھی جس پر منقوش تھا،

لمن ملک ذمار؟	ملک ذمار کس کا
لخیر الاخیار	نیک نفس حمیر کا

لمن ملک ذمار	ملکِ ذمار کس کا
للحبشۃ الاشرار	شریر الطبع اہلِ حبش کا
لمن ملک ذمار	ملک ذمار کس کا
للفارس الاحرار	شریف طینت اہلِ فارس کا
لمن ملک ذمار	ملکِ ذمار کس کا
لقریش التجار	تجارت پیشہ قریش کا۔

یہ تین اور اکلیل کی روایتیں یہیں ختم ہو جاتی ہیں، یاقوت نے معجم البلدان ذکر ذمار میں اس تحریر کی بابت لکھا ہے کہ جس سال قریش نے کعبہ کی عمارت کو (سنہ ۶۰۰ء میں) ڈھایا، اس کی بنیاد سے ایک پتھر نکلا جس پر یہی عبارت منقوش تھی آخر میں یہ بھی تھا کہ

ثم حار محارہ	پھر اپنی جگہ لوٹ گیا،

طفار کے تذکرہ میں اسی کو ذکر قریش کے حذف اور ذمار کی بجائے نطفار کی بابت نقل کیا ہے، اور کہا ہے کہ یہ عبارت نطفار کی ایک دیوار پر لکھی تھی، اور (ثم حار محارہ) کی بجائے یہ منقوش تھا کہ

لحمیر ستحار	عنقریب حمیر کے پاس لوٹے گا،

یہ تینوں روایتیں کچھ نہ کچھ اصلیت رکھتی ہیں نطفار کا کتبہ خانہ کعبہ والے پتھر سے قدیم تھا، جیسا کہ (ستحار) اور (ثم حار) کے فرق سے ظاہر ہے، منبر ہود والے کتبہ کی روایت میں صرف اتنی بات درست ہے کہ اس تحریر کا تعلق عمرو ذوالاذعار کے زمانہ سے ہے، جو کہ ابرہہ ذوالمنار کی نسل سے اور بلقیس بنت ہدہد کا حریف تھا، جو کہ حبش کے بادشاہ اذینۃ الصباح کی ہم عصر تھی، عمرو ذوالاذعار غالباً انہی حبشیوں میں سے تھا جن کی خدمات ذونواس نے بغاوت فرو کرنے کے لئے حاصل کی تھیں،

اس قدیم کتبہ سے ظاہر ہے کہ ایک زمانہ میں ملک ذمار پر قبضہ کرنے کی جد و جہد چار قومیں کر رہی تھیں،

(۱) حمیر اخیار — یعنی خود یمن کا قدیم شاہی گھرانا،

(۲) حبشہ اشرار — جن کی بابت زیر بحث کتبہ مین ہے کہ ذونواس نے حبش والون کو راضی کیا، اور وہ خادم ہوگئے، اور نقوش زیرین کے کندہ کارنے جن کا ذکر کوشش کے نام سے کیا ہے، اور ان کو ذیس جھگرا لونڈی بتایا ہے، اب تک کی معلومات کے مطابق اہل حبش نے ۳۴۵ء اور ۵۲۵ء مین یمن پر حکومت کی قدیم کتبہ کی روایت مین پہلی بار کے قبضہ اہل حبش کا ذکر ہونا چاہیے، کیونکہ سنہ ۶۰۰ء مین جو کتبہ خانہ کعبہ کے پاس ملا تھا، اس مین مذکور تھا کہ ملک ذمار اپنی جگہ لوٹ گیا، یعنی حمیر نے اس پر حکومت قائم کرلی، ملک ذمار ملک یمن ہی کا ایک نام ہے،

(۳) فارس احرار — زیر بحث کتبہ کی تشریح سے پہلے تک کے معلومات کے مطابق فارس والون نے یمن پر ۵۶۲ء یا ۵۷۰ء سے لے کر ۶۳۲ء تک حکومت کی تھی، اس لئے سمجھا جاتا تھا کہ قدیم کتبہ مین فارس احرار کے ذکر سے یہی دور مراد ہے، جب کہ یمن مرزبان ہرمز (وہرز) کے ورثا حکومت کرتے تھے لیکن اس پر یہ اعتراض ہوسکتا تھا کہ ۶۰۰ء مین خانہ کعبہ مین جو کتبہ ملا تھا، اس کے مطابق تو اس زمانہ سے پہلے حمیر، فارس اور قریش کی چوتھی ٹکر ختم ہوکر حکومت ذمار اپنے اصلی محور پر لوٹ گئی تھی، اور حمیری حکومت قائم ہوگئی تھی، زیر بحث کتبہ مین تو ذونواس کے تذکرہ نے حل کر دشواری ختم کردی، اسی زمانہ (۵۲۳ء نہایۃ سنہ ۵۲۵ء) مین حمیر اخیار، حبشہ اشرار اور فارس احرار تینون گروہ حکومت یمن کے حصول کی کوشش کرتے تھے، (باقی)

رحمت عالم

مدرسون اور اسکولون کے طالب علمون کے لئے عام فہم اور سادہ زبان مین سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت،

ضخامت :- ۲۰۰ صفحے، قیمت : مجلد :- عارضی مجلد ۱۲ (طبع پنجم) "منیجر"

باب التقریظ والانتقاد

نیا ادب

شاہ معین الدین احمد ندوی

مولفہ جناب پنڈت کشن پرشاد صاحب کول تقطیع بڑی ضخامت ۴۰۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت للدر تبہ :- انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی،

نئے اور ترقی پسند ادب کی موافقت اور مخالفت میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب تک کسی صاحب نظر ادیب نے اس کا تفصیلی جائزہ نہیں لیا، اور غیر جانبدارانہ محاکمہ نہیں کیا تھا، اس کام کو اردو کے نامور ادیب پنڈت کشن پرشاد کول نے انجام دیا ہے، اور اس کتاب میں انھوں نے نئے ادب کے ہر پہلو کا تفصیلی تجزیہ کر کے اس کے محاسن ومعائب ظاہر کئے ہیں، ابتدا میں ترقی پسند ادب کی حقیقت، اس کی غرض وغایت اور اس کے خیالات ونظریوں پر تبصرہ ہے، پھر اس کے افسانوں پر اجمالی، اس کے بعد مشہور ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانوں اور ناولوں پر تفصیلی تنقید کر کے ان کی خوبیاں اور نقائص دکھائے ہیں، اور آخر میں مشہور ترقی پسند شعراء کے کلام پر نقد وتبصرہ ہے اردو میں اس موضوع پر اس سے زیادہ جامع اور بہتر کتاب نہیں لکھی گئی، مؤلف مصنف نے بڑے اعتدال و توازن اور غیر جانبداری کے ساتھ ترقی پسند ادب کے محاسن ومعائب دونوں دکھائے ہیں جس سے اس کا ہر رُخ، سارے خط وخال اور عیب وہنر سامنے آجاتے ہیں، پوری کتاب مصنف کے بلند ادبی ذوق، نکتہ سنجی، دقت نظر اور صحیح تنقیدی نگاہ کی آئینہ دار اور تنقیدی وادبی حیثیت سے اصحاب ذوق خصوصاً ترقی پسند ادیبوں کے مطالعہ

کے لائق ہے،

درحقیقت ترقی پسند ادب کے بارہ میں اس کے حامی اور مخالف دونوں تنگ نظری اور افراط و تفریط میں مبتلا ہیں، سویٹ زدہ ترقی پسندوں کے نزدیک محض اشتراکی خیالات اور روسی ادب کی نقالی ترقی پسندی کی معراج ہے، انھوں نے محض بھوک، پیٹ، روٹی، کسان، مزدور، غریب، سرمایہ دار، انقلاب، آگ اور خون کے الفاظ اور فرائیڈ کے جنسی نظریات کی تبلیغ و اشاعت، فحاشی، عریاں نگاری اور شعر و ادب میں بے لگام آزادی کا نام ترقی پسند ادب رکھا ہے، اس کے علاوہ ہر ادب اُن کے نزدیک غیر صحت مند اور مجموعۂ خرافات ہے، اُن کے مقابلہ میں پرانے ادب کے پرستاروں کا طبقہ جواب بہت کم باقی رہ گیا ہے، پرانے ڈھرے سے ذرا بھی الگ ہونا بارگاہِ ادب میں سوءِ ادب سمجھتا ہے، یہ دونوں نقطۂ نظر غلط ہیں،

ترقی پسندی اور نیا ادب اگرچہ اصطلاحیں نئی ہیں، لیکن نیا ادب اس زمانہ کی پیداوار نہیں ہے، بلکہ ہر زمانہ کے حالات اور ذوق و رجحان کے تغیر کا فطری نتیجہ ہے جس سے کسی زبان و ادب کی بھی تاریخ خالی نہیں ہے، اگر اردو کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے، تو فضلی کی وہ مجلس، میر شیر علی افسوس کی آرایش محفل، اور میر امن کے قصہ چہار درویش سے لیکر موجودہ ترقی پسند ادب تک، ہر زمانہ میں ترقی پسندی اور نئے ادب کا ایک سلسلہ نظر آئے گا، اس کے ابتدائی دور میں ادب محض مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی اور خیالی افسانہ طرازی تک محدود تھا، اس کے بعد جب ترقی کا قدم آگے بڑھا تو افسانہ طرازی باقی رہی لیکن عبارت میں سلاست و سادگی آنے لگی، جس کا نمونہ چہار درویش ہے، اور کم و بیش ۱۸۵۷ء کے انقلاب تک یہ طرز قائم رہا، اس کے بعد جب حکومت کے ساتھ پرانی تہذیب کی بساط الٹی اور جدید تعلیم و تہذیب سے مذاق و خیالات میں تغیر پیدا ہوا، تو اس کے ساتھ ادب بھی بدلنا شروع ہوا، اور خیالی افسانہ طرازی کی جگہ حقیقت پسندی، ذہنی تفریح ادب کے بجائے مفید سنجیدہ علمی و اصلاحی لٹریچر اور عبارت آرائی کے بجائے سادگی شروع ہوگئی، اور ادب محض ذہنی تفریح کے بجائے زندگی کے تقاضوں کی تکمیل کا کام دینے لگا، سرسید، شبلی، حالی، محمد حسین آزاد اور مولوی

چراغ علی وغیرہ کی تصانیف اس کا ثبوت ہین، بلکہ خالص ادب اور افسانون مین بھی واقعیت و مقصدیت پیدا ہو گئی، ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی راشد الخیری کے اصلاحی افسانے اُس کے شاہد ہین، اور ترقی پسندی کی یہ رفتار برابر قائم رہی، اور حالات و ضروریات کے مطابق اردو ادب کا رنگ بدلتا اور ہر قسم کا لٹریچر پیدا ہوتا گیا، ہندوستان کی آزادی کی تحریک کے بعد سے اس وقت تک اردو مین اچھا خاصہ سیاسی لٹریچر بھی پیدا ہو گیا ہے،

اسی قسم کے تغیرات نظم مین بھی ہوئے، غدر کے بعد ہی سے اردو شاعری کا رنگ بدلنا شروع ہو گیا تھا، سب سے پہلے غالب نے نیا راگ چھیڑا، اور خیالات اور طرز ادا دونون مین وسعت و تغیر پیدا کیا، اُن کے بعد محمد حسین آزاد اور حالی نے ترقی کا قدم اور آگے بڑھایا، انھون نے اردو شاعری کو اُس کے قدیم تنگ کوچہ سے نکال کر نئے خیالات و تصورات سے آشنا کیا، مولانا حالی نے اس سے پسماندہ کاروان ملت کے لئے حدی کا کام لیا جس کا نمونہ مسدس حالی اور اُن کی دوسری نظمین ہین، اور پرانی شاعری کی عام اصلاح کے لئے مقدمۂ شعر و شاعری لکھا، اُن کے بعد اکبر الہ آبادی نے شاعری کے مقاصد مین اور زیادہ وسعت پیدا کی، اور اس سے گوناگون اصلاحی و تنقیدی کام لئے، اور اقبال نے اس کو محشرستان حیات کا صور اور جاوید نامہ کی تکبیر بنا دیا، قومون کے عروج و زوال ترقی و تنزل اور موت و حیات کا وہ کون سا اصول و فلسفہ ہے، جو اس مین نہین ہے اور بعد کے سارے واقعی ترقی پسند شعراء درحقیقت اُنھی کے خوشہ چین ہین، غرض غدر کے بعد اردو نظم و نثر کے جس پہلو پر بھی نظر ڈالی جائے اس مین ترقی پذیری، حقیقت پسندی اور مقصدیت نظر آئے گی، اسلئے یہ سمجھنا کہ ترقی پسندی موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء اور ادیبون کا کارنامہ ہے سراسر غلط ہے، البتہ زمانہ کے حالات و ضروریات کے لحاظ سے ترقی پسندی کا رُخ بدلتا رہتا ہے، چنانچہ موجودہ زمانہ مین سیاسی و معاشی و سماجی مسائل کے متعلق بھی اردو لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، ترقی پسندی کو محض اشتراکی ادب کی نقالی پیٹ کی آگ اور جنسی بھوک مین محدود کر دینا درحقیقت ترقی پسندی نہین بلکہ تنزل ہے، اس کے علاوہ

بھی زندگی کے بہت سے مسائل ہین، جو اُن سے کم اہم نہین،

پرانے ادب پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ عوام کی زندگی سے دور ہے اسمیں ان کی زندگی کی عکاسی اور اُن کے مذاق کی چیزین نہین ہین، اور وہ محض ذہنی و دماغی تفریح کا ذریعہ ہے، اس مین زندگی کے مشکلات و مسائل کا حل نہین ہے، ان اعتراضات کے جوابات کے لئے ان پر تفصیلی بحث کی ضرورت ہے، یہ صحیح ہے کہ پرانا ادب عوام کی زندگی سے دور ہے اس کا سبب یہ ہو کہ اس زمانہ مین عوام کی اتنی اہمیت ہی نہین تھی، اور نہ عوامی مسائل پیدا ہوئے تھے، ان کا بڑا حصہ تعلیم سے بے گانہ تھا، اور وہ زیادہ تر خواص تک محدود تھی، اس لئے پرانا ادب خواص کے طبقہ مین محدود رہا۔ اور انہی کے اثرات بھی اس مین آئے لیکن اس سے مراد اردو ادب ہے، اردو زبان نہین،

لیکن اس کے باوجود کہ اردو ادب عوام کی زندگی سے دور رہا، اس مین ان کے ذوق اور اُن کی ذہنی تفریح کا پورا سامان موجود تھا خصوصاً شہری عوام کے لطف و تفریح کا بڑا ذخیرہ ہے، قصہ چہار درویش، آرایش محفل، الف لیلہ، قصہ لیلیٰ مجنون، نل دمن، گل بکاولی، فورتن، سنگاسن بتیسی، بیتال پچیسی، قصہ مادھونل، اور اندر سبھا امانت وغیرہ بیسیون کتابین موجود تھین جن سے عوام ایسی ہی لطف و تفریح حاصل کرتے تھے جیسی موجودہ زمانہ کا ایک تعلیم یافتہ شخص اچھے سے اچھے ناول کے مطالعہ سے حاصل کرتا ہے، فرصت کے اوقات مین چند ہم سن و ہم مذاق ایک جگہ جمع ہو جاتے، حقہ کا دور چلتا، ایک خواندہ شخص ان مین سے کوئی کتاب پڑھتا، اور تمام سامعین اس سے لطف اندوز ہوتے، آج بھی لکھنؤ کے زردوزون، سادہ کاردن اور دوسرے اہل حرفہ مین اس قسم کے ادبی اجتماع عام ہین، بلکہ ان مجلسون مین فسانۂ آزاد اور داستان امیر حمزہ تک کا دور چلتا ہے، شہرون کے علاوہ بڑے قصبات تک مین اس قسم کے تفریحی اجتماع ہوتے ہین،

البتہ خالص دیہاتی اور ان پڑھ کسانون کی تفریح کا سامان اردو ادب مین موجود نہین ہے، یہ طبقہ اردو کی ادبی زبان ہی نہین سمجھ سکتا تھا تو اس کے لئے لٹریچر کہان سے پیدا ہوتا لیکن اُن کے ذوق و دلچسپی اور لطف و تفریح

کے لئے برج بھاشا میں بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور کہانیاں موجود تھیں اور جن کتابوں کے نام لکھے گئے ہیں ان میں نورتن سنگاسن بتیسی بیتال پچیسی قصہ نل دمن وغیرہ اور دوسری بہت سی کتابیں برج بھاشا میں بھی ہیں اُن کے علاوہ ہنس جواہر، اسلام کھنڈ، آلھا اودل کا قصہ، بارہ ماسے اور بہت سی داستانیں اور حکایات موجود ہیں، جو آج بھی دیہاتوں میں بڑے ذوق اور دلچسپی سے سُنی جاتی ہیں،

ان کے مقابلہ میں آج بھی دیہاتی عوام عوامی نئے ادب کے فیض سے محروم بلکہ اس کے نام تک سے واقف نہیں، پرانے ادب کی تفریحی کتابوں سے کم از کم وہ ذہنی تفریح تو حاصل کر لیتے تھے، نئے ادب نے تو اُن کو اس سے بھی محروم رکھا ہے، اور وہ محض شہری تعلیم یافتہ نوجوانوں کی مشق سخن اور تفریح کا ذریعہ ہے، البتہ زبانوں پر عوامی ادب کی فیض بخشی کا شور ہے، یہ بھی صحیح ہے کہ پرانے ادب میں دیہاتی زندگی کی عکاسی نہیں ہے اسکی وجہ وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس دور میں اُن کی اتنی اہمیت نہیں تھی، دیہاتوں میں تعلیم نہ تھی لکھنے والے سب شہری تھے، مختصر افسانوں کا رواج نہ ہوا تھا، اور اس زمانہ میں اردو کی عمر ہی کیا تھی، کہ اس میں ہر قسم کا لٹریچر موجود ہوتا، اس قسم کے مختصر افسانے تو مغربی زبانوں میں بھی ان کے انتہائی عروج، بلکہ زمانۂ حال میں پیدا ہوئے، ایسی حالت میں اردو میں ان کا وجود کہاں سے ہو سکتا تھا لیکن اسکی ترقی کے ساتھ سب چیزیں رفتہ رفتہ آرہی ہیں، اس کے علاوہ ان مقررین کو یہ سوال ہے کہ اُن کے عوامی ادب اور عوامی زندگی کی عکاسی سے خوان غریب دیہاتی عوام کو کیا فائدہ پہنچا، وہ اس کے علمی و عملی دونوں فوائد سے محروم ہیں، ان میں اتنی استعداد صلاحیت نہیں کہ وہ کم سے کم ایسے پڑھکر ذہنی تفریح ہی حاصل کر سکیں، اُن کی پرمحن زندگی جیسے پہلے تھی اب بھی ہے، ان کو جو فائدہ پہنچا بھی ہے، وہ سیاسی حالات نے پہنچایا ہے، عوامی نئے ادب کو اس میں کوئی دخل نہیں، وہ ویسے ہی محض تعلیم یافتہ طبقہ کی ذہنی تفریح کا ذریعہ ہے، جیسے پرانا ادب ہے، روس میں عوامی ادب اس وقت پیدا ہوا جب عوام کا بڑا حصہ تعلیم یافتہ یا کم سے کم خواندہ ہو گیا، یہاں حال یہ ہے کہ دیہاتی آبادی کا بڑا حصہ بلکہ تقریباً کل کا کل جاہل مطلق ہے، اور اس کی ضیافت کے لئے عوامی ادب کا خوان موجود ہے

جس کی خبر بھی ان بیچاروں کو نہیں ہے، یہ تو ویسی ہی ستم ظریفی ہے کہ غریب کسانوں کو آج بھی پیٹ بھر کھانا اور تن کا کپڑا میسر نہیں لیکن اُن کی ترقی کے نئے دیہاتوں میں بجلی اور ریڈیو رائج کرنے کی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں، اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ عوامی ادب سے عوام کو عملاً کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں پہنچا، ایسی حالت میں اس کا نام محض عوامی ادب رکھ دینے سے تو کچھ حاصل نہیں ہوتا،

ادب برائے ادب، اور ادب برائے زندگی کا جھگڑا ابھی نہایت فعل ہے، یہ دونوں قسمیں ہر زمانہ اور ہر زبان میں موجود رہی ہیں، گو یہ اصطلاحیں نہ رہی ہوں، البتہ اب ادب برائے زندگی کا تصور محدود ہو گیا ہے پہلے زندگی نام تھا اس کے مادی، اخلاقی اور روحانی تمام پہلوؤں کا اور اب وہ سمٹ کر محض پیٹ اور جنسی بھوک میں محدود ہو گئی ہے، زندگی کے صحیح اور جامع تصور کے مطابق اس کے ہر پہلو کی ہدایت و رہنمائی کے لئے عربی فارسی سنسکرت اور ہندی وغیرہ ہندوستان کی تمام رائج زبانوں میں حکیمانہ و فلسفیانہ کتابیں ہیں حکایات، حکیمانہ مقولے، اور ضرب الامثال موجود ہیں، اردو ایک نئی زبان ہے، اس لئے اس موضوع پر اسمیں کم کتابیں لکھی گئیں، لیکن دوسری زبانوں سے بہت سی کتابیں ترجمہ ہو چکی ہیں سنسکرت اور ہندی کے ترجموں کا راقم کو پورا علم نہیں ہے، لیکن انوار سہیلی یا کلیلہ دمنہ، گلستان سعدی، بہار دانش، اخوان الصفا، کیمیائے سعادت، مثنوی مولانا روم اور دوسری بہت سی حکیمانہ کتابوں کے جن سے زندگی کے ہر شعبہ میں سبق حاصل ہوتا ہے، ترجمے ہو چکے ہیں، اور یہ سب کتابیں تو ہمارے پرانے نصاب میں داخل تھیں یعنی زندگی کے جملہ مادی، روحانی و اخلاقی معاملات و مسائل کی باقاعدہ تعلیم ہوتی تھی، ایسی حالت میں پرانے ادب کو محض ادب برائے ادب میں محدود سمجھنا ناواقفیت کا ثبوت ہے،

خالص ادب یعنی ادب برائے ادب بھی زندگی کی ضروریات میں اور تہذیب و کلچر کی ترقی کا لازمی نتیجہ ہے، بلکہ دہقانی زندگی بھی اس سے خالی نہیں، انسان محض جانور یا مشین نہیں ہے، کہ وہ محض مادی ضروریات فراہم کرنے کا آلہ ہو، یا اس کی ضرورت محض پیٹ اور بھوک تک محدود ہو، بلکہ وہ مادی حوائج کو

ضروریات کے ساتھ کچھ لطیف جذبات و احساسات اور پاکیزہ تصورات بھی رکھتا ہے، زندگی مشقتوں اور جد و جہد کے بعد اس کو سکون کے کچھ لمحات اور دماغی و ذہنی لطف و تفریح کا سامان بھی درکار ہے، عملی سے عملی آدمی کو بھی ایسے لمحات کی ضرورت ہوتی ہے، دیہات کے کسان بھی اس سے خالی نہیں ہیں، دن بھر کی محنت و مشقت کی تکان کے بعد اُن کو بھی ذہنی و دماغی سکون و تفریح کی ضرورت ہوتی ہے چنانچہ وہ بھی اپنی فرصت کے اوقات میں دیہاتی قصص و حکایات و افسانوں کو سن کر لطف و تفریح حاصل کرتے ہیں اور جس قدر تہذیب و کلچر بڑھتا جاتا ہے اسی قسم کے لٹریچر کی ضرورت بڑھتی جاتی ہے، دل و دماغ کی تفریح و جلا کے لئے ادب برائے ادب ضروری اور تھکے ہوئے دماغ کی غذا ہے جس سے دماغ تر و تازہ اور شگفتہ ہو جاتا ہے، اس کے بغیر دماغ کند اور ذہن غبی ہو جاتا اور زندگی کی بہت سی لطافتیں اور رعنائیاں ختم ہو جاتی ہیں اس لئے انسانی زندگی کے لئے ادب برائے ادب بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح ادب برائے زندگی، اگر ادب و شاعری کا حصہ زندگی سے خارج کر دیا جائے، تو وہ یکسر بے رنگ و بو ہو جائے،

نئے ادب کے بعض اصلاحی پہلوؤں کی ضرورت اور اہمیت سے انکار نہیں، ترقی پسند ادیبوں میں ایسے اصحاب قلم بھی ہیں جن کی کوشش، ادبی و اصلاحی دونوں حیثیتوں سے قابلِ قدر ہیں لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، جم غفیر ان نوآموزوں کا ہے جن کو قلم پکڑنے کا بھی سلیقہ نہیں ہے، اور وہ ترقی پسند محض اس لئے کہلاتے ہیں کہ الٹے سیدھے اشتراکی خیالات کی نقالی کر لیتے ہیں، اُن کا سب سے بڑا عیب عریان نگاری ہے، بلکہ بجنسہٖ کار ترقی پسند افسانہ نگاروں کے افسانے بھی اس سے یکسر پاک نہیں، سماجی اصلاح کی ضرورت مسلم ہے، لیکن کیا اس کا طریقہ صرف عریان نگاری ہے، اگر بالفرض کسی خاص صورت میں کسی درجہ میں اس کی ضرورت تسلیم بھی کر لیجائے، تو اس کو فرمے فرمے لے لیکر بیان کرنے کی کیا ضرورت ہے، اس سے تو خود ان ادیبوں جنسی بیماری کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے فحاشی اور عریان نگاری کو نوجوانوں میں اپنی شہرت و مقبولیت اور تجارت کا ذریعہ بنا لیا ہے، ورنہ یہ کام شائستہ طریقہ سے بھی کیا جا سکتا ہے پرانے ادیبوں نے بھی اس موضوع پر۔

پر لکھا ہے، مرزا رسوا اور قاری سرفراز حسین نے اودھ کے آخری دور تک کی سرگزشت بیان کی ہے لیکن کس شائستگی کے ساتھ، خود قاضی عبدالغفار صاحب جو پرانے اور نئے دونوں ادب کے مجمع البحرین پرانے ادب کے نامور ادیب اور ترقی پسند ادبیوں کے مقتدا ہیں، ان کی کتاب لیلیٰ کے خطوط اور مجنوں کی ڈائری اصلاحی ترقی پسند ادب کا اچھا اور قابلِ تقلید نمونہ ہیں لیکن اس کے لئے بڑے سلیقۂ حسن مذاق اور اس سے بھی بڑھ کر حسنِ نیت کی ضرورت ہے جس کا نئے ادیبوں میں عموماً فقدان ہے،

یہ تو نئے اور پرانے ادب کے ایک حصہ یعنی شعر کا تجزیہ تھا، نظم کا حال بھی یہی ہے نہ ترقی پسند شاعری سراسر خیر ہے، اور نہ پرانی شاعری محض دفترِ پارینہ، شاعری ہی نے اردو جیسی نومولود بولی کو مستقل زبان بنایا، اور شعراء اور ادیبوں کو زبان و بیان کے جوہر عطا کئے ورنہ وہ ع

اک چیز لچر سی بہ زبان دکنی تھی

اس سے انکار نہیں کہ اردو کی قدیم شاعری کا بڑا حصہ عشق و عاشقی کے جذبات اور ہجر و وصال و گل و بلبل کی داستان پر مشتمل ہے لیکن حسن مذاق اور لطافت کے ساتھ یہ چیز میں شاعری کا عیب نہیں، بلکہ ہنر ہیں کس زبان کی شاعری اس سے خالی ہے، بلکہ شاعری کا آغاز ہی عشق و محبت کے جذبات سے ہوا، اسکو خارج کر دینے کے بعد شاعری میں رہ کیا جاتا ہے، البتہ اعتدال و سلامت مذاق ضروری شرط ہے، یہ صحیح ہے کہ آخری دور کے شعراء خصوصاً لکھنؤ کے شعراء نے شاعری میں بڑا ابتذال و رکاکت پیدا کر دی اور اس کو سفلہ جذبات کا چکلہ اور الفاظ کا کھیل بنا دیا، لیکن یہ اس دور کی زوال پذیر سوسائٹی کا قصور ہے، تاہم کوئی دور بھی بلند پایہ شعراء سے خالی نہیں رہا ہے، ان میں میر، مومن، ذوق، غالب، آتش اور انیس و دبیر بھی تھے جن کا کلام اردو شاعری کا لائقِ فخر سرمایہ ہے خصوصاً انیس و دبیر نے اردو شاعری کا دامن نہایت وسیع کر دیا، انیس نے بالکل صحیح کہا ہے،

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر میں نے پلہ گراں کر دیا

یہ صحیح ہے کہ شاعری کا دامن محض عشق و محبت کی واردات سے زیادہ وسیع ہونا چاہئے اس کا

سے بلاشبہ اردو شاعری کا گلہ بڑی حد تک بھرا ہوا ہے لیکن وہ دوسرے جذبات وخیالات سے یکسر خالی نہیں ہے خود غزل میں بھی جو اس حیثیت سے سب سے زیادہ مطعون سمجھی جاتی ہے، بہت سے اخلاقی وحکیمانہ خیالات پائے جاتے ہیں، بلکہ رباعی کے بعد غزل کے فرد اشعار ہی اس کے لئے موزوں ہیں جس سے کسی غزل گو کا کلام بھی خالی نہیں ہے رباعی اور قطعات حکیمانہ خیالات کے لئے مخصوص ہیں، جن کا بڑا ذخیرہ اردو میں مہیا ہے نظم کے لئے مثنوی ہے جس میں ہر قسم کے واقعات اور خیالات وجذبات نظم کئے جا سکتے ہیں، اور اردو مثنویوں میں اس کے بہتر سے بہتر نمونے موجود ہیں اس لحاظ سے مرثی کا دامن بھی جن کا موضوع اگرچہ محدود ہے ہر قسم کے جذبات وخیالات، مناظر اور واقعہ نگاری کے لئے نہایت وسیع ہے اور اس کی بہتر سے بہتر مثالیں انیس ودبیر کے مراثی میں موجود ہیں جن کی نظیر جدید اردو شاعری میں اب تک نہیں مل سکتی، یہ تو پرانی شاعری کا حال ہے جدید دور کی شاعری میں ہر قسم کی نظمیں اس کثرت سے ہو گئی ہیں کہ ان کا شمار بھی مشکل ہے البتہ موجودہ نقطۂ نظر سے قدیم شاعری زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کی تکمیل سے خالی ہے لیکن ایسے دور انحطاط کی شاعری میں جس کا نشو ونما حکومت کی تباہی سوسائٹی کے فساد اور لکھنؤ کے گہوارۂ تعیش میں ہوا ہو زندگی کی حرارت اور اس کے تقاضوں کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے بہادر شاہ کی زنگ خوردہ تلوار میں ہمایوں اور بابر کی تلوار کے جوہر اور جانفروں کے پیہم جنگ محل میں خون جگر تلاش کرنا لیکن جب سے اردو شاعری کا قدیم رنگ بدلا ہے، اس میں قومی، ملی، معاشی اور سیاسی مضمون کا بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا ہے،

یہ بھی عجیب بات ہے کہ جدید شاعری کے سرگروہ حالی، آزاد، شبلی، ظفر علی خان، اکبر اور اقبال سب کے سب پرانے مکتب شاعری کی پیداوار تھے، انہی نے جدید شاعری کا آغاز کیا، اور اس کو کمال کے اس درجہ تک پہنچا دیا کہ اب اس میں مشکل ہی سے اضافہ کیا جا سکتا ہے، خود ترقی پسند شعراء کے امام جوش ملیح آبادی بھی شاعری کے پرانے اسکول کی پیداوار ہیں، اگرچہ انھوں نے اپنے کلام میں ترقی پسندی کے رائج الوقت سکہ کا ٹھپہ لگا دیا ہے لیکن وہ اسی پرانی ٹکسال کا ڈھلا ہوا ہے اسی لئے اس میں کھوٹ نہیں ہے اور کمال فن اور محاسن شاعری کے اعتبار سے استادانہ ہے اس لئے پرانی شاعری کا دفتر بالکل پارینہ نہیں ہے البتہ اس کے بعض پہلو قابل اصلاح ضرور ہیں جنکی اصلاح ہوتی جا رہی ہے،

اس کے مقابلہ میں ترقی پسند شاعری کی ابھی کوئی حیثیت ہی قائم نہیں ہوئی ہے اور ترقی پسند شعراء میں جوش، مجاز، علی جواد زیدی، فراق اور اس قسم کے دو چار شعراء کو چھوڑ کر جن کی شاعری کا قالب وہی پرانا ہے اور جو درحقیقت شاعری کہی جا سکتی ہے، باقی نظم منثور لکھنے والے کسی شمار میں نہیں ہیں اور اُن کی حیثیت اشتراکی ادب کے بھونڈے نقال سے زیادہ نہیں، اگر پرانی شاعری محض عشق و محبت، گل و بلبل اور ہجر و وصال کے افسانوں تک محدود تھی تو جدید ترقی پسند شاعری محض پیٹ، روٹی، انقلاب، مزدور، سرمایہ دار اور فرائیڈ کی جنسیات تک محدود ہے،

ترقی پسند نثر اور نظم دونوں کے عیوب و نقائص قریب قریب یکساں ہیں، نظم میں دو عیب مزید ہیں، ایک شاعری کے قواعد سے آزادی، دوسرے اہمیت یا مزدکنایہ، قواعد سے آزادی کے لئے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ وہ خیالات کے تنوع اور وسعت کا ساتھ نہیں دے سکتے، اور اردو شاعری کی ترقی کے لئے اُن کا توڑنا ضروری ہے لیکن یہ محض عذر لنگ اور عجز بیان کا ثبوت ہے، رامائن، مہابھارت، شاہنامہ، مثنوی مولانا روم وغیرہ دنیا کی بہت سی غیر فانی کتابیں پابند نظم میں لکھی گئی ہیں، اور ان میں مختلف النوع جذبات و خیالات، افکار و تصورات، واقعات و حالات، فلسفہ و حکمت، اخلاق و روحانیات وغیرہ کا ایک عالم موجود ہے، اور اُن کے نظم کرنے میں شاعری کی پابندیاں حائل نہ ہو سکیں، خود اردو جیسی نوعمر زبان میں غالب، انیس و دبیر اور اقبال کے کلام میں کیا کچھ نہیں ہے، اقبال سے زیادہ بلند و دقیق کس کے خیالات ہونگے لیکن اُن کو کبھی قواعد شاعری کے دائرے سے باہر نکلنے کی ضرورت نہیں پڑی، خود ترقی پسند شعراء میں جوش، مجاز، فراق، علی جواد زیدی جانثار اختر کو جن کا کلام درحقیقت شاعری کہلانے کا مستحق ہے شاعری کے قواعد کی تنگ دامانی کا شکوہ کبھی نہیں ہوا، خصوصاً جوش کا کلام تو قادر الکلامی کا نمونہ ہے، اور اسی لئے اُن کے کلام میں جان ہے کہ اس کا قالب پرانا ہے،

بحر، ردیف اور قافیے کی پابندیاں محض لایعنی نہیں ہیں، بلکہ اُن سے کلام میں حسن، اثر پیدا ہوتا ہے، ایک ڈھلا ہوا شعر سامعہ اور ذوق دونوں کو متاثر کرتا ہے، قوت حافظہ بھی اسے جلد اور آسانی کے ساتھ محفوظ کر لیتی ہے، اس لئے تبلیغی مقصد کے لئے بھی پابند شاعری زیادہ مفید ہے، اس حد تک تو تسلیم ہے کہ ان تمام

قوانین کی پابندی کی ضرورت نہیں جن سے شاعری محض صنعت گری بن جائے لیکن موٹی موٹی باتوں مثلاً بحر و وزن اور قوافی کا لحاظ جن سے شعر کا قالب بنتا ہے ضروری ہے، ورنہ وہ شعر شعر نہیں رہ جائے گا، ایسا تو نہ ہو کہ ایک نظم کا ہر مصرع دوسرے سے مختلف ہو، اور نثر و نظم میں امتیاز کرنا دشوار ہو جائے، بلکہ نظم منثور کے فقرے بھی ایک دوسرے سے مربوط نہ ہوں، انگریزی کے بلینک ورس کی شوق سے تقلید کی جائے لیکن تھوڑی ترمیم کے ساتھ، ہر زبان کا ایک خاص مزاج ہوتا ہے جو دوسری زبانوں کی بجنسہٖ نقل و تقلید کا متحمل نہیں ہو سکتا، ایک ماہر و مبصر ادیب کا یہ کام ہے کہ دوسری زبانوں کے ادب کی نقل و ترجمہ کو اپنی زبان کے مزاج کے مطابق ڈھال لے، ورنہ ایک کی روح دوسرے کے قالب میں بالکل اجنبی نظر آئے گی، اس قسم کے تصرفات خود عربی فارسی اور اردو کی بحروں میں جو ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہیں کئے گئے ہیں، اس لئے کہ بجنسہٖ ایک زبان کے قوانین شاعری دوسری زبان کی شاعری کیلئے موزوں نہیں تھے، ایسی حالت میں انگریزی جیسی اجنبی زبان کی شاعری کی نقل و تقلید میں تو ترمیم اور تصرف بھی زیادہ ضروری ہے،

دوسرا عیب ابہامیت یا رمز و کنایہ ہے، اردو شاعری میں بھی استعارہ و کنایہ ہے لیکن اس کا استعمال خاص خاص مواقع پر اس خوبصورتی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ کلام کے حسن و اثر دونوں میں اضافہ ہو جاتا ہے، اور شاعر کا مفہوم و مقصد، تصریح سے زیادہ بلیغ طریقہ سے ادا ہو جاتا ہے، الکنایۃ ابلغ من التصریح مشہور مقولہ ہے، لیکن جدید شاعری کی ابہامیت ع

تدعا عنقا ہے اپنے عالم تحریر کا

کی مصداق ہے اور اس کا مفہوم و مقصد سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے، ترقی پسند شاعری کا بڑا مقصد خاص خیالات کی تبلیغ و اشاعت ہے، اور اس قسم کی ابہامیت اس کے بالکل منافی ہے، اس لئے سنجیدہ ترقی پسندوں کو ان نقائص کے اصلاح کی جانب توجہ کرنے کی ضرورت ہے، ورنہ ترقی پسند ادب کا اصل منشا پورا نہیں ہو سکتا اور اس کی زندگی بھی بہت تھوڑی ہو گی،

مطبوعاتِ جدیدہ

مسدّس بے نظیر مصنفہ جان صاحب مرتبہ جناب محمد علی خان صاحب اثر رامپوری تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۶۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ:- خسرو باغ روڈ ریاست رامپور؛

نواب کلب علی خان والی رامپور بڑے علم دوست، علماء نواز اور علم وفن کے بڑے قدردان وسرپرست تھے اُس دور کے بہت سے نامور علماء وشعراء وادباء دربار رامپور سے وابستہ تھے، نواب موصوف کے زمانہ میں بعض تمدنی کام بھی انجام پائے، اس سلسلہ میں انھوں نے اپنی تخت نشینی کی یادگار میں ۱۸۶۶ء میں ایک میلہ قائم کیا تھا جو رامپور کا تاریخی میلہ تھا، سرکاری انتظام میں باغ بے نظیر میں لگتا تھا، نواب ممدوح خود بنفس نفیس اس میں شریک ہوتے اور ہر فن کے باکمال اس میلہ میں اپنے اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے تھے، شعروادب کی محفل بھی جمتی تھی چنانچہ دربار رامپور کے بہت سے متوسل شعراء نے میلہ اور باغ بے نظیر کی تعریف میں اشعار کہے تھے مشہور رنجی گوجان صاحب نے ایک مستقل مسدّس مسدّس بے نظیر تصنیف کیا تھا، جو اب تک نہیں چھپا ہے، اس کا قلمی نسخہ ریاست کے کتبخانہ میں موجود تھا، جناب اثر رامپوری نے اسکو مبسوط مقدمہ کیساتھ شائع کیا ہے، مسدّس تو کل ۳۳ صفحوں کا ہے لیکن مقدمہ کی حیثیت مستقل تصنیف کی ہے اس میں لائق مصنف نے بڑی تلاش وجستجو سے تاریخی وادبی ماخذوں شعراء کے دواوین اور رامپور کے پرانے بزرگوں کی معتبر زبانی روایات سے میلہ اور باغ بے نظیر کے مفصل حالات تحریر کئے ہیں، اور جان صاحب کے مسدّس اور دوسرے شعراء کے کلام میں جن لوگوں کے نام یا جو اشارات آئے ہیں اُن کے مختصر حالات اور اُن کی تشریحات تحریر کی ہیں، اس طرح اس مقدمہ میں اس دور کے رامپور کی نہایت دلچسپ تمدنی تصویر آگئی ہے جس کا اب صرف تاریخوں میں ذکر ملے گا،

"م"

جلد ۶۶ ماہ صفر المظفر ۱۳۷۰ھ مطابق ماہ دسمبر ۱۹۵۰ عیسوی عدد ۶

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۰۲ -

مقالات

آہ مولانا شروانی !	سید سلیمان اندوی	۴۰۳ تا ۴۰۴
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران،	جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی	۴۰۵ - ۴۲۲
نفثۃ المصدور	جناب مولانا سید بدر الدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ	۴۲۳ - ۴۳۸
اعتراف	جناب سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری مترجم پولین اعظم وغیرہ،	۴۳۹ - ۴۵۶
مولانا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ میں،	شاہ معین الدین احمد ندوی،	۴۵۷ - ۴۷۷
صدر یار جنگ	جناب مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی	۴۷۸ - ۴۸۶
مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے خاندانی اور ذاتی حالات	جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے،	۴۸۷ - ۴۹۸

ادبیات

ماتم حبیب شبلی	جناب یحییٰ اعظمی	۴۹۹ - ۵۰۰

آثار علمیہ و ادبیہ

مکتوب شروانی		۵۰۰
مطبوعات جدیدہ	"م"	۵۰۱ - ۵۰۴

شذرات

معارف نے ہمیشہ مذاقِ عام سے اپنا دامن بچایا اس لئے آج تک اس کا کوئی خاص نمبر نہیں نکلا لیکن بعض حالات ایسے پیش آجاتے ہیں کہ پرانی روش سے ہٹنا ضروری ہوجاتا ہے، انہی میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم کا حادثۂ وفات بھی ہے، مرحوم کی ذاتِ گرامی ایسے گوناگون اوصاف و خصوصیات کی جامع تھی کہ ایسے نمونے اب دیکھنے میں نہ آئیں گے، بلکہ وہ اپنے زمانہ میں بھی ان اوصاف میں منفرد تھے، اُن کی وفات سے فضل و کمال، علم و دوستی و علماء نوازی، تقویٰ و دیانت، تہذیب و شرافت، سیرت کی استواری و وضعداری کی جامعیت کا خاتمہ ہوگیا، اس لئے اُن کی یادگار درحقیقت ان اوصاف و کمالات اور علم و فن کی یادگار ہے،

اس عمومی حیثیت کے علاوہ مرحوم کو دارالمصنفین سے خاص تعلق تھا، وہ مولانا شبلی مرحوم کے بڑے گہرے اور مخلص دوست تھے، اُن کی وفات کے بعد یہ ربط و تعلق اُن کی یادگار دارالمصنفین کی جانب منتقل ہوگیا چنانچہ مرحوم اس کے بڑے قدردان، ہوا خواہ مجلس دارالمصنفین کے رکن رکین اور اُس کے صدر نشین تھے اسلئے دارالمصنفین پر اُن کا بڑا حق تھا جس کو وہ اُن کی علمی یادگار ہی کی شکل میں ادا کرسکتا تھا،

اس نمبر میں اس کی کوشش کی گئی ہے کہ مرحوم کی زندگی کے تمام اہم پہلو اور اُن کی نمایاں خصوصیات سامنے آجائیں، چنانچہ متعدد مضامین ایسے اصحاب علم و قلم کے ہیں جن کو برسوں مرحوم کے ساتھ رہنے یا اُن کو زیادہ قریب سے سلسل دیکھنے کا موقع ملا ہے، اس لحاظ سے یہ نمبر اُن کی زندگی کا نہایت مستند مرقع ہے، حضرۃ الاستاذ مدظلہ کا مضمون ایسے وقت ملا جب معارف کا ابتدائی حصہ چھپ چکا تھا لیکن مضمون کی اہمیت کے لحاظ سے اُس کو ہر مقالہ رکھنا ضروری تھا، اس سے صرف چند ابتدائی صفحوں کے ہندسے مکرر ہوگئے ہیں، باقی اور کوئی فرق نہیں آیا ہے، ان گذارشات کے ساتھ مولانا شروانی مرحوم کی زندگی کا یہ مرقع اور اُن کی علمی یادگار ناظرین معارف کی خدمت میں پیش ہے،

مقالات

آہ! مولانا شروانی

از

سید سلیمان ندوی

اگست کی کوئی آخری تاریخ تھی کہ لاہور کے کسی اخبار مین سرسری طور سے یہ خبر چھپی کہ مولانا شروانی کا انتقال ہوگیا، خبر پڑھ کر دل دھک سے ہوگیا، اور اپنی دوری، مجبوری، اور مجبوری پر بڑا افسوس آیا، مین نے مرحوم کی زندگی ہی مین اُن کے واقعات اور خاندانِ شروانی کے بعض احوال لکھوا کر دار المصنفین مین رکھ لئے تھے، اب جب اُن کا سانحہ پیش آیا، تو تقدیر کی مجبوری دیکھئے کہ تدبیر کوئی کام نہ آئی،

مرحوم نے چھیاسی سال کی عمر مین بتاریخ ۱۱ اگست ۱۹۵۰ء اس دنیائے رنگ و بو کو خیرباد کہا، اور سلف صالحین سے جا ملے، مرحوم سے میرے تعلقات اس قدر گوناگون تھے کہ نہین کہا جا سکتا کہ اس کو کہان سے شروع کیا جائے، اور کیا کہا جائے اور کیا چھوڑا جائے، مین نے موصوف کو سب سے پہلے ۱۹۱۰ء مین نصف صدی پہلے پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین دیکھا تھا، بھرا شباب، مردانہ حسن و جمال، سپید رنگ، سیاہ خوبصورت داڑھی، اور سر پر زلفین، بلند و بالا قامت، لطیف و قیمتی لباس، جلسہ کے ہر اجلاس مین نیا جوڑا زیب بدن، کبھی سر پر عمامہ، کبھی گول ٹوپی، کبھی ترکی ٹوپی، جدھر نکل جاتے آنکھین اُٹھ جاتین انگلیان اشارہ کرتین لوگ ایک دوسرے کو دیکھاتے اور بتاتے، اسی طرح مین نے دیکھا، اور بتایا گیا کہ یہ علی گڈھ

کے ایک رئیس عالم ہیں،

۱۹۰۱ء میں جب ندوہ آیا، تو مدرسہ اُن کے ذکر جمیل سے پرشور تھا، انتظامی جلسے سال میں چند بار ہوتے، اور وہ اُن میں جب آتے تو جلسہ کی اہمیت بڑھ جاتی، ۱۹۰۴ء میں جب الندوہ نکلا، اور وہ اس کے اڈیٹر ہوئے، اور میرے ایک دو مضمون اس میں نکلے تو تعارف بڑھا، اور جب وہ آتے، تو میں حاضر ہوتا اور وہ اپنے بزرگانہ لطف و نوازش سے نوازتے ۱۹۰۶ء میں جب میری جماعت کی دستار بندی کا جلسہ ہوا اور خاکسار کی عربی تقریر نے حاضرین سے داد تحسین حاصل کی، اور حضرۃ الاستاذ نے خوش ہو کر اپنے سر سے ستارہ اُتار کر میرے سر پر رکھی تو اُس جلسہ میں مولانا شروانی شریک تھے تاہم حضرت الاستاذ نے خود اپنے قلم سے لکھ کر اُن کو اس واقعہ کی بڑی مسرت سے خبر دی، (یہ خط مکاتیب شبلی میں درج ہے) استاد کی یہ دو سعادت مولینا شروانی سے تقریب کا نیا ذریعہ بنی،

۱۹۱۰ء میں جب مکاتیب شبلی کی تدوین کا خیال آیا، تو اُستاد نے پھر مولانا شروانی سے تقریب کی، کہ اُن کے پاس شبلی کے خطوط ہوں، وہ سید سلیمان کو دیئے جائیں ۱۹۱۲ء میں جب ندوہ میں حضرۃ الاستاذ کے حسب ایما انگریزی مدارس کے نصاب تاریخ کی غلطیوں کی تصحیح کا کام میرے سپرد ہوا تو پھر تازہ تقریب کی گئی، نومبر ۱۹۱۴ء میں جب حضرۃ الاستاذ بیمار ہوئے، اور حالت مایوسی کو پہنچی تو خاکسار حاضر خدمت تھا، سب سے پہلے میں نے اس شدت تعلق کی بنا پر جو اُن دونوں دوستوں میں تھا، اس مضمون کا ایک مختصر کارڈ اُن کو بھیجا "افسوس کہ الفاروق کا مصنف اس وقت موت و حیات کی کشمکش میں ہے"، ۱۸ نومبر کو مولانا نے وفات پائی، اس کی اطلاع دی، اس کے بعد سے جو اُن سے مکاتبات کا سلسلہ شروع ہوا، تو آج سے دو برس پہلے تک اُس وقت تک برابر قائم رہا جب تک اُن کی قوت حافظہ اور عام قوت جسمانی کام دیتی رہی، آج سے دو سال پہلے میں علی گڈھ مسلم یونیورسٹی کے کورٹ کی میٹنگ میں سب سے آخری دفعہ اُن سے ملا، میں نے دیکھا کہ اُن کا نیر سا قدیم کمان بن چکا ہے، وہ چہرہ جو گلاب سا تر و تازہ اور شاداب رہتا تھا، پژمردہ

اور مرجھایا تھا، اوسی وقت دل نے کہا کہ یہ چراغِ سحر بجھا ہی چاہتا ہے،

میرا عمر بھر یہ دستور رہا کہ حضرۃ الاستاذ کے مخصوص احباب اور دوستون سے بزرگداشت کا تعلق رکھون اور ہمیشہ اُن کے سامنے اپنے کو چھوٹا سمجھون چنانچہ مرحوم سے خصوصیت کے ساتھ میری طرف سے خوزانہ اور اُن کی طرف سے بزرگانہ تعلق قائم رہا، مین انھین مخدوم لکھتا وہ عزیز لکھتے، دارالمصنفین کی تاسیس مین مرحوم کی بزرگانہ حمایت ہمیشہ رہنما رہی، دارالمصنفین کے پہلے صدر جسٹس مولوی کرامت حسین اور دوسرے نواب عماد الملک اور تیسرے مولانا شروانی ہوئے، اس تعلق سے بھی اُن سے خط و کتابت کا سلسلہ اکثر رہا کیا، ایک دفعہ جب احباب اور بزرگون کے محفوظ خطوط گنے تو سب سے زیادہ جن کے خطوط میرے پاس نکلے، وہ انہی کے تھے، مین نے جب اُنھین اس کی اطلاع دی، تو اُس پر مسرت ظاہر فرمائی، اور لکھا کہ اس مین تعجب کی کیا بات ہے، اس کا الٹا ہوتا تو تعجب ہوتا،

وہ قدیم و جدید تعلیم کا بہترین مجموعہ تھے، فارسی و عربی تعلیم گھر پر چاہل کی، عربی کی اونچی کتابین حضرت مولانا مفتی محمد لطف اللہ صاحب علی گڈھی کے درس مین پڑھین، انگریزی تعلیم میٹرک تک آگرہ اسکول آگرہ مین پائی، اُن کی جوانی تک علم و فن اور دین و تقوی کے باکمال اکابر موجود تھے، وہ ہر ایک کے در تک پہنچے اور ہر ایک سے حسبِ استعداد کسبِ فیض کیا، شیخ حسین یمنی عرب مقیم بھوپال سے سندِ حدیث حاصل کی، قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی سے فیض پایا، بیعت قطب الوقت حضرت مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی سے کی تھی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی کی زیارت سے بھی فیض یاب تھے،

اُن کا سب سے پہلا مضمون جس نے لوگون سے خراجِ تحسین وصول کیا، وہ بابر پر ہے، جو رسالہ حسن حیدرآباد مین چھپا تھا، اور جس پر مصنف کو ایک اشرفی انعام ملی تھی، مولانا شبلی کی المامون پر اُن کا تبصرہ اُن کا پہلا تنقیدی کارنامہ ہے، جو غالباً ۱۸۸۶ء مین شوق قدوائی کے اخبار آزاد مین چھپا تھا، اُن کے رسائل مین دو بہترین تاریخی رسائل ہین، یہ دونون ندوہ کے سالانہ جلسون مین پڑھے گئے تھے، پہلے کا نام علمائے سلف

اور دوسرے کا نام نا بینا علما، یہ دونوں انیسویں صدی کی یادگار ہیں ۱۹۰۱ء مین لاہور سے جب مخزن نکلا، تو اُس کی محفل مین بھی یہ شریک تھے حضرت خسرو کے غزلیات پر اس مین اُن کا مضمون چھپا تھا ۱۹۰۲ء مین الندوہ کے شریک اڈیٹر ہوے، تو اخلاق پر اُن کے مضامین نکلے،

علی گڈھ کی مجلسون مین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات مین الصدیق لکھ کر پیش کی حیدرآباد کی میلاد کی مجلسون کے وہ بانی تھے، اُن مین سیرۃ پر مختلف رسائل لکھے، جو چھپے اور چھپیلے، معارف مین اُن کے مضامین اور اُن کی غزلین اکثر زیب اوراق رہین،

شعر و شاعری کا ذوق اُن کو آغاز سے تھا، حسرت تخلص کرتے تھے، اردو اور فارسی دونون مین مشق سخن کرتے تھے، اردو مین حضرت امیر مینائی سے اصلاح اور فارسی مین مولانا شبلی سے مشورہ کرتے تھے، فارسی کے مشہور شاعر حضرت خواجہ عزیز سے بھی مولانا شبلی کے ذریعہ سے تعلق رکھتے تھے،

اُن کے اخلاقی فضائل مین وضعداری بڑی نمایان تھی جس سے جتنا ملتے تھے تمام عمر اسی طرح ملتے رہے جب لکھنؤ آتے تو منشی احتشام علی صاحب کی کوٹھی مین ٹھہرتے تھے، اور تمام عمر مین کبھی اس وضع مین فرق نہین آیا، پھر اس قیام مین جن جن بزرگون اور دوستون سے ملنے کا دستور تھا، اسی طرح وہ جاکر ملتے، اور اتنی دیر بیٹھتے لکھنؤ مین فرنگی محل اور وہان بھی مولانا محمد نعیم صاحب کی نشست گاہ مین ضرور حاضر ہوتے

اُن کی جوانی تھی کہ ندوہ کا غلغلہ بلند ہوا، یہ وہ مجلس تھی جس کی روحانی اور علمی صدارت جن بزرگون سے نسبت رکھتی تھی یعنی مولانا شاہ فضل رحمان صاحب گنج مرادآبادی اور حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب دونون ہی سے اُن کو قلبی تعلق تھا، اس لئے وہ ندوہ کے اُن اصلی ارکان مین تھے جن سے ندوہ کی مجلس عبارت تھی، وہ سب سے پہلے ۱۹۱۶ء مین ندوہ کے اجلاس ناگپور کے صدر ہوئے، اور یہین اسی وقت دولت آصفیہ مرحوم کی صدارت امور مذہبی کی خبر عام ہوئی جس کے بعد اُن کا بارہ تیرہ برس کے قریب حیدرآباد مین قیام رہا، اور جامعہ عثمانیہ کی تاسیس اور شعبۂ دینیات کے افتتاح مین اُن کی مساعی مشکور رہین حیدرآباد

کا حال وہان کے مقیم احباب سنائین گے،

حیدرآباد کے قیام کے زمانہ مین بھی وہ دو دفعہ ندوہ کے اجلاس کے صدر ہوئے، پہلی دفعہ انبالہ مین اور دوسری دفعہ لکھنؤ مین مرحوم کو قومی اداروں مین سے علی گڈھ، ندوۃ العلما لکھنؤ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے خصوصیت کا تعلق تھا، مولانا شبلی مرحوم کے بعد غالباً ۱۹۱۰ء مین وہ انجمن ترقی اردو کے بھی ناظم ہوئے، اور دو تین سال کے قریب خدمت کے بعد قرعۂ فال مولوی عبدالحق صاحب کے نام نکلا، ان اداروں کے علاوہ دارالعلوم دیوبند اور مظاہر العلوم سہارنپور کے بزرگون سے بھی ارتباط رکھتے تھے، اور ان درس گاہون کی بھی امداد فرمایا کرتے تھے،

عجیب اتفاق ہے کہ نادانستہ ۱۹۲۶ء مین سفر حج مین بھی میرا ان کا ساتھ ہوا، یہ موتمر اسلامی والا موقع تھا، وہان یہ سخت بیمار پڑ گئے تھے، مگر بڑی ہمت کے ساتھ سارے ارکان ادا کئے، مدینہ منورہ کے قیام کے زمانہ مین مین نے ان کا تعارف شیخ ابراہیم خربوطلی مدیر کتب خانہ شیخ الاسلام سے کرا دیا، تعلق چونکہ علمی اور روحانی دونون تھا، اس لئے بڑا سانہ گانہ آیا، اور اخیر اخیر وقت تک قائم رہا، حرمین محترمین کی خدمت بھی وہ سالانہ کیا کرتے تھے، اخیر دفعہ جب دو سال ہوئے، مین نے اپنے ارادۂ حج کی اطلاع ان کو دی تو لکھا کہ اس دفعہ حرمین شریفین کی خدمت کی رقم آپ ہی کے ذریعہ جائے گی، مگر روانگی کے وقت نہ ان کو یاد رہا، اور نہ مین نے یاد دلایا،

ان کو نادر اور قلمی کتابون کا بڑا شوق تھا، اور اس شوق کی تاریخ خود انھون نے لکھ کر معارف مین چھپوائی ہے، مولانا شبلی مرحوم کے ذریعہ سے اور ان کی پسند سے کتابین خریدا کرتے، لکھنؤ مین عبدالمحسن اور واجد حسین قلمی کتابون کے تاجر تھے، لکھنؤ آتے تو ان کے نوادر دیکھتے، اور چھانٹ کر لے جاتے، یون بھی کتابین ان کے پاس پہنچتی رہتی تھین، حیدرآباد کے قیام کے زمانہ مین بھی بہت سی کتابین حاصل کین، مین جب ۱۹۲۰ء کے آخر مین یورپ سے واپس آیا، تو عزیزون اور بزرگون کے لئے جو تحفے لایا مرحوم کے لئے نستعلیق کے اچھے خطاطون کی وصلیون کی

کی عکسی تصاویر کا مجموعہ لاکر پیش کیا،

پہلے تو اصل وطن علی گڈھ میں بھیکم پور میں تھا، بعد کو بھیکم پور سے کچھ دور اپنے نام سے حبیب گنج نام ایک گاؤں آباد کیا تھا، وہیں زنانہ اور مردانہ مکانات، مسجد اور ایک کتب خانہ کی عمارت تیار کی تھی، زمینداری کے شغل کے بعد بھی کتب خانہ اُن کی دلچسپی کا مرکز تھا،

معمول تھا کہ صبح کی نماز کے بعد ہاتھ میں ایک بڑی سی لکڑی لے کر باغ میں سیر کو نکل جاتے، اس وقت ان کے دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہوتی، لکھنؤ آتے تو صبح کو پیدل منشی احتشام علی کی کوٹھی واقع خیالی گنج سے مولوی عبدالباری صاحب ندوی کی کوٹھی ہارڈنگ روڈ تک پیدل جاتے، واپسی سواری پر ہوتی دارالمصنفین آتے تو احاطہ کے اندر کمرہ کے باہر روش پر ٹہلا کرتے،

ایک دفعہ دارالمصنفین کا جلسۂ انتظامیہ رمضان المبارک میں مقرر کیا، ہم نے عذر کرنا چاہا۔ تو جواب میں لکھا کہ کیا رمضان مسلمانوں کے کام میں مانع ہے، غرض تشریف لائے، اس زمانہ میں وہ چائے کے بجائے اولٹین پیتے تھے، میں کافی اور مولوی مسعود علی صاحب چائے پیتے تھے، سحری میں یہ تینوں شراب الصالحین لائی جاتیں اور ہر ایک کا ایک ایک دور چلتا، اور بڑی خوشی سے پیتے، اور بعد کی ملاقاتوں میں اکثر اس کا ذکر کیا کرتے تھے،

دارالمصنفین کی مسجد مرحوم ہی کی کوشش سے نواب مزمل اللہ خان مرحوم کی امداد سے مولوی مسعود علی صاحب کی نگرانی اور انجینیرنگ میں بنی، پھر دارالعلوم ندوہ کی مسجد بھی برادر موصوف ہی کی نگرانی اور انجینیرنگ میں بنی، مرحوم دونوں کو دیکھ کر برادر موصوف کے تعمیری ذوق کو بہت پسند فرماتے تھے، چنانچہ جب وہ علی گڈھ میں حبیب منزل بنوانے لگے، تو مولوی صاحب موصوف کو بلوا کر اُن سے مشورہ کیا، انھوں نے جو مشورہ دیا اس میں سے سامنے کی روکار عمارت ہٹ فرماتے تھے کہ اگر یہ حصہ نہ ہٹتا، تو یہ عمارت کچھ نہ ہوتی،

مرحوم کے اخلاق کی دو خصوصیتیں عجیب تھیں، ایک یہ کہ جس شخص سے جس جہت سے اُن کو تعلق ہوتا

اس سے اوسی جہت سے ملتے، اور اسی کے متعلق باتین کرتے، اوسکی دوسری جہتون سے اُن کو کوئی تعلق نہ ہوتا، حکیم اجمل خان مرحوم سے گہرے تعلقات تھے، مگر یہ یکجہتی، قدیم قلمی مخطوطات اور قدیم تہذیب و شرافت کے اذکار سے تھی، ان دونون کی ملاقاتون مین یہی تذکرے رہتے، کہین بیچ مین سیاست کا نام بھی نہین آتا، مولانا ابوالکلام سے بھی مولانا شبلی کے واسطہ سے اُن کے تعلقات تھے، اُن کی ملاقات اور مکاتبت بھی جو چھپ چکی ہے، سیاست کے تذکرہ سے خالی ہے، میری زندگی پر مختلف دور گذرے ہین، جن مین سیاست بھی ہے، مگر کبھی کسی خط مین نہ مین نے اُس کے متعلق کچھ لکھا، اور نہ کبھی انھون نے پوچھا،

اُن کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ اُن کی مجلس مین کبھی کسی کی بُرائی یا غیبت نہین ہوتی، کوئی کرتا بھی تو اوڑا دیتے، خطوط مین بھی یہی احتیاط تھی، اگر ناگزیر طور سے کچھ ذکر آتا، تو اس طرح اشارہ کنایہ مین کہتے کہ غیر اوس کے سمجھنے سے قاصر رہتے،

مرحوم کو اچھی اور تاریخی یادگارون کا شوق تھا، بعض بادشاہون کے فرامین، تلوارین یا خنجر اُن کے پاس تھے، مین جب ۱۹۳۲ء مین کابل کے سفر سے واپس آیا، اوس کے بعد مرحوم دارالمصنفین آئے تو قالینون کا تذکرہ نکلا، مین نے عرض کیا کہ نادر شاہ شاہ کابل نے مجھے ایک قالین عنایت کیا ہے، اُن کو دکھایا تو اُس کو پسند کیا، مُلّا صاحب سے جو اُن کے رفیق خاص تھے، اور ہمیشہ سفر مین ساتھ رہتے تھے، فرمایا مُلّا جی یہ تو پٹھانون کا مال ہے ساتھ باندھ لو، چنانچہ وہ قالین اُن کے نذر کر دیا کہ شاہان بشاہان می دہند، فقیرون کے یہان اس کا کیا کام، البتہ شاہ کی دی ہوئی تسبیح سبز شاہ مقصود کی فقیر کے پاس ہے،

مرحوم بزرگون کے قصے لطیفے، حالات اور حکایتین اس قدر ذوق و شوق و لطف سے مجلس مین بیان فرمایا کرتے تھے کہ اوس وقت وہ بلبل ہزار داستان معلوم ہوتے تھے، اُن کی تقریرون کا بھی یہی رنگ تھا، آواز گو پست تھی، مگر تقریر مسلسل اور تاریخی واقعات کے حوالون سے پر تاثیر ہوتی تھی، اُن کی انشا پردازی کا بھی ایک خاص رنگ تھا، نہایت ستھرا اور پاکیزہ، تکلف سے بری، تصنع سے خالی، اور آورد سے پاک بزرگون

کے تذکرے ادب سے کرتے تھے، زبان فطرۃً نہایت ادب شناس عنایت ہوتی تھی، لہجہ مین سختی اور آواز مین کرختگی مطلق نہ تھی، گرم سے گرم موقعون پر بھی وہ حدود سے باہر قدم نہین رکھتے تھے،

بظاہر وہ اخلاق مین بڑے نرم و ملنسار تھے، مگر جب کسی وقت کسی چیز پر اڑ جاتے، تو پھر اُس سے نہ ٹلتے تھے، چنانچہ حیدرآباد سے علیحدگی کا سبب یہی پیش آیا، اس پر ایک شعرا نھون نے کہا جو مجھے لکھ بھیجا تھا،

شاہباز ہمتم، ربطے بدست شاہ داشت
دست دیگر ترک کرد و در ہوا پرواز کرد

یہ بھی اُن کی سیرت کا قابلِ ذکر واقعہ ہے کہ باوجود ایک رئیس ابن رئیس ہونے کے اور حکام ضلع سے اچھے تعلقات رکھنے کے سرکاری اعزاز و احترام اور خطاب و القاب سے بچتے تھے، ایک دفعہ اُن کو شمس العلما کا خطاب ملنے والا تھا، اُن کو خبر ہوئی تو پوری کوشش کی کہ اس خطابت اُن کو بری رکھا جائے، فرماتے تھے کہ حیدرآباد کا خطاب اس لئے قبول کیا کہ یہ ایک دولت اسلامیہ کی نشانی تھی،

مرحوم کو ملت اسلامیہ سے جو محبت تھی، اُس کے اچھے واقعات اور مسرت بخش تذکرون سے خوش ہوتے تھے، اور اس کے نفاق و اختلاف کی باتون سے ہمیشہ کنارہ کش رہتے تھے، وہ کے باہمی اختلاف کے ایام مین باوجود اس کے کہ طرفین دوست تھے، دونون سے بیگانہ رہے، اور جب مولانا شبلی کی وفات کے بعد مصالحت کا زمانہ آیا تو وہ سب سے آگے تھے،

مرحوم گو سیاست سے سروکار نہین رکھتے تھے، تاہم ملک کے پچھلے واقعات سے بہت غمگین تھے، عمر کے ساتھ کچھ ملکی اور کچھ خانگی اذکار نے بھی اُن کے دل و دماغ کو متاثر کیا، مگر ضابطہ اور تحمل ایسے تھے کہ کبھی اس داستان کا ایک حرف زبان پر نہین آیا، اور کبھی قوی مین سب سے پہلے اُن کے حافظہ نے جواب دیا، اکثر بات بھول جاتے، جب کاروانِ خیال نکلا تو اس مین مولانا ابوالکلام کے جواب مین اُن کا یہ بیان پڑھکر مجھے بڑی حیرت ہوئی، کہ ہان مجھے یاد ہے کہ دو نوجوان غلام محی الدین اور ابوالکلام سفر عراق کو نکلے تھے

تفصیلات اب معلوم ہوئین، مین نے انھین لکھا کہ یہ صحیح ہے کہ سفر عراق پر (شاید ۱۹۰۷ء مین) دو نوجوان عراق کے سفر کو نکلے تھے جن مین سے ایک غلام محی الدین (مولانا ابوالکلام کے بڑے بھائی) تھے، مگر دوسرے ابوالکلام نہیں بلکہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری تھے، اور اوس وقت مولانا ابوالکلام امرتسر مین وکیل کے ایڈیٹر تھے، بیچارے غلام محی الدین مرحوم نے عراق مین انتقال کیا، ہندوستان خبر آئی، تو مولانا ابوالکلام نے وکیل مین اپنے حزن وغم کا اظہار فرمایا، اخیر مین مینے لکھا کہ آپ کی اس طرح تصدیق کر دینے سے افسانہ بھی تاریخ بن جائیگی،

اس پر مرحوم نے خاموشی اختیار کی، اور کچھ جواب نہین دیا، یہ اُن کی خاص عادت تھی کہ جس بات پر گفتگو کرنا نہین چاہتے، اس کے جواب سے اعراض کرتے، اسی سے اُن کے ادا شناس اُن کے مطلب کو سمجھ جاتے،

مرحوم کو بزرگون کی یادگارون سے والہانہ شیفتگی تھی، پٹنہ کے اجلاس ندوہ مین غالباً حاجی شاہ منور علی دربھنگوی بانی مدرسہ امدادیہ دربھنگہ جو حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی کے خلیفہ تھے، ندوہ کے جلسہ مین دستار سر پر باندھ کر آئے جو حضرت حاجی صاحب کا عطیہ اور تبرک تھا، ایک تعلیم یافتہ کی تقریر پر جلسہ مین ایک ایسا پرعظمت جوش علماء مشائخ صلحاء اور عامۂ مسلمین پر طاری ہوا کہ جو جس کے پاس تھا، وہ ندوہ کے نذر کر دیا، شاہ منور علی صاحب نے وہی دستار اُتار کر پھینک دی، وہ دستار نیلام ہو کر بڑی قیمت کو فروخت ہوئی، وہ کون خوش قسمت تھا جس نے آگے بڑھ کر اُس کی حسب حیثیت قیمت ادا کی، اور اس کو اٹھا کر آنکھون سے لگایا، نوجوان حبیب الرحمٰن خان شروانی! پھر اس کو وہ ہمیشہ اپنے لئے طرۂ سعادت سمجھتے رہے،

اُن کے اخیر دور کی یادگارون مین استاذ العلماء مولانا لطف اللہ صاحب کی سوانح عمری، اور خطیب بغدادی پر حنفی نقطۂ نظر سے تبصرہ ہے، جو معارف مین چھپے ہین، اور الگ بھی شائع ہوئے انھون نے

مولانا سلیمان اشرف صاحب کی کتاب المبین پر ایک تبصرہ لکھا اور میرے پاس بھیجا، اسی زمانہ مین فقیر کی تصنیف عرب وہند کے تعلقات چھپی تھی، جی چاہا کہ مرحوم کے قلم سے اس پر ایک تبصرہ شائع ہوتا، تو مصنف کو فخر و مباہات کا ایک موقع ہاتھ آتا، اس موقع پر اپنے مطلب کو مین نے اس طرح ادا کیا، المبین پر تبصرہ ملا، یاد آیا کہ حضرۃ الاستاذ کی تصنیفات پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ ہوا کرتا، چنانچہ المامون، الغزالی، سوانح مولانا روم اور شعر العجم وغیرہ پر تبصرے پڑھے، کیا حضرۃ الاستاذ کی متروکہ موروثی سعادتون مین سے راقم کو بھی اس سنت دیرینہ کی موروثی سعادت کے حصول کا موقع ملے گا، مرحوم نے بڑی خوشی سے تبصرہ لکھا جو معارف مین شائع ہوا،

مرحوم کی پابندی وضع کی ایک خاص یادگار علی گڈھ مین مولانا سلیمان اشرف صاحب کی قیامگاہ مین اخیر وقت کی حاضری تھی، جو بعد مغرب تک جاری رہتی، جب وہ علی گڈھ آتے، یہ حاضری بلاناغہ ہر موسم مین اور ہمیشہ رہی، اس وقت دلچسپی کی، ان علمی مسائل پر گفتگو رہتی، مولانا سلیمان اشرف صاحب کی وفات کے بعد مولانا مفتی عبداللطیف کی قیامگاہ پر اسی وقت اور اسی حیثیت سے مجلس جاری رہی،

مرحوم اپنے دور کے خاتم تھے، اب اس جوہر شرافت کا نمونہ کبھی دیکھنے مین نہ آئے گا، اب گلستان کا رنگ اور ہے، چار دانگ مین ہوائین اور سمت کی چل رہی ہین، اب ریاست اور ریاست کے ساتھ کمالات و فضائل کا یہ اجتماع گذشتہ تاریخ کا ورق بن کر رہ جائے گا، مگر انشاء اللہ یہ ورق یادگار رہیگا،

ع ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

سیرۃ عائشہ

اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے حالاتِ زندگی اور اُن کے مناقب و فضائل و اخلاق اور اُن کے علمی کارنامے اور اُن کے اجتہادات اور صنفِ نسوانی پر اُن کے احسانات، اسلام کے متعلق اُن کی نکتہ سنجیان اور معترضین کے جوابات، قیمت :- صر

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی علیہ الرحمۃ والغفران

از مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی

اپنی طالب العلمی کے ابتدائی دنون مین اس مبارک و مسعود نام کو پہلی دفعہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے آرگن اور مجلۂ شہریہ الندوہ کے سرورق پر دیکھنے کا شرف حاصل ہوا تھا، مولانا شبلی نعمانی کے اسم گرامی کے محاذی یہی نام بالالتزام لکھا جاتا تھا، واقعیت اس سے زیادہ نہ تھی کہ الندوہ کی ترتیب و ادارت مین مولانا شبلی کے معاون کوئی صاحب ہین، راجپوتانہ کی دور افتادہ ایک سنگستانی آبادی ٹونک مین قدیم علوم کے ایک طالب العلم کے لئے اس سے زیادہ جاننے کی کوئی صورت بھی نہ تھی، اگرچہ بہت کم لیکن یاد آتا ہے کہ کبھی کبھی کوئی مضمون بھی مولانا شبلی کے اس ہمدوش و ہم قدم مدیر کے قلم سے اس رسالہ مین نکل جاتا تھا،

مگر کیا معلوم تھا کہ اتنی دور سے جو دکھایا جا رہا ہے، اسی کے ساتھ قرب و نزدیکی کا ایسا مقام زندگی مین میسر آئے گا، جسے اب بھی جب سوچتا ہون تو "ظلِ پدر" یا "پدری شفقت" کے سوا تشبیہ کے لئے کوئی دوسری چیز سمجھ مین نہین آتی، آہ! ؎

ع قفا نبک من ذکری حبیب ومنزل

مقادیر کی گردشون نے ٹونک سے دیوبند اور دیوبند سے حیدرآباد پہنچایا، ٹھیک ان ہی دنون مین پہنچایا جب مرحوم ہی کے محاورے مین ان ہی کی کمان سب سے زیادہ چڑھی ہوئی تھی، نواب فضیلت جنگ مرحوم نواب اللہ خان استاذ السلطان رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کی وجہ سے حکومتِ آصفیہ کی جدّہ

قائم کردہ وزارت (معین المہامی) مذہبی کی جگہ خالی ہوگئی، ملک کے طول وعرض پر نظریں دوڑائی گئیں اور طے کیا گیا کہ اس عہدے کے شایانِ شان بہ صفت موصوف ہی کی ذات والا صفات ہے جو ہلکیم پور ضلع علی گڈھ کی ریاست کے ایک طرف رئیس بھی تھے، اور سیدنا الاستاذ العلام مولانا لطف اللہ علی گڈھی سابق مفتی عدالت عالیہ حیدرآباد دکن کے ممتاز تلامذہ میں بھی شمار ہوتے تھے، قلم بھی اُن کے ہاتھ میں تھا اور زبان بھی گل افشانیوں، دُرباریوں میں اپنی آپ نظیر تھی، پیکر شاہانہ، دل فقیرانہ،

الغرض حکومتِ آصفیہ کے ذریر مذہبی کے لئے جن خصوصیتوں کی ضرورت تھی ایسا پایا گیا کہ

ع جامہ بود کہ بر قامتِ او دوختہ بود

اباً عن جدٍ پشتہا پشت سے جسکے یہاں نوکر رکھنے کا دستور چلا آرہا تھا، اسی کو شاہ دکن نے اپنی نوکری کی دعوت دی، مرحوم اس شاہانہ دعوت کے تاثرات کا ذکر خود فرمایا کرتے تھے "تلنگانی پیام حیدرآباد سے اُن کے نام وصول ہوا، فرماتے تھے کہ بجز اس بات کے کہ کسی قسم کی دینی خدمت چاہی جاتی ہے کہ مجھ سے لی جائے، اور اس جگہ کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا، یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ اس عہدہ کا سرکاری نام کیا ہے تاہم غالباً ناظم امور مذہبی" کا لفظ کسی طرح داخل کر دیا گیا تھا، ناظم کا حیدرآباد کی سرکاری زبان میں کیا ترجمہ ہے، کس قسم کی ذمہ داریاں اُس کے سپرد ہوتی ہیں، اور اختیارات جو ملتے ہیں، ان کی نوعیت کیا ہوتی ہے، سب سے ناواقف تھے، تار ملا، بیان فرماتے تھے کہ سینہ پر تار رکھا ہوا تھا، خوابگاہ کے پلنگ پر لوٹ رہا تھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے "نوکری" کا تو کبھی خطرہ بھی قلب پر نہ گذرا تھا، خاندانی روایات اس کے قطعاً منافی ہیں، ضرورت بھی بحمداللہ نہ تھی، پھر خواہ مخواہ کی ذمہ داریوں کو اپنے سر کیوں لوں؟ ہجوم خیالات کا ایک سلسلہ تھا کہ آتا تھا اور جاتا تھا، دوسری طرف خیال گذرتا تھا کہ سرزمین ہند کی سب سے بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا کا حکم ہے، ان کے حکم سے سرتابی بلا وجہ کیوں کی جائے، اچانک فرماتے تھے کہ اپنے خیال کی آنکھوں کے سامنے پانے لگا کہ حشر کا میدان قائم ہے لوگ بلائے جا رہے ہیں

میری باری بھی آئی ہے، پوچھا جاتا ہے کہ

"میرے دین کی خدمت کا ایک موقع تیرے سامنے آیا تھا، کیا جواب ہے کہ اس موقع سے تو نے اعراض کیا، صرف اپنی تن آسانی کے لئے اعراض کیا"

اسی کے بعد جو مقدر تھا وہ فیصلہ بن کر سینے میں جلوہ گر ہوا، لبیک کے ساتھ تار کا جواب تار ہی سے غالباً دیا گیا، اور جب وعدہ حیدرآباد پہنچ گئے، لفظاً "ناظم" کی وجہ سے شروع میں مغالطہ کی کچھ صورت بھی پیش آئی، مگر بارگاہ خسروی سے جب تصریح ہوگئی، کہ "صدر الصدور ممالک محروسہ سرکار عالی" اس منصب کا سرکاری نام ہوگا جس کی دعوت دی گئی تھی، تو مغالطے کا جو بادل پھیلایا گیا تھا، پھٹ کر صاف ہوگیا، "ناظم امور مذہبی" کا عہدہ اُن کے تحت کر دیا گیا، جب تک صدر الصدوری کے منصب جلیل پر وہ سرفراز رہے، نواب اختر یار جنگ مولوی لطیف احمد مینائی مرحوم فرزند امیر مینائی مرحوم اُن کے محکمہ کے ناظم اور بعد کو معتمد بھی ہوگئے،

نواب موید الملک سر علی امام مرحوم نے جب "باب حکومت" کے نام سے کابینہ کی تنظیم کی، تو باب حکومت کے صدر کا نام صدر اعظم اور ارکین کابینہ صدر المہام کے نام سے موسوم ہوئے، صدر الصدور کی حیثیت اس کے بعد کیا ہوئی، اسے کیا بتایا جائے اسی سے قصہ شروع ہوا اور اسی پر ختم بھی ہوگیا[1]

---

[1] قیام باب حکومت کے بعد زیادہ منتظم شکل میں اور اس سے پہلے بھی حکومت آصفیہ کے ہر محکمہ کا ایک ناظم (ڈائرکٹر) اور ناظم کے اوپر معتمد (سکریٹری) ہوتا تھا جو کسی معتمدی کسی وزیر کے تحت کام کرتی تھی، جب تک باب حکومت قائم نہ ہوا تھا، وزیر اعظم کا نام مدار المہام اور اس کے رفقائے کار وزرا کو معین المہام کہتے تھے، باب حکومت جب قائم ہوا، تو کابینہ کے ہر رکن کا نام صدر المہام رکھا گیا، سوال پیدا ہوا کہ محکمہ امور مذہبی میں صدر الصدور کی حیثیت کیا ہوگی، سر علی امام مرحوم نے ذاتی طور پر باور کرایا تھا، کہ صدر الصدور کی حیثیت شیخ الاسلام کی رہے گی، جس کا رتبہ صدر اعظم اور وزرائے کابینہ سے بھی بلند تر ہے، اسی لئے شروانی صاحب کو باب حکومت کا رکن نہیں بنایا گیا، اور محکمۂ مذہبی کی نمایندگی کے لئے باب حکومت کے کسی وزیر کے دوسرے صیغوں کے ساتھ

خیر مین کن باتون مین مشغول ہوگیا، عرض یہ کر رہا تھا کہ تقدیر نے حیدرآباد جب پہنچایا، تو اس وقت حیدرآباد کی دینی وعلمی سرگرمیون کا مرکز وحید شروانی صاحب کی ذات والاصفات بنی ہوئی تھی، طالب العلمی کا زمانہ تو ختم ہوچکا تھا لیکن طالب العلمی کے بعد والی زندگی صحیح معنون مین چونکہ شروع نہین ہوئی تھی، اس لئے سن وسال وضع وقطع ہر لحاظ سے عربی مدرسہ کے ایک طالب العلم سے زیادہ میری کوئی حیثیت نہ تھی، تھوڑی دیر کے لئے صرف ایک سرسری ملاقات کا موقع ملا تھا لیکن دراصل نیازمندی کے صحیح تعلقات اس وقت سے شروع ہوئے، جب دوسری دفعہ درِ دولت پر فقیر حاضر ہوا تھا، ایک انگریز کی کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی، اسی مین مقیم تھے، وہ اندر ملاقات کے سجے ہوئے کمرے مین تشریف فرما تھے، سامنے چلمن پڑی ہوئی تھی، باہر برآمدے مین کرسیون پر میری طرح اور بھی مختلف طبقات کے لوگ ملنے کے لئے بیٹھے ہوئے تھے، ان مین اونچے نیچے سرکاری غیر سرکاری ہر طرح ہی کے لوگ تھے، ایک کرسی پر فقیر بھی اسی جھیلے مین بیٹھ گیا، صرف ہلکی سی سرسری ملاقات جس مین صورت کی شناخت بھی دوسرون کے لئے دشوار ہوتی ہے، مگر سنئے اُن کی نظر چلمن کی تیلیون سے برآمدے پر جو بیٹھے ہوئے تھے، ان پر پڑتی ہے، اور ایک بھاری بھرکم آواز میرے کانون مین اندر سے آتی ہے:-

"مولوی صاحب! آپ کی جگہ وہ نہین ہے، آپ بے تکلف اندر چلے آیا کیجئے"!

پہلے تو مجھے حیرت ہوئی کہ خطاب کس سے ہے لیکن خیال آتا ہے کہ پھر شاید نام مے کر اس حیرت کا ازالہ فرمادیا گیا، اور آپ کا خاص خادم محبوب مرحوم باہر آیا، بولا کہ نواب صاحب آپ کو اندر بلا رہے ہین، حاضر ہوگیا پاس

(بقیہ حاشیہ ص ۴۰۷) اس صیغہ کی نمایندگی بھی ضم کر دی گئی، ابتدا مین اس عجیب وغریب پیچیدہ صورت حال کا اثر واقعات پر نہ پڑا، لیکن شروانی صاحب کی حیدرآباد سے واپسی سچ پوچھئے تو اسی ابتدائی مغالطہ کا نتیجہ تھی جس کی تفصیل اب غیر ضروری ہے، "تلک امة قد خلت لها ما کسبت و لکم ما کسبتم ولا تسئلون عما کانوا یعملون" (۱۲)

بٹھایا اور مزاج پرسی کے بعد پھر اسی پدرانہ شفقت و عطوفت کے ساتھ فرمانے لگے کہ

"آپ کے لئے اجازت وغیرہ کے تقصون کی ضرورت نہین، جب آنا ہو، بے تکلف چلن اٹھا کر اندر چلے آیا کیجئے"

غیر معمولی مہربانی سے تعلق کی ابتدا ہوئی، اسی عرصہ مین حضرۃ الاستاذ مولانا حمید الدین فراہی رحمۃ اللہ علیہ کی ہمرکابی مین خاکسار اورنگ آباد اور خلد آباد کی سیر کے لئے روانہ ہوا، شروانی صاحب بھی شاہی فرمان کی بنیاد پر ضلع اورانگ آباد کے کسی بڑے جاگیردار کے مقدمہ کے تصفیہ کے لئے اورنگ آباد ہی مین قیام فرما تھے، خلد آباد بھی سیر کے لئے گئے ہوئے تھے، خلد آباد کی مقدس پہاڑی پر سب کا اجتماع تھا، اسی اجتماع مین استاذ مرحوم نے شروانی صاحب کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ مین وطن (اعظم گڈھ) جا رہا ہون خاکسار کا نام لیکر فرمایا کہ انکو بطور امانت آپکے سپرد کرتا ہون، مسکراتے ہوئے شروانی صاحب نے فرمایا کہ آپکی یہ امانت میرے پاس محفوظ رہیگی، حضرۃ الاستاذ وہین سے اعظم گڈھ کے ارادے سے روانہ ہوگئے اور رفاقت کی سعادت پہلی دفعہ نواب صاحب مرحوم کے ساتھ میسر آئی، پہاڑی سے اتر کر اورنگ آباد سب واپس ہوئے، اب خاکسار شروانی صاحب کے ساتھ اورنگ آباد کے دارالامارہ مین مقیم تھا حکم دیا گیا، کہ شہر مین گھوم گھوم کر قلمی کتابون کا پتہ چلاؤن، یہ بڑا دلچسپ مشغلہ تھا، نواب صاحب کے منشا کو پا کر اپنے اپنے کتب خانے کی سیر کی اجازت ہر ایک نے دی، اس سفر مین بعض نادر مخطوطات کا سرمایہ اکٹھا ہوا، دس پندرہ دن بعد نواب صاحب کی معیت مین حیدرآباد واپسی ہوئی، اورنگ آباد ہی مین فقیر بھی اُن سے مانوس ہو گیا، اور اُن کے لطف و کرم کی موسلا دھار بارشون کا سلسلہ اس کے بعد جو شروع ہوا، وہ زندگی کے آخری دنون تک برستا ہی رہا، امانت کا پورا حق ادا کرنے والے نے ادا کر دیا، فرحمہ اللہ و نور ضریحہ،

کم و بیش تقریباً بارہ سال کی طویل مدت اُن کے زیر سایہ حیدرآباد کی زندگی گذری، اس عرصہ مین سرکاری غیر سرکاری شعبون مین اُن کے کارنامون کی فہرست اتنی طویل ہے جس کی پوری تفصیل کے لئے ضخیم جلد بھی غالباً کافی نہ ہو، یہان سرسری طور پر بعض نمایان خدمات کا جو یاد آتے جاتے ہین تذکرہ کرنا چاہتا ہون

جس وقت نواب صاحب علیہ الرحمۃ والغفران حیدرآباد تشریف لائے تھے، میلادی مجلسون کا حیدرآباد مین جو رواج تھا، ان مین عموماً یہی دیکھا جاتا تھا کہ حضرمی عرب جن کے ساتھ کچھ مقامی پیشہ ور میلاد خوان لوگ بھی شریک تھے، اپنی مختلف پارٹیان بنائے ہوئے تھے، میلاد پڑھانے والے ان ہی میلادی ٹولیون مین سے کسی ٹولی کو دعوت دیدیتے، ٹولی میلاد پڑھنے والون کی اس کے گھر پر کچھ رات گذرے پہونچ جاتی، اور چیخ چیخ کر تین تین چار چار آدمی زیادہ تر اردو جس کے ساتھ فارسی اور عربی اشعار بھی ہوتے، ایک خاص لہجہ مین پڑھتے رہتے تاآنکہ صبح ہوجاتی، گھر کے لوگ اطمینان کے ساتھ سو رہتے، اور میلاد خوانون کی یہ ٹولی جاگ کر رات بسر کرتی، صبح کو معینہ فیس لے کر چلی جاتی تھی، شروع شروع مین حیدرآباد کے مسلمانون کے گھرون سے میلاد خوانی کی یہ آواز جب میرے کانون تک پہونچی تو مدت تک سمجھتا رہا کہ کہین بھجن گایا جارہا ہے، کچھ ایسے لب ولہجہ مین لوگ اردو اشعار کو بھی پڑھتے تھے، کہ الفاظ سمجھ مین نہین آتے تھے کہنے والے پیشہ ور میلاد خوانون کی ان ٹولیون کے متعلق طرح طرح کی باتین منسوب کرتے ہین، واللہ اعلم بالصواب لیکن سنی سنائی باتون سے قطع نظر کرلینے کے بعد وہان کی میلاد خوانی کی عام حالت وہی تھی جو بیان کی گئی

لیکن نواب صاحب مرحوم نے میلادی مجلسون کا ایک نیا نظام قائم کیا، قائم کیا کیا، اندرونی طور پر دلون مین تقاضا تو اصلاح کا پہلے ہی سے تھا، لیکن اصلاحی اقدامات مین عملی شرکت کے لئے کوئی آمادہ نہین ہوتا تھا، نواب صاحب نے اس کا خیال کئے بغیر کہ ان کے منصب جلیل کا اقتضا کیا ہے ہر اس شخص کے گھر پہنچنے پر راضی ہوگئے جو اُن سے میلاد پڑھوانا چاہتا ہو، سیرت طیبہ کے متعلق اُن کا مطالعہ کافی وسیع اور عمیق تھا، بیان وخطاب کا طریقہ بھی حد سے زیادہ متین وسنجیدہ، معلومات اُن کے کھرے ہوئے تحقیقی ہوتے تھے جس نے بھی بلایا اپنی موٹر پر اس کے گھر پہنچ گئے، اور گھنٹہ دو گھنٹے "سیرت طیبہ" کے مختلف پہلوؤن پر مسلسل پرمغز، موثر تقریر فرماتے، رفتہ رفتہ لوگون کا مذاق بدلنے لگا، اور بجاے انفرادی مجلسون کے اجتماعی مجلسون کے انعقاد کا ذوق پھیلنے لگا، اس کے بعد کیا ہوا، یہ آٹھ دس سال حیدرآباد کے واقعہ ہے کہ بھلا

نہین جاسکتے،

جلسہ مین شریک ہونے والون کی تعداد ہزار ہا ہزار تک پہونچ جاتی تھی، مبالغہ نہ ہوگا اگر میلاد کی بعض اجتماعی مجلسون کے سامعین کی تعداد کا تخمینہ پچاس ساٹھ ہزار تک کرون، سکندرآباد کی میلاد کی مجلس نے اس سلسلہ مین پہلا نمونہ قائم کیا، پھر توحیدآباد کے مشہور محلون اور بستیون مین شاید ہی کوئی محلہ اور کوئی بستی ایسی باقی رہ گئی، جس مین سکندرآبادی مجلس کے معیار تک جلسہ کے نظم و انتظام فرش و فروش، جھاڑ فانوس وغیرہ کو نہ پہنچا دیا گیا ہو، نہ نواب صاحب اس عرصہ مین بیان کرنے سے کبھی تھکے اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اُن کی تقریرون کے سننے والون مین مجھے کبھی جانے کی کیفیت ہی کبھی محسوس نہین ہوئی، وہ کہتے جاتے تھے، اور لوگ سنتے جاتے تھے، حالانکہ اُن کی تقریرین موضوع جعلی حدیثون، چھوٹے تراشیدہ افسانون، بلکہ شعر و نغمہ کی دلچسپیون سے قطعی طور پر پاک ہوتی تھین، بیان کا طرز بھی سادہ سیدھا، رواں ہوتا تھا، مگر قرآنی آیتون سے نکالے ہوئے صحیح نتائج معتبر حدیثون اور سیرت کے تاریخی مستند واقعات ہی مین اتنی غیر معمولی دل آویزی پیدا ہو جاتی تھی، کہ شکل ہی سے حیدرآباد کی پبلک دوسرون کی تقریر یا وعظ سننے کے لئے آمادہ ہوتی تھی، رئیس آدمی تھے، راحت و آرام کی زندگی کے قدرتاً عادی تھے لیکن میلادی مجلسون کے لئے نہ وقت کا سوال اُن کے لئے باقی رہتا تھا، اور نہ موقع اور محل کا، رات کے بجے بارہ بجے تک کبھی وہ بیٹھے ہوتی لیکن مین نے کبھی اُن کی زبان پر کسی قسم کی گرانی کی شکایت نہین پائی،[1]

---

[1] خاکسار بھی ان میلادی مجالس مین اپنی بساط کے مطابق تھوڑا بہت حصہ تقریباً لیا کرتا تھا، ایک دفعہ کثرت مجالس سے جو تقریری بار پڑتا تھا، اس کا ذکر ذرا گرانی کے ساتھ کرنے لگا، فرمانے لگے، مولوی صاحب کس کی مجلس ہے، آپ کے ٹخنون سے تو خون جاری نہین ہوا، اور آپکے دانت نہین توڑے گئے، ابھی سے گھبرا اٹھے شرم سے گردن جھک گئی،

غلط عقائد بے بنیاد اوہام، جاہلی رسوم و رواج، ہر ایک چیز کی اصلاح بھی اُن کی عالمانہ تقریرون سے ہوتی چلی جاتی تھی، لیکن مجھے یاد نہین ہو کہ کسی کو کسی زمانہ مین اُن کی تقریر کے کسی فقرے سے کبھی شکایت پیدا ہوئی ہو، اور فتنہ و فساد کا برپا ہونا تو دور کی بات تھی، وہ سب کچھ کہتے تھے، سب کچھ سناتے تھے جو کچھ کہتے اور جو کچھ سناتے تھے، صحیح ہوتا تھا، لیکن تلخی اُن کے بیان سے کبھی پیدا نہین ہوئی، فہمایش کا طریقہ قطعاً غیر معمولی تھا جس کی نظیر اپنے تجربہ مین تو نہین ملی، دیوبندیت، بریلویت، ندویت، نیچریت وہابیت وغیرہ وغیرہ عصری اختلافات کے سلسلہ مین حالانکہ ہر مسئلہ کے متعلق فیصلہ کن رائے رکھتے تھے، اور اپنے فیصلون پر اُن کو کافی اصرار تھا، تقریرون مین وہ اپنے فیصلون کے حدود سے سر مو متجاوز نہ ہوتے تھے، مگر یہ طرز بیان کی خوبی تھی کہ مخالف خیال رکھنے والون مین بھی انکی باتون سے کسی قسم کی گرانی پیدا ہوتی تھی، اور اس سے بھی عجیب تر یہ ہے کہ مسلمانون کے ان مختلف جتھون کے افراد کے قلوب مین غیر معمولی اعتماد اور بھروسہ اُن کے متعلق پایا جاتا تھا، اس راہ مین تو یہ واقعہ ہے کہ غیر اسلامی دائرون مین بھی اُن کی ہر دلعزیزی کا کافی وزن تھا، "امور مذہبی" کا شعبہ حکومت آصفیہ کا ایسا شعبہ ہے جس کے احاطے مین مسلمانون کے مساجد و مقابر اور دوسرے مآثر کے ساتھ ہندوؤن، عیسائیون، پارسیون کے مذہبی و دینی مقامات کی نگرانی بھی داخل ہے، اسی وجہ سے ہر ملت و مذہب کے نمایندے اُن کی خدمت مین حاضر ہوتے، اپنے درد و دکھ کے قصے سناتے، ہر ایک کی بات سنتے، اور حسن سلوک کا ایسا نمونہ پیش فرماتے، کہ ہر ایک آپ کا مداح ہو کر واپس ہوتا، کم از کم اس بارہ سال مین مین نے تو کسی دین و ملت کے ہیرو کو آپ سے شاکی نہ پایا، حالانکہ اپنی اسلامی و دینی زندگی مین اُن کا اصرار تصلب کے درجہ تک پہنچا ہوا تھا، مگر اُن کی زندگی کے مختلف شعبے اپنے اپنے حدود مین اس خوبی کے ساتھ محدود تھے، کہ غلط مبحث کی صورت ہی کبھی پیش نہ آتی تھی، شروانی صاحب اس باب مین غیر معمولی کردار کے حامل تھے، اُن کی زندگی کا یہ پہلو بڑی تفصیل کا طالب ہے، اسی کا نتیجہ تھا کہ ایک طرف سیدنا مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس اللہ

اور اُن کے خلفاء و جانشینوں کے ساتھ ایسے تعلقات قائم تھے کہ گویا ان ہی صاحبدل درویشوں مین ایک بڑے درویش وہ بھی ہین، دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی و مولانا ابوالکلام آزاد جیسے آزاد خیال بزرگون سے اُن کی راہ و رسم لوگون کے لئے باعث حیرت کبھی بن جاتی ہے مگر ان مختلف الجہات بلکہ متضاد تعلقات کے نباہنے احسن و خوبی کے ساتھ نباہنے کا غیر معمولی سلیقہ قدرت کی طرف سے اُن کو عطا ہوا تھا، ہر ایک مین فضل و کمال کا جو حصہ پایا جاتا تھا، حد سے زیادہ فراخ چشمی کے ساتھ اس کا اعتراف اُن کی عجیب و غریب خصوصیت تھی، ایک ہی مجلس مین اُن سے آپ مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا حبیب الرحمن مرحوم مہتمم دیوبند کی تعریف بھی سن سکتے تھے، اور اُسی کے ساتھ مولوی احمد رضا خان بریلوی مین جو علمی اور عملی خوبیان ان کے علم مین پائی جاتی تھین، اُن کا بھی ذکر فرماتے، ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی امہات الامۃ کی مجلس تحریق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ایک رکن وہ بھی تھے، اور اس آتشین مجلس کی بھپتی اڑانے والے مولوی عبدالحق صاحب بابائے اردو سے بھی اُن کی دوستی تھی،

حیدرآباد جس زمانہ مین یہ فقیر پہونچایا گیا تھا عثمانیہ یونیورسٹی اس وقت تک قائم نہین ہوئی تھی، چرچا البتہ اس کے قیام کا پھیلا ہوا تھا، سب سے بڑی رکاوٹ جیسا کہ خاکسار نے سُنا ہے نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ خان مرحوم کی طرف سے پیش آرہی تھی، کہتے ہین کہ "جامعہ" کا جو نقشہ پیش کیا گیا تھا، اسکو دیکھ کر مولانا مرحوم نے فرمایا تھا کہ ملک کی آمدنی مین اس یونیورسٹی کے تعلیم یافتون سے کوئی مدد نہین ملے گی بلکہ مصارف بڑھا دیئے جائین گے، اور الحاد و بے دینی کے جراثیم جن سے حیدرآباد ایک حد تک محفوظ ہے عوام مین پھیل جائین گے، حضرت آصف جاہ سابع پر مولانا انوار اللہ خان مرحوم کا غیر معمولی اثر تھا، نتیجہ یہ ہوا مولوی صاحب کی مخالفت راہ کا روڑا یونیورسٹی کے حق مین بن گئی تھی، نیچے سے اوپر اتنی طاقت کسی مین نہ تھی جو اس روڑے کو ہٹائے، اُن کی وفات کے بعد سب شروانی صاحب اُن کی جگہ مامور ہوئے تو اعلیٰ حضرت نے فرمان صادر کیا کہ یونیورسٹی کے متعلق جتنے کاغذات بھی ہون وہ صدالصدور کے توسط اور معائنہ

کے بعد پیش ہوں،

شروانی صاحب نے اس سلسلہ میں بلیغ کوشش کی، اور مولانا انوار اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی رائے کا اثر سرکار والا تبار کے قلب پر جو تھا، اس کے ازالہ میں کامیاب ہوئے، یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا؛ اور پہلے وائس چانسلر اس یونیورسٹی کے شروانی صاحب فرمانِ مبارک کی رو سے مقرر ہوئے،

ابتدا میں تو ان لوگوں کو جو جدید یونیورسٹی کا خواب دیکھ رہے تھے، بڑی خوشی ہوئی، وہ کلیتہً مشرق میں مغرب کا کھیل کھیلنا چاہتے تھے، سمجھتے تھے کہ شروانی صاحب روشن خیال آدمی ہیں، اس کھیل کی صرف اجازت ہی نہ دیں گے، بلکہ ایکٹ میں حصہ بھی لیں گے، لیکن اُنے بسا آرزو کہ خاک شدہ،

چارٹر تو منظور ہو گیا، چارٹر ہی میں شروانی صاحب نے یہ بھی منظور کرالیا کہ مغربی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ مشرقی روایات اور اسلامی اخلاق و جذبات کی نشو و نما کا کام بھی اس جامعہ سے لیا جائے گا، سمجھا گیا تھا کہ یہ رسمی الفاظ ہیں عمل کے وقت ان الفاظ کو بے اثر کر کے رکھ دیا جائے گا،

یونیورسٹی کے اوقات مختلف شعبے اور ہر شعبہ کا درجہ واری نصاب جب بننے لگا تو لوگوں کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب شروانی صاحب نے علاوہ شعبۂ دینیات کے (جو مرحوم دار العلوم کالج) کا جانشین، اور اسلامی علوم و فنون کی تعلیم کا مستقل ادارہ تھا، اس کے سوا بھی اُن کی طرف سے یہ مطالبہ پیش ہوا کہ ہر مسلمان طالب علم کو ابتدائی تعلیم سے بی اے تک ایک مستقل مضمون "دینیات" کا بھی لزوماً لینا پڑے گا، ان کو مغالطہ دیا جاتا تھا کہ "مضمون" کی حیثیت سے نصاب میں دینیات کا نام بھی لکھ دیا جائے گا، مطالبہ کے لئے کچھ کتابوں کی سفارش بھی کر دی جائے گی، لیکن یونیورسٹی کے کلاسوں میں اس کی تعلیم نہیں دی جا سکتی، خدا خدا کر کے تعلیم دلانے پر لوگ جب راضی ہوئے تو کہا گیا کہ اس مضمون میں طلبہ کا امتحان نہ ہوگا، مگر شروانی صاحب ڈٹے رہے کہ تعلیم بھی ہوگی اور امتحان بھی ہوگا، وقت ہی ایسا تھا کہ آخر سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑا، لیکن ظاہر ہے کہ ایک "جبری عنصر" جو پہلی دفعہ ایک جدید طرز کی یونیورسٹی کے نصاب میں باہر سے زور دار داخل کرا دیا

گیا تھا، اسی نئے دباؤ کے ہٹنے کے ساتھ ہی وہ باہر نکل پڑا جو نہیں جانتے ہیں وہ اس کو حکومت کے سکولر نظریہ کا کوئی جدید نتیجہ سمجھتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ قدیم نظریہ کا یہ قدیم نتیجہ تھا جس کا ظہور اب ہوا ہے،

دوسرا اہم معرکہ اسی جامعہ کے قصوں میں جو پیش آیا، وہ شعبۂ دینیات کے اساتذہ کی تنخواہ کا مسئلہ تھا، کہا جاتا تھا کہ بازار میں جن علوم کے پڑھانے والوں کی جو قیمت ہے، اس سے زیادہ قیمت یونیورسٹی بھی انکی کیوں ادا کرے، لیکن نواب مرحوم کے اصرار نے اس مسئلہ کو بھی طے کرا چھوڑا، وہ اس کو گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ جامعہ کے حدود میں داخل کر کے اسلامی علوم کی اہانت کی جائے،

اس کامل ایک جگ یا قرن میں اور اور کیا کیا قصے پیش آئے، انھیں کہاں تک بیان کروں، قدم قدم پر روڑے تھے، ٹھوکریں تھیں، مگر نہایت بے جگری اور دلیری کے ساتھ وہ آخر وقت تک زمانہ کی اس آندھی کا مقابلہ کرتے رہے، جو ہر موقع پر اُن کے قدم کا رُخ بدل دینا چاہتی تھی،

بعض دفعہ دلچسپ لطائف بھی اس سلسلہ میں پیش آتے، ایک دفعہ صاحب رزیڈنٹ بہادر کے یہاں ڈنر پر دوسرے حکام کے ساتھ مدعو ہوئے، انگریزی ڈنر میں جیسا کہ دستور ہے منجملہ دوسرے التزامون کے ضروری ہے کہ نشست دو جنسی ہو یعنی مرد کی ایک کرسی کے ساتھ دوسری کرسی جنس لطیف کے کسی فرد کی رکھی جاتی ہے، شاید نشستگاہ کی اس خصوصیت سے پہلے وہ واقف نہ تھے، ورنہ شرکت ہی سے عذر کر دیتے، مگر شریک ہو جانے کے بعد کیا کرتے، بقول امام ابو حنیفہ "ابتلیت به فصبرت" انھوں نے بھی صبر سے کام لیا، فرماتے تھے، کوئی میم صاحبہ دوسری کرسی پر اُن کے ساتھ بیٹھی تھیں، پوچھنے لگیں کہ آپ کی بیگم صاحبہ بھی کیا اس ڈنر میں شریک ہیں؟ نہیں کا جواب سُن کر میم صاحبہ نے پر لطف فقرہ یہ فرمایا کہ

"اپنی بیویوں کو آپ لوگ کیا اپنی ذات کے لئے مخصوص سمجھتے ہیں"

انگریزی زبان کا فقرہ تھا شاید اس کا ترجمہ یہی ہو سکتا ہے ہنس کر چپ ہو رہے، بعد کو بار بار اس فقرے کو دہراتے اور مسکراتے کہ میم صاحب نے عجیب بات پوچھی،

کبھی کبھی جامعہ کے بعض علمی مقالات خصوصاً اسلامیات سے جن کا تعلق ہوتا، ان کے ملاحظہ کے لئے بھی بھیج دیئے جاتے تھے

ایک دفعہ حجاج بن یوسف مشہور ظالم امت کی تداحی مین ایک مقالہ ایک خاص نقطۂ نظر کے پروفیسر صاحب کی نگرانی مین کسی طالب العلم نے پیش کیا، پروفیسر کی طلبی ہوئی، اور مذہبی نہین بلکہ علمی حیثیت سے جو مواخذے اُن کی طرف سے پیش ہوئے وہ بڑے دل چسپ تھے،

خود فرمایا کرتے تھے کہ انگریزی حلقون کے متعلق اس قسم کی خبرین مجھ تک بسا اوقات پہنچائی جاتی ہین کہ "نیرو مائنڈڈ" کا عیب اس شخص مین پایا جاتا ہے، کہتے ہین کہ اپنے بچے کھچے ایمان کی سند مین تو اسی کو سمجھتا ہون مگر ایک پہلوان کی زندگی کا اگر یہ تھا تو دوسری طرف ایک دفعہ نہین بیسیون مواقع پر تجربہ ہوا کہ قدیم خیال کے پرانے مولویون کا کسی مسئلہ پر شدید اصرار ہے، لیکن اُن کے اصرار سے قطعاً متاثر نہ ہوتے، اور اپنے نزدیک جو بات دین کی روح کے مطابق ہوتی اسی پر عمل کرتے، جامعہ عثمانیہ ہی کے شعبۂ دینیات کی انگریزی کا مسئلہ چھڑا، قصہ یہ تھا کہ گو اس شعبہ مین بھی انگریزی کا ادب کی تعلیم طلبہ کے لئے ضروری تھی، مگر آرٹس اور سائنس کے طلبہ کے مقابلہ مین معیار اُن کے نصاب کا پست تھا، نتیجہ یہ تھا کہ انگریزی پڑھنے مین شعبۂ دینیات کے طلبہ کا وقت بھی صرف ہوتا تھا، لیکن انگریزی زبان سے جیسی کہ چاہئے مناسبت بھی پیدا نہین ہوتی تھی، غیر سرکاری دفاتر مین بھی یہ کہتے ہوئے کہ انگریزی آپ لوگون کو نہین آتی اس شعبہ کے طیلسانی (گریجویٹ) واپس کر دیئے جاتے تھے، خاکسار کی طرف سے تحریک شروع ہوئی، کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی فنون سائنس کے مساوی کر دی جائے، بلکہ انگریزی، اُن کی تعلیم و امتحان تینون شعبون کی چاہئے کہ مشترک ہو، قدیم طرز کے علماء جن کی تعداد اس وقت شعبہ کے اسٹاف مین غالب تھی، اس ترمیم سے چراغ پا تھے، ناقص معیار کی انگریزی ہی سے وہ نالان تھے، مساوی معیار کی تجویز جس حد تک ان کو برہم کر سکتی تھی، ظاہر ہے مگر نواب صاحب مرحوم نے اول سے آخر تک اسی پر زور دیا کہ شعبۂ دینیات کی انگریزی دوسرے شعبون کے مساوی کر دی جائے، بالآخر اسی کو طے کرا کے رہے، اس ترمیم کے نتائج غیر معمولی نکلے جس کی تفصیل کا یہان موقع نہین ہے،

قدامت و جدت کا امتزاج اُن کے اندر کچھ عجیب و غریب طریقہ سے ہوا تھا، ایک طرف کوٹھی کے پائین باغ مین ورد و وظائف و تلاوت مین بھی مشغول پائے جاتے، اور صبح کے اوراد سے فارغ ہونے کے بعد چائے کی میز پر بالالتزام کسی انگریزی روزنامہ کے مطالعہ مین مشغولیت بھی اُن کی عام عادت تھی، مسرف تو وہ نہین تھے لیکن کریم النفس، فیاض، امیر باذل ہونے مین بھی شک نہ تھا، حیدرآباد مین اُن کو دو ہزار روپیہ ماہوار کے ساتھ الاؤنس کی بھی کافی رقم ملتی تھی لیکن جہان تک فقیر جانتا ہے گھر سے بھی حیدرآباد کے مصارف کی تکمیل کے لئے بسا اوقات منگوانے کی ضرورت پیش آجاتی تھی، اُن کا ہاتھ کھلا ہوا تھا، مشکل ہی سے کوئی ضرورت مند اُن کے آستانے سے محروم واپس ہوتا تھا، ہر سال شب دیگ کی دعوتون کا سلسلہ موسم سرما مین مہینون جاری رہتا، ہر شب مین ایک ایک ٹولی ہم مذاقون کی مدعو ہوتی، آج بھی اُن کی شب دیگی کی دعوتون کا ذکر کام و دہن مین یارون کے لچپل پیدا کر دیتا ہے،

مین اس سلسلہ مین دوسرون کا ذکر کیا کرون ملازمت کے ابتدائی سالون مین خود مجھ پر ایک سخت مرض کا حملہ ہوا، وطن ہی مین تھا، مین تو بیہوش پڑا ہوا تھا، میرے منجھلے بھائی برادرم مکارم احسن گیلانی سلمہ نے شروانی صاحب کو صرف میرے بیمار پڑ جانے اور مرض کی جو کیفیت تھی، اس سے مطلع کیا، جواب مین صرف استمزاج کا خط ہی نہین آیا، بلکہ منی آرڈر کے ذریعہ شاید ڈھائی تین سو کی رقم بھی ارسال فرمائی گئی، خط مین میرے بھائی کو انھون نے لکھا تھا کہ مولوی صاحب کے علاج مین مصارف کا خیال نہ کرنا، جتنے روپیے کی ضرورت ہو مجھ سے منگواتے رہنا، اگرچہ زیادہ منگوانے کی ضرورت بحمد اللہ نہ ہوئی، لیکن اُن کے شریفانہ برتاؤ کی یاد دل مین جب کبھی آجاتی ہے، چشم پُرآب ہو جاتا ہون، اب ایسے بے غرض حسن سلوک کرنے والے بزرگون کو دنیا کے اس پردے پر ہم کہان پائین گے،

سچ تو یہ ہے کہ علاوہ ان عام مادی منافع کے اُن کی صحبت و رفاقت مین خدا ہی جانتا ہے کہ شعوری و غیر شعوری طور پر کتنے علمی و اخلاقی جواہر پارے میرے دل و دماغ مین رچ گئے، انھون نے انسانی زندگی

کا بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا، عام ہنگامون سے آزاد ہو کر سوچنے کے عادی تھے، یاد آتا ہے کہ ایک دفعہ دینی و اسلامی علوم کے جاننے والون کی بے قدریون کا عام دکھڑا اُن کے سامنے جیسا کہ اس زمانہ مین دستور ہے رو رہا تھا، سنتے رہے، پھر فرمایا کہ مولوی صاحب! آپکے دینی و اسلامی علوم کے ماہرین کا کیا آج ہی یہ حال ہے، آپکے امام ابوحنیفہ جیل مین کب گئے تھے، اور امام احمد بن حنبل پر تازیانے کیا کسی غیر اسلامی حکومت کی طرف سے لگائے گئے تھے، امام بخاری کو جلاوطنی کی سزا کیا ان ہی دنون مین بھگتنی نہین پڑی تھی، جب دنیا پر مسلمانون ہی کا سیاسی اقتدار قائم تھا، سمجھاتے کہ آپ کے بزرگون نے کام کرنے کی شرط کبھی یہ نہین رکھی تھی کہ پہلے حکومت قائم ہو لے، مولویون کے لئے بڑے بڑے عہدون اور مناصب کے دروازے کھل جائین، تب کام کرین گے، اس دن کچھ ایسے انداز مین تقریر فرمائی کہ اپنے اندر بلا مبالغہ عرض کرتا ہون مین نے ایک کلی انقلاب محسوس کیا، مسلمانون کے سیاسی اقتدار کے زوال کو دین و علم کی بے قدری کا سبب قرار دینے کا جو دل عادی تھا، اس کا نقطۂ نظر ہی بدل گیا،

حیدرآباد کی مسجد چوک مین حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی یاد مین ایک جلسہ منعقد ہوا تھا، شروانی صاحب نے اس جلسہ مین تقریر کی، واقعہ یہ ہے کہ اس تقریر سے پہلے حضرت مجدد کے خدمات کی صحیح قیمت کا مجھے قطعاً اندازہ نہ تھا، مجدد سے پہلے مغلون کے تخت پر اکبر و جہانگیر، اور مجدد کے بعد شاہ جہان و عالمگیر ان کی تقریر کا اساسی عنوان تھا، پھر مین کیا بتاؤن کہ اس سلسلہ مین انھون نے معلومات کے کن خزینون کو وقف عام فرمایا، بعد کو حضرت مجدد الف ثانی پر فقیر نے جو مقالہ لکھا اور کافی مقبول ہوا، مجھے اس کا اعتراف ہے کہ صحیح نقطۂ نظر اگر نواب مرحوم سے نہ ملتا، تو اس مقالے کے لکھنے مین کبھی کامیاب نہ ہوتا،

ان کی خانگی مجلسین بھی علم و ادب کی مجلسین تھین، معلومات کا غیر معمولی ذخیرہ اُن کے سینے مین محفوظ تھا، مطالعہ ان کا غیر معمولی طور پر وسیع تھا، گویا مین تو یہ سمجھتا ہون کہ سبقاً سبقاً کسی کتاب کے پڑھنے کا موقع تو اُن سے مجھے نہین ملا لیکن کسی شاگرد کو اپنے استاذ سے جو فوائد پہنچتے ہین، مجھے اس پر فخر ہے

اُن سے یہ منافع مجھے حاصل ہوئے، اور بہت زیادہ حاصل ہوئے تفصیل کے لئے مستقل کتاب کی ضرورت ہے،

وہ بڑے صاف ستھرے اعلیٰ زندگی کے عادی تھے، جامہ زیبی میں مشکل ہی سے حیدرآباد میں کوئی دوسرا آدمی اُن کا مدمقابل بن سکتا تھا، ان کی موٹر بھی سب سے اچھی اور قیمتی موٹر ہوتی تھی، کوٹھی بھی ان کی سول لائن سواجی گوڑہ کی کوٹھیوں میں ممتاز تھی، زندگی کے اکثر شعبوں میں ان کا یہی حال تھا، بعضوں میں اُن کے اس طرزِ عمل سے گرانی بھی پائی جاتی تھی، مگر یہ جو کچھ تھا، صرف ظاہر میں تھا، باطن میں اُن کے کچھ نہ تھا، خیال آتا ہے کہ سفرِ حج کا عزم جب فرمایا گیا، تو فقیر کو علی گڈہ طلب کیا گیا، پہونچا، حکم ہوا کہ سفر پر روانہ ہونے سے پہلے بعض زندہ بزرگوں سے بھی ملنا چاہتا ہوں، اور اپنے پیر و مرشد مولانا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے مزار فائض الانوار پر بھی حاضری کا قصد ہے، جی چاہتا ہے کہ کم از کم اس سفر میں تو تم میرے ساتھ رہو، بسر و چشم قبول کیا گیا، منجملہ دوسرے مقامات کے فیض آباد بھی پہونچے، یہاں حضرت مولینا شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا شاہ نیاز احمد رحمۃ اللہ علیہ تشریف فرما تھے، ان کا قیام کویلو کے چھپر کے نیچے تھا، جس کے سامنے مٹی کا ایک چبوترہ میدان میں تھا جس پر بوریا بھی پڑا نہ تھا، گرد سے بھرا ہوا تھا، بیٹھنے کی جگہ اس کے سوا تھی بھی نہیں، اور شاہ صاحب نے حیدرآباد کے وزیر مذہب کو اسی چبوترے پر بیٹھ جانے کا شاہانہ بھی فرمایا، بے تکلف میں نے محسوس کیا کہ بغیر کسی جھجک کے بخندہ پیشانی وہ اس چبوترے پر اپنی قیمتی شروانی کے ساتھ بیٹھ گئے، پھر شاہ صاحب مرحوم سے دعا کی درخواست کی، اس عجیب و غریب دعا کے الفاظ آج بھی حافظے کے نہان خانہ میں گونج رہے ہیں، شاہ صاحب نے ہاتھ اٹھایا، اُن کے ساتھ ہم لوگوں کے ہاتھ بھی اٹھ گئے، پھر فرمانے لگے:-

"بارالٰہا! یہ حبیب الرحمٰن خان شروانی تیرا ایک ناچیز بندہ ہے،

بارالٰہا! جب اس پر ناگزیر وقت آجائے، سانس اکھڑ رہی ہو، تو اس کی امداد فرمائی جائے

بارالٰہا! جب کفن پہنا کر اس کے تابوت کو لے چلیں تو اپنی رحمت کا سایہ اس پر ڈال، اجب

گور کے خلوت خانہ مین حبیب الرحمٰن خان کو لوگ رکھ کر واپس آجائین اور غریب وہان تنہا رہ جائے تو اپنی رحمت اپنے کرم سے روشنی پیدا فرما، قوت بخش کہ نکیرین کے سوال وجواب مین یہ بے چارہ ثابت قدم رہے"

بارالہا! جب حشر کا میدان قائم ہو، اور بڑے چھوٹے پتنگون کی طرح ادھر ادھر مارے پھرتے ہون، تو اس بے چارے حبیب الرحمٰن بھیکم پور والے کی دستگیری فرما، اس کے گناہون کو بخش دے اور بجائے جہنم کے اس کو تیرے فرشتے جنت کی طرف لیجائین"

بیس سال سے زیادہ مدت کی بات ہے یہ دعوی تو مشکل ہے کہ یہی بجنسہ اُن کے الفاظ تھے لیکن بہت سے الفاظ اُن کی زبان سے نکلے ہوے اس مین محفوظ ہین، شاہ صاحب نے اور بھی کیا کیا فرمایا، اب یاد نہین، نواب علیہ الرحمۃ والغفران کی داڑھی آنسوؤن سے تر تھی، سارا مجمع مجسم گریہ وبکا بنا ہوا تھا آخر مین فرمایا کہ

اے اللہ اس غریب پر اس کے حج وزیارت کے سفر کو آسان فرما"

کیا معلوم تھا کہ بیس سال پہلے جن ضرورتون کی تصویر مرد عاقبت بین کے سامنے تھی، وہ ہم سب کے سامنے بھی آجائے گی، اُن پر اُن کا ناگزیر وقت آگیا، اب وہ تنہا اس عالم مین ہین جہان نہ اُن کے اعزہ ہین نہ اقربا نہ احباب ہین، اور نہ دوست، نئی دنیا ہے، نئے رفقا ہون گے، نئے حالات ہون گے آدمی خواب مین بھی پاتا ہے کہ ایک دوسری دنیا مین پہنچ گیا، اور بیداری کی دنیا کے واقعات سے بے تعلق ہو کر رہ جاتا ہے، کون کہہ سکتا ہے، اپنے حقیقی مرقد (خوابگاہ) مین کچھ یہی صورت اُن لوگون کے سامنے پیش آتی ہے، جو اس دنیا والون سے تو الگ ہو جاتے ہین لیکن نئی دنیا مین نئی ولادت اُن کی ہوتی ہے

فاللھم اغفر لہ وارحمہ کن اللھم انیسہ واجعل لہ من الملائکۃ والانبیاء والاولیاء رفیقا،

قلم ہاتھ مین آگیا ہے قصداً اس کو اگر نہین روکتا ہون تو یہ بہکتا ہی چلا جائے گا، بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہہ نہ سکا امرؤالقیس کے قصیدے کا ابتدائی شعر ؎

قفا نبک مِن ذکری حبیب و منزل

بسقط اللوی بین الدخول فحومل

بار بار زبان پر آجاتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج ہی کے لئے کل یہ شعر عرب جاہلی کے اس شاعر سے کہلوایا گیا تھا، آخر مین اُن ہی کے فرمودہ چند اشعار پر اپنے اس بیان کو ختم کرتا ہون،

"مجلس مذاکرات علمیہ" اُن ہی کی سرپرستی مین ایک علمی مجلس قائم تھی جس مین شہر کے ممتاز اہل علم و ادب جن کا علوم کے مختلف شعبون سے تعلق تھا، اس مجلس کے ارکان تھے، اسی مجلس مین اپنی زبان مبارک سے اردو کی یہ غزل سُنائی تھی، اس کا کیف و اثر دل پر اس وقت تک باقی ہے، "تیری" کی خطابی ضمیر سے کسی کو مخاطب بنا کر یہ غزل انھون نے لکھی تھی، دل اس خطاب کے رُخ کو آج کل خود غزل کہنے والے کی طرف کرکے بسا اوقات گنگناتا ہے، فرمایا تھا،

خوشا وہ باغ مہکتی ہو جس مین بو تیری — خوشا وہ دشت کہ ہو جس مین جستجو تیری

رہینِ صحنِ گلستان نہین دل افزائی — شمیم لطف دل افزا ہے کو بکو تیری

اس "کو بکو" سے ذہن اُس مقام کی طرف بھی منتقل ہو جاتا ہے جہان آج کل یہ فقیر کچھ دنون سے مقیم ہے، انھون نے بہار کے اس دور افتادہ کوردہ گیلانی کو بھی ایک دفعہ اپنی تشریف فرمائی سے سرفراز فرمایا تھا، اسی کا خیال آجاتا ہے، اور پھر زبان پر اسی غزل کا یہ شعر جاری ہو جاتا ہے،

ہنوز دشتِ ختن نافہ زار عالم ہے

کبھی کھلی تھی ادھر زلفِ مشکبو تیری

آخر کے دو شعر یہ تھے :-

فرشتۂ اجل آئے پری کے قالب مین
بوقتِ مرگ جو صورت[1] ہو روبرو تیری

امید تو یہی ہے کہ انشاء اللہ ان کی یہ آخری آرزو پوری ہوئی ہوگی، دوسرا شعر جو مقطع بھی تھا،

خیالِ لطف سے حسرت ہے باغ رضوان مین
سنا ہے جب سے کہ لطف و کرم ہے خو تیری

اب اُن کا شنیدہ "انشاء اللہ الملک الکریم الجواد" دیدہ بن چکا ہوگا، فتغمدہ اللہ بغفرانہ وطاب ثراہ،

---

[1] بخاری شریف کی روایت ہے کہ رہنے والون سے پہلی بات پوچھی جاتی ہے کہ ما تقول فی ھذا الرجل (اس آدمی کے متعلق تم کیا کہتے ہو) یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ کی طرف اشارہ ہوتا ہے، مسلمانو کا ساز و سامان اسی بشارت مین پوشیدہ ہے،

نوائے حیات
طبع دوم

جناب یحییٰ اعظمی کا مجموعۂ کلام نوائے حیات جس سے ناظرین معارف اور دوسرے اصحاب ذوق پوری طرح واقف ہین، دوبارہ چھپ گیا ہے، اس اڈیشن مین بہت سی نئی غزلون اور نظمون کا اضافہ ہے، اور اب یہ مجموعہ پہلے سے زیادہ جامع اور مکمل ہوگیا ہے، اس کے شروع مین مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم فیض رقم سے ایک مبصرانہ مقدمہ ہے،

ضخامت :- ۲۱۴ صفحے، قیمت :- ہے

"منیجر"

نفثۃ المصدور

از جناب مولانا سید بدرالدین صاحب علوی استاذ شعبۂ عربی مسلم یونیورسٹی

حکم ہوا ہے کہ جو تعلقات میرے اور مولانا شروانی مرحوم کے درمیان تھے، ان کی بنیاد پر مین معارف کے صدر یار جنگ نمبر کے لیے ان کی علمی زندگی کے کسی پہلو پر کچھ لکھ کر دون، اس کی تعمیل ناگزیر ہے، اول تو جو خلوص مجکو خود ان کے ساتھ تھا، اس کی بنا پر، دوسرے وہ نظر شفقت و کرم جو ان کی میرے حال پر تھی دونون ہی اس کی متقاضی ہین، تیسری چیز یہ بھی ہے کہ کرم فرماؤن کی بات رد نہین کی جاسکتی، چنانچہ جو کچھ ہوسکتا ہے مختصراً حاضر کرتا ہون، مگر یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ میرے جذبات کا تاثر میری تحریر مین بہت نمایان ہوگا، اور بجائے مخصوص پہلو کے میری تحریر مین عموم نظر آئے گا، امید ہے کہ یہ دونون بے اعتدالیان بنظر درگذر دیکھی جائین گی، کیونکہ مین اپنی افتاد طبیعت سے مجبور ہون، اور اسی وجہ سے عنوان تحریر وہ ہے جو اوپر نظر آرہا ہے،

آغاز واقفیت | جن دنون مین استاذ العلما، رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین پڑھتا تھا، مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی حضرت کے آستانے پر حاضر ہوتے رہا کرتے تھے، اول اول میرا سبق حضرت کی خدمت مین ظہر کی نماز کے بعد مقرر ہوا تھا، لیکن چند ہی روز بعد مولوی کرم الٰہی صاحب مرحوم کے دو سبقون مین سے ایک مین مجھے شرکت کا حکم ملکر صبح کے وقت بھی میری حاضری لازمی قرار پاگئی، شروانی صاحب استاذ رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت مین کبھی کبھی ایسے وقت آتے کہ میرا سبق ہو رہا ہوتا یا فوراً ہو چکا ہوتا، الغرض مجکو ان کے متعلق اس طور پر یہ معلوم ہوگیا تھا کہ وہ ایک رئیس ہین اور میرے استاد کے عقیدتمند شاگرد، وہ مجھکو اس سے زیادہ نہ

جانتے ہوں گے کہ کوئی طالب علم ہے، جو استفادہ کر رہا ہے، اور استاد ایسے شفیق ہیں کہ معذوری کی حالت میں بھی اس کو پڑھا رہے ہیں، اس دور ان میں کبھی ایسا بھی ہوا کہ حضرت نے میرے قلم سے کوئی خط مولوی حبیب الرحمٰن خانصاحب کو لکھوایا، کیونکہ جیسا کہ میں کلام لطف کے مقدمہ میں لکھ چکا ہوں، یہ سعادت مجھکو حاصل تھی کہ حضرت اپنے خطوط اکثر میرے ہی قلم سے لکھوایا کرتے، اس دور کے خاتمے کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے، کہ استاذ العلما، رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت کے بعد جب شروانی صاحب پہلی بار استاذ کے آستانے پر حاضر ہوئے تو میں نے خود دیکھا کہ جس مکان میں حضرتؒ کا قیام تھا، اس کی ڈیوڑھی میں کھڑے ہو کر بیساختہ رونے لگے، اور اس قدر بے قابو ہو گئے کہ رونے میں آواز بلند ہو گئی، اس دور کے بعد کوئی خاص تعلق ملاقات یا خط و کتابت کا نواب صاحب مرحوم کے اور میرے درمیان نہ تھا، تا آنکہ میرا تعلق لائبریری اور یونیورسٹی سے پیدا ہوا، اور کسی علمی ضرورت سے کبھی میں نے کوئی خط لکھا یا کسی بات پر توجہ دلائی تو اس کے جواب سے مجھکو مشرف کیا، عرصہ کے بعد ایک بسیط مقالہ استاذ العلما، کے سوانح حیات کا معارف میں شائع فرمایا جو اب میں بصورت رسالہ علیحدہ بھی نکلا ہے، اس میں میرا ذکر اس خصوصیت کے ساتھ آیا کہ حضرت نے علمی شغف کی وجہ سے معذوری کی حالت میں مجھکو تعلیم دی، اور اس سلسلے میں ایک مخصوص جملہ میرے متعلق فرمایا، جسکو میں اسی رسالے سے کلام لطف کے مقدمہ میں نقل کر چکا ہوں، اور اپنی سعادت کے لیے پھر دہراتا ہوں،

"میاں مولوی بدر الدین جب پڑھنے آجاتے ہیں تو میں اپنی تکلیفیں بھول جاتا ہوں اور جبتک ان کو پڑھاتا رہتا ہوں ہائے ہائے سے نجات مل جاتی ہے"۔

میری پہلی ملاقات شروانی صاحب سے علی گڈھ میں ان کے جائے قیام پر اس وقت ہوئی جب میں شرح المختار پر کام کر رہا تھا جس وقت میں پہنچا، سر راس مسعود مرحوم تشریف رکھتے تھے، ان کو رخصت کر کے میرا کام دیکھا اور بہت پسندیدگی کا اظہار فرمایا، میری یہ ملاقات بے غرض تھی، اس لیے خلوص کا اثر ظاہر ہوا، گو کہ میرا سلسلۂ آمد و رفت قائم نہیں ہوا، تاہم جب اور جہاں ملاقات ہوتی، بہت شفقت

فرماتے، اسی زمانہ میں اورینٹل کانفرنس کا جلسہ لاہور میں تھا، نواب صاحب بحیثیت صدر شعبۂ اردو تشریف لے گئے تھے، اور میں انٹرمیڈیٹ کالج کے نمایندے کے طور پر شریک ہوا تھا، کانفرنس کے عصرانہ میں ملاقات ہوئی، دیر تک متوجہ ہو کر مجھسے باتیں کرتے رہے، اور مغرب کا وقت ہوجانے پر مجھے آگے بڑھا کر نماز پڑھی،

تعلقات میں استحکام | غرض خلوص اپنا اثر دکھاتا رہا، میں جب شہر کی سکونت چھوڑ کر یونیورسٹی کے احاطے میں قیام پذیر ہوا، تو اس کی اطلاع پانے پر مجھکو تحریر فرمایا "یونیورسٹی میں قیام مبارک ہو" اس احاطے میں مقیم ہو کر میں نے اپنے مذاق کی صرف ایک ہی جگہ پائی جو مولوی سلیمان اشرف صاحب مرحوم کی قیام گاہ تھی، مولوی صاحب میرے والد مرحوم کے استاد بھائی تھے، یونیورسٹی سے میرا تعلق ہوجانے کے بعد اکثر میری آمد و رفت ان کے یہاں ہونے لگی تھی، اب پڑوس میں آکر، روزانہ عصر و مغرب کے درمیان میں نے وہاں حاضری کا معمول مقرر کر لیا، یہ سلسلہ بھی بے غرض اور خلوص سے تھا، پختہ ہوتا چلا گیا، مولوی صاحب میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے جیسا ایک بزرگ خورد کے ساتھ کرتا ہے، آمدم برسر مطلب۔ نواب صدر یار جنگ مرحوم کی عادت تھی کہ جتنے دن بھی علی گڈھ میں قیام رہتا، روزانہ مغرب کے قریب مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں تشریف لاتے، علمی و دینی مسائل، بزرگوں کے تذکرے اور تاریخی واقعات موضوع سخن رہتے، مولوی سلیمان اشرف صاحب نے نشست کی یہ ترتیب قائم کی تھی کہ ایک جانب خود، بیچ میں نواب صاحب اور دوسرے پہلو پر میں، بعد میں یہی ترتیب مفتی عبداللطیف صاحب کے یہاں اور حبیب منزل میں بھی قائم رہی کہ وسط میں نواب صاحب ایک پہلو پر مفتی صاحب اور دوسرے پہلو پر میں،

استاد سے عشق | نواب صاحب مرحوم کے ذاتی اوصاف کا آغاز میں اس عنوان سے کر رہا ہوں جو مجھکو بھی بہت محبوب ہے، شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو جس میں استاد کا ذکر نہ ہو، استاذ العلماءؒ کی شاگردی پر ناز تھا، درس کے واقعات، تلامذہ کے تذکرے، استاد کے علمی کمالات بہت لطف سے بیان فرماتے، میرے متعلق حضرت کا فرمایا ہوا جملہ جو اوپر نقل ہو چکا، حرف بحرف یاد تھا، مجھکو دیکھکر حاضرین مجلس کے سامنے

اکثر اس جملہ کا اعادہ فرماتے، سنتا تھا کہ میری غیبت مین بھی استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر مین یہ جملہ زبان پر لاتے، حبیب گنج اور علی گڈھ کے درمیان ایک ایسی جگہ پڑتی ہے جہان سے پلکھنہ کو راہ جاتی ہے، پلکھنہ استاذ العلماء کا مولد اور آبائی وطن تھا، جب ادھر سے گذر ہوتا، فرماتے تھے کہ استاد سے تعلق پلکھنہ کی طرف جاذب توجہ ہو جاتا، وہان تقریبات مین شریک ہونا اور علما کے مجمون کا سمان نگاہ کے سامنے آجاتا، ادھر آخر مین کئی بار اس مقام پر پہنچکر ایک ایک دو دو شعر بھی برجستہ موزون ہو جاتے تھے، جو کبھی حبیب گنج سے بذریعہ ڈاک میرے پاس بھیجدیتے کبھی بروقت ملاقات زبانی سناتے یا کسی پرچہ پر لکھ کر مجھے دیتے، اس وقت میرے پاس چار تحرین موجود ہین، جنکو مین یہان نقل کرنا موزون سمجھتا ہون،

(۱) ۱۳ ذی الحجہ ۱۳۶۶ھ اثنائے سفر علی گڈھ محاذی پلکھنہ

پلکھنہ وہ ہے نور شمس معارف — کیا جس نے پر نور عالم سراسر
پلکھنہ دیا فیض دنیا کو جس نے — لکھا نام اس کا ہے اوج فلک پر

"دنیا" پر نشان لگا کر نیچے یہ عبارت تحریر ہے" مبالغہ نہین، ایک بار جناب مولانا مرحوم کے یہان تقریب شادی مین علما کا مجمع حسب معمول تھا، ذکر چلا سرحدی درسگاہون کا، ایک عالم سرحد نے کہا کہ ایک بار ایک اہل علم کے جلسے مین صوبہ سرحد کے ان مدارس کو شمار کیا جو مولانا کے تلامذہ اور تلامذہ کے تلامذہ کے جاری تھے، تو تین سو رشمار مین آئے، اگر فی مدرسہ پچاس طالبعلم اقلاً رکھے جائین تو پندرہ ہزار ہوئے، اب مبالغہ کی گنجائش کہان ہے، اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ یہ فیض کب سے جاری تھا اب بھی بفضلہ تعالیٰ جاری ہوگا،

(۲) بذریعہ پوسٹ کارڈ" ابھی علی گڈھ سے آکر اترا ہون، فیض پلکھنہ فی البدیہہ

پلکھنے کا ہو وصف، کب ہے یہ امکان — یہان گرم تھی بزم ارباب عرفان
وہ ارباب عرفان جو تھے جان عالم — وہ محبوب عالم وہ جانان عالم

۲ نومبر ۱۹۴۷ء

(۳) پلکھنہ وہ معمور لطفِ لدنی منور ہے عالم تجلی سے جس کی

(۴) پلکھنے مین برسے ہین انوارِ حکمت درخشان وہان پر ہے نورِ تجلی

مرشد سے عقیدت | مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت تھی پورے خاندان کے اندر یہ سعادت صرف نواب صاحب مرحوم کو اور ان کے چچازاد بھائی خلیل الرحمٰن خان صاحب کو حاصل ہوئی، ورنہ خاندان کے تمام زن و مرد شاہ جہانپور کے شاہ عبدالغفور صاحب سے بیعت تھے، بہت عقیدت سے فرماتے کہ خاندان مین کبھی کسی کا نام رحمان پر نہین ہوا تھا، مولانا کی یہ کشش نام رکھتے وقت ہی ظاہر ہوئی کہ ہم دونون ان سے بیعت ہونے والے حبیب الرحمٰن اور خلیل الرحمٰن کے نامون سے موسوم ہوئے، مولانا کے واقعات اور انکے ارشادات سے شاید ہی کوئی مجلس خالی ہوتی ہو، پہلی بار جب گنج مرادآباد کی حاضری ہوئی تو مولانا نے دریافت فرمایا "مولوی لطف اللہ کو جانتے ہو"، عرض کیا "جانتا ہون"، فرمایا "خدمت کرتے ہو"، عرض کیا "بزرگ خدمت کرتے ہین"، اس واقعہ کا ذکر بہت خوبی کے ساتھ اکثر معمول تھا، فرماتے کہ خوش نصیبی تھی مولانا لطف اللہ صاحب سے پڑھا اور مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے بیعت کی، آخر مین استاد کی جو خدمت نصیب ہوئی اس کو بھی مرشد کے سوال کا نتیجہ خیال کرتے تھے،

میرے ساتھ شفقتِ بزرگانہ | جیسا کہ مین لکھ چکا ہون، میرے تعلق کا آغاز بہت معمولی طریقہ پر ہوا، مگر بعد مین اتنا مستحکم ہوگیا کہ احاطہ تحریر مین لانا ممکن نہین، استحکام کی دو وجہین معلوم ہوتی ہین، پہلی جو آغاز مین کارفرما تھی علمی اور ادبی یکجہتی اور ہمخیالی، اس مقام پر بتا دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ بڑے آدمیون اور حکام سے دور رہنا مجھ کو ہمیشہ سے محبوب رہا ہے، لیکن نواب صاحب مرحوم کی درویشانہ صفت، علم دوستی اور اور خود ان کی کشش نے مجھکو ان سے قریب کر دیا، دوسری وجہ میرا خصوصی تعلق استاذ العلماء رحمۃ اللہ کی خدمت مین، اب تو نواب صاحب مرحوم کا تعلق میرے ساتھ مستحکم ہوجانے کا یہ عالم تھا کہ فرماتے تھے کہ اگر تمھاری کوئی بات ہوتی ہے تو مولانا کی صورت سامنے آجاتی ہے، مثال کے طور پر ایک واقعہ بیان

کرتا ہوں، میرے یہاں تقریب تھی عین وقت پر معلوم ہوا کہ نواب صاحب حبیب گنج جا رہے ہیں، شریک نہ ہوں گے، میں فوراً پہنچا، اور عرض کیا کہ شرکت کے بعد تشریف لے جائیں، تھوڑے سے تامل کے بعد فرمایا بہت اچھا، شرکت کی، پھر حبیب گنج گئے، دوسری بار جب تشریف لائے، تو مخصوص جلسہ میں تبلایا کہ جب میں روکنے کے لیے پہنچا تو مولانا کی صورت سامنے آگئی، پھر یہ تاب کہاں تھی کہ شرکت نہ کرتے، اپنی تالیفات بہت اہتمام کے ساتھ مجھکو عطا فرماتے، سال گذشتہ جب فارسی کا دیوان چھپ کر آیا تو ایک نسخہ اپنے دست مبارک سے حسب ذیل عبارت لکھ کر مجھ کو دیا،

"ہدیہ مولف دزمست زبدۃ العلما، مولوی بدر الدین بدر سماء کمال مدفضلہ

حبیب الرحمن صدر یار جنگ، ۲۵ شعبان المعظم سنہ ۱۳۶۰ھ

اہل علم سے محبت اور علمی بنا پر تعلقات | اہل علم سے بہت رغبت تھی، محض علمی فضل کی بنا پر لوگوں سے تعلقات پیدا کرتے، اہل علم پر احسانات کرتے جس کے پس پردہ بجز علم پروری کے کوئی اور غایت نہ ہوتی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کی وائس چانسلری کے زمانہ میں اچھے اچھے علما، کو یونیورسٹی میں جمع کر دیا، اہل علم کے ساتھ ہم نشینی کا خاص ذوق تھا جس کا ایک مظہر یہ تھا کہ مولوی سلیمان اشرف صاحب اور مفتی عبد اللطیف صاحب کے یہاں روزانہ پابندی کے ساتھ تشریف لاکر گھنٹوں بیٹھتے، نواب صاحب مرحوم کی یہ مجلسیں بڑی پاکیزہ ہوتی تھیں، جن میں معلوم ہوتا تھا کہ اہل مجلس دنیا اور مافیہا سے بلند تر کسی اور عالم کے لوگ ہیں، خالص دینی، علمی اور تاریخی مضامین پر گفتگو رہتی تھی، یہاں یہ بتانا مناسب ہے کہ سارے ملک کے مشاہیر اہل علم و کمال سے پختہ تعلقات تھے جن کا ظہور خصوصیت سے سفر کے موقعوں پر ہوتا تھا، مثلاً ایک واقعہ لکھنؤ کے بابت بیان کرنا ہے، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی اور مولانا عین القضاۃ صاحب کے پاس جانا لکھنؤ پہنچکر لازم تھا، ایک بار وہاں کوئی دربار تھا، نواب فرمل اللہ خان صاحب کی رفاقت تھی، ایک ہی جگہ دونوں صاحب مقیم ہوئے، دوسرے روز صبح کو ضروریات سے فارغ ہوکر حسب معمول شروانی صاحب مولانا نعیم صاحب وغیرہ کے یہاں گئے

اور نواب مزمل اللہ خانصاحب حکام سے ملے، جاے قیام پر واپسی کے بعد جب ملاقات ہوئی، تو نواب مزمل اللہ خانصاحب نے جو چچیرے چچازاد بھائی اور عمر مین بڑے تھے، ذرا تیز ہوکر پوچھا "کہان چلے گئے تھے"، جواب سننے پر انھون نے پھر تیز ہوکر کہا کہ "ان لوگون سے ملنے گئے ہو یا دربار کے لیے"، اس کا جواب یہ تھا، کیا کیا جاے ایک خبط ہے"، اسی طرح ایک بار مزمل اللہ خانصاحب نے گرم ہوکر کہا کہ "یہ کیا واہیات ہے کہ روزانہ جہان شام ہوئی مولوی سلیمان اشرف کے یہان"، اس کا بھی جواب یہی تھا کہ "خبط ہے"، یہان ایک واقعہ اور لکھنے کے قابل ہے، یونیورسٹی مین کوئی تقریب تھی، لائبریری مین ممبران کورٹ اور ممبران اسٹاف اپنی اپنی مقررہ جگہ پر آکر بیٹھتے جارہے تھے، اسٹاف کے سلسلہ مین مین بھی آکر ایک طرف بیٹھ گیا تھا کہ نواب صدیار جنگ مرحوم لائبریری کے دروازہ پر آکر رکے، ادھر اُدھر نظر ڈالی اور مجھ کو دیکھکر میرے پاس تشریف لے آئے، اور اسکا کچھ خیال نہ فرمایا کہ وہان ان کی جگہ نہ تھی، جب تک لائبریری مین اجتماع رہا، میرے ہی پاس تشریف فرما رہے اور برابر باتین کرتے رہے،

درویشی اور تواضع | باوجود خاندانی خوش حال ہونے کے مزاج مین درویشی اور فروتنی تھی جس کے بکثرت مناظر شخص نے دیکھے ہین، مین سمجھتا ہون کہ اہل علم سے بے تکلف محبت کرنا شان درویشی ہی کا نتیجہ تھا، اپنے خاص واقعات بیان فرماتے، مگر اس طور پر کہ ہرگز کبھی کبر و نخوت ظاہر نہ ہوا، بلکہ فروتنی کے انداز سے بیان کرتے،

وضعداری اور پختگی | نہایت وضعدار تھے، جس سے جو رسم قائم ہوگئی بہت پختگی کے ساتھ اس پر عمل رکھا، اختلاف خیال اور اختلاف مذاق ہرگز اس رسم مین کمزوری پیدا نہ کرسکا، شاید ہی کوئی شخص شناساؤن مین ایسا ہو جس کے خیال مین اس کی مثالین نہ ہون، وضعداری کا ایک نمونہ یہ ہے کہ جب تک قوت رہی بہ بانہ قیام علی گڈھ روزانہ عصر کے بعد مفتی عبداللطیف صاحب کے یہان جو معمول آنے کا تھا اس مین کبھی ناغہ نہ ہوتا، اس مضبوطی کو دیکھیے کہ اگر مفتی صاحب علی گڈھ مین نہ ہوتے تو بھی حسب معمول تشریف لاتے، ان کی آمد

کی وجہ سے دوسرے اہل مجلس حاضر ہو جاتے، ایک بار ایسے ہی موقع پر مجھ سے فرمایا:

وممن مذهبي حب الديار لأهلها ... والناس فيما يعشقون مذاهب

یہ بھی فرماتے کہ اس وقت کہیں اور کا خیال بھی نہیں آتا، آخر میں جب کمزور ہو گئے، تو یہ معمول قرار پایا کہ عصر کے بعد مفتی صاحب کو اور مجھ کو لینے کے لیے ہمارے قیام گاہوں پر گاڑی آتی، اگر کبھی مفتی صاحب کسی وجہ سے نہ جا سکتے تو تنہا میں جاتا، پیشتر تشریف آوری کا معمول اسی پختگی کے ساتھ مولوی سلیمان اشرف صاحب کے یہاں مقرر تھا، غرض پختگی کی یہ کیفیت تھی کہ جو بات تھی پتھر کی لکیر کے مانند کسی کی طاقت نہ تھی کہ ذرا سی بھی جنبش دے سکے،

دینداری اور ضبط اوقات | بھوپال عرصہ سے دینداری کا مرکز تھا، اور اسی ماحول کے اثر سے نواب صاحب مرحوم میں بھی دینداری بدرجۂ اتم تھی، دینداری کا ایک جز ضبط اوقات ہے، وہ بھی بہت نمایاں تھا، نماز باجماعت کے لیے مسجد میں جانا اور ورد و وظائف میں مشغول رہنا سفر تک میں نہ چھوٹتا، علی گڈھ کے قیام میں مغرب کی نماز لازمی طور پر جماعت سے ہوتی، پہلے مفتی صاحب کے مکان پر اور بعد میں حبیب منزل میں جماعت سے فارغ ہو کر بے ساختہ اس پر خدا کا شکر ادا کرتے، نماز کی امامت مفتی صاحب کیا کرتے، مگر اب کئی سال سے یہ بار گراں مجھ کو سپرد ہو گیا تھا،

حیدرآباد کی صدر الصدوری دینی خدمت ہی کے خیال سے منظور کی تھی، فرماتے تھے کہ طبیعت گریزاں تھی، مگر بالآخر خدمت اسلام کا پہلو غالب آیا، چنانچہ وہاں کے دوران قیام میں بکثرت اصلاحیں کیں، بدعات کو توڑ کر صحیح اسلامی اور مسنون طریقے رائج کیے، ــــ یہی دینداری ہی کا نتیجہ تھا کہ ان کے یہاں غیبت کا گذر دور دور نہ تھا،

علمی ذوق | نواب صاحب مرحوم کو علم کا بے حد ذوق تھا، تعجب انگیز بات یہ ہے کہ ایک خوش حال گھر میں پیدا ہو کر پورے ماحول سے جداگانہ مذاق ان کے اندر پیدا ہوا، ان کے چچا عبدالشکور خان صاحب اپنے اور بھائیوں میں ضرور ایک امتیازی حیثیت رکھتے تھے کہ خود ذی علم اور درویشانہ زندگی بسر کرتے، لیکن

اس کے ساتھ ہی ایک اور نمونہ خود ان کے والد محمد تقی خانصاحب کا بالکل رئیسانہ تھا، نواب صاحب مرحوم نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف اپنے چچا کے حکم سے عربی پڑھی، اور اچھے اساتذہ کے فیض صحبت سے علم کی طرف مکمل رجحان پیدا کیا،

کتب خانہ اسی رجحان کا نتیجہ دو صورتوں میں ظاہر ہوا جن میں سے ایک یہ ہے کہ نوادر کو فراہم کرکے کتبخانہ قائم کیا، کتب خانہ کے آغاز کا بیان جیسا کہ خود فرمایا کرتے تھے، بہت دلچسپ ہے، اور "مقالات شروانی" میں معارف سے منقول ہوکر درج ہے،

"ان کے لڑکپن میں ایک کتاب فروش بچوں کی کتابیں بیچنے آیا کرتے تھے، ان کو دیکھ کر کتابیں فروخت کرنے کا شوق ہوا، رات کو زنانخانہ میں یہ کھیل ہوتا، کہ کسی چادر یا کپڑے کی گٹھری بناکر کتابیں بیچا کرتے، ہوا یہ اس کھیل کو دیکھ کر ہنستیں اور تعجب کرتیں، بچپن میں کتابیں بیچنے کا شوق آئندہ کتابیں خریدنے میں تبدیل ہوگیا، پہلے اردو دیوانوں کے نسخے خریدے، جو صندوقوں میں پلنگ کے پاس رکھے تھے، بعد کو الماری کا انتظام ہوا، انگریزی تعلیم کے لیے آگرہ گئے، وہاں قلمی کتابیں خریدنے کا شوق ہوا، جو علامہ شبلی سے تعلقات ہونے کے بعد شغف کے درجے پر پہنچ گیا، چنانچہ دہلی اور لکھنؤ کے سفروں میں قلمی کتابوں کی فراہمی کا خاص خیال رہتا تھا، حیدرآباد میں بھی بڑا ذخیرہ نایاب کتابوں کا فراہم ہوا جن میں ایک نسخہ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ کا خود مصنف شیخ عبدالحق دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے، اس طرح برابر کوشش کے ساتھ نایاب کتابوں کی بلکہ نایاب چیزوں کی فراہمی جاری رہی، شوق کی وجہ سے بعض اوقات خرچ بھی کافی کرنا پڑا، نتیجہ یہ ہے کہ محض کتابیں ہی نہیں ہر قسم کے نوادر جمع کرلیے، جن کے دیکھنے کے لیے غیر ممالک کے لوگ بھی آتے ہیں، کتبخانہ کی چند خاص باتیں قابل ذکر ہیں، کوئی نادر کتاب یا چیز ناجائز طریقہ پر حاصل نہیں کی، جتنی کتابیں فراہم کیں سب سے استفادہ کیا، جو شخص کتبخانہ کو دیکھنے کے لیے حبیب گنج آیا خواہ وہ کوئی بھی ہو بہت خوش ہوکر اس کی غیر معمولی خاطر کی،

تصنیف و تالیف علم کی طرف رجحان کی دوسری صورت کا ظہور تصنیف و تالیف سے ہوا، اس کا آغاز بھی

دلچسپ ہے، خود فرماتے تھے کہ ان کی طالب علمی کے زمانہ مین حیدرآباد سے رسالہ "حسن" نکلتا تھا، جو اچھے مضامین پر ایک اشرفی انعام دیتا، چنانچہ بابر پر ایک مضمون لکھ کر بھیجا، جواب علٰحدہ بھی چھپ چکا ہے، رسالہ نے اس پر ایک ایک اشرفی انعام دی، اس طریقہ پر لکھنے کا شوق بڑھتا گیا جس کی بدولت بکثرت تصانیف کین، مضامین لکھے، سارے ملک مین علمی شان کی دھوم مچ گئی، مضامین کا مجموعہ "مقالات شروانی" کے نام سے حال مین شائع ہوچکا ہے جس کے ۴۸۰ صفحات ہین، افسوس یہ ہے کہ اس مجموعہ مین المامون پر ریویو نہین شامل ہوسکا، جو علامہ شبلی مرحوم سے تعلق کا باعث بنا تھا، تصانیف مین "سیرۃ الصدیق" انگریزی مین بھی ترجمہ ہوکر شائع ہوئی، چھوٹی بڑی مذہبی، تاریخی اور ادبی تصنیفات تیس سے متجاوز ہین،

ایثار اور وقار | ملک مین جتنے تعلیمی، علمی اور دینی ادارے قائم ہوئے یا پہلے سے تھے، سب کے ساتھ گہرے تعلقات رکھے، ہمیشہ انکی مالی اعانت کی، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ۳۲ سال تک بالاتفاق منتخب ہوتے رہے، کانفرنس کے جلسون کے لیے بڑے بڑے لمبے سفر کیے، اور اخراجات خود برداشت کیے، اسی کا نتیجہ تھا کہ بڑا زبردست وقار ملک مین حاصل ہوا، مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات اور مشرقی علوم کے رکن کین سرسید کے زمانہ سے آخر تک رہے، بغیر خواہش یونیورسٹی کورٹ اور ایگزیکیوٹو کونسل کے ممبر بھی ہوتے رہے،

ادبی ذوق | اب مین نواب صاحب مرحوم کے ادبی ذوق کے چند نمونے پیش کرتا ہون، جس زمانہ مین حبیب منزل زیر تعمیر تھی، میرس روڈ پر حبیب منزل کے سامنے ایک جگہ بہ تقریب شادی میرا اور نواب صاحب کا اجتماع ہوا، فراغت کے بعد مجھ سے فرمایا کہ "آؤ ایک چیز تمھارے ذوق کی دکھلائین"، حبیب منزل لے گئے، اور ایک بڑے پتھر پر جلی اور خوشخط حرفون مین امرء القیس کا مصرعہ نہایت بلیغ تصرف کے ساتھ یون کندہ کیا ہوا دکھلایا،

فیاحبذا ذکری حبیب منزل

اس تصرف کو مین نے بیحد پسند کیا، اور متاثر ہوکر بے ساختہ دیر تک پسندیدگی کا اظہار کرتا رہا، مین ان دنون شہر مین رہتا تھا، تانگہ پر شہر سے آیا تھا، فرمایا "تانگہ رخصت کردو"، اور خود اپنے ساتھ مجھکو میرے قیام گاہ

کے قریب لاکر اتار گئے، پسندیدگی سے جو تاثر مجھے ہوا تھا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مکان پہنچکر چند منٹوں کے غور کے بعد بے اختیار یہ تضمین ہوگئی، جو درج ذیل ہے۔

بناء عظیم للحبیب بکوئل عن النقص والاخلال صار بمعزل

فیبقی علی الایام ذکری کلیهما فیا حبذا ذکری حبیب ومنزل

اسی دن یا دوسرے دن میں نے اس تضمین کو خط کے ذریعہ خدمت میں پیش کر دیا، جسکا جواب نیچے نقل کرتا ہوں

"مصرعے بلیغ ہیں، کوئل کا قافیہ غنیمت بارودہ ہے، امرؤالقیس کے مطلع پر اہل نظر نے یہ ایراد کیا تھا کہ مطلع کا دوسرا مصرعہ بسقط اللوی الخ مصرعۂ اولیٰ کے پایہ کا نہیں، آپ کا تیسرا مصرعہ چوتھے سے خوب چسپاں اور ہمپایہ ہے"۔

اسی خط میں مولوی عبدالرحمٰن خانصاحب کی سفر حج سے واپسی کی عربی تاریخ لکھ کر عنایت فرمائی جو بغیر نام کے محض تاریخ پر مشتمل تھی، میں نے اس پر عربی میں مصرعے لگا کر ان کا نام اور یہ کہ ان کے والد ماجد نے یہ تاریخ کہی ہے نظم میں ظاہر کر دیا، اس پر بھی خوشی کا اظہار مندرجۂ ذیل کلمات میں فرمایا،

"عربی تاریخ پر مصرعے صاف اور برمحل لگ گئے، کمی پوری ہوگئی، اہل کمال کے فیض سے نقص بھی کمال حاصل کر لیتا ہے"۔

بعض بعض جملے نواب صاحب مرحوم کی تحریروں میں انتہا درجے کے بلیغ ہیں، مثلاً "زینۃ المعانی کے مقدمہ میں اپنی تعلیم اور اساتذہ کے مختصر ذکر کے بعد تحریر فرماتے ہیں" جو حاصل ہوا فیض استاد سے جو رہ گیا اپنے تصور استعداد سے"۔ رسالہ استاذ العلماء میں مولوی امانت اللہ صاحب مرحوم کا حال لکھ کر تحریر فرماتے ہیں" باسٹھ برس کی عمر کا سرمایہ دو لفظ ہیں، پڑھا اور پڑھایا"۔ مقدمۂ دیوان وردؔ میں لکھتے ہیں "شہر وانی و ہنگامی مقدمہ نگاری پر مامور ہے"۔ یہ تین نمونے اس وقت دماغ میں موجود تھے جن کو پیش کر دیا، بیسیوں جملے اسی قسم کے انکی تحریروں میں موجود ہیں،

ان کا ادبی ذوق ایک ایسا بڑا عنوان ہے جس کو بہ تفصیل لکھنا بہت مشکل ہے، شاید ہی کوئی مجلس ایسی ہوتی ہو جس میں ادبی ذوق کے جوہر ظاہر نہ ہوتے ہوں، جب میں حاضر ہوتا، اس قسم کی گفتگو میں، روے سخن میری طرف کر لیتے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے دیوان طبع ہو چکے ہیں، کبھی خود اپنے اشعار سنا کر حاضرین کو لطف اندوزی کا موقع دیتے، اور کبھی استادوں کا چیدہ چیدہ کلام پیش فرما کر کیفیت پیدا کرتے جو کیفیت اسوقت پیدا ہوتی اسکو احاطۂ تحریر میں لانا ممکن نہیں، یہاں میں اس تحریر میں جان ڈالنے کیلئے ان کے کچھ اردو فارسی کے اشعار نقل کرتا ہوں

اردو | جلوہ فرما تو ہوا صحرا گلستان ہو گیا | تو چلا منہ پھیر کر گلشن بیابان ہو گیا

آنکھ جب بند ہوئی تب کھلیں آنکھیں اپنی | بزم یاراں جسے سمجھے تھے وہ زندان نکلا

پھول فرقت میں تری خار ہوئے جاتے ہیں | ہلکے پھلکے ہیں گرانبار ہوئے جاتے ہیں

کیے دیتی ہے وحشت پارہ پارہ کسوت ہستی | کہاں فرصت کہ بیٹھوں چاک کرنے میں گریباں کو

حیا، ناز، پندار، رعب و تغافل | تمہارے بھی ہیں پاسبان کیسے کیسے

تاب نظارہ تو جب ہو کر ہیں ہوش طلب | پھر کہاں ہوش جو ہو سامنے صورت تیری

فارسی | دل پری روئے اگر بردہ زمن نیست عجب | اہرمن بردہ ز کف مہر سلیمانے را

ہمت ما سر تسخیر دو عالم دارد | دولت ما بس بود آن شوخ ستمگر ما را

دلم با ساغر و مینا تسلی کشت حسرت | کہ بردہ نرگس مستانۂ زخود ما را

فدائے زخم نگاہت ہزار مرہم باد | نثار درد تو سازم ہزار درمان را

دو امقا مملکت عشق دیار یست غریب | کہ شہ غازی محمود غلام است اینجا

ہوائے باغ بہ ہجر تو سازگار م نیست | جدا ز کوے تو ذوقے بہ نو بہار م نیست

بادِ چمن علاج تپ دل نمی کند | عیسیٰ دمے ز گوشۂ دامانم آرزو ست

از بن ہر موے حسرت نالہ سر می زند | نغمہ ہاے دلکشا در بند چوب تار نیست

از بدخشان لعل و از عمان گہر — جوہر طبعم ز کانے دیگر است

منت رائحہ نافہ و غنچہ نہ کشند — سرخوشانے کہ بہ بوئے دہنے ساختہ اند

شاہباز ہمتم ربطے بدست شاہ داشت — خوش نہ کردہ بند دست دیگران پرواز کرد

ز چشم مست تو مستم شراب را چہ کنم — ز تاب حسن تو سوزم کباب را چہ کنم

نہ کرد جلوہ بت شوخ با ختم دل و دین — اگر بر افگند از رخ نقاب را چہ کنم

در حریم وصل جانانم وطن خواہد شدن — شمع بزم انس آن ماہ ختن خواہد شدن

نگاہ شوخ بہ چشم سیہ بدان ماند — کہ مست ناز خرامد بتے بہ بت خانہ

اے کہ از غایت لطافت طبع — نکہت نوبہار را مانی

ربودہ ہوش و قرارم غزال رعنائے — نگار مست خرامے بلند بالائے

مداوائے مریض عشق قانون دگر خواہد — طبیب درد دل آن نرگس بیمار باید

مجموعی حیثیت سے ایک نظر | خلاصہ یہ ہے کہ نواب صاحب مرحوم سیدھے اور سچے آدمی تھے، ایچ پیچ سے پاک، نہایت مہذب اور شائستہ، ان کی ہر ادا اور ہر بات انتہائی شائستگی سے پُر تھی، اس زمانہ میں ان کی ذات قدیم تہذیب کا مجسم نمونہ تھی، پاکیزگی اور صفائی نظر پڑتے ہی نمایاں ہوتی جس کے اندر وجاہت اور جمال صوری کی درخشانی بدرجۂ اتم تھی، گفتگو میں وہ لطف تھا کہ مجلس کے ہر وقت پر میری تو یہ حالت تھی کہ سب کاموں کو چھوڑ اس میں شرکت کے لیے مستعد ہو جایا کرتا کبھی ناغہ کرنے کو جی نہ ہوتا، ان کی ذات ایسی بہت سی بے مثال صفات کا مجموعہ تھی جو اس زمانہ میں مفقود ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بہشت برین میں بلند درجات پر فائز کرے۔ وبرحمۃ اللہ عبدا قال آمینا

اب میں اس تحریر کو متمم ثلاثین وثلاثمائہ کے دو حسب حال بیتوں پر ختم کرتا ہوں،

وکنا کندمانی جذیمۃ حقبۃ — من الدھر حتی قیل لن یتصدعا

فلما تفرقنا کأنی ومالکا لطول اجتماع لم نبت لیلۃ معا

اردو کا ایک مشہور مصرعہ بھی یہان موزون ہوگا ؎

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

ضمیمہ | محترم جناب مفتی عبداللطیف صاحب سے بھی درخواست کی گئی تھی کہ اس مخصوص نمبر کے لیے کچھ تحریر فرمائین کہ ان کی تحریر بہت قیمتی ہوتی لیکن انھون نے فرمایا کہ وہ لکھنے پر قادر ہی نہین، اور یہ مصرع پڑھا،

حدیثِ دل بکہ گویم عجب غمے دارم

میرے اصرار سے اس پر راضی ہوئے کہ چند باتین مجھے بتلادین جنکو مین لکھکر بطور ضمیمہ اپنی تحریر مین شامل کردون، چنانچہ جو کچھ موصوف نے فرمایا وہ درج ذیل ہے، لیکن قبل اس کے یہ عرض کردینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نواب صدر یار جنگ مرحوم مفتی صاحب، اور مین تینون ایک ایسے لازوال رشتے مین منسلک ہین جو کبھی ٹوٹ نہین سکتا، اور جس کی طرف مین نے اپنی ایک عربی تحریر مین بایں الفاظ اشارہ کیا تھا،

ولیعلم أننا أغصان شجر واحد و تلامیذ أستاذ ماجد،

سنہ ۱۳۰۶ھ مین مفتی صاحب استاذ العلما رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھتے تھے، اسی سال مولوی حبیب الرحمن خانصاحب شروانی مرحوم بھی درس مین شریک ہوئے، اور اس طرح پر کئی سال تک دونون صاحب ہم سبق رہے، اس وقت سے اس وقت تک کہ اکسٹھ سال کا زمانہ گذر گیا، باہم تعلقات مین شگفتگی ہی بڑھتی چلی گئی، طالبعلمی مین ساتھ رہا، ندوۃ العلما مین ساتھ رہا، حیدرآباد مین ساتھ رہا، اور آخر مین علی گڈھ مین ساتھ رہا، سفرون مین بھی بارہا رفاقت رہی غرض جو ارتباط قائم ہوا، ایسا تھا کہ اس سے زیادہ نہین ہوسکتا، نواب صاحب مرحوم کو جو محبت مفتی صاحب کے ساتھ تھی اس کا ذکر میری تحریر مین اوپر گذر چکا ہے مفتی صاحب کے تعلق کا اندازہ اس سے کیجئے کہ اب اکثر یہ شعر انکے ورد زبان رہتا ہے،

آتش اندر آشیان بے رحم صیادان زدند
در گلستان مشتِ خاک و شتم دگذاشتند

کہ لے دے کے ایک ہی ذات سے تعلق تھا، وہ بھی نہ رہی

مفتی صاحب فرماتے ہین کہ شروانی صاحب مرحوم کی طالبعلمی کی شان یہ تھی کہ ٹھیک بارہ بجے دن کو ان کا سبق ہوتا، گھوڑے پر سوار ہو کر پڑھنے آتے، ایک سائیس گھوڑے کا اور ایک خدمتگار کتابین ہاتھ مین لیے ساتھ ہوتا، کیسی ہی لو دھوپ یا بارش ہوتی ناغہ نہ کرتے، اور بہت پابندی کے ساتھ ٹھیک وقت پر سبق کے لیے استاد کی خدمت مین پہنچ جاتے، جب مولانا کا کمرہ چالیس یا پچاس قدم رہ جاتا، گھوڑے سے اتر کر کتابین اپنی بغل مین لیتے اور استاد کی خدمت مین ادب کے ساتھ حاضر ہو جاتے، یہ معمول چند روز نہ تھا، بلکہ مستقل تھا، ایک رئیس زادہ کو تحصیل علم کا اتنا شوق جس کے لیے کسی تکلیف کی پروا نہ کرنا لائق صد آفرین اور قابل تقلید ہے، جس سے اس زمانہ کے طلبہ کو سبق سیکھنا چاہیے، اس شان سے طالب علمی کا زمانہ گذرا اور بعد فراغت مطالعہ اور تحریر و تقریر کے میدان مین قدم رکھا، استعداد پختہ تھی نتیجہ یہ کہ تحریر مین وہ خصوصیت حاصل ہوئی کہ ہر شخص نے مدح سرائی کی، خاص خوبی یہ تھی کہ مطلب کی جامع ہوتی اور حشو و زوائد سے پاک بندش چست، تقریر مین وہ ملکہ حاصل کیا کہ کوئی علمی اور اسلامی مجلس ان کی تقریر سے خالی نہ رہتی تھی خواہ نزدیک ہو یا دور ایک بار پٹنہ مین ندوۃ العلما کا جلسہ تھا، اندازہ ہے کہ پچاس ہزار کا مجمع ہوگا، جس کے اندر اس زمانہ کے بڑے بڑے اشخاص مثلاً سر علی امام، جسٹس شرف الدین حسن امام وغیرہ وغیرہ شریک تھے، شروانی صاحب کی تقریر جب ہوئی تو مجمع کا ہر شخص از خود رفتہ ہو گیا خصوصیت کے ساتھ سر علی امام اور ان جیسے دیگر اشخاص بالکل بے قابو تھے،

تحریر اور تقریر کے علاوہ جو ایک بہت بڑا کام انھون نے انجام دیا وہ انکا کتبخانہ ہے، شخصی محنت سے اتنا بڑا کتبخانہ جمع ہونے کی مثال اس صوبہ یوپی کے اندر نہین، گویا یہ ایک فرض کفایہ تھا جو انھون نے پورے یوپی کی طرف سے ادا کیا، اس کتبخانہ کی خصوصیت یہ ہے کہ صرف نوادر اسمین جمع کیے گئے ہین،

علم کے ساتھ ساتھ خدا نے ان کو فہم سلیم عطا فرمائی تھی مفتی صاحب سے انکی گفتگو ہر قسم کے علمی مسائل پر ہوتی رہتی تھی جس سے اس بات کا مفتی صاحب کو یقین ہو گیا کہ مرحوم صحیح بات ہمیشہ فوراً سمجھ لیتے تھے، مزاج مین کجروی بالکل نہ تھی اور غلطیات ہرگز نہ مانتے تھے مفتی صاحب سے استاد بھائی ہونے کے علاوہ پیر بھائی کا بھی رشتہ تھا، مولانا فضل رحمان صاحب سے ارادت اس طریق پر ہوئی کہ ملاقات کے بعد تمام رات بے چینی مین کٹی جس کی وجہ یہ بتلاتے تھے کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اپنے تمام گناہ پیش نظر تھے صبح کو مرید ہونے کے بعد وہ کیفیت زائل ہو گئی، مولانا نے دعا دی کہ خدا قرض سے بچائے جس کا اثر یہ ظاہر ہوا کہ عبدالشکور خانصاحب کے انتقال کے بعد جائداد پر تین لاکھ کا قرضہ تھا، اسکو ادا کیا، خود کبھی قرضہ نہیں لیا، آمدنی مین خدا نے ایسی برکت دی کہ امور خیر بھی جاری ہے اور لاکھوں روپے کی جائداد خریدی، برادری مین اس طور پر لوگون کی امداد کی کہ جو کوئی مقروض ہو جاتا وہ اپنی جائیداد ان کے ہاتھ مین دیدیتا، یہ اس کا قرض ادا کر کے جائیداد واپس کر دیتے،

سرکاری خطابات اور کونسلون کی ممبری سے باوجود اتنی بڑی ریاست کے سخت نفرت تھی، ایک خطاب کی سفارش گورنمنٹ مین گئی، خطاب آنے سے پہلے شروانی صاحب کو پتہ لگ گیا سخت وحشت ہوئی، اور کوشش کر کے خطاب کو رکوا دیا، اگر وہ چاہتے تو بہت سے خطابات، کونسلون کی ممبری ان کو بہت آسانی کے ساتھ مل جاتی، مگر ان کی زندگی تو دوسرے ہی مقصد کے لیے تھی، تمام زندگی کا کارنامہ دو باتین ہین، علم حاصل کیا اور اسلام کی خدمت کی، مختصر یہ ہے کہ شروانی صاحب مرحوم اپنی صفات مین بے نظیر تھے

آخر مین یہ شعر پڑھا،

اندکے با تو بگفتم و بہ دل ترسیدم
کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اعتراف

از جناب سید معین الدین صاحب مرحوم مترجم نپولین اعظم وغیرہ

ہمہ شہر پر زخوباں منم وخیال ماہے
چہ کنم کہ چشم بدبین نکند بکس نگاہے

سید معین الدین صاحب مرحوم شاہجہانپوری اپنے زمانہ کے مشہور مترجم اور صاحب قلم تھے، جیسا کہ اس مضمون سے ظاہر ہوگا، یہ اعتراف انھوں نے آج سے ۲۳ سال پہلے بطور وصیت نامہ کے لکھا تھا، جسے بعد میں معارف میں اشاعت کے لیے بھیجدیا تھا لیکن شاید اسکی نوبت اسی لیے نہیں آسکی کہ وہ مولانا شروانی کی یادگار میں کام آئے، اسلیے مضمون نگار کی وصیت کی تکمیل کے لیے اس کو اس نمبر میں شائع کیا جاتا ہے جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزون ہے۔ "م"

۲۶ نومبر ۱۹۲۷ء کو یہ مضمون "اعتراف" کی سرخی سے میں نے اس وقت لکھا تھا جب کہ چھ سال متصل حیدرآباد دکن کے عہدۂ منتظمی دفتر پیشی صدر الصدوری امورِ مذہبی پر کام کرچکنے کے بعد میں اپنے وطن شاہجہانپور واپس آیا تھا، منشا صرف یہ تھا کہ اپنی عینی شہارت بطور وصیت کے تحریر کے ذریعہ سے اپنے پیچھے چھوڑ جاؤں جس ذاتِ گرامی کے متعلق یہ اعتراف میں نے لکھا تھا وہ ایک غیر معمولی شخصیت ہے اور مجھکو یہ دردانگیز خیال تھا کہ قاعدۂ قدرت کے موافق وہ ذاتِ گرامی ایک دن اس دارِ فانی سے اٹھ جائیگی، اور میں بھی نہ رہوں گا، پس اس ذاتِ گرامی کی اگر کبھی سیرۃ لکھی جائے تو میرا یہ "اعتراف" اس سیرۃ کا ایسا ایک باب بن سکے جس سے

زیادہ سچا دوسرا کوئی واقعہ اس سیرۃ مین دکھایا جاسکے، مین نے اس اعتراف کی تمہید مین لکھا تھا "میری سچائی کی دلیل یہ ہے کہ اب جبکہ مین یہ اعتراف لکھ رہا ہون نہ اس ذات گرامی سے میرے کوئی دنیاوی نفع کا واسطہ باقی ہے، نہ مجھ پر کوئی دباؤ ہے، پس جو کچھ یہان لکھا جاتا ہے وہ آلودگی اور ہر قسم کی لوث سے انشاءاللہ پاک ہے"

لیکن ان پچھلے چار سال مین حالات نے کچھ ایسے پلٹے لیے کہ حیدرآباد چھوڑنے کے بعد مجھے پھر معلوم نہ ہوا کہ وہان کیا ہو رہا ہے، تین برس تک اس ذات گرامی سے جس کے ساتھ پورے چھ سال مین ایک ہی کوٹھی مین رہ چکا تھا، مدحیں کا مین سب سے بڑا سرشتہ دار تھا کسی قسم کی خط و کتابت بھی نہ ہوئی کہ اب یکایک معلوم ہوا کہ استعفیٰ کے ذریعہ سے اس ذات گرامی نے حیدرآباد سے تعلق قطع کرلیا، چونکہ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا ہے جبکہ مین زندہ ہون، لہذا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ "معارف" کے ذریعہ سے اپنا یہ اعتراف ناظرین کے سامنے پیش کردون، میرا مدعا اصلی اس طرح پورا ہوجائے گا یعنی جب سیرۃ لکھی جائے گی "معارف" ہی سے سیرۃ نگار یہ سطور چن سکے گا،

وہ ذات گرامی نواب صدر یار جنگ بہادر مولانا مولوی محمد حبیب الرحمن خان صاحب شروانی کی ہے جس سے اس اعتراف مین مجھے بحث کرنی ہے، مین اس طولانی داستان سے بات کو طول نہ دون گا، کہ شروانی صاحب سے کب اور کس طرح میری ملاقات ہوئی اور اس تیس برس مین باہمی ربط و قدردانیون نے کیا منزلین طے کین، اسلئے اصل مدعا کی طرف آتا ہون،

انتیس ۲۹ برس سرشتۂ تعلیمات مین کام کرنے کے بعد مین نے سلطانپور سے گورنمنٹ کی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اور ہز ہائی نس نواب صاحب باؤنی کا پرائیویٹ سکریٹری ہوا، ویلی کالج اندور مین نواب صاحب ممدوح کا گورنمنٹ صوبہ متحدہ کے حکم سے مین پہلے اتالیق رہ چکا تھا، اسی زمانہ مین شروانی صاحب حیدرآباد دکن کے صدرالصدور امور مذہبی ہوئے، مین باؤنی مین دو برس کام کرنے پایا تھا کہ شروانی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ لیا، اور حیدرآباد مین اپنے دفتر پیشی کا، سرکار آصفیہ

کی منظوری حاصل کر لینے کے بعد، منتظم کر دیا، یہ تقرر ۶ رجون ۱۹۲۰ء مطابق ۱۸ رمضان المبارک ۱۳۳۸ھ کو ہوا، اب مین اس منزل پر پہنچ گیا کہ شروانی صاحب سے میرا ہر وقت کا ساتھ ہے اور مجھکو موقع ملتا ہے کہ انکو اتنے قریب سے دیکھون جتنے قریب سے دیکھنا ممکن ہے، غالباً میرا خیال صحیح ہے کہ کسی دوسرے کو متصل چھ سال ایسے نہ ملے ہون گے کہ اس نے ایک جاسوس کی طرح شروانی صاحب کی زندگی کا ہر پہلو، میرے جیسے مشاہدے کی نظر سے مطالعہ کیا ہو اور اپنے نہایت باقاعدہ روزنامچہ کی جلدون مین یہ پہلو بر بر قلمبند کیے ہون،

اب مین چھ برس کا تجربہ اور مشاہدہ اس اعتراف مین نہایت دیانت اور راستی سے لکھتا ہون کہ مین نے شروانی صاحب کو کس عالی رتبہ کا باعمل مسلم پایا، لیکن اتنا پھر لکھنا ضروری سمجھتا ہون کہ چونکہ مین شروانی صاحب کو اچھی طرح جانتا ہون اور یہ اعتراف اب ان کی نظر سے بھی گذرے گا، اگر خلاف واقعہ مین نے کوئی بات لکھی ہو تو میرے حق مین سب سے زیادہ سخت جج وہی ہون گے، اور مجھ پر سب سے زیادہ نفرین وہی کرین گے، چنانچہ جو کچھ شروانی صاحب کے متعلق مین آگے لکھتا ہون مین ان کو ایسا ہی جانتا ہون، اس کے بعد اصل علم خدا کو ہے اور صحیح اور بہتر جاننے والا وہی ہے،

وضع شکل وصورت | صحیح مسلمانہ وضع قطعی مشرقی، حسن صورت ہزارون مین ایک، حیدرآباد کے عظیم الشان جلسون مین مین نے یہی پایا کہ سب سے پہلے نظر انھین کی طرف بے ساختہ اٹھتی تھی، جمال صورت کے ساتھ مسلمانہ عبا، عمامہ اور لباس، سبحان اللہ، حضور نظام خلد اللہ ملکہٗ کی کسی سرکاری تقریب مین بھی شروانی صاحب نے مغلی دستار کبھی سر پر نہ رکھی، اگرچہ ان کی پیشی مین مجھکو پچھلے تین سال پیشی کے وقت مغلی دستار استعمال کرنی پڑی،

انشاء | شروانی صاحب کی انشا مین ایک چاشنی اور وہ ذائقہ ہے کہ صاحب ذوق ہی وہ لذت جان سکتا ہے، وجہ اس چاشنی اور لذت کی یہ ہے کہ چونکہ وہ فارسی اور اردو کے ایک گران پایہ شاعر ہین،

اگرچہ وہ شاعری کی مشق نہین کرتے، اس لیے نثر مین شاعرانہ تخیل داخل ہوکر نثر کا پایہ نہایت بلند کردیتی ہے، جملے چھوٹے چھوٹے، ثقیل اور غیر مانوس الفاظ و لغات سے پاک، لیکن آمد مضامین کی رو مین کبھی قوافی کا واقعہ ہوجانا یا کہین پر خفیف عرق ظرافت کی جھلک ناوک و نشتر کی گویا چھیڑ ہوتی ہے، مین نے چونکہ ان کے ہر قسم کے مسودات کثرت سے صاف کیے ہین، ان کی نثر کا اسلوب مین جانتا ہون، منصف مزاج ایسے کہ زبان کے متعلق کسی لفظ کے استعمال کے متعلق جب کبھی مین نے اپنا کوئی خطرہ یا شبہہ ظاہر کیا انھون نے کبھی برا نہ مانا، فوراً تحقیقات کی، اگر میرا خطرہ یا شبہہ صحیح ہوا تو نہایت مسرت سے انھون نے قبول کرلیا، اگر مین غلطی پر ہوا تو خود میری غلطی کی اصلاح ہوگئی، ان کے انشا مین بیکار اور زائد باتون کا دخل نہین،

تقریر | مین نے شروانی صاحب کی قریب قریب ہر ایک تقریر حیدرآباد مین سنی ہے، تقریر عام فہم، تقریر کا ایک خاص مرکز و مقصد، پیرایہ دلون سے استغنا نہ کرنے والا، مذہبی تقریرین رطب و یابس روایات سے قطعی پاک، تقریر مسلسل، برجستہ اور آخر مین اپنے مرکز و مقصد پر پہنچ جانے والی اور تقریر کا منتہاے کمال یہی ہے، اعلیحضرت سلطان دکن مدظلہ العالی کی موجودگی مین بھی مین نے دیکھا ہے کہ بال برابر بھی لہجہ یا تقریر کے تیور مین فرق نہین آتا،

وقت کی قدر اور تقسیم اوقات | روزمرہ کی واہیات اشغال مین اپنے نفس کے رجحان سے کبھی وقت ضائع کرتے مین نے شروانی صاحب کو نہ دیکھا، حبیب گنج مین فجر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے کے بعد سب سے پہلا کام وہ یہ کرتے تھے کہ رخصت ہونے والے پردیسیون اور مسافرون کو رقعہ دیتے، پھر اپنے باغ کی سیدھی طولانی روش پر تسبیح لیے ہوئے متصل ایک گھنٹہ کے قریب ٹہلتے اور وظیفہ پڑھتے رہتے، ایک مضبوط عموماً مرزاپوری بانس کی چھڑی ان کے ہاتھ مین ضرور ہوتی، چھڑی کبھی ترک نہ کی جاتی حتیٰ کہ جب مسجد کو جاتے تب بھی چھڑی ہاتھ مین لے جاتے، حیدرآباد مین بھی فجر کی نماز کے بعد ٹہلنے اور وظیفہ کا یہی دستور تھا، لیکن یہان مسافرون اور پردیسیون کی جگہ اطراف کے چھوٹے چھوٹے بچے جن کی تعداد کبھی ایک سو سے زیادہ ہوجاتی تھی،

شروانی صاحب کو گھیر لیتے تھے، اور شروانی صاحب ہر ایک بچہ کو ایک ایک پیسہ دیتے اور مسکراتے جاتے اور کسی بچہ کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی پھیرتے تھے، وظیفہ سے فارغ ہو کر چائے پیتے اور خطوط لکھنے شروع کر دیتے، دس بجے عموماً اجلاس پر آجاتے اور اسوقت تک کام کرتے کہ آج کا سب کام ختم ہو جاتا، ہر ایک مثل خود پڑھتے اور ہر ایک حکم اپنے قلم سے لکھتے، ظہر اور عصر کے درمیان کوٹھی کی بالائی منزل پر اتنی بلند آواز سے روزمرہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے کہ آواز نیچے صاف سنائی دیتی، نماز ظہر کے بعد بھی ہمیشہ چائے پیتے تھے، حیدرآباد مین نماز عصر کے بعد وہ بالاخانہ سے نیچے اترتے، مغرب تک یا تو ملاقاتیون سے ملاقات ہوتی یا موٹر مین سوار ہو کر ہوا خوری کو جاتے، عموماً مین ساتھ ہوتا اور اس وقت مزاج کی شگفتگی اپنی بہار پر ہوتی، واپسی پر نماز مغرب عموماً خود پڑھاتے لیکن اگر کوئی اور صاحب عبا و عمامہ موجود ہوتے تو انھین کو امام بنا دیتے، خود نماز پڑھاتے تو اس نماز مین اور اس نماز مین جو وہ سنت یا نفل کی صورت مین تنہا پڑھتے تھے، بڑا فرق ہوتا، یعنی جب امام ہوتے تو قرأت مختصر اور ارکان نہایت معتدل ہوتے، مقتدیون پر وہ نماز کبھی بار نہ ہوتی، لیکن جب تنہا پڑھتے تو ارکان طولانی ہوتے صحت ارکان کا یہ حال دیکھا ہے کہ کبھی سجدے سے وہ جانماز پر ہاتھ ٹیک کر نہ اٹھے، پس اگر صحیح نماز پڑھنی ہو تو شروانی صاحب کو نماز پڑھتے ہوئے غور سے دیکھ لینا کافی ہے، مغرب کی نماز کے بعد وہ جانماز پر دیر تک بیٹھتے، پھر ایک لمبی دعا مانگتے، فجر کی نماز جماعت مین بھی یہی دیکھا کہ عموماً وہ سب مصلیون کے بعد مسجد سے باہر آتے، مغرب کی نماز کے بعد حیدرآباد مین وہ ملاقات کے کمرہ مین بیٹھتے، ملاقاتی ہوتے تو ملاقات کرتے ورنہ اخبار دیکھتے، رات کا کھانا عشا کی نماز پڑھکر کھاتے، اس کے بعد مطالعہ شروع ہوتا، اور نہین کہا جا سکتا کہ کب تک ہوتا رہتا، انھین اوقات مین کمیٹیون کی شرکت، مدارس مین دینیات کے معاینے، تقریبات دعوتون، تقریرون، وغطون غرض ان سب ہی ضروریات کے لیے وقت نکال لیا جاتا،

لطیفہ | مین نے حیدرآباد مین اکثر دیکھا کہ مغرب کی نماز کی جس وقت شروانی صاحب امامت

کر رہے ہوتے تھے تو اس وقت بعض بڑے عہدیدار جن کا عموماً سررشتۂ تعلیمات سے تعلق تھا، ان میں ایسے بھی تھے کہ ولایت میں انگریزی تعلیم پائی تھی، نہایت آسودہ اور بے غم مغرب کی جماعت میں شریک ہونے کے بجائے کرسیوں پر بیٹھے سگریٹ پیتے رہتے تھے، ایک دن میں نے شروانی صاحب سے کہا کہ "آپ ان مسلمانوں کو ہدایت کیوں نہیں فرماتے کہ نماز کا احترام کریں، اور جماعت میں شریک ہوا کریں"، اس پر شروانی صاحب نے مجھے یہ جواب دیا "منتظم صاحب، ان لوگوں کو ابھی ٹھوکر نہیں لگی ہے، ایک ٹھوکر میں یہ سیدھے ہو جائیں گے، کسی کی ہدایت کی ضرورت نہیں"۔ اس کی تصدیق بہت جلد ہو گئی، یعنی چند ہی روز بعد میں نے ایک کو ایسا نمازی پایا کہ ریل میں بھی ان کی تسبیح اور جانماز کا پورا اہتمام رہتا تھا، یہ ٹھوکر کھائے ہوئے تھے،

کثرت مشاغل شروانی صاحب کی تحریروں کے حجم سے مجھ پر ہول طاری ہو جاتا تھا، ہر ایک مثل وہ خود پڑھتے اور سب احکام اور تجویزیں اپنے قلم سے لکھتے، امور مذہبی اور صدارت العالیہ کا کام انجام دینے کے ساتھ وہ عدالت العالیہ کے خاص اور اہم دیوانی کے مقدمات میں ججوں کے افسر بنائے جاتے تھے، جامعہ عثمانیہ کے مختلف شعبوں کے وہ رکن تھے، کتب خانۂ آصفیہ، دار العلوم نظامیہ شعبۂ تالیف و ترجمہ، دار الاشاعت، کتب درسی کا احتساب، مختلف مصنفین و مؤلفین کی تصنیفات و تالیفات پر اعلیٰ حضرت معظم کو ناقدانہ تحریری رائے کا بھیجنا، مدارس کے معائنے، دورے، اکمنہ مذہبی کی جانچ پڑتال وغیرہ، مذہبی جلسوں میں وعظ، ادھر ہندوستان میں وقف کرنال، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی کے شعبوں کی رکنیت، تعلیمی کانفرنس کی شرکت، صدارت کے خطبات، ندوۃ العلماء کے اہم امور میں عملی شرکت، اپنے عظیم الشان تعلقہ اور کتاب خانہ کی داشت و نگرانی، کثیر خط و کتابت، سلسلۂ تالیف، دیوانوں، تذکروں اور مثنویوں پر مبسوط مقدمات لکھنا، مواعظ کے مستقل رسالے بنا دینا، رسالوں میں مضامین لکھنا، اس کے ساتھ کتابوں کا مستقل مطالعہ، گویا وقت کا ہر ہر لمحہ کام میں

لگا ہوا، اور ہمیشہ یہی دیکھا کہ وہ ایسا کام کرتے تھے جو کرنے کے لایق ہوتا تھا، نہ وہ کام جس کے کرنے کو جی چاہے، مطالعہ کا اندازہ کسی قدر اس سے ہو سکتا ہے کہ حبیب گنج کے کتاب خانہ سے مین نے بہت دفعہ کتابین لین، کھولین اور بہت سی پڑھین بھی لیکن کوئی کتاب ایسی نہ ملی جس مین پنسل یا قلم سے شروانی صاحب کے مطالعہ، صحت یا رائے وغیرہ کے نشانات نہ پائے ہون، ان کی معیت مین چھ سات سال کے دوران مین ہر سال حیدرآباد سے ہندوستان کو دو دفعہ آنا اور واپس جانا ہوتا تھا، اس طولانی سفر مین ان کا عزیز شغل مطالعہ رہتا تھا، روزانہ اخبار، ماہوار رسالے وغیرہ سبھی کچھ پڑھ لیتے تھے، کتب خانۂ آصفیہ سے ان کے مطالعہ کے لیے کتب تاریخ، سیر اور تفسیر مین برابر منگاتا اور واپس کرتا تھا،

دیانت اور تقوی | حیدرآباد مین سرکاری کام مستثنی کرکے اپنے خانگی اور نجی کام مین شروانی صاحب نے کاغذ، روشنائی، قلم اپنے ذاتی استعمال کیے، خود ان کی ذات کا تو ذکر ہی کیا ہے، ان کی پیشی کے دفتر مین کسی اہل معاملہ کو کبھی یہ ہمت نہ ہو سکی کہ کسی ناجائز مطلب کے نکال لینے کے واسطے رشوت تو درکنار کوئی معمولی سوغات یا تحفہ پیش کر سکتا،

کسی بڑے امیر کی ایسی تقریب مین جہان رقص و سرود ہو شروانی صاحب کبھی شریک نہ ہوئے اور جہان ایسا احتمال ہوتا وہان دعوت دینے والے امیر سے بذریعہ تحریر پوچھا جاتا تھا کہ "کوئی ایسی ویسی تفریح تو نہین ہے"؟ چنانچہ جب حیدرآباد کے امراء کو یہ بات معلوم ہو گئی تو ایسی تقاریب مین جہان یہ خرافات ہونے کو ہوتے وہ شروانی صاحب کو مدعو ہی نہ کرتے تھے، ایسے ڈنرون، دعوتون اور جلسون سے جہان کوٹ پتلون، لیڈیان، انگریز اور ہندوستانی نیم جنٹلمین جمع ہوتے شروانی صاحب کو عموماً پرہیز رہا، مین نے دیکھا ہے کہ جب کوئی "جنگ" یا "ملک" شروانی صاحب کی ملاقات کو آیا، تو سرکاری کام سے تو مجبوری تھی، مگر ان کو ایسی ملاقاتون سے وہ لطف نہ آتا تھا جو علماء سے ملاقات مین آیا کرتا تھا،

بزرگان دین یا ان کے مزارات کا احترام کوئی شروانی صاحب سے سیکھے، مین نے ان کو حبیب عید روس صاحب کے حضور مین حاضر ہوتے بھی دیکھا ہے، اور گلبرگہ شریف مین حضرت بابا گیسو دراز رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر اور بہاڑی شریف کے حضرت شاہ شرف الدینؒ اور حضرت اورنگ زیب عالمگیر کے مزار پر خلد آباد شریف مین بھی شروانی صاحب کی مخصوص حالت دیکھی ہے، اچھی قوالی کا ان پر یہ اثر ہوتا کہ وہ قطعی ساکت ہوجاتے، جمعہ کے دن کا خاص احترام ہوتا تھا، آج شروانی صاحب سرکاری کام کو ہاتھ نہ لگاتے، نماز جمعہ کی حیدرآباد مین خاص طریقہ سے تیاری کی جاتی، عمدہ لباس، عبا، عمامہ، عطر مین بسے ہوئے، اور اس پر شیروانی صاحب کا حسن صورت، بس کچھ نہ پوچھیے، حیدرآباد کی مکہ مسجد مین ہمیشہ جمعہ کی نماز پڑھتے پہلی صف مین امام سے پیچھے ان کی جگہ خالی رکھی جاتی، لیکن مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اگر تین چار صفین بھر جانے پر وہ مسجد مین پہنچتے تو پھر مصلیون کو چیرا اور پھاندکر وہ اگلی صف مین کبھی اپنی خالی جگہ پر نہ جاتے بلکہ نہایت خاموشی سے کسی مناسب جگہ پر پیچھے ہی بیٹھ جاتے،

حیدرآباد مین مین نے ہمیشہ دیکھا کہ اپنی تنخواہ، جو دو ہزار تین سو روپیہ ماہوار تھی، شروانی صاحب نے کبھی آنکھ اٹھاکر نہ دیکھی، وہ روپیہ کی حقیقت سنگ ریزہ کی برابر سمجھتے، اکثر مقروض رہتے اور حبیب گنج سے برابر روپیہ منگاتے رہتے، کبھی وہ ایسے خالی ہاتھ ہوجاتے کہ مسافر، نومسلم، حاجتمند کی امداد کو اپنے خادم سے قرض لیتے، نیا کپڑا بناتے تو عموماً استعمالی پرانے، جو برائے گفتن پرانے کہہ بھیجے، تقسیم کردیے جاتے، یہ بات بھی مین نے اچھی طرح دیکھی ہے کہ وہ اہل علم سے تعلق رکھنے والے عالمون کے وہ سب سے بڑے قدردان تھے، اس گروہ کی وہ انتہائی عزت کرتے تھے،

لیکن ایک چیز کی شروانی صاحب کو مین نے ضرور ہوس یا حرص دیکھی، وہ چیز کتاب تھی، نادر، کمیاب پرانی قلمی یا مطبوعہ کتاب وہ کسی قیمت پر بھی نہ چھوڑتے تھے، مجھے صحیح اندازہ نہین کہ کتابین جمع کرنے مین انھون نے کس قدر روپیہ صرف کیا، حبیب گنج کے اپنے کتاب خانہ مین ایک دفعہ مجھ سے فرمایا تھا،

منتظم صاحب، یہ کتابیں میری چالیس برس کی سعی کا نتیجہ ہیں"۔

تمامی عمر میں شروانی صاحب نے صرف ایک عمارت بنائی ہے، وہ بھی ان کی نہیں، خانۂ خدا ہے حبیب گنج میں جاکر اس خانۂ خدا کی جلوہ ریزی دیکھو، خصوصاً جبکہ بھادوں کی بھرن برس رہی ہو، اور کالی گھٹائیں چڑھی ہوں، یا طلوع آفتاب سے پہلے یا چاندنی رات میں،

رمضان المبارک میں شروانی صاحب اپنی کوٹھی کے احاطہ میں ہمیشہ بہترین حافظوں سے دو قرآن مجید جماعت کے ساتھ سنتے، اور حافظوں کو نہایت معقول نذرانے اور خلعت دیتے، جماعت میں ان سے بائیں ہاتھ کو میری جگہ مقرر تھی، وہ عموماً عطر میں ایسے بسے ہوتے تھے کہ تیز جنس کے عطر کی خوشبو سے جماعت مہک جاتی، اور کبھی مجھکو چھینکیں آنے لگتیں، یہی حالت افطار کے موقعوں پر ہوتی، اور افطار کے جلسہ میں سب سے زیادہ بشاش وہی ہوتے، رمضان کا فریضہ وہ نہایت اہتمام اور خوشی سے ادا کرتے، وہ نہ تمباکو کھاتے ہیں نہ حقہ پیتے ہیں،

ربیع الاول شریف میں مجالس عید میلاد شروع ہوتیں، یہ سلسلہ ربیع الثانی تک حیدرآباد میں جاری رہتا اور جن پیمانوں پر یہ مجالس ہوتیں حیدرآباد کو یہ بات پہلے کبھی نصیب نہیں ہوئی تھی، شروانی صاحب ان جلسوں کے صدر ہوتے، ان جلسوں میں انھوں نے نہایت معرکۃ الآرا وعظ کہے، اعلیحضرت بھی بعض جلسوں میں شرکت فرماتے، شروانی صاحب ان ایام میں حیدرآباد کے مسلموں میں محبوب ترین ہستی تھے، ربیعین میں راتوں کو تھیٹر اور سینما خانے عموماً مسلمانوں سے خالی ہوجاتے، اسلام نے ایک عملی رنگ اختیار کرلیا تھا، بعض مجالس کے حالات میں نے منظوم کیے ہیں، اور اکثر وعظوں کے نوٹ میرے روزنامچوں میں محفوظ ہیں،

حیدرآباد میں خدمات کا مختصر کارنامہ | جن لوگوں نے شروانی صاحب سے پہلے حیدرآباد کے محرم، رمضان، اور ربیعین وغیرہ دیکھے ہیں اور حالات مذہبی پر نظر کی ہے، اب وہ اسی حیدرآباد کو شروانی صاحب کی صدارت میں

کے زمانہ میں دیکھیں اور دونوں حالتوں کا مقابلہ کریں اگر صدالمہام فینانس جواب ایک مسلمان ہے، مسٹر گلا
عیسائی انگریز سابق صدرالمہام فینانس کی طرح مالی معاملات میں صیغۂ امور مذہبی کے ساتھ کشادہ دلی
سے پیش آتا تو میں بڑے بڑے اسلامی رفاہ و ترقی کے واقعات دکھا دیتا، کیونکہ میں اسی امور مذہبی کے صیغہ
کا سب سے بڑا سررشتہ دار تھا، اور ہدایات میرے ہی ہاتھوں سے ہوتی تھی لیکن پھر بھی اس گئی گزری مالی حالت میں
شروانی صاحب نے جو کچھ کر دکھایا وہ نہایت اختصار کے ساتھ حسب ذیل ہے،

محرم کی بدعات شنیعہ یعنی مسلمانوں کا شیر، ریچھ، بھیڑیے بنانا، تاڑی سیندھی کے نشہ میں چور ہجوم و ہنگامہ آرائیاں اور
بدمستیاں کرنا، عورتوں کی اس مستی میں بے حرمتی کروانا وغیرہ ایسی سب باتوں کی ایسی جڑ کاٹ دی کہ پھر ان باتوں کا عود کرنا قطعی
ناممکن ہوگیا، تاڑی اور سیندھی پینے جانا اور اسی حالت میں میلاد خوانی کرنا، دکھنی بھٹیاری میں نوت خوانی، بانی مجلس کا تاڑی
اور سیندھی دیکر ان بدبخت میلادخوانوں کو رات بھر تنہا الاپتے چھوڑ دینا اور خود گھر میں جاکر سو رہنا معدوم کر دیا گیا، یہ انتظام کیا گیا کہ ان
میلادخوانوں کے طائفے صدارت العالیہ میں طلب کئے گئے، انکی جانچ کی گئی، اہل کو میلادخوانی کی باضابطہ اجازت دیگئی، اور نااہلوں کو بمقابلہ
ممانعت کر دیگئی، سیندھی، تاڑی شراب وغیرہ کی دکانیں شہر پناہ سے باہر نکالدی گئیں، اور شہر پناہ کے اندر مسکرات کا باہر سے لانا جرم قرار دیا گیا،

اہالیان خدمات شرعیہ کا جیسے قاضی وغیرہ احتساب ہوا، امتحان لیے جانے لگے، سندیں دی
ان کے لڑکے تکمیل تعلیم دین کے واسطے مدرسۂ نظامیہ حیدرآباد میں بھیجے اور دارالاقامہ میں رکھے گئے،
قاضیوں کے دفتر از سر نو ترتیب دیے گئے، رویت ہلال کی صحت کا بڑی احتیاط کے ساتھ اہتمام کیا گیا،
مسجدوں میں تنخواہ دار اماموں کی تعداد میں اضافہ کیا گیا، مؤذن، جاروب کش، جانمازدن، برقی بلکھون
پانی کے نلون، حوضون، طہارت خانون، غسل خانون، بڑی مسجد میں تنخواہ دار خطیبون وغیرہ کا اضافہ کیا گیا،
عیدگاہ میر عالم کی درستی اور توسیع ہوئی، جہاں اب بیس بیس ہزار مصلیون کا عید کی نماز میں ہجوم ہونے لگا،
اور اس عیدگاہ کو شروانی صاحب کی صدرالصدوری میں یہ فخر پہلی دفعہ نصیب ہوا کہ اعلیحضرت نظام دکن
میر عثمان علی خان بہادر خلداللہ ملکہٗ نے عید کے دو گانے اسی عیدگاہ میں ادا کرنے شروع کیے، اور امراء

دار الکین سلطنت عید کی نماز کو یہان حاضر ہونے لگے، اضلاع مین دینی مدارس اور اصلاحی تبلیغی انجمنین قائم کی گئین، انگریزی مدرسون مین دینی تعلیم کا خاص نگرانی کے ساتھ انتظام ہوا، واعظین مقرر کیے گئے، جو اضلاع کے دورے کرتے اور وعظ کہنے کو شہر مدراس تک بلائے جانے لگے، ہفتہ وار مذہبی رسالے جاری ہوئے، مدارس حفاظ قائم ہوئے، محکمۂ اوقاف کی تنظیم ہوئی، اکمنۂ مذہبی سے متعلق اراضیات فائدہ کے ساتھ لوگون کو دی گئین یا نگرانی سرکار مین لی گئین، مہتمم اوقاف و مساجد کے عہدے قائم کیے گئے، درگاہون کی آمد نیا خائن متولیون سے نکالی گئین، ماہ صیام مین چائے خانے، آبدارخانے اور ہوٹل دن مین بند کر دیے گئے، مسلخون مین ذبیحہ کی نگرانی کی گئی، حاجیون کے قافلہ کا خاص انتظام کیا گیا اور سہولتین بہم پہنچائی گئین، غیر آباد مساجد بند کرکے بے حرمتی سے بچائی گئین، مختصر یہ کہ شروانی صاحب کی صدر الصدوری مین مذہبی رنگ کچھ ایسا چڑھا کہ ولایت کے تعلیم یافتہ ہائی کورٹ کے جج اور حکیمون نے بھی کے فیصلون اور مطب کے ساتھ ساتھ مجالس وعظ و میلاد مین خوب خوب تقریرین کین،

شروانی صاحب نے ایسے نازک مذہبی جذبات و تعصبات کے زمانہ مین جیسا یہ زمانہ ہے تمام مذاہب کے انتظام کی باگ ایسے دانشمندانہ طریقہ سے ہاتھ مین لے کر کام کیا کہ ان کے خلاف کسی مذہبی گروہ کی آواز بلند نہ ہوئی، اور یہ ان کے عادلانہ انتظام کا کھلا ثبوت ہے،

عادت کی فلسفیت | مذہبی حس عمل کے ساتھ شروانی صاحب کی عادت مین ایک خاص فلسفیت کا بھی مجھے تجربہ ہوا ہے، یعنی وہ دکھلاوے اور نمائش کے انسان نہین، کسی فوری جذبہ سے ان مین تبدیلی نہین ہوتی، اکثر باتین وہ نہایت بے پروائی کی نظر سے دیکھتے تھے، نہ سب سے بڑی خوشی کے موقع پر وہ از خود رفتہ ہوتے نہ بڑے سے بڑے حادثہ یا نقصان پر وہ شکستہ دل اور مغلوب ہوتے تھے، اسی فلسفیانہ مزاج کی پرواز کا یہ نتیجہ تھا کہ سفر کے بڑے بڑے مصارف، جو میرے اہتمام سے ہوتے تھے، باورچی خانہ، روزمرہ کا دسترخوان، اور تمام حیدرآباد کے خانگی انتظامون مین چیخ پکار، غصہ، غضب، اعتراض، اپنی

وجاہت کے اظہار، غرض ایسی کسی بات کا مین نے ان مین نشان تک نہ دیکھا، مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مین ان کی ہر ادا پر عاشق ہون، ایک سطحی خیال کا آدمی تو یہ باتین دیکھکر کہے گا کہ "شروانی صاحب مین قوتِ انتظام نہین"۔ لیکن ایک نگاہِ غائر دیکھے گی کہ ان تمامی باتون پر ایک اصل فلسفی کی طرح وہ توجہ نہین کرتے، اور ان کو قابل التفات نہین پاتے، اور شروانی صاحب کو سمجھنے کے لیے بڑی گہری مشاہدہ کرنے والی آنکھ کی ضرورت ہے، تعلیم اسلام ان مین کچھ ایسے عملی طریقہ سے پیوست ہوگئی ہے کہ جن معاملات کو ہم جیسے لوگ منجانب اللہ صرف زبانون سے کہنا سیکھتے ہین شروانی صاحب ان معاملات کے منجانب اللہ ہونے کا یقین رکھتے ہین،

قرونِ اولیٰ کے مسلمانون کو اگر آجکل کے بگڑے ہوئے لوگ دیکھتے تو ان کو (خاکم بدہن) احمق وخبطی کہتے، اور وہ برگزیدہ لوگ آجکل کے بندگانِ زر اور غلامانِ دنیا کو حیوان مطلق یقین کرتے،

حدیث شریف تو یہ تعلیم دیتی ہے کہ

خدمتگار کا قصور دن مین ستر بار معاف کرو، دولت وہ جمع کرتا ہے جس مین عقل نہین، سب سے بہتر وہ ہے جس کا برتاؤ اپنے گھر والون سے بہت اچھا ہو، بچون پر مہربان ہو، یتیمون کے سر پر ہاتھ پھیرو، بدزبانی نہ کرو، غصہ سے دور بھاگو، خوش خلقی مسلم کی سب سے اچھی صفت ہے، وغیرہ وغیرہ

جب اس معیار پر ہم شروانی صاحب کو جانچتے ہین، اور پورے چھ سال ایک عیب جو جاسوس کی طرح ان کو دیکھا ہے اور اپنے روزنامچون کی تین جلدین مین نے سیاہ کی ہین، لیکن مجبور ہون کہ فیصلہ شروانی صاحب کے حق مین دینا پڑا ہے، ہمارا روے سخن ایسے ملم رئیس کی طرف نہین ہے جو بات بات پر خدمتگارون یا ماتحتون کو اپنے زجر وتوبیخ، محاسبہ اور سخت گیری سے خائف وترسان رکھتا، جرمانے کرتا یا برطرف کرکے اپنے ناچیز وجود کو ایک بڑی ہستی ظاہر کرتا، اور خود فریبی کے مرض مین مبتلا ہے، یا اپنی دولت کی بدولت اخلاقی معصیت کا شکار ہے، اور اس کا ہمسایہ اس کے شر اور درازدستی

سے امن میں نہیں ہے،

رائے کی مضبوطی اور جرأت اخلاقی | حیدرآباد میں مجھے یہ دیکھنے کا موقع ملا ہے کہ چاہے کتنی ہی خطیر و کثیر مالیت کا دیوانی کا مقدمہ ہو لیکن تجویز میں انھوں نے پہلی دفعہ جو رائے لکھ دی اس سے پھر نہ ہٹے اور ججوں کے اصرار پر کہ ایک فقرے میں ذرا سی تغیر کر دی جائے کہ سب کی رائے کا اتفاق ہو جائے شروانی صاحب نے یہی جواب دیا کہ "رائے ایک دفعہ دیجاتی ہے، تجویز اعلیحضرت معظم کے ملاحظہ میں بھیج دیجائے"، اور اپنی رائے میں جو پہلی دفعہ لکھ دی تھی ذرا بھی تغیر و تبدیل نہ کی، ایسا تار حبیب گنج سے حیدرآباد کے ججوں کو حسب الحکم میں نے خود دیا تھا، اخلاقی جرأت کا یہ حال دیکھا ہے کہ سات لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا مقدمہ ہے، فریقین میں ایک طرف تو اعلیحضرت معظم کے خاص اسٹاف کا بڑا حضوری افسر ہے، اور دوسری طرف ایک ناچار بیوہ ہے، یہ مقدمہ پہلے اس بڑے درباری کے حق میں اس طرح فیصل ہو چکا ہے کہ بیس مفتی علما بیوہ کے خلاف فتاوی لکھ چکے ہیں، درباری افسر کو ڈگری مل چکی ہے، لیکن اب وہ پرانی اور بھاری مثل اعلیحضرت آخری توثیق کی غرض سے شروانی صاحب کو بھیجتے ہیں، شروانی صاحب تجویز لکھتے ہیں، اور بصیغۂ اشد راز وہ تجویز مجھے دی جاتی ہے میں اسے صاف کرتا ہوں اور تجویز پر شروانی صاحب کے دستخط لیکر سربمہر لفافہ میں یہ تجویز مع مثل کے اعلیحضرت معظم کو بھیج دیتا ہوں، تجویز یہ لکھی گئی ہے کہ بیسوں فتاوی پر جو اسٹاف افسر کے موافق مفتیوں نے لکھے تھے، مدلل تردید کا قلم پھیر دیا جاتا ہے، اسٹاف افسر ہرایا جاتا ہے، بیوہ کے حق میں ڈگری دیجاتی ہے، نہ بیس فتاوی کا لحاظ فرمایا جاتا ہے، نہ اسٹاف افسر کی وجاہت و مروت راہ انصاف میں حائل ہوتی ہے، نہ اسٹاف افسر کا خوف ہے کہ دربار سلطانی کا ہر وقت کا حاضر باش ہے، آخر فقرہ اس تجویز کا یہ تھا "شرعی حکم تو یہ ہے، آئندہ اختیار سلطانی"، بعد کو معلوم ہوا کہ اعلیحضرت نے اسی تجویز پر عمل فرمایا، جو شروانی صاحب نے دی تھی، گذارش یہ ہے کہ بیس فتاوی کی تردید کسی معمولی فقیہ کا

کا کام نہین، نہ ایک ہندوستانی دربار مین ایسی جرأت اخلاقی آسان ہے،

جب کسی کی سرکار، عالی مین شروانی صاحب نے شفارش کی تو اپنی صائب رائے سے استحقاق کو ایسا ملحوظ رکھا کہ وہ سفارش کبھی نامنظور نہ ہوئی، ہان، ایک دو مثالون مین ایسا ضرور ہوا کہ شروانی صاحب نے مثلاً تیس روپیہ ماہوار کی سفارش کی تو اعلحضرت معظم نے تیس کو پچاس فرمادیا لیکن تیس کو پچیس یا بیس کبھی نہین کیا

کیسی ہی بڑی سفارش کے ساتھ کیسی ہی رایون یا تقریظون سے آراستہ کوئی تالیف و تصنیف قلمی شروانی صاحب کے پاس آئے جس کے متعلق مؤلف یا مصنف کو سرکار عالی کی سرپرستی، انعام یا وظیفہ کی بڑی توقع ہو لیکن وہ کتاب ناقص ہو، تو شروانی صاحب کبھی تو ایسا کرتے کہ اس پر رائے لکھتے ہی نہ تھے، انکار کر دیتے تھے، لیکن اگر لکھتے تو اس کتاب کے نقص نکال کر دکھا دیتے تھے، اور سفارشون یا تقریظون کا مطلق لحاظ نہ کرتے کبھی ایسا بھی ہوتا کہ سب سے زیادہ لایق عالم تقریظ نگار کو بلا کر وہ کتاب اس کے سامنے رکھ دیتے اور پوچھتے تھے کہ ایسی ناقص کتاب پر یہ تقریظ اس نے کس طرح لکھی اور تقریظ نگار کو معذرت کرنی پڑتی، کہ مؤلف کتاب نے اس کو جان سے تنگ کر دیا تھا،

دات کی صنعت کاری کا اثر اس عنوان مین سب سے پہلے یہ دکھانا ہے کہ کوئی عمدہ شعر ہو شروانی صاحب پر وجدانی حالت طاری کر دیتا تھا، یہ کلیہ یاد رکھنے کا ہے کہ حساس دل پر شعر کا اثر ہوتا ہے، اور ایسا ہی دل اخلاقِ حسن کا گنجینہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے،

اس سے اخلاقِ حسن کی کیا توقع کیجیے، شعر سے یعنی نہ جس بے حس کو لذت آئے ہے

شعر بھی نیچر کی سحر کاریون مین سے ایک سحر کاری ہے، اسی شاعرانہ طبیعت کا انسان تیز محسوسات رکھتا ہے، پھر عیب و ہنر، نیکی بدی، جھوٹ سچ سب ہی باتون کا اسے احساس ہوتا ہے، حسن و قبح سے وہ متاثر یا متنفر ہوتا ہے، کسی بے حس دل کو پتھر کا ٹول سمجھو اور ایسے دل والے سے کوئی توقع نہ رکھو

یہ بے حسی ہی تو ہے جو آدمی کو کنجوس، فریب کار، بے حیا، سنگدل، کذاب، ریاکار، نمائشی یا ابن الوقت بنا دیتی ہے، خودداری اس سے معدوم کر دیتی، اور صرف جاہ طلبی اس کا نصب العین بنا دیتی ہے،

چنانچہ فطرت کی صنعت کاری کا اثر جو ہم نے خود شروانی صاحب پر دیکھا ہے یہ ہے کہ وہ بھوٹگیر کے دورے میں جاتے ہیں، ہم ساتھ ہوں، بھوٹگیر کے آسمانی قلعہ پر جو صرف ایک پتھر کی چٹان پر کسی پرانے زمانہ میں تعمیر کیا گیا تھا صرف تفریح اور تاریخی تحقیقات کی غرض سے پہنچنے کو، اس رفیع الشان چٹان پر ہم چڑھنا شروع کرتے ہیں، راہ میں ٹھہرتے اور دم لیتے جاتے ہیں، آخر میں جب ہم بڑی بلندی پر پہنچتے ہیں شروانی صاحب چٹان کے ایک شگاف میں پانی بھرا پاتے ہیں جس میں نیلوفر کے صرف دو پھول کھلے ہوئے ہیں، یہ پھول دیکھتے ہی شروانی صاحب پر عجیب حالت طاری ہو جاتی ہے، وہ اس بلندی، پہاڑی کی خشکی، پھر یہاں پانی، پانی میں نیلوفر، نیلوفر کی شادابی پر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں، ان کا برقی خیال صانع حقیقی کی قدرت اور صنعت کی طرف جا پہنچتا ہے، وہ اس مقام پر ٹھہر جاتے اور اسی مبحث پر عجیب مؤثر پیرایہ میں گفتگو کرتے ہیں،

حبیب گنج کے اپنے بے نظیر باغ کے چمن میں وہ ٹہل رہے ہیں، جنوری کا مہینہ ہے، گلاب ایسا کھلا ہوا ہے، کہ چمن میں گویا آگ لگ رہی ہے، بس وہ کسی شاداب پھول، اس کے گہرے، ہلکے رنگوں اور اس کی نزاکت پر غور کرتے، اور صانع حقیقی کے کمال اور قدرت کے خیال میں غرق ہو جاتے ہیں، پھر مجھکو ایک ایک باریکی اور مصور قدرت کی تعلم کاری سمجھاتے ہیں، اور اسی حالت میں میں سودا کا یہ شعر پڑھتا ہوں ؎

رنگِ گل بے طرح دھکے ہے سن اے ابر بہار آشیاں میرا چھڑک لگتی ہے اب گلشن کو آگ

چمن کے قطعی حسب حال یہ شعر سنکر ان کا دل ایک اضطراری ولولے سے بھر جاتا ہے، کسی سایہ دار درخت، کسی پتے، کسی پھل میں بس فوراً صانع حقیقی کی قدرت گویا شروانی صاحب پڑھنے لگتے تھے،

ہم کو سرسون کے وسیع کھیتون کے کنارے بھی کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا ہے، جہان تک نظر جاتی ہے زرد پھولون کا ایک زعفران زار ہے، نظر لوٹی جاتی ہے، لیکن سب سے زیادہ روحانی لذت اس سے شروانی صاحب ہی کو ہوتی ہے، کیونکہ جمال مین وہ جمال آرا کا مشاہدہ فرما رہے ہین،

حیدرآباد کی کوٹھی امید منزل کے حاطہ مین عزیزی عبدالوحید خان نے چھرّے سے ایک دفعہ ایک چڑیا مار دی، ایسی حسین چڑیا ادھر شمالی ہندوستان مین نہین ہوتی، اس شہید بے گناہ کو شروانی صاحب نے دیکھا، اور انھون نے ایک عجیب انداز سے فرمایا" وحید! کس دل سے تم نے اسے مارا، کیا اس کا حسن بھی اس کا سفارشی نہوا، کس قدر تاسف کا مقام ہے کہ قدرت کا یہ حسین نقشہ کوئی یون مٹا دے"

یہ ذرا ذرا سی باتین ہین جو نہ اب عبدالوحید خان کو یاد رہی ہون گی، نہ شروانی صاحب کو خیال رہا ہوگا لیکن میرا حاسوس روزنامچہ اس حسین چڑیا کی شہادت پر ہمیشہ مرثیہ خوان رہے گا، اور شروانی صاحب کی رقیق القلبی پر گواہی دے گا، مختصر یہ کہ مین نے شروانی صاحب مین ایسی ایسی پاک صفتین دیکھی ہین کہ جنکی غالباً ان کو خود خبر نہین، اور اگر اپنے روزنامچون سے ان کی پوری تفصیل کرون تو یہ اعتراف ایک بڑی کتاب بنجائے گا،

اور تو اور شروانی صاحب کا طریقۂ تعلیم خیرات تو دیکھو کہ غریب بچون کو جیب گنج کی گڑی مین وہ خود اپنے ہاتھ سے پیسے نہین بانٹتے بلکہ اپنے چار برس کی عمر کے پوتے سے یہ پیسے بٹواتے ہین یعنی پوتے کو خیرات دینے کی تعلیم گہوارے مین دیجاتی ہے، مرحبا۔

نمود و نمائش سے نفرت اور عام اخلاق

شروانی صاحب کو رواجی شہرت کی نہ آرزو ہے نہ جستجو، اس کی کثرت سے مثالین مین نے دیکھی ہین، یعنی جب بڑے صاحبزادے آنریبل محمد عبدالرحمن خان سلمہٗ اللہ تعالیٰ کی شادی ہوئی تو یہ شادی بڑے اونچے پیمانہ پر ہوئی تھی، لیکن کسی انگریز کو دعوت یا گارڈن پارٹی مین مین نے نہ دیکھا، شمس العلما کا خطاب انھون نے نہ لیا، اور سرکاری تجویز ابتدا ہی مین نامنظور

کردی، سرکار آصفیہ کے خطاب "نواب صدر یار جنگ" کی انھوں نے اس لیے قدر کی کہ اسلامی سرکار سے اس کا واسطہ تھا، اور مذہبی نقطۂ نظر اس موقع پر ملحوظ تھا، حقیقی شہرت کا صحیح مفہوم وہ سمجھتے ہیں احسان کرکے نہ احسان جتاتے ہیں نہ محسن کے سے کبھی تیور اختیار کرتے ہیں، تعلیم اسلام کا ان پر گہرا عملی رنگ چڑھا ہوا ہے، کتب سیر، اور احادیث میں شمائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انھوں نے بے کار مطالعہ نہیں کیا ہے، صرف ادائے فرض اور مخلوق کے ساتھ بھلائی ان کی زندگی کا مقصد ہے جس میں ریا اور نمایش کو دخل نہیں اور اس زمانہ میں سب سے بڑی اور سچی یہی تعریف ہے جو کسی کی جا سکتی ہے، ان کی نیکیوں میں ایسی قوت ہے کہ "اہل" ہم نشین پر اپنا رنگ چڑھا دیتی ہیں اور یہ بات شروانی صاحب کے اخلاص اور صداقت کا بین ثبوت ہے،

آخر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ شروانی صاحب بھی صرف ایک انسان ہیں، فرشتہ نہیں، دنیا میں جتنی بڑی ہستی کا انسان ہوتا ہے، اسی قدر اس کی طرف نگاہیں اٹھتی ہیں اور اس گروہ میں ایک بھی انسان ایسا ہم کو تاریخ میں نہیں ملتا جس کو سب نے اچھا کہا ہو، اچھے انسان کی یہ پہچان ہے کہ اسے صاحب تمیز، انصاف کی اہلیت رکھنے والے، اور بے غرض لوگ اچھا کہیں، انسان کسی دوسرے انسان کو اکثر اپنے ذاتی جذبات یا اغراض کی عینک سے بھی دیکھا کرتا ہے، اور کبھی اغراض، رشک و حسد یا خود اپنے نفس کی خباثت سے یہ عینک غبار آلود ہو جاتی ہے، جس سے نورانی چیزیں صاف نظر نہیں آتیں بلکہ دھندلی اور گرد آلود نظر آتی ہیں، پس خطا نورانی چیزوں کی نہیں ہوتی، تقصیر غباری عینک کی ہوتی ہے، چنانچہ اس اعتراف میں جس پہلو کی شروانی صاحب کی تصویر نہایت دیانت و راستی سے دکھائی گئی ہے، وہ ناظرین کے سامنے ہے، اس تصویر کو دیکھتے ہوئے اب ناظرین دوسرے دولت والے امیر کبیر مسلمانوں سے جن سے ناظرین اچھی طرح واقف ہوں شیروانی صاحب کا مقابلہ کریں اور اگر یہ مقابلہ و موازنہ کرنے والے انصاف

فرمائین گے، تو ضرور ایک سبق آموز نتیجہ پر انشاء اللہ تعالیٰ پہنچ جائین گے،

آخر مین نازک خیالون سے میری یہ گزارش ہے کہ مین نہایت تنہائی پسند اور قریب قریب وحشی انسان واقع ہوا ہون، اُمراء کے پاس حاضر ہونے کو بہت سے عقلمند موجب فخر یقین کرتے ہین، لیکن مین امراء سے بہت ڈرتا ہون، شروانی صاحب میری یہ عادت اچھی طرح جانتے ہین میری سادہ لیکن نہایت مصروف زندگی انھون نے خوب دیکھی ہی، صرف ادائے فرض کو مین نے خوشامد کا قائم مقام یقین کیا ہے، لیکن اس بیگانہ روش پر شروانی صاحب نے مجھ پر بڑی بڑی مہربانیان فرمائی ہین پس یہ اعتراف صرف دو وجوہ سے مین نے لکھا ہے کہ کچھ تو ادائے شکر گزاری کا فرض پورا ہو جائے اور دوسرے ناظرین یہ دیکھین کہ بڑے فضل و علم اور مرتبہ اور دولت کا اصل مسلم کیسا ہوتا ہے، امراء کو مین اپنی طرح عاجز اور درماندہ سمجھتا ہون جنکو میری ہی طرح بھوک پیاس لگتی ہے، اور میری طرح ان کے درد سر بھی ہو سکتا ہے، اور یہ مین نے شروانی صاحب سے سیکھا ہے جنھون نے حیدرآباد کی ایک عظیم الشان مجلس مین اپنی تقریر کے درمیان فرمایا تھا "صاحبو! اپنے نفس سے محاسبہ کرنے کی عادت ڈالو، یہی تم کو بتلائے گا کہ تم جس قدر بڑا اپنے تئین خیال کرتے ہو اسی قدر زیادہ تم درماندہ، عاجز اور محتاج ہو، یہی عادت آدمی کو انسان بناتی ہے، اور یہی اسلام کی تعلیم ہے"

دار المصنفین کی نئی کتاب

امام رازی

امام فخر الدین رازی کو جو جامعیت حاصل تھی، اس کا تقاضہ تھا کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جائے، اسی کمی کو پورا کرنے کے لیے یہ کتاب لکھی گئی ہے، جس مین ان کے سوانح و حالات اور تصنیفات کی تفصیل کے ساتھ فلسفہ و علم کلام اور تفسیر کے اہم مسائل کے متعلق انکے نظریات و خیالات کی تشریح کیگئی ہی، جو لوگ قرآنمجید پر خالص فلسفیانہ حیثیت سے غور و فکر کرنا چاہتے ہین ان کیلیے یہ کتاب مشعل ہدایت کا کام دیسکتی ہے

(مرتبہ مولانا عبد السلام ندوی) قیمت ۲ روپے

"منیجر"

مولینا شروانی کی تصویر اُن کی تحریر کے آئینہ مین

از

شاہ معین الدین احمد ندوی

نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مرحوم ہماری پرانی تعلیم و تہذیب کے اُن نمونون مین تھے جن کی مثال اب نہ ملے گی اُن مین علم و عمل دین و تقوی اخلاق و شرافت وقار و متانت وغیرہ قدیم تعلیم و تہذیب کی تمام خوبیان اور وضعداریان جمع تھین،

وہ صاحب علم علم دوست، علماء نواز اور علم و فن کے بڑے قدر دان اور سرپرست تھے، ان کی ساری زندگی علمی و تعلیمی خدمات و مشاغل مین گذری، سرسید کے زمانہ سے لے کر موجودہ دور تک وہ مسلمانون کی تمام مفید علمی تعلیمی اور اصلاحی تحریکون کے حامی و مددگار رہے، کوئی اسلامی ادارہ ان کی عملی و اخلاقی امداد سے محروم نہ تھا، اسلامی علوم و فنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ اور قدیم تہذیب سے اُن کو عشق تھا، ان سب کی تفصیل ایک مضمون مین سما سکتی ہے، اور نہ ہمارا مقصود ہے، یہ مرحوم کے ان رفقاء اور معاصرین کا کام ہے جن کو ان کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، راقم کو صرف دو چار مرتبہ مختصر ملاقات کا موقع ملا ہے، اس لئے وہ اس پر لکھ بھی نہین سکتا، البتہ مرحوم کی تصانیف اور تحریرین برابر نظر سے گذرتی رہین جن مین اُن کے بہت سے خیالات رُجحانات اور خصوصیات کی جھلک نظر آتی ہے، اس مضمون مین اسی آئینہ مین اُن کی تصویر دکھانے کی کوشش کی جائے گی،

مسلمانون کی دینی اور قدیم تعلیم سے دلچسپی

مرحوم پرانی تعلیم کی یادگار اور عالم باعمل تھے، اس لئے عربی اور دینی تعلیم سے

اُن کو بڑی دلچسپی تھی، اور انھوں نے علمی و عملی دونوں حیثیتوں سے اُس کی خدمت کی، وہ شروع سے دارالعلوم ندوۃ العلما، کے معاون و مددگار رہے، انجمن ترقی عربی الٰہ آباد کے سرپرست، اور دوسرے عربی مدارس کے ہمدرد و خواہ تھے، مسلمانوں کی قدیم تعلیم اور اُس کے نصب العین پر ایک رسالہ لکھا ہے جس میں مذہبی نقطۂ نظر سے تعلیم کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے، یہ رسالہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے،

دارالعلوم ندوۃ العلما، کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت میں دینی تعلیم کے متعلق یہ خیالات ظاہر کئے ہیں

"ہمارے علما، کی یہ شان رہی ہے، کہ انھوں نے علم کو علم کے لئے حاصل کیا، علوم دینیہ سے انھوں نے خدا اور رسول کی خوشنودی مقصود رکھی، علوم دینیہ (جس کو بہت کم ذریعۂ جاہ و حشمت بنایا) اس کی خدمت بھی بحیثیت علم کرتے رہے، یہ واقعہ زرّین تاریخ کا کارنامہ ہے کہ جب بغداد میں مدرسۂ نظامیہ قائم ہوا، اور وہاں علما، کے گران قدر شاہرے اور طلبہ کے بیش قرار وظائف اور سامان آسایش مہیا کئے گئے، تو علمائے بخارا نے علم کی مجلس ماتم منعقد کی اور رو کر کہا کہ اب علم علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ و حشمت کے لئے حاصل کیا جائے گا"

(مقالات شیروانی ص ۲۰۴)

مسلمان علما، کے حالات میں علمائے سلف اور نابینا علما، دو کتابیں لکھیں اوّل الذکر میں علمائے سلف کے دینی تعلیمی اور اخلاقی و معاشی حالات و واقعات تحریر کئے ہیں جس کا اندازہ حسب ذیل عنوانوں سے ہوگا،

طلب علم، افلاس و تنگدستی و شوآریان، سفر کی مشقتیں، کتابوں کی نقل و کتابت، توجہ کامل، اور شوق طلب، حفظ و استحضار علمی، علم کی حرص، اس کی راہ میں صرف ہمارے سلف کا علمی ذوق، امرا میں علم کا ذوق،

اختلاف و اتفاق تمہید (جس میں یہ ذکر ہے کہ مذہبی نزاع کو سلف صالحین کیسا سمجھتے تھے)

اختلاف رائے صحابہ کے زمانہ میں، علمائے اہل سنت و جماعت کا برتاؤ، مخالف عقیدہ کے علما، کیساتھ مختلف مذہب کے علمائے اہل سنت کا آپس میں برتاؤ، جب نزاع کا دروازہ کھل گیا، تو خود علمائے اہل سنت

وجماعت باہم کس طرح مخالف ہوگئے،

حق پسندی وراست گوئی، حق پسندی حکام کے مقابلہ مین معاصرین وہم چشمون کے مقابلہ مین اپنے نفس کے مقابلہ مین،

حسنِ معاشرت کسبِ معاش، تجارت، حرفت، تمول، علمار کے تعلقات، سلاطین کے ساتھ اور ان کا اثر سلاطین پر، ملک پر، مخالف فرقون کی محبت علمار کے ساتھ، غیر مذہب کے لوگون کی محبت علمار کیساتھ، علمار کی معاشرت کے بعض امور حالات لباس، جسمانی ریاضت، اپنا کام خود کرنا،

ان عنوانات سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ اس کتاب مین قدیم تعلیم کے تمام اہم اور ضروری پہلوؤن علما کی حیثیت، ان کے فرائض اور ذمہ داریون اور ان کے اصلاح طلب امور کی پوری تفصیل آگئی ہے،

تعلیم جدید مین دینی روح کی ضرورت مرحوم زمانہ کے حالات وضروریات کے پیش نظر جدید تعلیم کے بھی حامی تھے اور ابتدا سے علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کے معاون و مددگار اور اس کے رکن رہے، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، کچھ دنون تک جامعہ عثمانیہ کے وائس چانسلر بھی رہے لیکن اُن کا دینی جذبہ جدید تعلیم مین بھی مذہبی روح دیکھنا چاہتا تھا، اس لئے وہ سرسید احمد خان کی تعلیمی واصلاحی کوششون کے معترف ومداح اور ان کے معاون ومددگار ہے، لیکن اُن کے مذہبی خیالات سے اُن کو سخت اختلاف تھا اور علی گڈھ کالج اور مسلم یونیورسٹی کی مذہبی حالت سے وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہے، اس کا ثبوت ان کی مختلف تقریرون اور تحریرون سے ملتا ہے، حیاتِ جاوید کے ریویو مین اس کی پوری تفصیل موجود ہے، اس مین انھون نے سرسید احمد خان کے مذہبی خیالات کے متعلق اپنے اختلافات تفصیل سے ظاہر کئے ہین، (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو مقالات شروانی ص ۴۸)

اسی ریویو مین کالج مین مذہبی تعلیم کی جانب سے بے توجہی پر بھی اظہار تاسف کیا ہے مولانا حالی نے حیاتِ جاوید مین یہ بھی تحریر کیا ہے کہ کالج مین مذہبی تعلیم کا بڑا اہتمام تھا، مولانا شروانی اس اہتمام کے لفظا

پر تحریر فرماتے ہین،

"جو حالت مذہبی تعلیم کی کالج مین عہدِ سرسید مین رہی، مین نہین سمجھتا کہ اس پر اہتمام کا لفظ کس طرح صادق آسکتا ہے،..... افسوس ہے کہ سرسید کے عہد ٹرسٹی شپ اور سٹریچی کی پرنسپلی کے زمانہ مین کالج مین جو چیز سب سے زیادہ غیر اہتمام بالشان تھی، وہ مذہبی تعلیم تھی، بجائے اس کے کہ اس کی تربیت سے مذہب کی خدمت ذہین نشین ہوتی، اور وہ ایک عمدہ پالیسی کے پیرایہ مین دماغون مین جاگزین ہوتا، ہماری سمجھ مین نہین آتا، کہ کالج کی جس مذہبی تعلیم کو سراہا جاتا ہے، وہ کیا چیز تھی، سرسید تحریر و تقریر مین ہمیشہ مذہب کے سرگرم حامی رہے لیکن عالمِ عمل مین آئے تو معلوم نہین ہوتا کہ وہ مذہب کیا تھا جس کے وہ حامی تھے" (مقالات شروانی صفحہ)

نان کوآپریشن کے زمانہ مین ٹرسٹیون کے ایک جلسہ مین کالج کے طلبہ کی مذہبی لاپروائی پر ان الفاظ مین تاسف کا اظہار کیا ہے،

"حضرات مین علی گڈھ اس خوشی کے خیال کرنے کو آیا تھا کہ طلبہ تحریک (نان کوآپریشن) کے اثر سے کالج کے طلبہ مین مذہب کا جلوہ دیکھون گا جس کی تمنا برسون سے دل مین تھی، بجو باوجود گوناگون کوششون کے اب تک حاصل نہ ہوسکا لیکن حالات دیکھ کر مایوسی ہوئی،..... رات مین نے عشا کی نماز کالج کی مسجد مین جماعت کے ساتھ پڑھی، میرا خیال تھا کہ اب جب کہ مذہبی روح طلبہ مین سرایت کرچکی ہے، (نان کوآپریشن کے اثرات مراد ہین) تو ایک بڑی آرزو پوری ہوگی، اور کم از کم ایک پوری صف مین طلبہ کو دیکھون گا، مگر افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی،

حضرات! اسلام ایک زندہ مذہب ہے اور جب تک دین قائم ہے، اسلام بھی قائم رہے گا، وہ زندگانی کا ایک خاص قانون لایا ہے جس کی پابندی عملاً ہر مسلمان پر واجب ہے،" (مقالات شروانی ص ۲۱۹ و ۲۲۰)

مسلم یونیورسٹی مین اسلامی آرٹ کے سلسلہ مین ایک تحریر مین لکھتے ہین،

"اسلامی آرٹ کا مفہوم تفصیل طلب ہی، سب سے بڑا اسلامی آرٹ وہ حسین زندگی ہے، جو عالم انسانی مین خالق جمیل کے جمال کامل کے پرتو سے جلوہ فرما ہوئی، اسلام ہی نے مخلوق کو بلا واسطہ خالق کے سامنے بٹھا کر یہ حسن زیبائی پیدا کی، حبیب کبریا وحی فداہ کی حیات حسن و جمال سے لبریز ہے، اور اسلامی آرٹ کا اشرف و اعلیٰ نمونہ اس کے بعد قرآن مجید اور خالص اسلامی علوم ہین، پھر اسلامی تاریخ ہے، جو دلون پر تصرف و فرمانروائی کی دلکش مثالون سے معمور ہے، ..... اس کے بعد شاعری ہے، پھر عمارت و صنعت ہے پھر خطاطی، سب سے آخر مین مصوری چونکہ تصویر بنانا شرعاً ممنوع ہے، اس لئے کمتر طبیعتین اس کی جانب مائل ہوئین، مگر اہل کمال نے حرفون کے نقوش مین عالم تصویر دکھایا، ایک استاد کا قطعہ ایک ہنر بین کی نگاہ مین وہی ذوق بخشتا ہے، جو ایک کامل مصور کی تصویر" (مقالات شروانی ص ۲۵۳)

اُن کی دوسری تقریرون اور تحریرون مین بھی اس قسم کے خیالات بکثرت ملتے ہین، لیکن ہمارا مقصد صرف ہر پہلو کی جھلک دکھانا ہے، اس لئے تفصیل مین نہ پڑین گے،

مسلمانون کی علمی تاریخ اور اسلامی علوم وفنون سے ذوق و شغف

اسلامی علوم وفنون اور مسلمانون کی علمی تاریخ سے والہانہ شیفتگی تھی، اور اُس پر انکی نگاہ نہایت وسیع تھی، اُن کی کوئی تقریر و تحریر شکل ہی سے اس تذکرہ سے خالی ہوتی تھی، ندوۃ العلماء کے اجلاس مدراس کے خطبۂ صدارت مین مسلمانون کی علمی تاریخ پر مختصر اور جامع تبصرہ ہے، فرماتے ہین:-

"اسلام جس سرعت و قوت سے پھیلا، اسی سرعت و قوت سے علم کا شوق مسلمانون کے دلون مین ترقی کرتا گیا، پہلی صدی ہجری مین ممالک اسلامیہ دار العلوم بن گئے، اس مین کسی قوم یا رنگ کی خصوصیت نہ تھی تابعین ہی کے طبقہ مین عرب کی جگہ عجمیون نے لے لی تھی، امام مکحول، عکرمہ، امام ابوحنیفہ وغیرہ ائمہ جلیل القدر عجمی تھے، حدیث مین ارشاد ہے، الحکمۃ ضالۃ المومن حیثما وجدھا اخذھا" اس گم شدہ

کی تلاش میں مسلمانوں نے دنیا کا کوئی گوشہ نہیں چھوڑا، جہاں سے خزانۂ علم حاصل نہ کیا ہو، کوئی علمی زبان نہیں چھوڑی جس کا سرمایہ عربی میں منتقل نہ کیا ہو..... جن ممالک میں مسلمان گئے علم اور علم کا شوق ساتھ لیتے گئے، حجاز، شام، یمن، عراق، ماوراء النہر، ایران، خراسان، کابل، ترکی، مصر، تونس، مراکو، اندلس، چین، صقلیہ اور بحر روم کے دوسرے جزائر جاوا وغیرہ شرق الہند کے جزائر ہندوستان غرض وہ کون ملک تھا جہاں مسلمان گئے اور وہ دارالعلوم نہ بن گیا، اُن کے شہر اور قصبے درکنار گاؤں تک مرکز علوم بن گئے۔ مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ، بغداد، اصفہان، نیشاپور، ہرات، طوس، دہلی، لکھنو، قیروان، قرطبہ، قاہرہ، قونیہ، بیت المقدس، بخارا، سطح ارض پر کہاں کہاں بکھرے ہوئے ہیں لیکن ان میں سے جس مقام پر جاکر گوش عبرت سے سنئے گا، ذرہ ذرہ کی زبان پر علوم اسلامیہ کا تذکرہ پائے گا، (مقالات شیروانی ص ۲۰۱)

یہ اس خطبہ کا ایک اقتباس ہے، خطبہ میں اس اجمال کی تفصیل پر نظر ڈالی گئی ہے، اُن کی بعض تصانیف اور بیشتر مضامین اسلامی علوم کی تاریخ سے متعلق ہیں، خود علمائے سلف سے اسلامی فنون کی تاریخ کے بہت سے گوشوں پر روشنی پڑتی ہے،

مسلمانوں کی علمی دولت کی بربادی کا ماتم

ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے ساتھ، اُن کے علم، دولت، اور اعمال و اخلاق پر بھی زوال طاری ہوگیا تھا، اور نا اہل اخلاف کے ہاتھوں اسلاف کرام کا علمی خزانہ بھی تلف ہونے لگا تھا، ہزاروں بیش بہا قلمی، اور نادر کتابیں کوڑیوں کے مول بک کر ردی میں پہنچ گئیں، جو کچھ بچا کھچا سرمایہ باقی رہ گیا تھا، سرسید احمد خان نے اس کے تحفظ کی جانب توجہ کی تھی چنانچہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے مقاصد میں نادر قلمی کتابوں کی تلاش اور اُن کی حفاظت بھی تھی، لیکن اس پر عمل نہ ہوسکا، کانفرنس کی باگ جب مولانا شروانی مرحوم کے ہاتھوں میں آئی، تو انھوں نے دوبارہ اُس کی جانب توجہ کی، اور ۱۹۱۹ء میں قلمی کتابوں کی حفاظت نے علمی خزانوں کی بربادی کے عنوان سے ایک دردانگیز اپیل شائع کی، یہ اپیل بہت طویل ہے، اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں،

ہندوستان مین سلطنتِ مغلیہ کے زوال اور بربادی کے ساتھ ساتھ جہان مسلمانون کی دولت اور ثروت کا خاتمہ شروع ہوا، اُن کی جاگیرین، زمینداری اور علاقے برباد ہوئے، اُن کی اخلاقی اور دماغی قوتین بھی فنا ہونا شروع ہوئین، اسی کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور تحصیل علوم کا سرمایہ یعنی بیش بہا کتاب خانے جو جواہرات سے بھی زیادہ قیمتی تھے، تباہ ہونا شروع ہوئے،

جو اسلاف مندِ علم کی زینت دینے والے تھے، اُن کے اخلاف اور قائم مقام ایسے ہوئے جنھون نے ان انمول موتیون کی سنگریزون کے برابر بھی قدر نہ کی، غدر ۱۸۵۷ء کے واقعہ کو ابھی پون صدی بھی نہین گذری اہلِ بصیرت کو اس کا علم ہے کہ اس زمانہ مین شہر تو شہر عمدہ قصبے بھی ایسے تھے، جہان یہ علمی سرمایہ بہت کچھ موجود تھا، دہلی، لکھنؤ، لاہور، پٹنہ، آگرہ، سورت، احمدآباد، بنارس، بلگرام، کاکوری، پانی پت، مارہرہ، امروہہ، اور مثل ان کے بہت سے مقامات تو گویا اس بازارِ علم و عمل کے ساہوکار تھے جس مین متاعِ حدیث، فقہ، تفسیر، منطق، معانی، تاریخ، طب، حکمت و فلسفہ، اور عربی و فارسی ادب کی کتابین، نامی شعراء کے دواوین، قلمی بے بہا نسخون، مشہور خطاطی کے اسنادون کے قطعات اور قلمی مرقعون کی شکل مین انبار کے انبار نظر آتے تھے، اُن کے مکانات کی الماریان اور بڑے بڑے صندوق ان جواہرات سے معمور تھے،

کتاب خانے ایک طرف رہنے کے مکانون کا یہ عالم تھا کہ جہان آج مکانات کی زینت اور آرایش مین یورپ کی نت نئی اشیا نے جگہ حاصل کی ہے، وہان اب سے پچاس ساٹھ برس پہلے تک مسلمانون کے دیوان خانون اور گھرون کے معمولی سے دالانون کی آرایش مین جو چیزین دیگر اشیاے نمایش مین نمایان نظر آتی تھین، وہ ان خوش نویس صاحبِ کمال خطاطون کی وصلیان اور طغرے ہوتے تھے جن مین نہایت پر معنی اور پر کیف بیتین پر نصیحت قطعے، پر اخلاق جملے، دل آویز فقرے، حدیث شریف اور کلام پاک کی آیت مبارکہ کے پر تاثیر جملے اس خوبی اور کمالِ تحریر کے ساتھ چوکھٹون مین رکھکر آویزان کیے جاتے تھے جن کے در و دیوار سوتے جاگتے، اخلاق آموزی، حکمت پژوہی، اور خوبی مذاق کی طرف زبان حال سے تعلیم دینے مین مصروف

رہتے تھے، اس دستور کی وجہ سے صدہا اقوال مسلمانون کے علمی لٹریچر کی جان بن کر جا ملون تک کی زندگی کا دستور العمل بن گئے،

جن علمی جواہرات کو ہماری جہالت نے خزف ریزون کی طرح پامال کرنا شروع کیا، یورپ نے اپنے دامن امید مین ان موتیون کو بھرنا شروع کیا، آج بڑے سے بڑے مسلمان عالم کی نادر و نایاب کتابون کا، مسلمانون کے علوم و فنون سے بچسپیون کا بڑے بڑے مسائل علمی پر اُن کی مجتہدانہ اور محققانہ موشگافیون کا میدان علم کی تلاش و جستجو مین اُن کے پر مغز کارنامون کا پتہ لگانا چاہو تو اس کا نشان یورپ کے سوا کہین اور نہین ملے گا، جب قوم مین قومی علوم کی یہ قدر افزائی رہ جائے تو پھر قومی خصوصیات کا ذکر اور اس کی بقا کی امید ایک قصۂ پارینہ سے زیادہ وقعت نہین رکھتی، جب اُن کے کتب خانے اپنے معلمانِ اخلاق کی تصنیفات سے خالی ہون گے، تو اس جذبہ اور کیفیت کی تلاش تحصیل حاصل ہے کہ کبھی ہماری قوم بھی علوم و فنون کی دنیا مین اخلاق پھیلانے کی اور تہذیب و شائستگی کو اس عالم مین رواج دینے کی کفیل تھی، اور ہم نے بھی یہ سبق عالم کو پڑھایا تھا،

ایسی کوشش جو مسلمانون کے قدیم قلمی و علمی ذخیرہ کو فن خوشنویسی اور خطاطی کے کمال کو اُن کی انتشار کے طور و طریق کے نمونون کو قدیم فرامین کو آئندہ کی تباہی اور بربادی سے محفوظ رکھ سکے، جہانتک میری محدود معلومات کا ذریعہ ہے کسی ذمہ دار جماعت کے اہتمام سے اب تک باقاعدہ طور پر عمل مین نہین لائی گئی، اور نہ اس وقت تک لائی جا رہی ہے، لہذا اس کی حفاظت کی تدبیر عملاً اختیار کرنے کا وقت حد سے زیادہ گذر چکا ہے، اور ضرورت اس امر کی ہے کہ بقیہ نقیہ جس طرح بن پڑے سمیٹ کر اکٹھا کیا جائے، اور اس کو درست حالت مین رکھنے کی توجہ کے ساتھ کوشش شروع کی جائے" (مقالات ص ۲۲۲ تا ۲۲۴)

یہ اپیل بہت طویل ہے، مذکورۂ بالا عبارت محض اس کا ایک ٹکڑا ہے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے

کہ مرحوم کو اسلامی علوم و فنون کے ساتھ کتنا شغف اس کی بربادی کا کتنا غم اور اُن کے تحفظ کا کتنا خیال تھا، گو یہ اپیل بھی زیادہ کارگر نہیں ہوئی لیکن انھوں نے خود اپنی محنت و تلاش سے بڑی دولت صرف کرکے نادر اور قلمی کتابوں کا بڑا بیش قیمت ذخیرہ جمع کیا، اور اُن کا ذاتی کتب خانہ قلمی اور نادر نسخوں کے اعتبار سے ہندوستان کے بہترین کتب خانوں میں ہے،

پرانی تہذیب اور قدامت و وضعداری سے شیفتگی

علمی ذوق و شوق کے بعد مرحوم کی زندگی کا نمایاں پہلو قدامت و وضعداری ہے، وہ خود قدیم تہذیب کا نمونہ تھے، اور اسی کا جلوہ وہ مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت میں دیکھنا چاہتے تھے، اُن کی تحریریں اس ذکر جمیل سے بھی بہت کم خالی ہوتی تھیں، اُن کے تاریخی مضامین میں کسی نہ کسی عنوان سے ان کا ذکر ضرور آجاتا تھا، اور جہاں ہندوستان کی قدیم سلامی سوسائٹی، پرانی وضعداریوں یا کسی پہلو سے پرانی تہذیب کے کسی رُخ کا ذکر ضرور آجاتا، وہاں اُن کے قلم کی بزم آرائی، اس اُجڑی ہوئی محفل کی یاد کی تڑپ اور تاثیر دیکھنے کے لائق ہوتی ہے، اور اُن کی تحریروں میں پرانی صحبتوں پرانے بزرگوں کی وضعداریوں، قدیم تہذیب و آداب اور دوسری تہذیبی خصوصیات کے بڑے دلکش مرقعے نظر آتے ہیں، اس کے کچھ نمونے ملاحظہ ہوں،

فارسی زبان کے فیض کے سلسلہ میں تحریر فرماتے ہیں:-

"فارسی ادب کی حیات بخشی کا ناقابل ثبوت وہ فضا ہے، جو اس ادب کی فیض باری سے سرزمین ہند میں پیدا ہوئی، اسی فضا کی روح پروری سے سارے مذہبی اور فرقہ واری اختلاف صلح سے بدل گئے، ہندو مسلم، شیعہ سُنّی، [illegible] سب ایک رنگ میں رنگ گئے، رنگ پوڈر کا نہیں جمعیت و یک جہتی کا تھا، گجراتی، مرہٹی، ہندی، بنگالی، گورکھی، وغیرہ جس زبان کو لوگے، ادب فارسی کی گرمی سے اس کی نبض میں جنبش پاؤگے، آج کل کی تصانیف نہیں، اس زمانہ کی تصنیف پڑھو، اس رنگ بلکہ بے رنگی کا واضح ثبوت پاؤگے، عارف رومی کی دو بیتیں یہاں بر سبیل تنزل سبق آموز ہوں گی،

چونکہ بے رنگی اسیر رنگ شد، موسی و فرعون اندر جنگ شد

چونکہ بے رنگی رسی کان داشتے موسی و فرعون دارند آشتی

حال و ماضی پر نظر ڈالو یہ شعر مکرر پڑھو، مرقع عبرت نگاہون کے سامنے آجائے گا،

افسوس دیکھتے دیکھتے اس بہار پر خزان آگئی، وہ فضا ہی مسخ گئی، خاقانی و انوری کا درس ہے، مگر مٹا ہوا برائے نام بلکہ نام کو بھی نہین، کیون ادبی فضا نہین نتیجہ آنکھون کے سامنے ہے، جو لوگ زمانہ حال کو بنا گئے، اُن کو آنکھین ڈھونڈھتی ہین، اور نہین پاتین، راجہ رام موہن رائے، پنڈت اجودھیا ناتھ سر سید احمد خان محسن الملک اور وقار الملک آج کہان ہین، ..... اس بے کیفی کی تاریکی مین اگر کسی طرف سے روشنی نظر آجائے تو اول حیرت اُس کے بعد مسرت ہوتی ہے، (مقالات ص ۴۱۴)

تیموری دور کے ایک صاحب علم و قلم امیر راجہ کندن لال آسکی کے حالات مین لکھتے ہین،

"اس عہد کی تعلیم پر نگاہ ڈالو علا وہ علوم کے مردانہ فنون، استعمال اسلحہ، گھوڑے کی سواری، فنون لطیفہ، خوش نویسی، تصویر کشی وغیرہ دائرۂ تعلیم سے باہر نہ تھے، راجہ کندن لال کی ہمہ گیر طبیعت کا رنگ اُن کی تصانیف اُن کی مختلف ملازمتون اور ان اہل کمال کی فہرست سے ٹپک رہا ہے جن سے وہ ملے، یہ ہمہ گیر طبیعتین وہی تعلیم پیدا کر سکی، جس پر صرف قدامت کے جرم مین نفرت کی نگاہین پڑتی ہین، (مقالات ص ۱۲۵)

فارسی شاعری کے مسلم الثبوت استاذ خواجہ عزیز لکھنوی کے حالات مین تحریر فرماتے ہین،

"لکھنؤ کی سبزی منڈی مین خواجہ صاحب کی بارہ دری گویا خیابان شیراز تھی، انسان وہان پہنچتا تو حافظ و سعدی کے کمال کی مہک پاتا رونق دوبالا ہوتی، جب علامہ شبلی بھی وہان ہوتے، اور یہ اکثر ہوتا، تو لکھنؤ کی حاضری مین خواجہ صاحب کی خدمت مین باریاب ہوتا، میرے لیے لازم تھا، جس وقت اطلاع پہنچتی، تو محلسرا سے اس شان سے برآمد ہوتے کہ لب پر تبسم ہوتا، ہاتھ مین چائے کا سامان بالآ

قلبی محبت جس کا اثر تمام حرکات وسکنات مین عیان نظراتا، مراسب پذیرائی کے بعد بیٹھتے باتین کرتے، چائے کی تیاری کا اہتمام جاری رہتا، ناممکن تھا کہ مہمان ہاتھ بٹائے، چائے مین زعفران ضرور پڑتی تہام کو سادی اور صبح کو دودھ ناشتہ کے ساتھ ..... خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا، بارہا حاضر ہوا، مگر کلام سننے یا حاصل کرنے مین اتنا کم کامیاب ہوا کہ گویا نہین ہوا، ہان دوسرون کا کلام سناتے ادبی نکتے بیان فرماتے علمی سوالون کا جواب شافی ملتا، ناممکن ہے کہ ان صحبتون کا ذکر ہو، اور مرحوم کی نورانی صورت یاد نہ آئے، اس کا ایک طرف خاکساری سے بیٹھنا، کلام کے مزے لینا، نکتہ سنجی، لطف کلام ایک خاص لطف رکھتا تھا، جو برسون گذر جانے کے بعد بھی آج تک نقش ہے، (مقدمہ کلیات عزیز لکھنوی ص ۲)

خواجہ صاحب باوقات وعبادت گذار تھے، مذہب کی طہارت اور مشرب کی وسعت اُن کے جملہ حرکات وسکنات سے خود بخود عیان ہوتی تھی، مشک انست کہ خود ببوید، نہایت غیور اور سیر چشم تھے، کسی کا بار احسان نہ اٹھا سکتے تھے، تحائف کا خوش اسلوبی سے فوراً عوض کر دیتے تھے، بعض دقہ دستی بھیجنے کا موقع نہ ملا تو پارسل ڈاک مین پہنچا، باوجود وضع کی پابندی اور شان استغنا کے نہایت ملنسار اور متواضع تھا، آدمی جتنی دیر حاضر رہتا، اخلاق کی پاکیزگی سے مسحور رہتا، حسن اخلاق مذہب وفرقہ کی قید سے بالاتر تھا، مسلمان، عیسائی، ہندو، سنی شیعہ سبکے ساتھ یکسان اخلاق سے پیش آتے محض ظاہری اخلاق نہین، بلکہ وہ اخلاق جسکا دل پر اثر ہوتا عارف جامی کا مشہور شعر گویا انکی زندگی کا اصول تھا

پس چنان زی کہ بعد مردن تو
ہمہ گریان بوند تو خندان

اپنے استاد مولانا لطف اللہ صاحب مرحوم کے حالات مین لکھتے ہین،

جب اس خاکدان سفلی مین اسلامی تمدن کی بہار آئی ہوئی تھی، اور اُس کے فیض سے ایشیا اخترتھا

اور یورپ تینوں برِ اعظم رشکِ گلزار بنے ہوئے تھے، اس وقت قصبات کا ایک عظیم الشان نظام ممالکِ اسلامیہ میں قائم تھا، یہ قصبات زندگی کے سرچشمے تھے جن سے شہر خصوصاً دارالسلطنت سرسبز و شاداب رہتے، شہری آب و ہوا، دو تین نسلوں کے بعد دماغوں کو سست کر دیتی، تو قصباتی اہلِ کمال تازہ زندگی لے کر پہنچتے، اور بزمِ حیات کو از سرِ نو منور و معمور فرماتے، دہلی مرحوم میں شاہ صاحب اور لکھنؤ میں فرنگی محل کا خاندان لاکھوں میں دو بتا لیں ہیں،

اُن کے عادات و خصائل کی تصویر یہ ہے:۔

"نشست و برخاست اور گفتگو میں تہذیب و وقار کی پوری شان تھی، نگاہ نیچی رہتی، کم سخن تھے لیکن خاموشی میں بھی ایک عالمِ شگفتگی محسوس ہوتا، روش سادہ تھی، جفاکشی اور محنت داخلِ عادت تھی، چھتری کبھی نہ لگاتے، شدتِ گرما میں سر پر چادر ڈال کر دھوپ میں چلے جاتے، اس سلسلہ میں ایک جان پرور واقعہ سن لو،

گرمی کے سخت موسم میں ایک مرتبہ مدرسہ عالیہ کا امتحان لینے رامپور تشریف لے گئے، امتحان سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے بارہ بج گئے، حسبِ عادت سر پر چادر ڈال کر پیادہ پا استاذ العلماء مولوی ہدایت اللہ خان صدر مدرس مدرسہ جونپور کے مکان پر پہنچے، مولوی صاحب قیلولہ کے لئے زنانہ مکان میں جا چکے تھے، اطلاع پر باہر تشریف لائے، اول ایک پلنگ صاف ستھرا بچھوایا، اس کے بعد مہمانِ محترم کی پذیرائی فرمائی،

شانِ پذیرائی غور سے سنو، یہ واقعے اب کہاں دیکھنا در کنار، سنو گے بھی نہیں، اپنے بھتیجے حافظ سعد اللہ خان کو بھیج کر کنوئیں سے تازہ پانی منگوایا، مہمان گرامی کے پاؤں پر عزیز سے پانی ڈلوایا، اپنے ہاتھ سے پاؤں دھوئے، سقاہ اللہ تعالیٰ کما سقانا،

ابھی کریم النفسی کی داستان باقی ہے، رامپوری فاضل اجل نے راوی سے یہ واقعہ بیان فرمایا تو

یون کہا کہ مولوی لطف اللہ صاحب نے بڑا کرم فرمایا، ایسی دھوپ مین تکلیف فرمائی، وہ بھی پیادہ پا اپنی خدمت کا اشارہ تک نہ کیا، ایک موقع پر جب راوی موصوف نے مفتی صاحب سے مولوی صاحب کی شکرگذاری کا ذکر کیا، تو فرمایا مین نے کیا کرم کیا، مجھ کو دوپہر کہین بسر کرنی تھی، وہین چلا گیا، کرم تو مولوی صاحب نے فرمایا یہ کہکر پاؤن دُھلانے کا واقعہ بیان فرمایا، دیکھو یہ تھے وہ پاک مشرب صاف سینے جن سے علمی فیض کے چشمے کیا دریا بہتے تھے،

آدم بر سر مطلب مزاج شگفتہ تھا، بامذاق تھا، تکلف سے بَری تھے، خاص صحبتون مین مزاح بھی فرماتے، شعر کا پورا ذوق تھا، خاص صحبتون مین شعر کا ذکر چھڑ جاتا، تو گھڑیون جاری رہتا، اشعار لطیف پڑھتے، لطف و خوبی ظاہر فرماتے، ایک ہی قافیہ یا مضمون پر متعدد اساتذہ کا کلام سناتے، عربی فارسی اور اردو ادب سے یکسان ذوق تھا،..... گفتگو ہر شخص سے علیٰ قدر مراتب شفقت و محبت سے فرماتے، جس کا اثر سامع محسوس کرکے محظوظ ہوتا، تعلّی یا ادّعا کا شائبہ بھی کلام مین نہ پایا جاتا، تقدس مآبی اور جلوہ نمائی پاس نہ تھی، تلاوت کلام مجید بھی تخیئے مین فرماتے، سخت کلامی اور فحش الفاظ غصہ مین بھی زبان سے نہ نکلتے (اساتذ العلما ص ۳۱، تا ۳۳)"

علامہ شبلی مرحوم کی خصوصیات کا مرقع،

"علامہ شبلی مرحوم سچے اور بااخلاص دوست تھے، اس زمانہ کی سوسائٹی کی بہت سی کمزوریون سے پاک اور صاف تھے، اُن کے اخلاق کا معیار بہت بلند تھا، نظر مین بلندی تھی، مزاج مین استغنا، حوصلے مین عزم تھا، مزاج مین نفاست تھی،..... صحبت نہایت پاکیزہ و شگفتہ تھی، انسان خواہ کسی درجہ کا ہو، ان کی باتون سے محظوظ ہوتا تھا، جس مسئلہ پر گفتگو کرتے، کمال کی خوبیان نظر آتین، عقلی پیرایہ مزاحانہ انداز، شاعرانہ نکتہ سنجی اُن کے بیان کے رفیق و ہمدم تھے، جب کبھی کسی علمی مسئلہ پر گفتگو ہوئی تو بعض نادر اور نازک پہلو ضرور بیان کئے، فضول باتین اُن کی زبان سے مین نے کبھی نہین سنین،.....

اعزہ کے ساتھ بہت الفت تھی، اپنے بھائی مہدی مرحوم کا ذکر برسون دلگیری کے ساتھ کیا دوسرے بھائی (مولوی اسحٰق صاحب) کی موت تو اُن کی جان ہی لے گئی، احساس بہت شدید تھا، اس لئے رنج والم سے بہت متاثر ہوتے تھے، ۱۹۰۲ء مین کانفرنس کے اجلاس کلکتہ کے زمانہ مین مین اور وہ ایک مکان مین مقیم تھے، ایک روز ایک نیم مردہ بھڑ نے اُن کے پاؤن مین ڈنک مار دیا، اس قدر بے تاب ہوئے کہ مجھکو حیرت ہوگئی، اس قدر زمانہ گذرنے کے بعد آج تک اس اضطراب کی تصویر آنکھون مین ہے، یہ احساس شاعری کا لوازمہ تھا، ہر ذوق مین شدت چاہتے تھے، نمک کھانے مین تیز ہو، دسترخوان پر نمک رکھ لیتے، اور کھانے مین ڈالتے جاتے، شیرینی بھی گلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتین کرتے جاتے ہین، قند کے دانے منہ مین ڈالتے جاتے ہین، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے ع

سخن ہاے شیرین بہ از قند ہست،

مرچ کی تیزی کی تاب نہ تھی فرماتے تھے، مین نے یہین ہتھیار ڈالے ہین،.....نیز پانی تیز و سرد پیتے تھے، جاڑون مین بھی یہی ہوتا تھا، اس کے ساتھ سردی و گرمی بہت محسوس کرتے تھے، ایک مرتبہ جاڑون مین حبیب گنج تشریف لائے، متعدد رضائیان اوڑھین تسلی نہ ہوئی، دوسرے دن خاص اہتمام سے لحاف خوب روئی بھروا کر تیار کیا گیا، گرمیون مین ہندوستان چھوڑکر سرد یا کم گرم مقام پر چلے جاتے تھے، اس سلسلہ مین بمبئی کے سفر فارسی شعر و سخن کے یادگار رہین گے، چائے سادہ اور کڑی پیتے تھے، صبح کو نماز کے اوّل وقت چائے پی کر فارغ ہو جاتے تھے، عادات مین سادگی تھی، لباس عمدہ اور نفیس پہنتے تھے، غذا بہت کم تھی، آخر آخر مین غذا کی قلت پر حیرت ہوتی تھی"، (مقالات ص ۱۷۰، ۱۷۱)

منشی احتشام علی صاحب رئیس کاکوری کی تصویر،

"میرے محب قدیم منشی احتشام علی صاحب اسی آہنی حصار قصبہ کاکوری کے چشم و چراغ اور

نامور مستحکم آئین باپ کے فرزند تھے، اُن کی صفات مین دونون کا جلوہ تھا، لکھنؤ کی شایستگی کا لباس مین، کھانے مین، نشست و برخاست مین، معاشرت مین، گفتگو مین پورا جلوہ شایستگی کا نمایان، بلکہ تابان تھا لباس مین وہی انداز جاڑے اور گرمی کا تھا، جو عمائد لکھنؤ کا تھا، جاڑون مین شال اور جامہ دار کے جلوے، اور جوہر نظر آتے، گرمیون مین جامدانی وغیرہ نگاہ کو تازگی بخشتی، یہی نہین شال جواہرات وعطر وغیرہ کی شناخت اسکے مالہ وماعلیہ کی واقفیت اور پرکھ مین اعلیٰ دماغ تھا، اب بھی خربوزے اور آم کا شوق لکھنؤ کے اجڑے گھرون سے بعض نادر نمونے شال وغیرہ کے باہر سے آتا ہے جب ایسا موقع ہوتا، تو مین ضرور یاد آتا، قریبًا ہر سال شال کا کوئی نہ کوئی نادر نمونہ میرے واسطے خریدا جاتا، درست کرایا جاتا، اگر کنارے حاشیہ وغیرہ کی ضرورت ہوتی، تو شوشہ خانہ سے نکلوا کر اضافہ کیا جاتا، غرض پرانا بوسیدہ ٹکڑا نیا اور رعنا بن کر میرے سامنے آتا،

منشی صاحب کا دسترخوان قدیم مہمان نوازی، خوبی مذاق، بلند حوصلگی اور لطافت کا نمونہ ہوتا تھا برسون دیکھا لطف اٹھایا، ایک معیار بلند تھا جس سے کبھی نیچے نہ گرا، ہر کھانا دال سے لے کر بریانی اور مرغ فرنگ اپنے معیار پر ہوتا، دسترخوان ہمیشہ وسیع پایا، عزیز احباب صادر و وارد سبھی ہوتے، سب کی نشست مدارات یکسان بلا فرق ہوتی، کھانے مین منشی صاحب کی شگفتگی لطف پروری جان نوازی فرماتی، کھانے ہر ہر موسم کی رعایت سے تیار ہوتے، عادات مین منشی صاحب تکلف تصنع طمطراق سے بالکل پاک وصاف تھے، اسی کے ساتھ نہایت شایستہ اور پختہ وضع، مین نے باون برس کی مسلسل رفاقت مین کبھی کوئی فرق کسی عادت مین نہین پایا، بے تکلف اور مخلصانہ صاف گوئی، کلام مین تھی، رائے مین پختہ بلکہ سخت تھے، جو کسی رعب طمع، یا خاطرداری سے مرعوب واثر پذیر نہ ہوتی،

مذہب کے سخت پابند تھے، نماز روزہ اور اوراد و وظائف پر پورے عزم سے ثابت قدم، عقائد مین مستحکم یہ اثر تھا، حضرت پیر و مرشد کے فیض کا اور منشی امتیاز علی صاحب کی تربیت کا"

نہایت فیاض تھے، غریبون ملنے والون، صادر و وارد، حاجتمندون غربا و مساکین کی خدمت مین علانیہ اور خفیہ برابر سرگرم رہتے، اُن کی عظیم الشان کوٹھی کا ایک حصہ گویا بورڈنگ ہاؤس تھا، جو طلبہ کے لئے مخصوص تھا، متعدد مستقل ٹھہر کر تعلیم حاصل کرتے، بعض امتحانون کے موقع پر آتے تیاری کرتے امتحان دیتے چلے جاتے، اور یہ سب کے سب منشی صاحب کے مہمان ہوتے،

ایک حصہ کوٹھی کا عزیزون، مہمانون، دوستون کے تصرف مین رہتا، عارضی بھی اور مستقل بھی دوستی اور دوست نوازی منشی صاحب کے اوصاف مین یون نمایان تھی، جیسے آفتاب کی کرنین ہر موقع پر ہر معرکہ مین وہ دوستی کسوٹی پر پوری اترتی، محبت پیکر مجسم بن کر سامنے آجاتی، بہت کچھ لکھا گیا، پھر بھی قلب اور قلم دونون کہتے ہین کہ کچھ نہین لکھا، اللہ تعالیٰ کی رحمت اُن پر ہو، ایک نمونہ تھے، قدیم پاکیزہ اخلاق، وضعداری، حسن مذاق شائستگی، دوستی اور اسلامی زندگی کا (مقالات ص ۳۹۹ تا ۴۰۲)"

چودھری نوراللہ خان رئیس سہسوان کی خصوصیات مین تحریر فرماتے ہین،

"چوہتر برس کی عمر پائی، اس طویل عمر کو جس پاکیزگی اور وضعداری سے نباہ گئے، وہ ایک کارنامہ زندگی ہے، ایک صدی کے ان تین چوتھائی حصون نے عالم مین کس قدر تغیرات دیکھے ہین، اور کیسے کیسے انقلابون کا تجربہ کیا ہے، مگر چودھری صاحب کی ذات اُن کی زد سے بچی ہوئی تھی، وضع عادات و حرکات مین اپنے نیک سلف کے طریقہ پر قائم رہے،

عادات نہایت شائستہ، مگر بیحد مستحکم اور مضبوط تھین، برآمدہ مین ایک جانب چوکی بچھی رہتی تھی اس پر بنیٔ گدا اور تکیہ لگا رہتا، جمعہ کی نماز اور ضروریات سے فارغ ہوکر دوپہر تک اور پھر بعد ظہر اس پر نشست ہوتی تھی، اور آنے جانے والون کاروبار کے آدمیون اور اہل حاجت کے واسطہ اذن عام ہوتا، کوئی موسم ہو کیسی ہی سردی گرمی ہو، اس مین فرق نہ آتا تھا، عصر کی نماز کے بعد ہوا خوری کے واسطے جنگل کو تشریف لیجاتے اور مغرب کے وقت واپس آتے تھے، آندھی آئے بارش ہو اس مین تغیر نہ ہوتا تھا، (مقالات ص ۵۱)"

ذوق ادب وانشار | فطرۃً لطیف الطبع نفیس مزاج اور نازک خیال تھے، خوشگوار رنگینی کی بھی ہلکی سی جھلک تھی، اُن کی لطافتِ ذوق کا اثر اُن کی پوری زندگی مین نمایان تھا، چنانچہ اردو اور فارسی دونون زبانون کے شعروادب کا بڑا ستھرا اور پاکیزہ مذاق رکھتے تھے، اردو کے صاحبِ طرز ادیب تھے، اور اپنی تحریرون مین حسن انشار کا خاص اہتمام رکھتے تھے، اس لئے گو اُن کی تحریرین اور باوقار ہوتی تھی لیکن اس مین ادب وانشار کی تمام خوبیان اور لطافتین موجود ہوتی ہین، اپنے مجموعۂ مقالات کے دیباچہ مین لکھتے ہین:-

"ایامِ طالب علمی مین کتاب مختصر المعانی علامہ تفتازانی کی پڑھی تھی، اس مین علامہ کا یہ قول بلاغت مین پڑھا تھا، کمالِ بلاغت اس مین ہے، کہ واقعات کے بیان مین جوہر بلاغت نمایان ہون، اس لئے کہ واقعہ نگاری مین بیان واقعات کے تابع ہے، لہذا میدانِ تنگ ہے، اور افسانہ وخیالی مضامین کی نگارش مین بیان آزاد ہے، اور افسانہ ومضامین تابع اس قول کو دل نے لے لیا لکھنے کا شوق، واقعہ نگاری مین پورا ہوا، افسانہ اور خیالی مضامین سے طبیعت کنارہ کش رہی، خودستائی معیوب ہے تاہم بعض نکتہ سنج اربابِ ذوق نے جو خیال میری تحریرون کی بابت ظاہر فرمایا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ مین بحمداللہ کامیاب ہوا، اب نظر کو بڑھائیے، مقالات پڑھئے، اور خود فیصلہ کیجئے"

بلاغت کے ان نکتون سے اُن کی کوئی تحریر خالی نہین ہے، خصوصًا شعروادب کے مضامین مین جوہر بلاغت زیادہ نمایان ہین، امیر خسرو کی مثنوی مجنون ولیلی کا مبسوط مقدمہ جو مرحوم کی تنقید وتصحیح کے ساتھ ساتھ شائع ہوئی ہے، اور خود مرحوم کے دیوانِ فارسی مین اُن کے قلم سے فارسی شاعری کے ادوار اور اسکی خصوصیات پر تبصرہ اُن کی ذوق ادب نکتہ سنجی اور حسن مذاق کے اچھے نمونے ہین لیکن یہ سب بہت طویل ہین اُن کے اقتباسات نقل کرنا دشوار ہے، اس لئے ان کی مختلف تحریرون سے ادب پارون کے کچھ نمونے نقل کئے جاتے ہین،

مرحوم نے اپنے زمانۂ شباب مین حیدرآباد کے رسالہ حسن مین بابر پر ایک مضمون لکھا تھا، جو ۳۰ سال

کے بعد جب کہ اس بہار پر خزان آچکی تھی، کتابی صورت مین شائع ہوا، اُس کے دیباچہ مین لکھتے ہین،

"جون ۱۸۹۰ء سے ستمبر ۱۸۹۱ء تک مضمون بالا رسالہ حسن مین شائع ہوتا رہا۔ اس کو ۲ برس گذر گئے، وہ وقت ابتدائے شباب کا تھا، زندگی تازہ بہار تھی، امیدون کے پھول سے دل و دماغ شگفتہ و شاداب تھے، زندگی بعینہٖ اسی دلآویزی کے ساتھ نظر کے سامنے تھی، جیسے کسی خوشنما شہر کا پہلا منظر، اب بھی مضمون کے مطالب مین کسی ترمیم یا اضافے کی ضرورت محسوس نہین ہوئی، البتہ تقاضائے عمر نے فطرۃً بعض الفاظ کی شوخی و رنگینی پر چشمک زنی کی، مگر تصرف سے یہ خیال مانع رہا کہ یہ شوخی و رنگینی زندگی کے دورِ عزیز کی امانت ہے، اور امانت مین دست اندازی نارواہ، وہ عزیز عہد نہ رہا، تو اس کی یادگار رہے، یاد رہے ع

جوانی کجائی کہ یادت بخیر، "

فارسی غزل کی خصوصیات کے جلوے ملاحظہ ہون،

"فارسی غزل کو دیکھو، مضامین اس مین بھی تقریباً متحد ہین لیکن یہان (اردو غزل) سے وہان (فارسی غزل) ایک بات زائد ہے، یعنی خیال اس خیال کی نیرنگی نے غزل کو ایک ایسا شاہد رعنا بنا دیا ہے جس کے جلوون کی انتہا نہین، جب دیکھو ایک نیا جلوہ دیدہ افروز ہوگا، اور پہلا جلوہ دوسرے سے اتنا ممتاز ہوگا کہ یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ یہ وہی آفتِ روزگار ہے، جو پہلے جلوہ گر تھا، یا اور ہے،

عربی فارسی مین جس چیز نے شور و شر بپا کر رکھا تھا، وہ تصوف ہے، فارسی عربی گویون مین بہت سے باکمال ایسے ہوئے جن کے سینون مین عشقِ حقیقی کی آگ شعلہ زن تھی، یہ شعلے جب منہ سے نکلے تو غزل کہلائے" (مقالات ص ۸۶ و ۸۷)

شوکت بلگرامی نے رباعیات خیام کا ترجمہ اردو رباعی مین کیا تھا، اس کا دیباچہ مولانا شروانی نے لکھا تھا، اس مین تحریر فرماتے ہین:-

"رباعیون کا وزن مخصوص ہے، زبان مخصوص، خیال پورا ہونا در ہو، توحید، حکمت یا عشق کا نچوڑ اس مین ہو، ان قیود کے ساتھ چارون مصرعے باہم ایسے مربوط ہون کہ ایک پھول کی چار پنکھڑیان معلوم ہون، تلم شکن یہ کہ چوتھا مصرعہ کڑی کمان کا تیر بن کر نکلے، جو دل پر جا بیٹھے، خلاصہ یہ کہ ہر صنف سخن کی جان رباعی مین کھپانی پڑتی ہے، غزل کی تڑپ، قصیدے کی متانت، مثنوی کا تسلسل رباعی مین ہو، اس کے ساتھ رباعی کا مخصوص اختصار میدان سخن کو تنگ کرکے اشہب قلم کی کمر توڑ دیتا ہے، حاصل کلام عطر سخن رباعی ہے،

نیشاپور کے میخانہ قدیم مین ایک پیر میکدہ خیام تھا جس کے جام مین حکمت کا امتزاج ہوا، اس امتزاج سے نشہ دوبالا ہوکر جو رنگ لایا، اس کی جھلک اس بادہ شیراز مین ہے،

ازان افیون کہ ساقی در مے افگند حریفان را نہ سر ماند نہ دستار

ممالک ایشیا اس نشہ سے جھوم رہے تھے، یورپ بھی جام اول مین غوطہ ہو گیا، افلاطون کدہ ملیگرام کے خم نشین شوکت نے اس بادہ کہن کو تازہ روانی بخشی اور دور جدید سے آشنا کیا، یعنی نیشاپوری شراب اردو کے ساغر مین لنڈھائی، اس مے دوآتشہ سے نشہ کی رسائی دوبالا ہوگئی، اسی مے دوآتشہ پر اس وقت ایک نظر ڈالنی ہے، مبادا دامن صدارت پر دھبہ لگے، (ریاست حیدرآباد کی امور مذہبی کی صدارت کی طرف اشارہ ہے) اس لئے اول ایک شعر سنا دیتا ہون:-

نہ من تنہا درین میخانہ مستم جنید و شبلی و عطار مستند "

(دیباچہ مے دوآتشہ)

شیخ محمد بن طالب گجراتی کے حالات کی تمہید مین ارقام فرماتے ہین:-

"مغلیہ سلطنت کا آفتاب لب بام پہنچا تھا کہ ایک اور آفتاب علم طلوع ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب ملک عرب کو گئے، اور چشمہ رحمت کا صاف اور خالص آب حیات دل سے لگا کر لائے، شاہ صاحب کا فیض تھا کہ دریا بن کر ملک مین پھیلا اور سرد دلون کی خشک کشت زار سرسبز ہو کر لہلہانے لگی، (مقالات ص ۳۹۵)"

خواجہ میر اثر دہلوی کا سلسلہ شاعری یہ ہے، خواجہ میر درد محمد ناصر عندلیب، شاہ سعد اللہ گلشن، شاہ محمد قدرت اللہ قدرت، یہ اصحاب شاعری کے ساتھ صاحب دل بھی تھے، مولانا شروانی، خواجہ میر درد کے دیوان کے دیباچہ مین یہ شجرہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہین :-

"دیکھو گل کی جلوہ نمائی سے گلشن ہوا گلشن نے نالۂ عندلیب پیدا کیا، نالۂ عندلیب سے درد جلوہ افروز ہوا، درد سے اثر پیدا ہوا،

این سلسلہ از طلائے ناب است این خانہ تمام آفتاب است"

الہ آباد کی اڈیٹری مین مولانا شبلی مرحوم کے ساتھ مولانا شروانی کا نام بھی تھا، اس کی معلحت یہ بیان کی ہے :-

"جب اس رسالہ کے اجرا کی تجویز مجلس انتظامیہ نے منظور کی تھی تو اڈیٹری مین میرا نام اس وجہ سے نہم کیا گیا تھا کہ میری جہالت کی تاریکی علامہ شبلی کے خیالات کی تیز روشنی کی چکاچوند کو کم کرتی رہے گی اور بدگمانی کا زیادہ موقع نہ ملے گا، (مقالات ص ۲۰۱)"

علی گڈھ کالج کے مشہور استاد پروفیسر آرنلڈ اور مولانا شبلی کی ملاقات اور تعلقات کے علمی فوائد کی ان الفاظ سے تعبیر کی ہے،

"یہ دونون دلدادگان علم باہم ملے، اور اس طرح ملے کہ جس طرح مختلف اللون نور کی شعاعین باہم مل کر عالم کی روشنی کا سبب بنتی ہین"

مولانا شبلی کو شیرنی بہت مرغوب تھی، کچھ نہین تو شکر کے دانون ہی سے شغل کیا کرتے تھے، اس کا اس پیرایہ مین اظہار کیا ہے،

شیرنی گلوسوز مرغوب تھی، یہ عام منظر تھا کہ کاغذ پر قند رکھی ہوئی ہے، باتین کرتے جاتے ہین، قند کے دانے منہ مین ڈالتے جاتے ہین، وہ قند سے اور سامع اُن کے کلام سے شیرین کام رہتے ع

ع سخنہائے شیرین بہ از قند ہست"

خواجہ عزیز لکھنوی بہت کم سخن اور خاموش تھے، ان مین شیرین بیانی نہین تھی، دیکھئے یہ عیب حُسن بیان سے ہنر بن جاتا ہے،

"کم سخن تھے، اور سادہ بیان خودستائی سے کوسون دور اسلئے گفتگو مین خوش بیانی نہ تھی، مگر ع

وراے شاعری چیزے دگر بود

لیکن خواجہ صاحب کے اوصاف مین وہ تاثیر تھی کہ سیدھی سادہ مختصر باتون پر خوش بیانی کا دفتر قربان تھا،،

ایسے ادبی شرارے جن سے پوری تحریر چمک جاتی تھی، اُن کی تحریرون مین بکثرت ملتے ہین بلکہ ان کی کوئی تحریر بھی اُن سے خالی نہین جس کا اندازہ اوپر کے طویل اقتباسات سے بھی ہوا ہوگا، یہ فریہ مثالین اندازہ کرنے کے لئے پوری طرح کافی ہین، درحقیقت دوسرے مضامین طرزادیبون کی طرح مرحوم کا بھی ایک نہایت دلکش اور دلپذیر طرز تھا، جو انہی پر ختم ہوگیا،

صدق (جدید)

(زیر ادارت)

مولینا عبدالماجد بی اے دریابادی صاحب تفسیر القرآن

انشاء اللہ یکم دسمبر ۱۹۵۵ء سے پورے آب و تاب کے ساتھ نکلنا شروع ہو جائے گا،

قیمت سالانہ بجائے عہ کے ہے،

پتہ

حکیم عبدالقوی دریابادی مہتمم "صدق جدید" کچہری روڈ، لکھنؤ،

صدر یار جنگ

ذاتی تاثرات

از جناب مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی

نام نامی پر نظر سب سے پہلے اس وقت پڑی جب اپنا زمانہ اسکولی طالبعلمی کا تھا، اور مولانا شروانی ایک خاصہ پختہ کار اہل قلم، اپنی جوانی کی آخری منزلون مین تھے، اور علی گڈھ منتھلی کے مضمون نگار رہتے تھے، یہ ذکر کوئی ۱۹۰۵ء کا ہے، چند ہی روز مین دیکھا کہ اسم گرامی الندوہ (لکھنؤ) کے سرورق پر شریک ادارت کی حیثیت سے ہر مہینہ چھپ رہا ہے ـــــ ایک اڈیٹر تو مولانا شبلی نعمانی تھے، اور دوسرے ان کے حبیب لبیب اور ہم قافیہ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی،

الندوہ مین شروانی صاحب نے لکھا لکھایا تو برائے نام ہی لیکن نام بحیثیت اڈیٹر کے برسون چھپتا رہا ـــــ کچھ ہم رنگی اس باب مین مولانا شرر مرحوم سے حاصل رہی تخلص ان کا بچہ بچہ کی زبان پر لیکن شاعری کا نمونہ دیکھنا چاہیے تو کسی "ریسرچ اسکالر" کی دستگیری کے بغیر کامیابی ممکن نہین! مضمون شاید چند سال کی مدت ادارت مین ایک ہی لکھا "حیات خضر" دو نمبرون مین، باقی ان کے نام کا تلازم مولانا شبلی کے نام کے ساتھ ذہن مین خوب جم گیا ـــــ دو چار سال اور گذرے، اور اب کالج کی طالب علمی کے زمانہ مین جب تقریباً روزانہ حاضری مولانا شبلی کی خدمت مین رہنے لگی، تو معلوم ہوا یہ کہ کم از کم جانتک معاملات ندوہ کا تعلق ہے، خان شروانی اور شیخ نعمانی کے درمیان چولی دامن کا ساتعلق ہے

ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہے ــــ علی گڈھ اور اعظم گڈھ کے درمیان ایک اور وجہ ارتباط، ایک اور رشتۂ توافق و اتحاد!

صوری زیارت سب سے پہلے ندوہ کے ایک جلسۂ انتظامیہ مین ہوئی، سنہ غالباً ۱۹۱۱ء تھا، ارکان مین دو پارٹیان تھین (اور مسلمانون کی کس انجمن یا ادارہ مین پارٹیان نہین!) ایک فریق کے لیڈر مولانا شبلی تھے، اور دوسرے کے قاری شاہ سلیمان پھلواروی اور مولوی خلیل الرحمن سہارنپوری ہملوگ کالج کے چند لڑکے بھی تماشائیون مین شریک کہ اگر کسی موقعہ پر پبلک کی مدد کی ضرورت پڑی تو تو پبلک کے نمایندہ بنکر مولانا شبلی کو کمک پہنچائی جائے گی، فلان صاحب آئے اور فلان صاحب آئے ــــ اپنے لیے فخر کا یہ موقع کیا کم تھا کہ ایسے معزز جلسہ مین بیٹھنے کو مل گیا، تماشائی ہی کی حیثیت سے سہی! ــــ یہانتک کہ مولانا شروانی آگئے: حسن مردانہ کا نمونہ، چہرہ پر شرافت برستی ہوئی، متانت بلا مین لیتی ہوئی، مشہور یہ تھا کہ یہ زبردست "شبلوی" ہین، دیکھنے مین یہ آیا کہ یہ اپنا دامن ہر فریقانہ آلودگی سے بچائے ہوئے، نہ گفتگو مین گرمی، نہ لہجہ مین درشتی، ایک پیکر حلم و آشتی،

سنہ غالباً ۱۹۱۵ء تھا کہ اپنی ایک لغوی کتاب (لغو، تو اب کہہ رہا ہون، اس وقت تو وجہ نازش تھی) فلسفہ اجتماع کا مقدمہ الناظر مین نکلا، اس مین دہلی کے ایک واقعہ سے متعلق مولانا شبلی پر تعریض تھی، اس کی تردید اور صفائی مین بہ طور شاہد عینی کے شروانی صاحب کا مضمون الناظر کے دوسرے ہی نمبر مین موجود، لیکن تردید مین تلخی نہ تعریض، بس صاف اور سادہ بیان واقعہ، سیرت کی شرافت کا اثر چہرہ ہی پر نمایان نہ تھا، قلم بھی اسی رنگ مین ڈوبا ہوا تھا،

۱۹۱۸ء کی شاید جولائی کا مہینہ تھا کہ شروانی صاحب حیدرآباد صدر الصدور امور مذہبی ہو کر نئے پہنچے، ان کی مذہبیت اور گہری دینداری کا ڈنکا بجا ہوا، مین اپنی زندگی کے اسی دور مین الحاد و بے دینی کے لیے بے طرح پر رسوا اور بدنام، اور عین اسی زمانہ مین ایک کتاب کے سلسلہ مین خاص طور پر حیدرآباد

کے سکم پریس کی زد مین آیا ہوا، شروانی صاحب عہدہ کے لحاظ سے بھی مجھ سے کہین اونچے مرتبہ پر، پہلی مرتبہ حاضری کی نوبت اتنے مخالف حالات مین ہوگیا تو بہت ڈرتے ڈرتے لیکن پہلی ہی ملاقات مین معلوم ہوگیا کہ ڈرے محل اور اندیشہ بیجا تھا، خوب ملے، اس کا سایہ ہی نہین پڑنے دیا کہ میری بدمذہبی اور بدعقیدگی ان کی شفقتون اور عنایتون کی راہ مین کچھ بھی حائل ہورہی ہے۔۔۔ اپنا رہنا اس کے بعد کچھ ہی دن اورنگ آباد مین ہوا، شروانی صاحب کی فرض شناسی، دیانت، بے لوثی، مستعدی اور کارگذاری کے چرچے سن سن کر جی خوش ہوتا رہا،

اگست مین رخصت پر لکھنؤ آیا، اور یہان سے استعفا لکھ کر بھیجا، بیکاری کو ابھی ۸ ہی ۹ مہینے ہوئے تھے کہ اپریل یا مئی مین سر امین جنگ مرحوم (صدر المہام پیشگاہ مبارک) کا تار پہنچا کہ اعلیٰحضرت نے یاد فرمایا ہے، فوراً آجاؤ، گیا، اسٹیشن پر ہی حکم ملا کہ قیام سرکاری طور پر صدر الصدور امور مذہبی ہی کے یہان رہیگا، جانا اور رہنا پڑا، ۴، ۵ روز کے قیام مین مولانا کو خوب قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا، وہ ان کی صحیح مذہبیت (جس مین تعصب و نفرت کا شائبہ نہ تھا)، دینی پختگی (جو کرختگی سے ناآشنا تھی) معتدل اور متوازن خوش اخلاقی، مہمان نوازی، ایک مرتب نظام اوقات کی پابندی، جدید اور قدیم رنگ کی خوشگوار آمیزش، لباس و طرز معاشرت کی نفاست، وضعداری، ایک ایک چیز کا مشاہدہ ہوگیا، اور ایک ایک چیز دل مین اتر گئی، اعلیحضرت کے یہان باریابی، اور پھر میرے لئے ماہوار تفتیشی وظیفہ کی منظوری کے سارے مرحلون مین مرحوم جس شفقت اور اخلاص کے ساتھ قدم قدم پر رہنمائی فرماتے رہے، اس کا نقش آج تک دل پر تازہ ہے،

اب تعلقات بڑھے، اور مراسلت خاصی کثرت سے رہنے لگی، اور ذاتی، قومی، ملی، دینی سب ہی مسئلے موضوع گفتگو رہے، اور ملاقاتین کبھی لکھنؤ مین ہوتی رہین، کبھی علی گڈھ مین، اور کبھی حیدرآباد ہی مین،۔۔۔ مرحوم کو ندوہ کے ساتھ شغف تھا، اس کے رکن کیا معنی رکن اعلیٰ تھے، پابندی کے ساتھ اس کے ہر جلسہ مین شریک ہوتے، علی گڈھ سے سفر کرکے لکھنؤ آتے، اور ہمیشہ اپنے محب خصوصی منشی احتشام علی علوی کا کو [illegible]

کے ہاں ان کی خیالی گنج والی کوٹھی میں ٹھہرتے جب تک سفر کی قوت ذرا بھی باقی رہی، اس معمول میں فرق آنے پایا، اور علی گڈھ تو گویا ان کا گھر ہی تھا، یونیورسٹی کورٹ کی ہر میٹنگ میں التزام کے ساتھ کیوں نہ آتے۔

مسلم یونیورسٹی میں وائس چانسلر خواہ طوعاً خواہ کرہاً، ہر تھوڑی مدت کے بعد بدلتے رہے ہیں، ابھی مہاراجہ محمود آباد اس عہدہ پر ہیں، تو ابھی صاحبزادہ آفتاب احمد خان، کل سر سلیمان کا تخت سلیمانی اتر رہا ہے تو آج سر راس مسعود کے ورود مسعود کی تیاریاں ہو رہی ہیں، ابھی نواب مزمل اللہ خان کا طوطی بول رہا ہے، تو ابھی سر ضیاء الدین کا ستارۂ اقبال عروج پر ہے، ابھی نواب محمد اسمٰعیل خان ہاتھ لائے جا رہے ہیں، تو ابھی ڈاکٹر ذاکر حسین خان کی پیشوائی کے لیے فرش بچھ رہے ہیں، کورٹ کے ممبر کچھ ان کے ساتھ کچھ ان کے ساتھ، اور کچھ "ان" اور "اُن" دونوں سے الگ صرف اپنے ساتھ ــــ شروانی صاحب کا مرکز ثقل ہر حال میں اپنی جگہ پر قائم، ندوہ میں بھی تو اپنا امتیاز اسی طرح قائم رکھے ہوئے تھے، مولانا شبلی اور منشی احتشام علی کی پارٹیاں آپس میں برسرپیکار، لیکن شروانی صاحب کے تعلقات دونوں سے یکساں ہموار و خوشگوار، گویا دونوں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال!

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء کا زمانہ اسلامی ہند کی تاریخ میں ایک خاص ہیجان کا دور ہوا ہے، تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان زوروں پر، ملک کا سواد اعظم شیخ الہند مولانا عبد الباری فرنگی محلی، اور علی برادران اور مولانا ابوالکلام کے ساتھ، ساری فضا پر یہی حضرات چھائے ہوئے، ندوہ اور علی گڈھ دونوں زد پر اور ندوہ غریب تو خیر، اصلی اور معرکہ کا مورچہ علی گڈھ تھا، شروانی صاحب مع اپنے گنے چنے افراد کے دوسرے کیمپ میں، کچھ نہ پوچھیے کہ کیا کچھ سننا پڑا، کیا کچھ سہنا پڑا، جوش اور ہیجان کے وقت کس کو اپنی زبان و قلم پر قابو رہا ہے، آج گورنمنٹ کے جاسوس کہلائے، اور کل "حبیب الرحمٰن" سے "حبیب الشیطان" مشہور ہوئے! ــــ یہ بندۂ خدا سب کچھ صبر و متانت ہی سے سنتا رہا، سہتا رہا،

ایک زمانہ وہ تھا، ۱۳، ۱۴ سال قبل جب ابوالکلام آزاد کا شمار حلقۂ شبلی میں مبتدیوں میں تھا،

اور مولانا شروانی کے ہان ان کا تقرب خود ان کے لیے باعث فخر و مباہات تھا، اب دیکھتے دیکھتے وقت وہ آگیا تھا کہ مولانا ابو الکلام لیڈری کے بام بلند پر تھے، اور شروانی صاحب ایک اہل قلم، اور چھوٹے موٹے رئیس کی حیثیت سے جہان تھے وہین قائم ـــــ ظرف و شرافت کے امتحان کا اصلی وقت، دوستی و اتحاد کا نہین، مخالفت و بیزاری ہی کا وقت ہوتا ہے، پٹھان تو اپنی تند مزاجی کے لیے بدنام ہین، اور شروانی پٹھانون ہی کے ایک خاندان کا نام ہے، صدر یار جنگ کی مثال نے دکھایا کہ جنھون نے پٹھانون کو حلم و متانت سے یکسر معرا قرار دیا ہے، انھون نے کلیہ قائم کرنے مین جلدی یا غلطی کی ہے! محمد علی جوہر کا ایک شعر خفیف تصرف کے ساتھ ؎

یہ ظلم ہے کہ سب کو کرو ایک سا خیال
پاتے ہین حلم[1] سبھی کبھی شروانیون مین ہم

مارچ ۱۹۲۲ء تھا کہ اس وقت کی خوش عقیدگی کے جوش مین ارادہ عرس اجمیر مین شرکت کا کرلیا، لکھنؤ سے ساتھ مولانا عبد الباری فرنگی محلی کے قافلہ کا ہوگیا، ان پر باوجود علم و فضل کے مشائخانہ رنگ غالب تھا، خیر صاحب اجمیر پہنچکر مولانا کی پارٹی کی خوب خاطر داریان ہوئین، شروانی صاحب بھی یہان آئے ہوئے تھے، ذاتی طور پر ہر آستانۂ چشت کے عقیدتمند تو تھے ہی لیکن یہان اس وقت انکی آمد سرکاری حیثیت سے تھی، مملکت حیدرآباد کے صدر الصدور محکمۂ امور مذہبی کی حیثیت سے آئے ہوئے تھے، اعزاز و تکریم کے ساتھ ہر طرف سے ہاتھون ہاتھ لیے جارہے تھے، اور دیوان صاحب درگاہ کے مہمان خاص تھے، رات کے وقت محفل سماع مین دیکھا، عام لوگون کی صف مین مسند سے دور ایک معمولی شریک محفل کی طرح بیٹھے ہوئے! ان سے کہین بہتر جگہ پر تو ہم لوگ قابض تھے، وہ ذرا چاہتے تو بہتر سے بہتر جگہ ان کے لیے خالی کرائی جاسکتی تھی، لیکن طبیعت مین یہ انکسار کہ ہر طرح قدرت رکھنے کے

---

[1] اصل شعر مین بجائے 'حلم' کے 'عقل' ہے

باوجود اپنے لیے مقام امتیاز کسی طرح گوارا نہیں! ـــــ غلبۂ تواضع کے مشاہدہ کا یہی ایک موقع نہ تھا، حیدرآباد، اعظم گڈھ، علی گڈھ، لکھنؤ مین خدا معلوم کتنی بار اور مشاہدے اسی قسم کے پہلے بھی ہو چکے تھے، اور بعد کو بھی ہوتے رہے، ۱۹۴۲ء یا ۱۹۴۳ء مین علی گڈھ مین کسی عالم دین کا تقرر ہونے والا تھا، انتخابی کمیٹی مین مولانا شروانی کے ساتھ یہ خاکسار بھی تھا، "انٹرویو کے وقت جب مختلف علما آنے شروع ہوئے، تو صدر مجلس (وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد) کرسی صدارت پر صدیار جنگ کو بٹھا، کسی ضرورت سے باہر چلے گئے، ان حضرت نے کیا کیا کہ معاً خود بھی کرسئ صدارت چھوڑ اپنی جگہ اس بے علم و عمل کو بٹھا دیا! مین شرمندگی سے گڑا جاتا تھا لیکن ان کے شدید اصرار کے سامنے میرا انکار کیا کچھ چل پایا! ـــــ اور آخر زمانہ مین جب تک ذرا بھی سفر کے قابل رہے، یہ تو بارہا دیکھنے مین آیا کہ لکھنؤ مین ندوہ کی مجلس انتظامی کا جلسہ ہو رہا ہے، اور حضرت صدیار جنگ اپنی مستقل صدارت چھوڑے ہوئے اپنے ایک نیازمند ہی کی عزت افزائی کر رہے ہین!

گفتگو بڑی پرلطف ہوتی تھی اور پر مغز بھی، علمی، ادبی، شعری، مذہبی، تعلیمی، سیاسی جو موضوع بھی چاہیے چھیڑ دیجئے، اور گھنٹون اس مجلس سے سیری نہ ہوگی، اللہ نے رئیس کے ساتھ ساتھ دل کا رئیس بھی بنایا تھا، کھاتے پہنتے تو خوب تھے ہی، کھلانے کا ذوق بھی خوب رکھتے تھے، اور جاڑون کے موسم مین شب دیگ کی دعوت بڑے اہتمام سے کرتے، اس دعوت مین جو ایک بار بھی شریک ہو جاتا اس کا مزہ مدتون نہ بھولتا ـــــ تحریرین ادب سے بڑھکر انشاء پرداز کی شان رکھتے تھے، متین، سلجھا ہوا انداز بیان اور ہر طرح گٹھا ہوا، الفاظ ضرورت سے زائد نہ کم، بس ٹھیک اتنے ہی جتنے مؤثر ادائے مطلب کے لیے ضروری ہوتے، گویا ہوشیار اور فن کار معمار عمارت مین گڑھی ہوئی اینٹین چن چن کر اور گن گن کر لگا رہا ہے! ـــــ اور تحریر سے بڑھ کر اس کمال فن کا ظہور تقریر و گفتگو دونون مین، میدان مین خطاب عام ہو تو اور کمرہ کے اندر خطاب خاص ہو تو، زبان حشو و زوائد سے ناآشنا، میٹھے میٹھے بول گنے چنے ہوئے، دلکشی و تاثیر کے سانچے مین ڈھلے ہوئے، ۱۹۳۶ء مین جب حج و زیارت سے واپس آئے ہین تو حالات سفر خصوصاً مشاہدات

مدینہ منورہ سادہ اور بے ساختہ زبان میں اس انداز سے بیان کرتے کہ سماں بندھ جاتا، خود بھی آبدیدہ ہو جاتے اور سننے والوں کو بھی رلا دیتے،

غیرت دینی اور حرارت ایمانی کے تو کہنا چاہیے کہ پتلے ہی تھے، سنہ ۱۹۳۰ء یا سنہ ۳۱ء میں اردو کے ایک مشہور رسالہ نے دینی و اعتقادی حیثیت سے بڑا سر اٹھا رکھا تھا، ضرورت اس کی تھی کہ ملت اپنی اجتماعی قوت سے فتنہ کی سرکوبی کرے، خیر وہ تو جون توں کرکے ہو گیا، شروع سنہ ۳۲ء میں ایک منزل ایسی آئی کہ قانونی کارروائی کے لیے حکومت وقت کی منظوری یعنی ضروری تھی، صوبہ گورنمنٹ کے ہوم ممبر نواب مزمل اللہ خان مرحوم تھے، ان پر مجرم کی طرف سے سفارشوں کا جادو چل چکا تھا، ان اثرات کو باطل کرنے کے لیے درکار ایسی زبردست شخصیت تھی اور وہ صدر یار جنگ کی ذات میں ہاتھ آگئی ـــــ بچارہ نے پس پردہ رہ کر وہ سب کچھ کر دیا جو ایک مرد مومن کو ان حالات میں کرنا تھا،

اسے چند سال گذرے تھے کہ ایک اور فتنہ کا سامنا کرنا پڑا، آج سے ۲۵ سال قبل ہمارے جوار میں ایک نوجوان وکیل سجاد علی انصاری مرحوم تھے، پڑھنے لکھنے کے بڑے شائق، بڑے ذہین، شوخ نگار، ذاتی طور پر خدا کے فضل سے پورے مذہبی لیکن مذہبی عنوانات پر قلم اٹھاتے تو معلومات کی سطحیت و بے مغزی کے ساتھ شوخیوں میں بھی حدود سے تجاوز کر جاتے، علی گڈھ میگزین وغیرہ میں طالبعلمی کے زمانہ میں مضمون لکھا کرتے، اور ہم لوگ بھی داد دے دیتے، جس طرح ہر نومشق اور ہونہار اہل قلم کو اسکی ہمت افزائی کے خیال سے داد دی جاتی ہے، اللہ کا کرنا کہ سنہ ۳۴ء میں تو سجاد مرحوم کا عین شباب میں انتقال ہو گیا، اور اس کے کئی سال بعد بعض "خوش مذاق" بے فکروں نے ان کے مضامین اور ایک ناتمام ڈراما کو کتابی صورت میں چھاپ دیا، اور علی گڈھ کے شعبۂ اردو کے کارکنوں کو خدا معلوم اس میں کونسی ادبی خوبی نظر آئی کہ کتاب کو داخل نصاب کر دیا، اس خاکسار کو جب اس کا علم ہوا تو اس کھلی ہوئی بدمذاقی پر حیرت کے ساتھ غصہ بھی آیا، اور پہلے بہ ادب تمام یونیورسٹی کے استادوں

کی خدمت مین عرض معروض کیا، مطلق پزیرائی نہ ہوئی، ہار کر اور مجبور ہو کر بلند آواز سے چیخنا چلانا پڑا، اور اب یہان سے شرکت صدر یار جنگ کی شروع ہوتی ہے، وسط ۱۹۴۳ء مین ایک تحقیقاتی کمیٹی قائم ہوئی، جس کے صدر موصوف تھے، اس مجلس نے متفقہ طور پر کتاب کو نصاب سے نکلوا یا، حضرت کی پوری رائے صدق ۸ نومبر ۱۹۴۳ء مین اس کے ڈھائی تین کالمون مین درج ہو چکی ہے، یہان اس کے چند اقتباسات کافی ہون گے :-

"علی گڈھ میگزین کی جو بھی عزت کی جائے، بہرحال اردو کے اعلیٰ میگزین مین نہ تھا، اس مین مضامین کی اشاعت کسی بلندئ خیال یا پاکیزگئ ادب کی ضامن نہین ہو سکتی،

سخت قابل افسوس اور خطرناک یہ پہلو ہے کہ مجاز، فلسفہ، اخلاق، مذہب سب ہی سے بیزار ہین، مذہبی ادب کی عظمت کا ایک فقرہ مین یہ خیال خود خاتمہ کر دیا ہے، گویا ان کے یہان کوئی اصول زندگی نہین، بے اصول زندگی محبوب و مقبول ہے، ان کے ہان تین محبوب ہین، عورت کا شباب بشرطیکہ وہ عفت و عصمت کی گندگی سے پاک صاف ہو، ایک عرق شباب قحبہ جو کسی کمرہ پر داد عیش دے رہی ہو، وفا اور پابندی سے سخت بیزار ہو، کمالات نسوانی کا بہترین نمونہ ہے، اس کی تعریف مین ان کے تمام مضامین رطب اللسان اور گلریز ہین، اگر کوئی نوجوان عورت نکاح کر کے عصمت و عفت کی زندگی بسر کرے تو وہ خارج از بحث، ننگ انسانیت ہے،

دوسرا محبوب "معصیت لطیف" ہے، مگر باوجود پوری کاوش کے مجھکو پتہ نہ لگا کہ ان دو لفظون کا اصلی مفہوم مضمون نگار کے ہان کیا ہے، پڑھنے والا جس گناہ سے لطف لینا چاہے اسکو محبوب قرار دے لے،

تیسرا محبوب ان کا شیطان اور شیطنیت ہے، اول سے آخر تک شیطان اور شیطنیت کا سراپا ہے، خلاصہ کائنات قرار دیا ہے، بلکہ پیدایش عالم کی اصل حکمت،

اس کے مقابلہ مین انبیاء کرام، ملائکہ مقربین بلکہ ان کے ڈرامائی "وزجزا" کا خدا بھی پست و بے وقعت

ہیں، حضرت جبریل اور دوسرے مقرب فرشتوں کی جس طرح اس ڈراما میں شیطان کے مقابلہ میں تضحیک کی گئی ہے، اس کو پڑھکر ڈراما نگار کی فہم و دانش پر سخت تاسف ہوتا ہے، مذہب کے استخفاف سے محشر خیال اول سے آخر تک بھرا ہوا ہے، مضامین زلیخا، روز محشر میں جس طرح مضامین قرآنی کے مقابلہ میں کم فہمی جہالت اور خیرہ سری کا انتخاب ہے، وہ قابل صد نفرین ہے ..... بہرحال میری رائے میں محشر خیال نہ ادب ہے، نہ لٹریچر کی کوئی اعلیٰ خوبی اور تخیل الضب العین کی، اس طرح یہ کتاب مسلم یونیورسٹی کے اعلیٰ درس میں رہنے کا اپنی کسی خوبی کے لحاظ سے حق نہیں رکھتی ہے، اس کے اوصاف خود اس کے قدر دانوں نے دو تین لفظوں میں بیان فرما دیے ہیں، "شعلہ مستعجلہ" تلملایا اور جگمگایا" بس یہی پوری تعریف محشر خیال کی ہے، رات کو جگنو جگمگایا تلملایا، تھوڑی دیر میں شعلہ مستعجل کے مانند گل اور خاموش، پھر تاریکی اور اندھیرا"

اقتباس کے ذرا لمبے ٹکڑے سے مرحوم کی ادبیت، ذوق نظر، مذہبیت سب پر خاصی روشنی پڑ گئی، مسلم یونیورسٹی کی دینیت کے حق میں وہ ایک ستون مستحکم تھے، اور ملت کے سامنے ان کی تحریریں اردو میں ادب صالح کا ایک کامل ترین نمونہ تھیں، اب ایسی جامع شخصیت ڈھونڈھنے سے بھی کہاں نظر آئے گی؟ ــــ کُلُّ مَنْ عَلَیْہَا فَانٍ سیکڑوں بار کی طرح ایک بار پھر پڑھکر دل تھام لیجئے،

تاریخ اخلاق اسلام

اس میں اسلامی اخلاق کی پوری تاریخ، قرآن پاک اور احادیث کے اخلاقی تعلیمات اور پھر اسلام کی اخلاقی تعلیمات پر مختلف حیثیتوں سے نقد و تبصرہ ہے،

(مصنفہ مولانا عبدالسلام ندوی) قیمت: ۱۲ عہ

"منیجر"

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی

کے

خاندانی اور ذاتی حالات

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب ایم اے

علی گڈھ کا شروانی خاندان صوبہ متحدہ کا نہایت ممتاز صاحب وجاہت اور تاریخی خاندان ہے، مسلمانوں کی تعلیم جدید کا مرکز بھی علی گڈھ ہی تھا، اس لیے شروع سے اس کی امداد و اعانت میں شروانی خاندان کا بڑا حصہ رہا، نواب سر عزیز اللہ خان مرحوم شروانی عرصہ تک مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے، اور اس کو لاکھوں روپئے کے عطیے دیے، خود مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی مسلم یونیورسٹی کے رکن رکین اور آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سکریٹری تھے، ان کے علمی و تعلیمی خدمات کا دائرہ نہایت وسیع ہے، اس لیے دنیاوی دولت و وجاہت کے علاوہ اس خاندان نے علمی و تعلیمی خدمات انجام دی ہیں، اس لیے مولانا شروانی کی یادگار کے سلسلہ میں اس خاندان کی مختصر تاریخ بھی لکھدینا مناسب معلوم ہوا،

خاندانی حالات | ہندوستان میں شروانیوں کا ورود بہلول لودھی کے عہد میں ہوا، ۱۴۵۱ء میں جب اس بادشاہ نے خاندان سادات سے افغانوں کے لیے سلطنت ہند کو حاصل کیا، تو اس نے افغانستان کے قبائل کو ہندوستان آنے کے لیے ترغیب آمیز اور تحریص انگیز خطوط لکھے، چنانچہ فوج

قندھار سے چند سربرآوردہ قبیلے شروانی، غلزئی، لودھی، سوری، لوہانی، اور نیازی ہندوستان وارد ہوئے، ان میں سے شروانی، غلزئی اور لودھی حقیقی بھائیوں کی اولاد تھے، لودھیوں نے اپنی حکومت کا سکہ ہندوستان پر بٹھایا، اور شروانی خاندان نے مسند وزارت کو زینت دی، اور سپہ سالاری کے عہدۂ جلیلہ کے حقدار قرار پائے، بہلول لودھی کے عہد میں عمر خان شروانی وزارت کے منصب پر متمکن تھے، ان کا خطاب مسند عالی تھا، ان ہی کی کوشش سے سکندر لودھی کو دہلی کا تخت حاصل ہوا تھا، جب ابراہیم لودھی کا زمانہ آیا تو افغانی امرا، اس کی بے عنوانیوں اور مظالم سے تنگ آکر ملک کی مختلف سمتوں میں پھیل گئے، اور افغانی قبائل کا جو شیرازہ بہلول لودھی نے باندھا تھا، وہ منتشر ہوگیا، ۱۵۳۹ء میں جب شیر شاہ نے ہمایوں کو ہندوستان سے باہر نکال دیا، تو اس نے بنگالہ میں افغانی قبائل کی مجلس مشاورت منعقد کرکے یہ تجویز پیش کی کہ وہ جس کو چاہیں اپنی مرضی سے سلطنت ہند کا مالک بنا دیں، چنانچہ عمر خان شروانی کے فرزند نے اصرار کرکے خود شیر شاہ کو تخت نشین کرایا، شیر شاہی معرکوں کے بعد جب سلاطین مغلیہ نے افغانوں سے برہم ہوکر ان کا قلع قمع کرنا چاہا تو خاندان شروانی کے مورثوں نے شاہی تعلقات کو چھوڑ کر مختلف مضافات میں زمینداریوں پر قبضہ کرلیا،

مولانا حبیب الرحمن خان شروانی مرحوم کی خاندانی روایات سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ خاندان شروانی کے دو بزرگ محمد میر خان اور محمد مغیث خان نے لودھیوں ہی کے عہد میں سرکار کوں (یعنی علی گڈھ) کے نواح میں آکر آباد ہوگئے تھے، محمد میر خان کی اولاد پہلے موضع پرورہ میں آباد ہوئی، پھر وہاں سے دتاولی، برلہ، سہاولی، سنہرہ، دھنساری اور بروٹی کے مواضعات میں پھیل گئی، محمد مغیث خان کے تین بیٹے تھے، سالار الدین، رکن الدین اور بہار الدین، موخر الذکر کی اولاد میں سے اب کوئی باقی نہیں ہے، سالار الدین کی اولاد بھموری، بھکم پور، داؤدن، اکوریہ بوڑھا گاؤں حسن پور، کنولی، بھامون، ٹنڈولی اور کنادہ وغیرہ میں آباد ہے، محمد مغیث خان کے دوسرے بیٹے رکن الدین کی اولاد

دیہات بربرہ، بھرسولی، علی پور، اٹوا، گھنونہ، طبالپور، عنایتی وغیرہ مین آباد ہے، اور رکنڈی کہلاتے ہین، عبدل خان یا عبداللہ خان شروانی خاندان کے ایک بزرگ تھے جنھون نے جہانگیری عہد مین شاہی ملازمت اختیار کی، پھر مارکھ الدنیا ہوکر حضرت مخدوم ثنائی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار (واقع گنگیری) پر گوشہ نشین ہوگئے، اور وہین سپرد خاک ہوئے، ان کی قبر وہان اس وقت تک موجود ہے، اس زمانہ مین اس خاندان کے مشاہیر مین نواب یوسف خان ساکن راج مئو کنا وہ کا نام خاص طور سے قابل ذکر ہے، انکی شان وشوکت کے بڑے قصے مشہور ہین، ان کا سال وفات ۱۶۶۳ء بتایا جاتا ہے، روایات مین یہ بھی مشہور ہے کہ نواب یوسف خان نے عہد شاہجہانی دیکھا تھا، اور شاہجہان کے دربار مین حاضری کا شرف بھی حاصل کیا تھا، اور ان کو شاہجہان آباد مین منجنہ کا موضع عطیۂ شاہی مین ملا تھا، نواب یوسف خان کی والدہ اور بہن یا لڑکی کی قبرین خاص راج مئو مین ابتک موجود ہین، خود نواب یوسف کی قبر جھاڑی گھنا کنا وہ مین ایک حصار کے اندر واقع ہے، نواب یوسف خان کی شخصیت اپنے زمانہ مین بڑی ممتاز تھی، اور وہ اس وقت مرجع خلائق تھے، ان کے عروج واقبال کی کوئی انتہا نہ تھی، اس نواح مین دور دور تک کوئی رئیس ان کے مقابلہ کا نہ تھا،

۱۷۴۰ء سے ۱۷۷۱ء تک جاٹ گردی کے زمانہ مین پرگنہ علاقہ اترولی، سرکار کول کے حلقہ مین بوڑھا گانون بھموری، قلعہ چھپرہ، دھنساری، دتاولی، برلہ وغیرہ کے علاقے تباہ کر دیے گئے، چنانچہ اس جاٹ شاہی عہد مین شروانی خاندان کے افراد اپنی اپنی زمینداریان چھوڑ کر گنگا پار، کھٹیر، اور سہسوان چلے گئے، پھر طوائف الملوکی کا دور ختم ہونے کے بعد گنگا پار سے واپس آکر اپنی اپنی زمینداریون پر قابض ومتمکن ہوئے، گنگا پار سے واپس آنے والون کے سرگروہ بھموری کے بازخان صاحب تھے، جنھون نے اٹھائیس سال کی جلاوطنی مین بہت ٹھوکرین کھائی تھین، اور زمانہ کا بہت گرم وسرد دیکھا تھا، اس لیے جب وہ دوبارہ واپس آئے تو ایک پختہ کار اور تجربہ کار انسان اور زمیندار تھے،

اور انھون نے اپنی آبائی ریاست پر حسن تدبیر سے قبضہ کیا، بہت سے گاؤن بذریعہ بیع و نیلام حاصل کیے، ۱۷۹۱ء مین پٹہ زمینداری مین بھموری کا تعلقہ نامزد ہوا جس مین دادون بھی شامل تھا، مرہٹون کے استیلاء کے زمانہ مین یہ انتظام برقرار رہا، اس لیے بازخان صاحب کا اثر و اقتدار برابر ترقی کرتا گیا، ۱۸۰۳ء مین ان کا انتقال ہوا تو انھون نے ایک وسیع علاقہ ترکہ مین چھوڑا جس مین ۳۵ گاؤن تعلقہ بھموری بزرگ مین، اور ۲۰ گاؤن تعلقہ تاہ اور ۲۵ گاؤن تعلقہ ہرودی مین، ۱۴ گاؤن کنکتہ مین اور ۹ گاؤن رہن مین چھوڑے، بازخان خدا ترس بزرگ اور اپنے پیر کے بڑے عقیدتمند تھے، ۱۷۹۰ء مین انھون نے اپنے پیر کے حکم سے بھکم پور کو دوبارہ آباد کیا، اور خود مع اہل و عیال بھموری سے وہان منتقل ہوگئے، بازخان کی شادی ڈوری مین نصیب خان کی لڑکی سے ہوئی تھی بھموری کے قیام کے زمانہ مین ۱۸۰۵ء مین ان کو اچھلے اہیر سے دادون کے مقام پر ایک معرکہ پیش آیا جس مین خاندان کے لوگون نے بھی ان کا ساتھ دیا، اس معرکہ مین بازخان صاحب کے تلوار اور برچھے وغیرہ کے کئی زخم آئے تھے، ان کا انتقال ۱۸۳۰ء مین جب وہ حج کے لیے جارہے تھے بمقام بروہ ہوا، ان کی قبر بھی بروہ ہی مین ہے، ان کی بی بی جو مدینہ بی بی کے لقب سے موسوم تھین اس سفر مین ساتھ اور بڑی باہمت خاتون تھین، اس حادثہ کے باوجود انھون نے حج کا سفر ملتوی نہین کیا اور اس فریضہ کو مع الخیر پورا کیا،

بازخان صاحب کے تین بیٹے نامور ہوئے، خان زمان صاحب جو شاخ بھکم پور حبیب گنج کے مورث اعلیٰ ہین، حاجی محمد داؤد خان صاحب جو شاخ ظفر منزل علی گڈھ کے جد اعلیٰ تھے، اور حاجی غلام محمد خان جو بعد تقسیم جائداد ۱۸۳۵ء مین بھکم پور سے دادون منتقل ہوئے،

خان زمان صاحب ہی کی اولاد مین مولانا حبیب الرحمن خان شروانی تھے، ان کے والد ماجد کا اسم گرامی محمد تقی خان صاحب تھا،

ولادت | مولانا حبیب الرحمن خان کی ولادت بتاریخ ۲۸ شعبان المعظم ۱۲۸۳ھ مطابق ۱۸۶۶ء

صبح کے وقت بھیکم پور (ضلع علی گڈھ) میں ہوئی لیکن مستقل سکونت حبیب گنج میں رہی جس کو ان کے والد ماجد نے ان ہی کے نام پر آباد کیا تھا، حبیب گنج بھیکم پور سے چند فرلانگ کے فاصلے پر واقع ہے،

تعلیم | کلام پاک ختم ہوا تو تعلیم کی ابتدا فارسی سے ہوئی، جو قدیم مکتبی طریقہ پر گھر ہی پر دی گئی، فارسی نصاب میں سہ نثر ظہوری، مینا بازار اور دیوان غنی وغیرہ ختم کرلیا، تو عربی شروع کرائی گئی، اور قاعدہ طور پر درس نظامی کی تحصیل کرتے رہے، حضرت سید احمد کبیر قدس اللہ سرہٗ کے فرزندوں میں سے ایک عالم سے عربی کے ابتدائی اسباق لیے، نحو (میزان ابتدائی فقہ) مولوی غلام محمد صاحب پنجابی تلمیذ مولانا لطف اللہ سے پڑھی لیکن زیادہ فیض مولانا عبدالغنی خان صاحب سے حاصل کیا، مولانا ممدوح سے فقہ میں شرح وقایہ ہدایہ آخرین کتاب الرہن تک پڑھی، حدیث میں مشکوٰۃ المصابیح، تفسیر میں جلالین و تفسیر بیضاوی (ابتدائی حصہ) اور علم معانی میں مختصر المعانی پڑھتے رہے، فن منطق کی تکمیل علی گڈھ میں مولانا لطف اللہ سے کی، اور ان ہی سے حمد اللہ قاضی مبارک، میرزاہد رسالہ مع حاشیہ غلام یحییٰ پڑھا، حدیث میں شمائل ترمذی اور صحیح بخاری (۹ پارے) سبقاً سبقاً شیخ حسین صاحب سہسی بھوپالی سے پڑھی، اور باقی کتابوں کی اجازت و سند بھی لی، حدیث کی دو سندیں سفر حرمین میں حاصل کیں، ایک شیخ حبیب اللہ شنقیطی سے اور دوسری شیخ عمری سے، ایک حدیث مسلسل بالاولیت کی سند میاں سید محمد شاہ صاحب محدث رامپوری سے بھی حاصل فرمائی، قرأت میں قصیدہ جزریہ قاری عبدالرحمن (مدرس احیاء العلوم الہ آباد) سے پڑھا، شاہ ولی اللہ صاحب کی چہل حدیث قاری عبدالرحمن صاحب پانی پتی سے پڑھی،

آگرہ کالجیٹ اسکول میں انٹرنس تک انگریزی تعلیم بھی پائی، اگرچہ انٹرنس کا امتحان نہیں دیا، لیکن یکے بعد دیگرے چار انگریزوں سے انگریزی پڑھنے اور لکھنے کی مشق کرتے رہے،

آگرہ سے واپسی کے بعد علیگڈھ میں محمڈن کالج کے ہڈ ماسٹر مسٹر ہوٹ سے انگریزی لٹریچر پڑھا،

تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے زمانہ کے تمام مشاہیر اصلحا و علما، مثلاً مولانا عین القضاۃ صاحب لکھنوی، مولانا فیض الحسن صاحب سہارنپوری، مولانا محمد فاروق چریاکوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب کانپوری، مولانا احمد حسن صاحب جونپوری، مولانا عبد المقتدر صاحب بدایونی، مولانا نذیر حسین صاحب محدث دہلوی، مولانا محمد نعیم صاحب فرنگی محلی، مولانا ابو الخیر صاحب مجددی، شاہ ابو احمد صاحب بھوپالی، خواجہ الطاف حسین حالی، حبیب عبد روس صاحب یمنی حیدرآبادی سے گہرے مراسم قائم رکھے، اور ان بزرگون سے علمی فیض حاصل کرتے رہے، مولانا شبلی مرحوم سے قلبی لگاؤ پیدا ہوگیا تھا، اور بہت سے علمی و تعلیمی کامون مین ان کے شریک کار رہے،

بیعت کی سعادت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی قدس سرہ العزیز سے حاصل کی تھی،

علمی ذوق کا نشو و نما | علمی ذوق کا آغاز غالب کی اردوے معلی کے مطالعہ سے ہوا جس کو انھون نے اپنے والد ماجد کے حکم سے پڑھنا شروع کیا تھا، اس کے تھوڑے عرصہ کے بعد گلزار داغ کا مطالعہ کیا، اگرچہ ان کے چچا صاحب نے اس ذوق پر زجر فرمایا لیکن طبیعت کی افتاد شوق دلاتی رہی، اور رفتہ رفتہ جب وہ زمانہ آیا کہ اپنی مرضی سے کتابون کا انتخاب کرین تو عربی کی متقدمین کی تصانیف کو زیادہ پسند کیا، اسی زمانہ مین کلام پاک کا بھی گہرا مطالعہ کرتے رہے، فارسی مین متاخرین ایران کی سحر آفرینی سے زیادہ مسحور ہوئے، اردو مین شعرائے دہلی کا کلام زیادہ پسند تھا، شاعری مین امیر مینائی سے تلمذ حاصل تھا، کئی سال تک استاذ سے مراسلت اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا، لیکن دونون مین ملاقات نہ ہوسکی، فارسی شاعری کے ذوق کا نشو و نما مولانا شبلی، مولانا عبد الغنی خان، خواجہ سنجر طہرانی، خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز لکھنوی اور خواجہ غلام غوث خان صاحب بیخبر الہ آبادی کی صحبت مین ہوا،

مضمون نگاری | ۱۸۸۳-۸۴ء سے مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا، اور لسان العصر سید اکبر حسین مرحوم نے بلنٹ کی کتاب فیوچر آف اسلام کا اردو ترجمہ مستقبل اسلام کیا، تو اس پر تبصرہ لکھا جو مولوی غلام محمد خان صاحب تپش کے اخبار مشیر قیصر لکھنؤ میں شائع ہوا، یہ غالباً ان کا پہلا مضمون تھا، اس کے بعد مختلف اخبارات مثلاً اودھ اخبار لکھنؤ، آزاد لکھنؤ، البشیر اٹاوہ، سرمور گزٹ، اکمل الاخبار دہلی، انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں مضامین لکھتے رہے، ۱۸۹۱ء میں رسالہ حسن (حیدرآباد دکن) میں ایک انعامی مضمون ظہیر الدین شاہ بابر پر لکھا، اور ادارے کی طرف سے ایک اشرفی انعام ملی، پھر ملک کے مختلف رسائل دلگداز لکھنؤ، مخزن لاہور، معارف علی گڈھ، زمانہ کانپور، علی گڈھ میگزین، اولڈ بوائز علی گڈھ، خاتون علی گڈھ، اردوئے معلی علی گڈھ، نظام المشائخ دہلی، الندوہ لکھنؤ، اور معارف اعظم گڈھ کو اپنے ادبی علمی اور تاریخی مضامین سے رونق بخشتے رہے، رسالہ الندوہ (لکھنؤ) کی اڈیٹری میں مولانا شبلی مرحوم کے شریک ادارت تھے، جو ان کی اعلیٰ علمی صلاحیت اور ادبی ذوق کا ثبوت ہے، ۱۸۸۵ء سے ۱۹۴۷ء تک جتنے مضامین لکھے ان کا مجموعہ **مقالات شرقی** کے نام سے علی گڈھ سے شائع ہو گیا ہے۔

تصانیف | تذکرۂ بابر کے علاوہ **ذکر حبیب** اور **ذکر جمیل** کے نام سے میلاد مبارک کے لیے دو کتابیں تحریر فرمائیں، **علماے سلف** میں علماے اسلام کے حالات ہیں، **نابینا علما** میں ان علما کا ذکر ہے، جنھوں نے نابینائی کی حالت میں تحصیل علم اور ناموری حاصل کی، **سیرۃ الصدیق** میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے حالات ہیں، جس کو ابتداً محمڈن کالج علی گڈھ کے طلبہ کے سامنے بطور لکچر پڑھا تھا، ایک رسالہ **اخلاقی لکچر** ہے جس میں اخلاق اسلامی کا بیان ہے، یہ لکچر بھی محمڈن کالج کے طلبہ کے سامنے پڑھا گیا، اور طلبہ کے نصاب میں داخل ہوا، ۱۹۱۶ء میں امیر خسرو کی مشہور مثنوی مجنون لیلیٰ کو تصحیح کر کے شائع کیا، جس کے شروع میں ان کے قلم سے ۱۱۵ صفحے

کا ایک فاضلانہ مقدمہ ہے، میر حسن کا تذکرہ شعرائے اردو جو انجمن ترقی اردو سے شائع ہوا ہے، اس کا انشا پردازانہ مقدمہ ان ہی کا لکھا ہوا ہے، اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کئی رسائل وقتاً فوقتاً شائع کرتے رہے، مثلاً (۱) **اسلامی اخلاق** جس میں اخلاق پر ولنگٹن بحث کے بعد اچھے اور برے اخلاق کے متعلق حدیثوں کا اردو ترجمہ دیا ہے (۲) **فقہ حنفی** جس میں فقہ حنفی کی تاریخی اور محدثانہ حیثیت پر بحث ہے (۳) **تبصرہ**، یہ تاریخ خطیب بغدادی پر عالمانہ ریویو ہے (۴) **عرض اخلاص** یہ ایک تقریر ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ مسلمان لڑکیاں زمانہ کے مطابق تعلیم ضرور پائیں لیکن اسلامی شعار اور معاشرت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں (۵) **سرسید کی یاد**، اس کو ۲۸ مارچ ۱۹۳۹ء کو مسلم یونیورسٹی کے یونین ہال میں پڑھا جس میں سرسید کی تعلیمی جد وجہد کا ذکر نہایت دلچسپ پیرایہ میں کیا ہے، (۶) **نقش وفا** میں حقوق وفرائض زوجین پر بہت سی مفید ہدایات ہیں (۷) **استاذ العلما** میں حضرت مفتی محمد لطف اللہ مرحوم کے سوانح ہیں، جن کے ضمن میں مفتی عنایت اللہ صاحب شہید اور استاذ الاساتذہ مولوی بزرگ علی صاحب کے کچھ حالات بھی آگئے ہیں (۸) **حالات حزین**، آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ بنارس میں فارسی کے مشہور شاعر علی حزین پر ایک پرمغز مقالہ پڑھا، اس میں حزین کے کلام کا انتخاب بھی ہے (۹) **ذکر محبوب** میں حضرت عبد القادر جیلانیؒ کے حالات ہیں (۱۰) **قرۃ العین** میں حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سوانح ہیں (۱۱) **مسلمانوں کی تعلیم قدیم** میں قدیم تعلیم کا نصب العین بتایا ہے (۱۲) **تعلیم اسلام کا اثر عمر وصحت پر**۔ اس میں بزرگان دین کی عمر کی درازی کا حال لکھ کر یہ بتایا گیا ہے کہ اسلام کی کما حقہ پابندی قیام صحت کا باعث ہوتی ہے (۱۳) **برق تجلی**، اس میں حسن وعشق کی زندگی پر تبصرہ ہے۔

میلاد النبی کے موقع پر کچھ نہ کچھ ضرور تقریر فرماتے، اور اس کو قلمبند کر لیتے، بعض ایسے رسائل کے نام یہ ہیں **آفتاب رسالت**، **شان رسالت**، **رسالت عامہ**، **ذکر شریف**،

پیغام رحمت، شمع ہدایت،

اپنی زندگی کے آخری ایام مین اپنے اردو اور فارسی کلام کے علٰحدہ علٰحدہ مجموعے بھی شائع کیے تھے،

نادر کتب خانہ | ان کے علمی ذوق اور اسلامی علوم وفنون سے ان کے شغف کا یہ بین ثبوت ہے کہ انھون نے اپنی محنت سے زر کثیر صرف کرکے ایک بڑا نادر اور قیمتی کتب خانہ جمع کیا، جس مین پانچ ہزار سے زیادہ مطبوعہ اور نایاب قلمی عربی اور فارسی کتابین ہین، اردو اور انگریزی کی کتابون کا بھی ایک حصہ ہے، مولانا شبلی مرحوم کا خیال تھا کہ فارسی کلام کا جیسا اچھا ذخیرہ حبیب گنج کے کتب خانہ مین ہے، رامپور اور بانکی پور کے کتب خانہ مین بھی نہین، "حبیب گنج کا کتب خانہ کس طرح جمع ہوا" کے عنوان سے خود مولانا شروانی مرحوم نے معارف (اکتوبر ۱۹۳۱ء) مین ایک مقالہ تحریر فرمایا ہے، اپنی زندگی ہی مین اس کتب خانہ کو مسلم یونیورسٹی پر باضابطہ وقف کر دیا تھا،

قومی مشاغل | سیاست سے ان کو ذوق نہ تھا، اور اس سے وہ ہمیشہ کنارہ کش رہے، لیکن مسلمانون کی علمی و تعلیمی تحریکون مین ہمیشہ پیش پیش رہے، ہوش سنبھالا تو علی گڈھ مین سرسید احمد خان کی تحریک کا چرچا سنا، جس مین خود ان کے خاندان کے کئی افراد شریک تھے، مولانا شروانی کو اگرچہ سرسید مرحوم کے بعض مذہبی خیالات سے اختلاف تھا، لیکن اس کے باوجود انھون نے ان کی مفید علمی تحریک مین پورا حصہ لیا، اور سرسید نے ان کو اپنے کالج کا ٹرسٹی منتخب کیا، محسن الملک مرحوم کی معتمدی کے زمانہ مین وہ اہل سنت وجماعت کے دینیات کی تعلیم کے سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کی تحریک کے زمانہ مین میرٹھ کانفرنس کی کمیٹی کے سکریٹری بنائے گئے، اور اس سلسلہ مین متعدد وفود مین شرکت کی، اور تحریک کی اشاعت مین تقریرین کین، نقد چندہ دیا، اور جب سے مسلم یونیورسٹی قائم ہوئی برابر کورٹ کے ممبر رہے، اور مختلف اوقات مین یونیورسٹی کی اگزکٹو کونسل، اکیڈیک کونسل کے ممبر مقرر ہوتے رہے، اور دینیات کی تعلیم کے متعلق نگران مقرر ہوئے، ۱۹۳۱ء مین مسلم

یونیورسٹی نے ان کے علمی وتعلیمی خدمات کے اعتراف میں ان کو ڈاکٹر آف تھیولوجی کی اعزازی ڈگری دیکر اپنی علم دوستی کا ثبوت دیا،

۱۸۹۰ء سے آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ممبر تھے، ۱۹۱۷ء میں جب صاحبزادہ آفتاب احمد خان صاحب انگلستان تشریف لے گئے تو مولانا شروانی کانفرنس کے جائنٹ سکریٹری مقرر ہوئے، مسلم یونیورسٹی کے قیام کے بعد جب کالج کے آنریری سکریٹری کا عہدہ ختم ہوگیا جو کانفرنس کا سکریٹری بھی ہوتا تھا تو ۱۹۲۰ء میں مولانا شروانی کانفرنس کے سکریٹری مقرر ہوئے، اور اپنی وفات کے کچھ دنوں پہلے تک اس عہدہ پر امور رہے، بالکل آخر میں ضعف پیری کی وجہ سے اس سے مستعفی ہوگئے تھے، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے بعض اجلاسوں کی صدارت بھی فرمائی،

دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شروع سے تعلق تھا، وہ اس کے رکن رکین اور بڑے معاون ومددگار تھے، اس کے تین سالانہ اجلاسوں کی صدارت بھی کی،

دار المصنفین سے بھی ان کو قلبی تعلق تھا، ۱۹۳۱ء سے آخر تک اس کی مجلس ارکان اور مجلس انتظامیہ کے صدر رہے،

کرنال کے وقف کے بھی نگران تھے، اس کا جو معاوضہ ان کو ملتا تھا، وہ اس کو کسی نہ کسی ادارہ کو دیدیتے تھے،

آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے بھی ممبر تھے، ۱۹۲۸ء میں اس کا پانچواں اجلاس لاہور میں ہوا، تو اس کے شعبۂ اردو کے صدر مقرر ہوئے، اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انھوں نے پڑھا، اس پر تحسین وآفرین ہوئی، ادارۂ معارف اسلامیہ لاہور کی بھی ۱۹۳۷ء میں صدارت فرمائی،

یو، پی ہسٹاریکل سوسائٹی، مسلم گرلز کالج علی گڈھ، اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ، انجمن حمایت اسلام لاہور اور طبیہ کالج دہلی، آرٹس سوسائٹی لندن سے بھی مختلف شکلوں میں وابستہ رہے،

قیام حیدرآباد دکن نواب فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ کی وفات کے بعد مملکت آصفیہ کے عہدۂ صدر الصدور پر ۱۳۳۶ھ مطابق ۱۹۱۸ء مین فائز ہوئے، اور اس منصب پر بارہ تیرہ سال رہے، صدر الصدوری سے متعلق دو صیغے تھے، صدارت العالیہ اور امور مذہبی، صدارت العالیہ خالص اسلامی صیغہ تھا، جو حضور نظام کے براہ راست ماتحت تھا، امور مذہبی ایک عاملانہ صیغہ تھا، جو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے عام مذہبی نظم ونسق سے متعلق تھا، مولانا شروانی نے ان دونون صیغون کی اصلاح بڑی توجہ اور سرگرمی سے کی، جس کا صلہ ان کو ۱۳۴۱ھ مین "نواب صدر یار جنگ" کے خطاب کی شکل مین ملا، قیام حیدرآباد کے زمانہ مین یہان کے باشندون پر ان کی پاکیزہ سیرت کا بڑا گہرا اثر پڑا، وہان کی تمام علمی وادبی تحریکون مین انکا نمایان حصہ رہا، اور نواب عماد الملک مرحوم کے ذمہ جو ادبی فرائض تھے وہ ان کے بعد ان ہی کے سپرد کر دیے گئے، اور جامعۂ عثمانیہ کے قیام کے بعد اس کے پہلے وائس چانسلر مقرر ہوئے، جامعہ کی مجلس دینیات کے بھی امیر تھے، اور اپنے قیام کے دوران مین کتبخانہ آصفیہ کی مجلس ذیلی کے صدر الصدور اور مجلس انتظامی کے نائب صدر، اشاعت علوم کے صدر، دائرۃ المعارف کے رکن، مدرسہ نظامیہ کی مجلس کے صدر اور انجمن احترام اوقات متبرکہ کے نگران اعلیٰ بھی رہے، انجمن ترقی اردو (ہند) اورنگ آباد دکن مین تھی، تو مولانا عبدالحق سے پہلے اس کے بھی سکریٹری تھے،

حیدرآباد دکن سے ۱۹۳۰ء مین پنشن پائی، حیدرآباد ہی کے قیام کے زمانہ مین غالباً ۱۹۲۶ء مین حرمین شریفین کی زیارت کے لیے تشریف لے گئے، مکہ معظمہ مین قاری سید عبدالرحیم کو پورا کلام پاک سنایا، اور مدینہ طیبہ مین قاری حسن شاعر سے ان کا رسالہ قرأت پڑھا، ان سے آخری سبق مسجد نبوی مین لیا، اور قرأت کی سند حاصل کی،

حیدرآباد سے سبکدوشی کے بعد ان کی زیادہ تر توجہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، مسلم یونیورسٹی، دارالمصنفین اور ندوۃ العلما کی طرف رہی،

وفات | ۸۶ سال کی عمر میں ایک ہفتہ کی شدید علالت کے بعد ۱۱ اگست ۱۹۵۳ء مطابق ۲۰ شوال المکرم بروز جمعہ بوقت صبح عالم جاودانی کو سدھارے، دوران علالت میں زیادہ تر اللہ اور رسول کی باتیں کرتے رہے، اور انگلیوں میں پڑی ہوئی تسبیح کے ورد سے غافل نہ ہوتے، طہارت کا برابر خیال رکھتے، روح پرواز ہونے سے پانچ منٹ پہلے تک باتیں کرتے رہے، اور جب آفتاب طلوع ہو رہا تھا، تو روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی، جنازہ ایک فوجی کار میں مسلم یونیورسٹی کے کرکٹ لان پر لایا گیا، اس کے پیچھے پیچھے مسلم یونیورسٹی کے اساتذہ، طلبہ، اور شہر کے حکام، رؤسا اور معززین بھی ساتھ تھے، نماز جنازہ ادا کرنے کے بعد میت علی گڈھ سے ۲۶ میل دور موضع بھموری متصل حبیب گنج کے خاندانی قبرستان میں لے جائی گئی جہاں علم و فضل، امارت و حشمت اور وقار و سنجیدگی کا پیکر پیوند خاک کر دیا گیا، اللہ تبارک و تعالیٰ ان کی تربت کو ہمیشہ ٹھنڈی رکھے، آمین ثم آمین،

حیات شبلی

یہ کتاب تنہا علامہ شبلی مرحوم کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ اس میں انکی وفات ۱۹۱۴ء تک اسکے پہلے کی ایک تہائی صدی کی ہندستان کے مسلمانوں کی مذہبی، سیاسی، علمی، تعلیمی، اصلاحی اور دوسری تحریکوں اور سرگرمیوں کی مفصل تاریخ آگئی ہے، شروع میں جدید علم کلام کی نوعیت، اسکی حیثیت اور اس سے متعلق علامہ شبلی مرحوم کی علمی خدمات پر تبصرہ ہے، پھر خلجی اور تغلق کے زمانہ سے لیکر انگریزی حکومت کے آغاز تک صوبہ آگرہ و اودھ کے مسلمانوں کی علمی و تعلیمی تاریخ کو بڑی تلاش و جستجو سے مرتب کیا گیا ہے، اور اکابر علماء کے حالات بڑی محنت سے جمع کیے گئے ہیں،

صفحات ۴۶۸ صفحے، قیمت: مجلد عہ غیر مجلد: لعہ

"منیجر"

ادبیات

ماتم حبیب شبلی

از جناب یحییٰ اعظمی

محو آرام ہوئے جا کے قریب شبلی — آہ رخصت ہوئے دنیا سے حبیب شبلی
دانش افروز کہن، یار ادیب شبلی — ہر نوا جنکی تھی پیغام نقیب شبلی

قدر دانِ ادب و فلسفۂ نعمانی
سرپرستِ ہنر کہنہ و نو شروانی

آج قائم تھا انھیں سے شرف دانش و دین — آہ تھے بزم "معارف" کے وہی صدر نشین
شکل دیکھو تو ز سر تا بہ قدم نور یقین — جن سے اس دور مین تازہ تھی سلف کے آئین

ہوگیا ختم وہ دور مئے رنگین افسوس
تیرہ و تار ہوئی مجلس دوشین افسوس

کس کو توفیق نے بخشا تھا وہ گل ریز قلم — کس کو قدرت نے دیا تھا وہ دل آویز قلم
گہر افشان، گہر آرا، گہر انگیز قلم — نظم و نثر ادب و فن بہم آمیز قلم

جس کے ہر نقش مین رنگینی و رعنائی تھی
جس کے ہر حرف مین صد حسن و دل آرائی تھی

آج سنسان ہوا میکدۂ دانش و فن — اٹھ گیا بزم سے جو ساقیٔ صہبائے کہن

ہو گیا نذرِ خزاں حکمت و عرفان کا چمن وقفِ ماتم ہے جہانِ ادب و شعر و سخن

دیکھئے جن کو شریکِ غم و ماتم ہیں سبھی

مجلسِ علم "بھی" دانش کدۂ قومی "بھی"

آہ تنہا نہیں یہ حکمت و فن کا ماتم آہ تنہا نہیں یہ شعر و سخن کا ماتم

ہے حقیقت میں یہ تہذیبِ کہن کا ماتم سچ جو پوچھو تو ہے اک شیخِ زمن کا ماتم

غم ہے وہ حکمت و اسرار کا عارف نہ رہا

غم ہے سرو قتر "اربابِ معارف" نہ رہا

اب کہاں اٹھتے ہیں اس وضع کے ارباب کمال اب کہاں دولت و تقویٰ کی یہ پاکیزہ مثال

قد و الا تھا کہ سرتا بقدم سروِ جلال جس میں تھا صورت و معنیٰ کا وہ آئینہ جمال

مظہرِ علم و ہنر پیکرِ زیبائے ادب

جس کی ہر فکر و نظر سرخوشِ صہبائے ادب

اک امیر اور حقائق کے یہ اسرار و نکات اک رئیس اور معارف کے یہ پاکیزہ صفات

کس نے پائی ہے یہ رخشندہ و تابندہ حیات صرف اک ذات گرامی کی نہیں ہے یہ وفات

کاروانِ حکمت و دانش کا رواں ہوتا ہے

قافلہ فضل کا آنکھوں سے نہاں ہوتا ہے

دورِ تابندۂ تحقیق کی رحلت یہ ہے ثانیِ شبلی مرحوم کی رخصت یہ ہے

دفن سرتا قدم اسرار کی دولت یہ ہے علم کے گنجِ گراں مایہ کی تربت یہ ہے

اے خدا تو اسے اب نور سے کر دے معمور

اس پہ ہوتا رہے دائم تری رحمت کا ظہور

حبیب گنج
(ضلع علی گڑھ)

۲۲ جنوری ۱۹۳۸ء

مکتوب شروانی

مولانا شروانی مرحوم ۱۹۳۸ء مین دارالمصنفین تشریف لائے تھے۔ واپسی پر انھون نے حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کو یہ خط لکھا تھا، جس سے دارالمصنفین کے متعلق ان کے تاثرات کا پتہ چلتا ہے۔

مکرمی

السلام علیکم ورحمۃ اللہ

لکھنؤ سے واپسی پر طبیعت ناساز ہوگئی اسلیے اس سے قبل

اللہ تعالیٰ شروفساد سے اور سکر محفوظ رکھے اور خدمت ملک
وملت میں ترقی وکامیابی دے ساتھ مصروف رکھے۔
آمین۔
مہدی صاحب کی روانگی فروری فریدہ کے ساتھ باعث ہوئی
روانہ پٹنہ وغیرہ ہو چکا ہوگا۔

مطبوعات جدیدہ

اسلام کیا ہے مولفہ جناب مولانا محمد منظور نعمانی، تقطیع بڑی، ضخامت ۲۴۲ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ۴ غیر مجلد ۳ عربیہ: کتب خانہ الفرقان گوئن روڈ، لکھنؤ،

آج مسلمانوں کو اسلام سے عملاً بہت کم علاقہ رہ گیا ہے، اور ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی اسلامی تعلیم کے مطابق نہیں ہے، بلکہ مسلمانوں کی بڑی تعداد اسلام کی حقیقت تک سے ناآشنا اور اسلامی زندگی کے صحیح تصور سے بھی بیگانہ ہے، اور مسلمان نام رہ گیا ہے صرف مسلمان کہلانے کا، یا زیادہ سے زیادہ زبان سے کلمۂ توحید پڑھ لینے اور روزہ ونماز کی ظاہری صورت کسی نہ کسی شکل میں ادا کر لینے کا، اس کے علاوہ دوسرے اسلامی فرائض کا احساس بھی نہیں رہ گیا ہے، اس لیے فاضل مصنف نے جنکو اللہ تعالیٰ نے اسلام کی روح کو سمجھنے اور اس کی تبلیغ واشاعت کی خاص توفیق عطا فرمائی ہے، اس کتاب میں کلام مجید اور احادیث نبوی سے اسلام اور اسلامی زندگی کی حقیقت بیان فرمائی ہے، اور اس کے تمام اجزاء توحید، عبادات، روزہ، نماز، حج وزکوٰۃ، تقویٰ وپرہیزگاری، معاملات، اخلاق، معاشرتی حقوق وفرائض، اللہ اور اس کے رسول کی محبت، دین سے تعلق، اس پر استقامت، اس کی خدمت ونصرت وحمایت، عالم برزخ، عالم آخرت، جنت ودوزخ، ذکر اللہ، توبہ واستغفار وغیرہ اسلام کے جملہ ارکان اور اس کے تکمیلی عناصر یعنی اسلام، ایمان واحسان اور اسلامی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو کی پوری تفصیل اور نہایت موثر اور دلنشین انداز میں اس کی تشریح اور اسکی روح بیان کردی ہے، اور انشاء اللہ کہنا بالکل صحیح ہوگا کہ اس کتاب میں دین کا پورا لب لباب آگیا ہے، اور قرآن وحدیث سے وہ سب تعلیمات بیس اسباق کی شکل میں جمع کردی گئی ہیں جن سے واقف ہونا اور جن پر عمل کرنا ایک عام مسلمان بھی نہ صرف اچھا مسلمان

اللہ تعالیٰ شروانی کو سکر محفوظ رکھے اور خدمت ملک
وملت میں ترقی و کامیابی دے ساتھ مصروف رکھے۔

آمین

مہدی[1] صاحب سلمہٗ رونق افروز ہوئے مبارکباد ہوئی
روانہ پٹنہ و غیرہ ہونگے۔

مولوی سید علی صاحب کو سلام مسنون اور دعا
کہ اللہ تعالیٰ قدر رقتاً فوقتاً حضور کو سلام و دعا کہا کریں

معارف :-

[1] حمدی صاحب سے مراد سید ابراہیم صاحب حمدی ناظم کتبخانہ شیخ الاسلام مدینہ طیبہ ہیں جو اس سفر میں شروانی صاحب کے ہمراہ تھے۔

بلکہ انشاء اللہ مومن کامل اور ولی بن سکتا ہے"، اس لیے یہ کتاب اس لائق ہے کہ ہر مسلمان اس سے فائدہ اٹھائے، بلکہ اس میں اسلام اور اسلامی زندگی کی صحیح تصویر پیش کی گئی ہے، اس لیے وہ ان غیر مسلموں کے بھی مطالعہ کے لائق ہے جو اسلام کے متعلق غلط خیالات رکھتے ہیں، اس سے اسلام کی صحیح تصویر ان کے سامنے آجائے گی،

جمہوریت اور مغربی تحریکیں مترجمہ جناب مولوی عبدالوہاب صاحب ظہوری پروفیسر نظامیہ طبیہ کالج،

تقطیع بڑی ضخامت ۲۶۲ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد سے ریتہ: مکتبہ نشاۃ ثانیہ منظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن،

ڈاکٹر ایڈورڈ رابنسن سابق صدر جمہوریہ چیکوسلواکیہ یورپ کے مشہور سیاست دان صحیح جمہوریت کے علمبردار، انسانی برادری میں حقیقی مساوات کے داعی اور امن عالم کے بڑے مبلغ ہیں، اس مقصد کے حصول کیلئے انھوں نے چند خطبات دیے تھے، جن کا ترجمہ کئی زبانوں میں ہو چکا ہے، لائق مترجم نے اسی کا اردو ترجمہ کیا ہے، جمہوریت بلا امتیاز رنگ ونسل تمام انسانوں اور قوموں میں آزادی ومساوات کی داعی اور اس کی بڑی محافظ وپاسبان سمجھی جاتی ہے، اور اس لحاظ سے جمہوری نظام حکومت سارے نظاموں میں بہتر سمجھا جاتا ہے، لیکن یورپ میں جو جمہوریت عملاً رائج ہے، وہ صحیح جمہوری روح سے خالی ہے، اور اس میں ایسے بنیادی نقائص ہیں کہ وہ آزادی مساوات اور قیام امن کے بجائے نسلی تفوق وبرتری، قومی وجغرافی تفریق، طبقاتی تقسیم، معاشی ناہمواری، سیاسی کشمکش اور جنگ وخونریزی کا ذریعہ بن گئی ہے، ان ہی نقائص کی بنا پر اس کے متوازی اشتراکیت، ٹریڈ یونین اور آمریت کی تحریکیں پیدا ہوگئیں اور قومی خود غرضی اور اقتصادی ناہمواری سے جنگ وجدال کا ایک غیر مختتم سلسلہ شروع ہوگیا، جس نے نہ صرف یورپ بلکہ ساری دنیا کے امن وسکون کا خاتمہ کر دیا، اور اس کے انسداد کی جتنی تدبیریں اختیار کی گئیں وہ سب بنیادی خرابیوں کی وجہ سے کامیاب نہ ہو سکیں اور آج پھر دنیا ایک بڑی جنگ کے آتش فشاں کے دہانہ پر کھڑی ہے، مصنف نے اس کتاب میں انقلاب فرانس سے لیکر جب سے یورپ میں جمہوریت کی بنیاد پڑی، گذشتہ جنگ کے خاتمہ تک یورپ کے سیاسی انقلابات، یورپین

قوموں کی سیاسی و اقتصادی کشمکش، ان کی لڑائیوں، مختلف سیاسی نظریوں اور تحریکوں کی روشنی میں جمہوریت کے نقائص اور اس سے پیدا شدہ مذموم نتائج پر مفصل تبصرہ کیا ہے، جس سے یورپ کا گذشتہ چند صدیوں کا پورا سیاسی مد و جزر اور اسکے اسباب و نتائج سامنے آجاتے ہیں، کتاب کے آخر میں مصنف نے صحیح جمہوریت کے بارہ میں جو حقیقی آزادی و مساوات کی ضامن ہو اور جس کے ذریعہ دنیا میں امن و امان قائم ہو سکے، اپنا مشورہ پیش کیا ہے، ترجمہ صاف اور سلیس ہے اور یہ کتاب سیاست سے دلچسپی رکھنے والوں کے مطالعہ کے لائق ہے،

اردو ادب کے معمار تقطیع اوسط، ضخامت ۱۵۲ صفحے، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر،

قیمت عمدہ پتہ: سب رس کتاب گھر خیریت آباد حیدر آباد دکن،

اردو زبان کی تعمیر و ترقی کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے، اور اس میں ہر زمانہ کے نامور شعرا و ادیبوں کی کوششیں شریک رہی ہیں، اس کتاب میں یہ جدت کی گئی ہے کہ محمد قلی قطب شاہ اور ملا وجہی وغواصی سے لیکر موجودہ زمانہ تک کے اردو زبان کے ان چھبتیس شعرا اور ادیبوں کے حالات جنکا اردو کی تعمیر و ترقی میں حصہ رہا ہے، موجودہ دور کے ممتاز اور نامور اہل قلم کی تحریروں سے لیکر مرتب کیے گئے ہیں، لیکن یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ انتخاب کس اصول پر کیا گیا ہے، اس کے دو ہی اصول ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ کسی شاعر یا ادیب کی خدمت زبان مسلم ہو یا یہ کہ جس کے حالات کسی ادیب نے لکھے ہوں لیکن ان دونوں اصولوں کے لحاظ سے ہر دور کے بہت سے شعرا، ادیبوں اور اردو کے معماروں کے حالات چھوٹ گئے ہیں، پرانے اساتذہ میں مومن، آتش اور دبیر جیسے معماران اردو کے حالات نہیں ہیں، داغ کا حال ہے مگر امیر مینائی کا نہیں ہے، حالانکہ ان سب کے حالات ممتاز ادیبوں کے قلم سے موجود ہیں، یہ صرف چند نام لکھ دیئے گئے ہیں، ورنہ اس قسم کے بہت سے شعرا خصوصاً نثر نگاروں کے حالات نہیں لیے گئے ہیں، اور موجودہ زمانہ کے تو بہت سے مسلم شعرا اور ادیب چھوٹ گئے ہیں، تاہم اس کتاب میں ایک جدت ضرور ہے، کتاب کے شروع میں اردو زبان کی مختصر تاریخ ہے،

حج بیت اللہ از جناب مولوی محمد داؤد صاحب راز، تقطیع جیبی، ضخامت ۲۲۴ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت مجلد ہے، پتہ، شوقی برادران، مالیگاؤں، ضلع ناسک،

اردو میں حج کے بہت سے سفرنامے اور مناسک حج پر مستقل کتابیں موجود ہیں، حج بیت اللہ اس موضوع پر نئی جامع کتاب ہے، اس میں عرب کا جغرافیہ، حرمین کی تاریخ، اس کے مقدس آثار ومقامات کی تفصیل، حج کے مناسک، اس کے متعلق ضروری مسائل، اور انکے اسرار وحکم کو اختصار وجامعیت کے ساتھ تحریر کیا گیا ہے، جس سے مناسک حج، اور اس کے مسائل کے ساتھ حرمین کے متعلق بہت مفید مذہبی وتاریخی معلومات حاصل ہو جاتے ہیں، اس حیثیت سے یہ کتاب حج کی معلم بھی ہے اور حرمین کی تاریخ بھی، تاریخی حالات کی توضیح کے لیے حج کے سوانح اور مقدس مقامات کے متعدد نقشے اور فوٹو بھی دیدیے گئے ہیں،

تلقین حق از پروفیسر سید نواب علی صاحب ایم اے، تقطیع اوسط، ضخامت ۷۰ صفحے، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱ر، پتہ ادارہ تعلیمات اسلامی نمبر ۳۸ امین آباد پارک لکھنؤ،

مصنف کی نظر دوسرے مذاہب اور ان کے صحیفوں پر بہت وسیع ہے، یہ کتاب انھوں نے بچوں کے لیے اسلام پر تحریر فرمائی ہے، اس میں دوسرے مذاہب کے مشرکانہ عقائد اور ان کی افسانہ طرازیوں کے مقابلہ میں اسلام کی توحید خالص، اللہ تعالیٰ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے سامان، وحی کی حقیقت، دوسرے صحیفوں کے مقابلہ میں کلام مجید کی خصوصیات، اس کے خاص خاص مضامین سزا وجزاء، روزہ، نماز، حج وزکوٰۃ، اور اسلام کی دوسری اہم تعلیمات، اس کے اوامر ونواہی، حلال وحرام، اخلاق حمیدہ ورذیلہ وغیرہ اسلام کے عقائد واعمال کو مختصراً سادہ اور سلجھی ہوئی زبان میں تحریر کیا گیا ہے، گو یہ رسالہ بچوں کے لیے لکھا گیا ہے، لیکن افادہ کے لحاظ سے ہر عمر کے اشخاص کے مطالعہ کے لائق ہے،